گورکی کی آپ بیتی

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

نمبر ۴۶

سلسلۂ مطبوعات نمبر ۱۷۳

گورکی کی آپ بیتی

حصۂ دوم - روٹی کی تلاش

از

میکسم گورکی

مترجمہ

ڈاکٹر اختر حسین صاحب رائے پوری (ڈی لٹ پیرس)

شائع کردہ
انجمن ترقّیٔ اُردو (ہند) دہلی
سنہ ۱۹۴۱ء
قیمت تین روپے

سلسلۂ مطبوعات نمبر ۱۷۳

گورکی کی آپ بیتی

حصہ دوم — روٹی کی تلاش

از

میکسم گورکی

مترجمہ

ڈاکٹر اختر حسین صاحب رائے پوری (ڈی لٹ پیرس)

شائع کردۂ

انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی

۱۹۴۱ء

روٹی کی تلاش

باب (۱)

شہر کے صدر بازار میں جوتوں کی ایک طرح دار دکان پر مجھے شاگرد پیشہ کی جگہ مل گئی۔ دنیا میں میری جدوجہد کا یوں آغاز ہوا۔

میرا مالک گول مٹول آدمی تھا۔ اس کا رنگ گندمی، چہرا کھردرا دانت بڑے اور آنکھیں مچمچی تھیں۔ پہلی نظر میں مجھے گمان ہوا کہ وہ اندھا ہے اور اپنے قیاس کی جانچ کے لیے میں نے اُس کا منہ چڑھایا۔

"منہ کیوں بنا رہا ہے؟" اس نے دھیمی آواز مگر سخت لہجے میں کہا۔ یہ خیال کہ اس کی مچمچی آنکھیں مجھے دیکھ سکتی ہیں، مجھے ناگوار تھا اور مجھے اس کا یقین نہ آیا۔ کیا یہ اغلب نہیں کہ اسے میرے منہ چڑھانے کا محض شبہ ہی شبہ ہوا ہو؟

"کہہ دیا نہ کہ یوں منہ نہ بنا" اس نے دوبارہ کہا اور اس کے موٹے ہونٹوں کو جنبش تک نہ ہوئی۔

اس کی تنتنی سرگوشی نے کانوں میں کہا: "ہاتھ نہ کھجا۔ تو شہر کے صدر بازار کی ایک چوٹی کی دکان کا ملازم ہے۔ یہ بات کبھی نہ بھولنا۔ دربان کو تو مجسمہ بن جانا چاہیے۔"

ایک تو میں یہ نہ جانتا تھا کہ مجسمہ کس بلا کو کہتے ہیں اور پھر ہاتھ کھجانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کیوں کہ کیڑوں نے وہ دُرگت کردی تھی کہ ہاتھ پھنسیوں اور دانوں سے بھرے ہوئے تھے۔

مالک نے میرے ہاتھوں کو تکتے ہوئے پوچھا: "جب تم گھر پر رہتے تھے تو روٹی کس طرح کماتے تھے؟

میرا جواب سُن کر اس کی گول کھوپڑی اور سفید بال ہلے۔ اور وہ بھڑک کر بولا:

"چیتھڑوں کا چُننا! ارے یہ تو بھیک یا چوری سے بھی زیادہ گیا گزرا کام ہے!"

میں نے قدرے فخر کے ساتھ اسے اطلاع دی:-

"گاہے گاہے میں چوری بھی کرلیتا تھا۔"

یہ سنتے ہی اس کے ہاتھ میز پر گر پڑے گویا کسی بن بلاؤ نے پنجے اٹھالئے ہوں۔ وحشت ناک انداز سے مجھ پر آنکھیں گاڑ کر وہ پھنکار اُٹھا۔

"کیا ..... ؟ کس چیز کی چوری؟"

میں نے فوراً بتا دیا کہ کس چیز کی کیسے چوری کی تھی۔

"خیر یہ تو محض شرارت تھی لیکن اگر تم نے میرے رُبوں یا جوتوں پر ہاتھ صاف کیا تو بچو ٹھنڈے ٹھنڈے جیل جاؤ گے اور عمر بھر وہاں سڑا کرو گے۔"

ایسے اطمینان سے اس نے یہ باتیں مجھے سنائیں کہ میرے چھکّے چھوٹ گئے۔ پھر تو مجھے اس شخص سے نفرت ہوگئی۔

مالک کے علاوہ دُکان میں دو ملازم تھے۔ ایک تو میرا چچا زاد بھائی ساشا جاکوف، اور ایک منشی جو اپنے کام میں ہوشیار، چکنا چُپڑا اور سُرخ رو تھا۔ ساشا کے اب یہ ٹھاٹھ تھے کہ فراک کوٹ اور لمبی پتلون زیبِ تن، قمیص کا سینہ کلف کیا ہوا اور اوپر سے ٹائی پھر وہ بھلا مجھے کب خاطر میں لاتا۔

نانا جان جب مجھے دُکان کے مالک کی خدمت میں لائے تھے تو ساشا سے کہا تھا کہ میری مدد کرے اور مجھے کام سکھائے ساشا نے اکڑ کر تاکید کی:-

"یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب الکسی میرا کہنا سُنے"

میری چندیا پر ہاتھ رکھ کر نانا نے زبردستی میرا سر جھکا دیا۔

"تمھیں ساشا کی فرماں برداری کرنا چاہیے، تجربے اور عمر دونوں میں وہ تم سے بڑا ہے"

ساشا نے بھی آنکھیں مٹکا کر مجھ سے کہا:

"نانا کی نصیحت کو گرہ باندھ رکھو" اپنے بڑے پن سے فائدہ اُٹھانے میں اس نے مطلق دیر نہ کی۔

مالک کبھی کبھی اس پر نکتہ چینی کرتا:

"ساشا، یوں بینگے پن سے نہ دیکھو"

ساشا سر جھکا کر بڑبڑانے لگتا:- میں کیوں بینگا ہونے لگا"

مگر مالک بھی اسے یوں سستے نہ چھوڑتا تھا۔

کہنی نہ ہلاؤ۔ گاہک سمجھے گا کہ کوئی بکرا گھس آیا ہے"

منشی جی اس مذاق پر مودبانہ مُسکرائے۔ مالک کی باچھیں

ہولناک طریقے سے چڑ گئیں۔ بیچارے ساشا کا چہرہ تمتما اٹھا اور وہ میز کے پیچھے جا چھپا۔ مجھے اس قسم کی گفتگو کا لب ولہجہ ناپسند تھا۔ وہ ایسے بہتیرے الفاظ استعمال کرتے تھے جو میرے لیے ناقابل فہم تھے اور کبھی کبھی تو محسوس ہوتا کہ وہ کسی اجنبی زبان میں بات چیت کر رہے ہیں۔ جب کوئی عورت دکان میں آتی تو مالک جیب سے فوراً ہاتھ نکال لیتا موچھوں پر تاؤ دیتا اور اس کے چہرے پر ایک لطیف تبسم کی دھری سی لگ جاتی تھی۔ یہ مسکراہٹ اس کے گالوں پر جھریاں تو لے آتی تھی مگر آنکھوں کی بےحس کیفیت کو نہ بدل سکتی تھی۔ منشی فوراً تن کر کھڑا ہو جاتا اور ہاتھ باندھ کر وہ اپنی انگلیوں کو ادب گسترانہ طریقے سے نچانے لگتا۔ ساشا زرا کنیاتے ہوئے آنکھیں مچمچاتا اور برابر کوشش کرتا رہتا کہ اس کے پھٹے ہوئے دیدوں پر کسی کی نظر نہ پڑنے پائے اِدھر میں دروازے پر بت بنا کھڑا چوری چھپے اپنے ہاتھوں کو کھجا لیتا۔ اور بکری کے ڈھنگ کو غور سے دیکھتے رہتا تھا۔

گاہکن کے آگے گھٹنے ٹیک کر منشی بلا کی پھرتی سے پاپوش آزمائی کرنے لگتا۔ عورت کے قدموں کو وہ ایسی نزاکت سے چھوتا کہ اس کے ہاتھ لرزنے لگتے۔ گویا اس خوف سے کہ کہیں پاؤں ٹوٹ نہ جائیں بارے یہ ٹانگیں موم کی نہ تھیں۔ عورت کی ٹانگ ایک ایسی الٹی بوتل کی سی تھی جو سڈول پن سے منہ کی طرف پتلی ہوتی چلی آئی ہو۔

ایک دن ان بیگمات میں سے کسی نے اپنی ٹانگ جھاڑ کر چیخ لگائی۔

"نوج تم تو مجھے گدگدانے لگے!"

منشی جی نے فوراً یہ بانکا جواب دیا :-

"شاید آپ کو بہت گدگدی لگتی ہی"

گاہکوں سے اس کے چوچلے اس قدر مضحکہ خیز ہوتے کہ منشی رو کنے کے لیے میں باہر دیکھنے لگتا ۔ مگر اس تماشے سے آنکھیں چرانا میرے لیے ناممکن ہوجاتا ۔ منشی کا بیوپار بیحد دلچسپ ہوتا تھا اور میں سوچ میں پڑجاتا کہ ہاتھوں کی یہ نازک حرکت اور دوسروں کو اس سگھڑاپے سے جوتے پہنانے کا فن مجھے کب آئے گا ۔

اکثر یہ ہوتا کہ مالک دُکان کے بائیں کمرے میں چلا جاتا اور ٹہل خدمت کے لیے ساشا کو بھی وہیں طلب کرلیتا ۔ اب منشی کا گاہکن کے ساتھ تخلیہ ہوجاتا تھا ۔ ایک مرتبہ کسی سُرخ بیگم کے قدموں پر جھکے جھکے ان حضرت نے اس کا پاؤں ہاتھوں میں لیا اور اس پر ایک بوسہ جڑ دیا ۔

عورت پھولی نہ سمائی اور کہنے لگی :-

"تم بھی کتنے بے دھڑک انسان ہو !"

یہ سُن کر منشی جی کے کلّے پھول گئے اور مُنہ سے ایک طویل "آہ — " کے سوا کچھ نہ نکلا ۔

ہنسی کے مارے میرا یہ حال ہوا کہ گرنے سے بچنے کے لیے دروازے کے دستے سے لٹک جانا پڑا ۔ دستہ ٹوٹ گیا اور سر نے دروازے کے شیشے کو ایسی ٹکر دی کہ وہ چکنا چور ہوگیا ۔ منشی مجھ پر بہت بگڑا ، مالک نے اپنی بھاری بھرکم انگوٹھی سے میری کھوپڑی پر ایک ٹھوکا دیا اور میاں ساشا نے میری گوشمالی کی کوشش کی ۔

شام کو گھر لوٹتے وقت اس نے مجھے ڈانٹ کر کہا :-
"ان کرتوتوں کے ہوتے تم نکال دیے جاؤ گے - آخر مذاق کا موقعہ بھی تو ہو۔" پھر اس نے مجھے سمجھایا : "اگر عورتیں دُکان کے کسی ملازم کو پسند کریں تو کاروبار کے لیے یہ اچھا ہی ہے - عورت کو جوتوں کی ضرورت نہ بھی ہو تاہم ملازم سے دم بھر دو چار ہونے کے لیے وہ آتی اور خواہ مخواہ کچھ نہ کچھ خرید لے جاتی ہے - مگر تمھاری عقل پر تو پتھر پڑے ہیں - تمھاری خاطر کوئی اپنا نقصان بھی کرے لیکن تم —"

اس پر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی میری وجہ سے کوئی اپنا نقصان کیوں کرنے لگا اور پھر وہ بھی میاں ساشا ؟"
پو پھٹے، باورچن — جو ظاہر میں مردار اور باطن میں ناہنجار تھی - ساشا سے پہلے مجھے جگا دیتی - مجھے مالک، منشی اور ساشا کے جوتے صاف کرنے اور کپڑے جھاڑنے ہوئے تھے - پھر سماوار میں پانی بھر کر چولھے میں آگ سلگانی ہوتی اور برتن مانجھنے ہوتے ، اس کے بعد دُکان جاکر میں جھاڑ پونچھ میں مصروف ہو جاتا ، چائے چڑھاتا اور گاہکوں کا مال گھر گھر پہنچانے جاتا - یہ سب کر دھر کر دوپہر کا کھانا لانے گھر جاتا - اس دوران میں چوکیدار کی خدمت ساشا کے سپرد کی جاتی جو اسے اپنی کسر شان سمجھ کر مجھ پر غرّاتا :-
"نکمّے ، نٹھلے کہیں کے ! تیرا سارا کام تو میں کیا کرتا ہوں !"
یہ لیل و نہار میرے لیے نرے غیر دلچسپ اور بے مزہ تھے - مجھے تو "کنون" کے کوچوں میں، دریائے اوکا کے کنارے اور

جنگل پہاڑوں میں دن رات آوارہ گردی کرنے کی عادت تھی - نانی جان اور اپنے یار دوستوں سے بچھڑ کر میں یہاں آ پھنسا تھا - کوئی ایسا نہ تھا جس سے دو باتیں کر سکتا - زندگی اپنا سیاہ اور مکروہ پہلو مجھ پر آشکارا کر رہی تھی - کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کوئی گاہکن خالی ہاتھ چلی جاتی اور تینوں کو یہ محسوس ہوتا کہ ان کی سخت توہین کی گئی ہے، مالک اپنی مُسکراہٹ کو تہ کرکے جیب میں رکھ لیتا اور مجھے حکم دیتا :-

"کشرین ان چیزوں کو ان کی جگہوں پر رکھ دو" پھر وہ بڑبڑانے لگتا :-

"سوُر کی بچّی تھی ! گھر میں جی گھبرایا تو یہاں چلی آئی اور ساری دُکان تلے اوپر کر گئی ! اگر میری جورو ہوتی تو مزاج درست کر دیتا !"

لیکن اس کی بیوی جو، ناک کی لمبی، آنکھ کی کانی اور دُبلاپے میں پھلجھڑی تھی، اسے اپنا دربان گردانتی تھی - اسے یوں اُلٹی سیدھی سُناتی گویا وہ اس کا نوکر ہے -

اکثر یہ ہوتا کہ کسی عورت کو میٹھی میٹھی باتیں سناتے اور جھک جھک کر سلام کرتے ہوئے دُکان سے رخصت کرنے کے بعد یہ لوگ اس کا ذکر ایسے فحش اور شرمناک طریقے سے کرنے لگتے کہ میرا جی بے اختیار چاہتا کہ لپک کر اس عورت کو یہ سب سُنا آؤں - یہ تو میں بھی جانتا تھا کہ لوگ بیٹھ پیچھے ایک دوسرے کی بُرائی کیا کرتے ہیں - لیکن یہ تینوں ایک مخصوص معاندانہ انداز سے دنیا بھر کی نکتہ چینی کرتے - گویا یہ کوئی پیر پیغمبر تھے جو دنیا کے نیک و بد کا حساب لگاتے

کے لیے بھیجے گئے تھے۔ ان کے رشک و حسد کا یہ حال تھا کہ بھول کر کسی کی تعریف نہ کرتے تھے اور ہر ایک کے بارے میں کوئی نہ کوئی بُری بات جانتے تھے۔

ایک روز دُکان میں کسی جوان عورت کا آنا ہوا، اس کے گال لال گلال اور آنکھیں متوالی تھیں۔ جسم پر مخملی لبادہ تھا جس کا کالر سیاہ پشمینے کا تھا۔ پشمینے کے باہر اس کا مکھڑا گلِ تر کی طرح جگمگا رہا تھا۔ اس کا سڈول بدن نیلے بھورے ریشم کی چُست انگیا میں ملبوس تھا۔ کانوں میں ہیرے کے بُندے دمک رہے تھے۔ اسے دیکھ کر مجھے پُرانی دیوی کی یاد آئی اور گمان ہُوا کہ کہیں یہ گورنر کی بیگم تو نہیں ہے۔ دُکان والوں نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی۔ ادب سے یوں بچھے جاتے تھے گویا یہ کوئی نور پارہ ہے، جی حضوری کرتے کرتے ان کی زبان خشک پڑگئی۔ تینوں، بندروں کی طرح دُکان میں یہاں سے وہاں اُچھلنے لگے اور شیشے میں ان کی پرچھائیں پھرکی کی طرح چکر لگانے لگی۔ لیکن جب وہ جلدی سے کوئی قیمتی جوتی خرید کر چلی گئی تو مالک نے چٹخارہ بھر کر سیٹی بجائی اور کہا:۔

"چھنال کہیں کی!!"

منشی نے حقارت سے ہاں میں ہاں ملائی: "ناٹک والی تھی!"

وہ دونوں اس عورت کے عاشقوں کا ذکر کرنے لگے اور اس کے اللے تللے کا حال سُنانے لگے۔

کھانے کے بعد جب مالک دُکان کے بائیں کمرے میں جا کر لیٹ رہا تو میں نے اس کی سونے کی گھڑی کھول کر کمانیوں میں سرکہ ٹپکا دیا۔

جاگنے کے بعد جب وہ گھڑی ہاتھ میں لیے بڑبڑاتے ہوئے دُکان میں آیا تو میری خوشی کا ٹھکانا نہ رہا:-

"یہ کیا بات ہوئی؟ میری گھڑی گیلی ہو رہی ہے، پہلے کبھی ایسی بات دیکھی نہ سُنی - بالکل سیل گئی ہے- اس کا ستیاناس ہوگیا"

دُکان اور مکان کے کام کاج پر مستزاد یہ کہ میں اداسی سے نڈھال رہنے لگا- اکثر سوچتا کہ ایسی حرکتیں کرنے لگوں کہ برطرف کر دیا جاؤں، برف کے بار سے لدے ہوئے انسان دُکان کے سامنے سے چپ چاپ گزرا کرتے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی کو دفن کرنے جا رہے ہیں- گویا ان کا ارادہ تو تھا کہ مردے کو کاندھا دیں مگر جنازے کا جلوس پہلے نکل چکا تو اب یہ قبرستان دوڑے جا رہے ہیں- برف سے ڈھکے ہوئے راستوں پر چلنے کی تھکن کے مارے گھوڑے ہانپ رہے تھے- دُکان کے پیچھے کے گرجا کے گھنٹہ گھر سے روز ٹنا ٹن کی مغموم صدا آیا کرتی- یہ ایک تیوہار کا زمانہ تھا- گھنٹے کا یہ ٹھاکا میرے دماغ پر یوں پڑتا گویا کسی تکیے پر گر رہا ہو- اس سے چوٹ تو نہ لگتی تھی مگر کان سُن ہو جاتے اور دماغ بھنا جاتا تھا، ایک دن نئے مال کا صندوق آیا اور میں آنگن میں اُسے کھولنے لگا- اتنے میں گرجا گھر کا چوکیدار قریب آیا- اس بڈھے کے جسم میں اتنے پیچ و خم تھے گویا وہ کپڑے کا بنا ہوا تھا اور کپڑے یوں تار تار تھے جیسے کتوں نے اسے بھنبوڑ ڈالا ہو-

"کیوں بھئی، مجھ پہ ترس کھا کر دو چار گولوش[1] چرا دوگے؟"

---

(۱) جوتوں پر پہننے کے لیے ربر کا تپلا سا غلاف-

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ ایک خالی صندوق پر بیٹھ گیا۔ جماہی لے کر اپنے مُنہ پر صلیب کا نشان بنایا اور پھر پوچھا:-

"چرا دو گے؟"

میں نے جواب دیا کہ "چوری سے بُرا کوئی گناہ نہیں۔"

"پھر بھی ساری دُنیا چوری کرتی ہے۔ بڑھاپے کے دن کس طرح کٹیں۔"

میں جن لوگوں کے ساتھ رہتا تھا ان سے وہ مختلف تھا اور خوش مزاج معلوم ہوتا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ اسے یقین کامل ہے کہ میں چوری کر دوں گا۔ آخر کار میں نے وعدہ کر لیا کہ گولوش چُرا کر کھڑکی میں سے اسے دے دوں گا۔

"شاباش" اس نے اطمینان سے کہا "باتیں تو نہیں بنا رہے ہو، نہیں، میں بھی اُڑتی چڑیا پہچان سکتا ہوں۔"

دم بھر وہ خاموش رہا اور گندی برف کو جوتے کے تلے سے روندتا رہا۔ پھر ایک لمبا سا پائپ سلگا کر اس نے ایسی بات کہی کہ میں اُچھل پڑا:-

"لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ میں تمھیں دھوکہ دے رہا ہوں! فرض کرو میں یہ 'گولوشس' تمھارے مالک کے پاس لے جاؤں اور کہہ دوں کہ تم نے آٹھ آٹھ آنے میں مجھے بیچے ہیں، تب کیا ہوگا؟ ان کی قیمت دو رُپے ہے اور تم اٹھنّی میں مجھے دے رہے ہو۔ تحفہ دیا جا رہا ہے کیوں؟"

میری گھگھی بندھ گئی اور میں اسے یوں دیکھتا رہ گیا گویا وہ یہ رٹ کر بھی آیا ہے۔ لیکن وہ اپنی ہنہنی آواز میں یہ بکواس کرتے ہوئے اپنے جوتوں کا معائنہ کر رہا تھا اور نیلے دھوئیں کے بادل اُڑا رہا تھا۔

"فرض کرو تمہارے مالک نے مجھ سے کہا ہو کہ زرا ٹٹول کر دیکھو تو سہی کہ یہ لونڈا چور تو نہیں ہے۔ ایں؟"

میں نے کچھ سہم کر اور کچھ بگڑ کر کہا: "میں ہرگز تمھیں گولوشس نہ دوں گا۔"

"وعدہ کر چکے ہو تو دینا ہی ہوگا۔"

میرے بازو پکڑ کر اس نے مجھے اپنی طرف کھینچا اور اپنی ٹھنڈی اُنگلیوں سے میرے ماتھے کو کھٹکا کر بولا:۔

"گھر پھونک تماشا دیکھنے کا منصوبہ تم نے کب سے باندھا ہے؟"

"تم نے ہی تو مجھے اس کی تلقین کی تھی۔"

"میں تو اور بھی بہت کچھ کہہ سکتا ہوں۔ اگر میں تمھیں گرجا گھر میں ڈاکہ ڈالنے کو کہوں تو عمل کروگے؟ تم سمجھتے ہو کہ ہر آدمی پر اعتبار کیا جاسکتا ہے؟ - ابے لونڈے! تو تو نرا احمق ہے!" یہ کہہ کر اس نے مجھے دھکا دیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

"مجھے چوری کے گولوشس کی ضرورت نہیں۔ نہ میں کوئی رئیس ہوں کہ یہ نخرے پالوں - میں تو تجھے بنا رہا تھا۔ مگر تیرے بھولے پن کا انعام میں یہ دوں گا کہ جب تیوہار کا دن آئے گا تو میں تجھے گھنٹہ گھر پر چڑھنے، گھنٹا بجانے اور وہاں سے شہر کا نظّارہ کرنے کی اجازت دوں گا۔"

"یہ شہر تو میرا دیکھا بھالا ہے۔"

"مگر گھنٹا گھر سے اسے دیکھو تو اور ہی بات نظر آئے گی۔"

برف پر اپنی پھٹی ہوئی چپّل چٹخاتے ہوئے وہ گرجا کی طرف

چلا گیا۔ میں خوف و ہراس سے اس سوچ میں پڑ گیا کہ بڈھا مذاق کر رہا تھا یا مالک کا بھیدیا تھا۔ دُکان میں قدم رکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ ساآشا نے آنگن میں آکر آواز لگائی:۔

"ارے تو زندہ ہے یا مر گیا؟"

مجھے ایسا غصہ آیا کہ ہتوڑا اُٹھا کر اس کے پیچھے دوڑا۔ میں خوب جانتا تھا کہ وہ اور منشی دونوں جی کھول کر چوری کرتے ہیں۔ جوتے یا چپّل کی جوڑی وہ کہیں چھپا رکھتے اور گھر جاتے وقت اسے اوورکوٹ کی آستین میں دبا لیتے تھے۔ ان کی اس دیدہ دلیری پر میں ڈر جاتا تھا کیونکہ مالک کی دھمکی مجھے بھولی نہ تھی۔

"کیا تم چوری کرتے ہو؟" ایک بار میں نے ساآشا سے پوچھا زرا جھلا کر اس نے جواب دیا: "چوری تو منشی کرتا ہے مگر مجھے چشم پوشی کرنی پڑتی ہے۔ اس کا حکم ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اگر میں اس کا کہا نہ کروں تو وہ مجھے نقصان پہنچا دے۔ مالک کی پوچھو تو یہ حضرت بھی کبھی کسی کے ملازم تھے اور ان باتوں کو خوب سمجھتے ہیں۔ مگر تم اپنی زبان پر لگام لگائے رہیو۔"

یہ کہتے کہتے اس نے آئینے میں اپنے کو دیکھا اور اپنی ٹائی کو ایسے جھٹکے سے ٹھیک کیا جو صاف منشی کی نقل تھی۔ اپنے بڑپن کا رعب وہ ہمیشہ مجھ پر گانٹھا کرتا تھا۔ کبھی گرج دار آواز میں مجھے ڈانٹتا اور کبھی مُکّا دکھا کر اُمکا ڈھمکا کرنے کا حکم دیتا۔ میں اس سے ڈیل میں اونچا مگر ڈول میں دبتا ہوا تھا۔ پھر میں پھوہڑ تھا۔ وہ دوہرے جسم کا اور زیادہ چست و چالاک تھا، کوٹ اور پتلون پہن کر وہ مجھے در اصل

کوئی بڑا آدمی معلوم ہونے لگتا۔ مگر اس کے باوجود اس میں کوئی ایسی بات تھی جو مجھے ناگوار اور مضحکہ خیز معلوم ہوتی۔ وہ باورچن سے نفرت کرتا تھا۔ (یہ عورت بھی ایک ہی آفت خانم تھی اور یہ طے کرنا مشکل تھا کہ وہ اچھی ہے یا بُری)، اپنے انگارے سے دیدوں کی کالی پتلیوں کو پھیلا کر وہ اعلان کرتی: "لڑائی بھڑائی مجھے دنیا میں سب سے زیادہ پسند ہے۔ کوئی بھی لڑائی ہو ــــ خواہ مرغوں کی، کتّوں کی یا آدمیوں کی۔"

اگر آنگن میں اتفاق سے مرغوں یا کبوتروں میں جھپٹ ہو جاتی تو باورچن کام چھوڑ کر کھڑکی کے پاس کھڑی ہو جاتی اور سانس روک کر آخر تک یہ تماشا دیکھتی رہتی۔ شام کو وہ مجھ سے اور ساشا سے کہتی:

"بچّو، یوں ہاتھ پر ہاتھ دئے کیوں بیٹھے ہو۔ اور کچھ نہیں تو کُشتی ہی لڑا کرو!"

اس پر ساشا بپھر پڑتا تھا:

"گنوار کہیں کی! مجھے کیا کوئی بچہ سمجھا ہے، میں دُکان کا چھوٹا منشی ہوں!"

"اس سے کیا ہوتا ہے۔ جب تک تمھاری شادی نہ ہو جائے میری نگاہ میں تم بچے ہی رہوگے۔"

"گنوار، پھوہڑ!"

"شیطان سے زیادہ چالاک کون ہے، لیکن اللہ میاں اس پر لعنت ہی بھیجتے ہیں۔"

اس کی بات چیت پر ساشا خاص طور پر چڑھتا تھا اور اسے طرح طرح سے ستایا کرتا تھا۔ لیکن وہ حقارت اور حیرت سے اسے

گھور کر بس یہ جملہ دُہرا دیتی تھی:

"پھٹکار ہی تجھ پر گرگٹ کہیں کے! خدائی کا کلنک!"

کبھی کبھی سا آشا مجھے شہ دیتا کہ باورچن جب سوتی ہو تو اس کے مُنہ پر کالک پوت دوں، اس کے تکیے میں سوئی رکھ دوں یا اسی قسم کی کوئی شرارت کروں لیکن اس عورت سے میری کنّی دبتی تھی۔ پھر وہ کبھی گہری نیند نہ سوتی تھی اور رات کو کئی بار جاگا کرتی تھی۔ قندیل جلا کر وہ پلنگ کے کنارے بیٹھ جاتی اور دیوار کے کونے کو گھورا کرتی۔ کبھی وہ تنور کے پیچھے آتی جہاں میں سوتا تھا اور مجھے جگا کر بھرّائی ہوئی آواز میں کہتی:۔

"الکسی، کسی طرح آنکھ نہیں لگتی۔ طبیعت میں کچھ بے چینی ہے۔ ذرا دیر مجھ سے باتیں ہی کر لے۔"

نیم خوابی کی حالت میں میں اسے کوئی کہانی سُنانے لگتا اور وہ خاموش بیٹھی وجد کیا کرتی۔ مجھے محسوس ہوتا کہ اس کے جسم سے موم اور لوبان کی بو آتی ہے اور وہ جلد مر جائے گی۔ ہر آن مجھے کھٹکا لگا رہتا کہ وہ اب منہ کے بل زمین پر گرے گی اور ختم ہو جائے گی۔ ڈر کے مارے میں زور زور سے بولنے لگتا تھا مگر وہ روک دیتی:۔

"شہ ہ ۔ ۔ ۔ ۔! تم تو سارے گھر کو جگانے کا جتن کر رہے ہو۔ لوگ سمجھیں گے کہ تم میرے یار ہو!"

میرے قریب وہ ایک ہی انداز سے بیٹھتی تھی ۔ اکڑوں کلائیاں گھٹنوں کے درمیاں اور پنڈلیوں کی ہڈیوں سے انھیں بھینچتی ہوئی۔ اس کا سینہ بالکل سپاٹ تھا۔ اونی شب خوابی کے لباس کے اندر

سے بھی اس کی پسلیاں جھلکتی تھیں، جیسے ٹوٹے ہوئے برتن کی کرچیں ہوں۔ دیر تک چپ بیٹھے بیٹھے وہ یک بیک آہستہ سے کہہ اٹھتی:۔
"بلا سے مجھے موت آجائے۔ آگے پیچھے سب کو اس جہان سے جانا ہی۔" کبھی وہ کسی نامعلوم آدمی سے سوال کرتی:۔ "کیوں جی اب تو میرے چل چلاؤ کا وقت آگیا؟"
میری بات کاٹ کر کبھی وہ غرّا پڑتی: "سوتا ہی یا نہیں۔" اور پلنگ سے اتر کر دبے پانو اندھیرے باورچی خانے میں سے ہو کر نکل جاتی تھی۔
پیٹھ پیچھے ساشا اسے چڑیل کہا کرتا تھا۔ ایک بار میں نے اس سے پوچھا:۔
"یہی بات تم اس کے منہ پر کیوں نہیں کہتے؟"
"کیا مجھے اس کا ڈر ہی؟" مگر دم بھر بعد ناک بھوں چڑھا کر وہ بولا: "نہیں بھئی، منہ در منہ تو مجھ سے نہ کہا جائے گا۔ کیا عجب جو وہ دراصل چڑیل ہی ہو۔"
یہ دیونی تو کسی کو منہ نہ لگاتی تھی، پھر بھلا مجھے کب خاطر میں لاتی۔ صبح سویرے کھینچ کر بستر سے اٹھا دیتی اور گلا پھاڑ کر کہتی:۔
"آیا ہی بڑا سونے والا! چل، ایندھن نکال، سماوار میں پانی سمو، دروازوں کی صفائی کر!"
ساشا کی آنکھ کھل جاتی اور وہ دہاڑ پڑتا: "گھر سر پر کیوں اٹھا رکھا ہی؟ میں مالک سے شکایت کیے بغیر نہ رہوں گا۔ سونا دو بھر کر دیا ہی۔"

اپنے سوکھے ساکھے بدن کو مٹکا کر اور بے خواب، آتش بار آنکھوں کو اس پر گاڑ کر وہ جواب دیتی :-

"خدائی کا کلنک! اگر میری اولاد ہوتی تو مزہ چکھاتی"

ساشا بھی اسے گالیاں سناتا اور اس پر لعنت ملامت بھیجتا رہتا جب ہم دکان سے چلے تو رستے میں اس نے کہا "اسے نکالنے کی کوئی ترکیب سوچنی چاہیئے - آنکھ بچا کر ہم کھانوں میں نمک جھونک دیں گے - اگر کھانے میں نمک ہی نمک ہوا تو پھر ضرور نکال دی جائے گی ..... تم آنکھیں پھاڑ کر کیا دیکھ رہے ہو؟"

"یہ سب آپ ہی کیجیے گا"

ساشا نے غصے کے مارے تھوتھنی چڑھا لی :-

"ڈرپوک کہیں کا!"

ایک دن آنکھوں دیکھتے باورچن مرگئی - وہ سماوار اٹھانے کے لیے جھکی تھی کہ یک بیک زمین پر گر پڑی اور اس کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا - بس یہ معلوم ہوا کہ کسی نے اس کے سینے میں خنجر بھونک دیا - اس نے ایک کروٹ لی - ہاتھوں کو جنبش ہوئی اور منہ سے لہو کی دھار بہہ نکلی -

چشم زدن میں ہم تاڑ گئے کہ وہ مرگئی - مگر ہول کا یہ حال تھا کہ ہماری آنکھیں ٹنگی کی ٹنگی رہ گئیں اور گھگھی بندھ گئی - بالآخر ساشا باورچی خانے سے جان لے کر بھاگا - میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کروں لہٰذا میں کھڑکی کے پاس روشنی میں کھڑا ہو گیا - مالک اندر گھسا، دبے سے اس کے پاس بیٹھ گیا اور اس کے منہ پر ایک انگلی رکھ دی -

"او ہو، یہ تو مرچکی۔ بیٹھے بٹھائے اسے کیا ہوگیا؟" کونے میں رکھے ہوئے شہ نشین کے بت کے آگے کھڑے ہوکر اُس نے صلیب کا نشان بنایا اور فاتحہ پڑھ کر مجھے حکم دیا:- "کشرین! دوڑکر پولیس کو بُلا لاؤ"

پولیس نے آکر کچھ کھسر پسر کی "ناؤ نوش" کے لیے دام سیدھے کیے اور اپنی راہ لی۔ کچھ دیر بعد پولیس والے مہتر گاڑی لے کر لوٹے اور باورچن کی لاش کو کاندھا دے کر سڑک پر لے گئے۔ مالکن دروازے سے یہ ماجرا دیکھتی رہی اور پھر مجھ سے کہا:-

"فرش دھو ڈالو۔"

مالک نے حاشیہ آرائی کی:-

"خیر ہوئی کہ اس نے شام کے وقت انتقال کیا۔"

یہ خیر و خراب میری سمجھ میں نہ آیا۔ رات کو سوتے وقت ساشا نے غیر معمولی لجاجت سے کہا:-

"قندیل گل نہ کرنا۔"

"کیا تمھیں ڈر لگ رہا ہے؟"

اپنا منہ کمبل میں لپیٹ کر وہ دیر تک دم سادھے پڑا رہا رات ایسی سنسان تھی گویا کچھ سننے کے لیے گوش برآواز ہے یا کسی کے انتظار میں محو ہے، مجھے یہ گمان ہوا کہ اسی گھڑی گھنٹا بجا اور سارا شہر ایک ساتھ ہڑبڑا کر کہرام مچانے لگا۔

ساشا نے کمبل سے ذرا سا منہ نکال کر نرمی سے کہا:

"چلو تنور پر دونوں کے دونوں سو رہیں۔"

"وہاں بڑی گرمی ہے"۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ بولا:۔

"آناً فاناً یہں چل بسی۔ کہتا نہ تھا کہ چڑیل ہے۔ اب مجھے نیند نہ آئے گی"۔

"یہی حال میرا ہے"

وہ مُردوں کے قصّے سُنانے لگا۔۔۔۔ قبرستان سے نکل کر آدمی رات کو وہ کس طرح شہر کا گشت لگاتے ہیں اور ان مقاموں کی تلاش کرتے ہیں جہاں وہ یا ان کے اقربا رہتے تھے"۔

آہستہ سے وہ بولا:۔"مُردوں کو شہر تو یاد رہتے ہیں لیکن مکان اور راستے فوراً بھول جاتے ہیں"۔

سناٹا اور اندھیرا بڑھتا جاتا تھا۔ اتنے میں ساشا نے سر اُٹھا کر پوچھا:

"تمھیں دکھلاؤں کہ میرے صندوق میں کیا کیا ہے؟" اس صندوق کا راز معلوم کرنے کی خواہش مجھے عرصے سے تھی۔ وہ اسے مقفل رکھتا تھا اور بڑی احتیاط سے کھولتا اور بند کرتا تھا۔ اگر میں تاک جھانک کرتا تو وہ ڈانٹ دیتا:۔

"یہاں کیا کر رہا ہے، اَیں"؟

اب جو میں نے رضامندی ظاہر کی تو وہ اچک کر پلنگ پر اُکڑوں بیٹھ گیا اور مجھے حکم دیا کہ صندوق لا کر اس کے پانو کے پاس رکھ دوں۔ چابی اس کے گلے میں صلیب کے ساتھ لٹکتی رہتی تھی۔ باورچی خانے کے تاریک کونوں کو غور سے دیکھ کر

وہ شان سے کھانسا کھکھارا۔ پھر تالا کھول کر ڈھکنے کو یوں پھونکا گویا وہ گرم ہی اور اسے اوپر اُٹھا کر کئی کپڑے باہر نکالے۔

آدھا صندوق دواؤں کی ڈبیوں، چائے کے رنگ برنگے پلندوں اور ٹین کے خالی ڈبوں سے بھرا ہوا تھا۔

"یہ کیا؟"

"زرا صبر کرو"

صندوق کو اپنے زانوؤں میں دبا کر وہ ہولے ہولے گنگنانے لگا:۔ "کالی بلی کبوتر کھا گئی رے ــــ"

میں سوچ رہا تھا کہ اب کھلونوں کی باری آئے گی۔ میں ہمیشہ اس نعمت سے محروم رہا تھا، اس لیے یوں ظاہر کرتا تھا گویا ان سے زیادہ حقیر کچھ نہیں۔ مگر دل ہی دل میں میں ان سے جلتا تھا جن کے پاس کھلونے ہوتے تھے۔ اس خیال سے میں خوش ہُوا کہ ساشا جیسا اکل کھرا بھی کھلونے پسند کرتا ہی گو کہ شرم کے مارے انھیں سینت کر رکھتا ہی۔ اس شرم کی کیفیت میں سمجھ سکتا تھا۔

ایک ڈبا کھول کر اس نے اس میں سے چشمے کا فریم نکالا اور اسے ناک پر رکھ کر مجھے گھورتے ہوئے بولا:۔

"شیشہ نہیں تو کیا ہوا! یہ خاص قسم کی عینک ہی"

"زرا مجھے بھی دیکھنے دو"

"تمھاری آنکھوں پر نہ بیٹھے گا۔ یہ کالی آنکھوں کے لیے ہی مگر تمھاری تو بھوری ہیں" یہ کہ کر وہ مالکن کی ڈانٹ پھٹکار کی نقل کرتے کرتے اچانک رک کر سہمے ہوئے تیور سے باورچی خانے

کی طرف دیکھنے لگا۔

ٹین کی ایک ڈبیا میں طرح طرح کے بٹن بھرے ہوئے تھے جنھیں دکھلاکر وہ فخریہ بولا:۔

سب کے سب سڑک پر پڑے ہوئے ملے۔ اکیلے میں نے ہی تو چُنے تھے! پورے سینتیس ہیں۔"

دوسرے ڈبوں میں جوڑے کھونسے، دروازوں کے زنگ آلودہ، شکستہ یا ثابت ہتّے، جوتوں کے تسمے، چھڑیوں کے ہڈّی کے دستے، دوشیزاؤں کی طرح دار کنگھیاں، پریوں کے قصّے اور اسی قبیل کی بہتیری چیزیں بھری پڑی تھیں۔

جب میں سڑکوں پر رڈی چنا کرتا تھا تو مہینے بھر میں اس سے دس گنا زیادہ کباڑ جمع کرلیتا۔ اس بھان متی کے پٹارے کو دیکھ کر مجھے کچھ تو ساشا پر ترس آیا اور کچھ مایوسی ہوئی۔ مگر وہ تو ہر چیز کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے ہوئے بڑے لاڑ سے اسے سہلاتا اور پھر اپنے موٹے ہونٹوں کو شان سے چباتا تھا اس کی پھٹی ہوئی آنکھیں اس ملغوبے پر مہر و محبّت سے جمی ہوئی تھیں عینک پہن کر اس کا طفلانہ چہرا مضحکہ خیز معلوم ہونے لگا تھا۔

"تم نے یہ کباڑ کیوں جمع کر رکھا ہی؟"

عینک ہی سے مجھے گھور کر اس نے پوچھا:۔

"کہو تو اس میں سے کچھ تمھیں بھی دوں؟"

"شکریہ، مجھے کسی چیز کی حاجت نہیں"

میرے انکار اور ان عجائبات کی ناقدری کی وجہ سے

اسے صدمہ ہوا - دم بھر چپ رہ کر اس نے نرمی سے کہا :-
"تولیہ لے کر ان سب کو پونچھ ڈالو - گرد جم گئی ہی"
جب جھاڑ پونچھ ہو چکی تو وہ دیوار کی طرف منہ کر کے لیٹ گیا۔
مینہ رم جھم برس رہا تھا - چھت میں سے بوندیں ٹپاٹپ گر رہی تھیں
اور کھڑکی کو ہوا کھڑکھڑا رہی تھی - ساشا نے مجھے جتلایا :
"زرا صبر کرو! جب باغ کی مٹی سوکھ جائے گی تو میں تمھیں
ایک ایسی چیز دکھلاؤں گا کہ تم حیران رہ جاؤ گے"
مجھ پر نیند کا ایسا غلبہ تھا کہ جواب میں کچھ نہ کہا -
پل بھر بعد ہی وہ چونک پڑا ، دیوار کو ہاتھوں سے پیٹ کر
بھرّائی ہوئی آواز میں گڑگڑایا :-
"مجھے ڈر لگ رہا ہی - اللہ مجھ پر رحم کر - یہ کیا ہی ؟"
میرے تو چھکے چھوٹ گئے - ایسا معلوم ہوا کہ باورچن میری
طرف پیٹھ کیے کھڑکی کے پاس سر جھکائے کھڑی آنگن میں مرغوں
کی پالی دیکھ رہی ہی - جی کڑا کر کے میں باورچی خانے میں یوں
گھُسا - گویا انگاروں پر چل رہا ہوں - دائیں بائیں نظر گھمانے کا
ہیاؤ نہ ہوا ، چٹ ساشا کے پاس لیٹ گیا ، دہشت ایسی طاری
تھی کہ ہم دونوں سو گئے -
اس واقعے کے کئی روز بعد ایک تیوہار آیا - دوپہر تک
دُکان میں رہ کر ہم گھر کھانا کھانے آئے - جب مالک قیلولے کی
غرض سے اندر چلا گیا تو ساشا نے چپکے سے کہا :-
"میرے ساتھ چلے آؤ"

میں تاڑ گیا کہ وہ عجوبہ چیز دیکھوں گا جو مجھے حیران کر دے گی
ہم دونوں باغ پہنچے ۔ دو مکانوں کے بیچ ایک تنگ سی بینڈ پر آٹھ دس لیمو کے پیڑ کھڑے تھے ۔ ان کے تنوں پر ہری کائی جمی ہوئی تھی اور بے برگ و سیاہ شاخیں بے جان و بے حرکت لٹکی ہوئی تھیں ۔ ان پر کسی کوّے تک کا گھونسلا نہ تھا ۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی گورستان کے ستون ہیں ۔ باغ میں نہ گھاس پھوس تھی نہ باڑی جھاڑی ۔ لے دے کر یہی پیڑ تھے ۔ پگڈنڈی کی مٹی روندی روندائی کالی پٹ تھی اور لوہے سے کم سخت نہ تھی ۔ سڑی ہوئی پتیوں کے نیچے جہاں جہاں زمین نظر آتی تھی وہ بند پانی کی طرح ہموار تھی ۔

ساشا چہار دیواری کے اس کونے میں جا دبکا جہاں سڑک والوں کی نگاہ نہ پڑتی تھی ۔ پھر ایک لیمو کے پیڑ تلے آکر آنکھیں پلٹ پلٹ کر پڑوس کے مکان کی میلی کچیلی کھڑکی کو دیکھنے لگا ۔ زمین پر بیٹھ کر اس نے ہاتھ سے پتیوں کی ڈھیری ہٹائی ۔ نیچے موٹی سی جڑ تھی جس کے پاس دو اینٹیں زمین میں گڑی ہوئی تھیں اینٹیں جو ہٹائیں تو لوہے کا پتر نظر آیا اور اس کے بھی نیچے ایک چوکور تختہ تھا ۔ آخر کار، جڑ کی تہ میں ایک سوراخ نکلا ۔

ساشا نے دیا سلائی سلگا کر موم بتی جلائی اور اُسے سوراخ پر رکھ کر مجھ سے کہا :

"اندر دیکھو لیکن ڈرنا مت !"

لیکن ڈر کے مارے خود ان حضرت کا بُرا حال تھا ۔ ہاتھ کی

موم بتی تھرتھرا رہی تھی اور چہرے کا رنگ زرد پڑگیا تھا، ہونٹ لٹک گئے، آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور دوسرا ہاتھ خود بخود پیچھے چلا گیا اس کے ہراس کا اثر مجھ پر بھی ہوا اور میں نے جھجکتے ہوئے جڑ کی تہ میں جھانکا جسے ساشا نے محراب کی سی شکل دے دی تھی اس غار کے کونے میں تین چھوٹی چھوٹی موم بتیاں جل رہی تھیں جن سے نیلی سی روشنی نکل رہی تھی۔ غار خاصی کشادہ تھی لیکن گہرائی مشکل سے گز بھر ہوگی۔ اس کے پہلو ٹوٹے ہوئے شیشوں اور پھوٹے ہوئے برتن بھانڈوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ بیچوں بیچ ایک بلند مقام پر لال کپڑے سے ڈھکا ہوا ننھا سا تابوت رکھا تھا جس کی آرائش روپہلے کاغذ اور زرّین مخمل سے کی گئی تھی مگر اس احتیاط کے باوجود نیچے سے ایک چڑیا کی چونچ اور پنجے صاف نظر آرہے تھے۔ تابوت کے پاس ایک رحل رکھی ہوئی تھی۔ جس پر پیتل کی صلیب دھری تھی۔ اس کے گرد تین موم بتیاں شمع دانوں میں روشن تھیں جن پر مٹھائیوں سے نوچے ہوئے سنہرے روپہلے کاغذ لپٹے ہوئے تھے۔

جھینی جھینی جوت غار کے دہانے کو اُجال رہی تھی۔ اندر کا حصہ ہلکی ہلکی رنگ برنگی کرنوں سے روشن تھا۔ موم اور سیلن کی بھاری بو سے میرا دم گھٹنے لگا اور رنگا رنگ روشنی پر قوسِ قزح کا گمان ہوا۔ ہر طرف رنگوں کی برکھا سی ہونے لگی۔ یہ تماشا دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی اور سارا وہم وہراس ہوا ہو گیا۔

"پسند آئی یہ جگہ؟"

"آخر یہ ہے کیا؟"

"مزار ہے مزار۔ سُجھائی نہیں دیتا؟"

"بات کچھ سمجھ میں نہ آئی۔"

"پرندے کو کوئی مردہ آدمی تصوّر کرو۔ یہ ستم زدہ بے گناہ تھا، اس لیے اس کی یادگار باقی رہنا چاہیے۔"

"کیا تمھیں اس کی لاش ملی تھی؟"

"نہیں تو۔ بیچاری چڑیا کمرے میں آگئی۔ میں نے ٹوپی کے نیچے دباکر اس کا دم گھونٹ دیا۔"

"یہ کیوں؟"

"اس لیے کہ میرا جی چاہا۔"

میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس نے دوبارہ پوچھا:۔

"جگہ پسند آئی یا نہیں؟"

"نہیں"

سانتسا نے غار پر تختہ بچھایا اور اینٹوں سے اسے چھپاکر اُٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اپنے کپڑوں کو جھاڑتے ہوئے سختی سے بولا:

"پسند کیوں نہیں آئی؟"

"کیوں کہ مجھے اس پرندے کے انجام کا افسوس ہے۔"

پل بھر کے لیے اس کی آنکھیں کسی اندھے کی آنکھ کی طرح کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ پھر میرے سینے پر مُکا مار کر وہ چلایا:۔

"اُلّو کہیں کا! حسد کے مارے باتیں بنا رہا ہے، گویا تیرے باغ کا تہہ خانہ اس سے بہتر تھا۔"

اپنے تہ خانے کا خیال آتے ہی میں نے کامل اعتماد سے جواب دیا: "اس میں کیا شک ہے"

یہ سنتے ہی ساشا نے کوٹ اُتار کر زمین پر پھینکا، آستین اُلٹی اور پنجے جھاڑ کر بولا:

"جب تک دو دو ہاتھ نہ ہوں اس کا فیصلہ نہ ہوگا" میں لڑنا نہ چاہتا تھا۔ طبیعت پر ایسا بار سا تھا کہ ہمت ٹوٹ گئی تھی۔ چچا زاد بھائی کے تمتمائے ہوئے چہرے نے اور بھی سہما دیا۔ اتنے میں اس نے سر سے میری چھاتی کو ایسی ٹکر ماری کہ میں چاروں شانے چت گر پڑا۔ اب وہ مجھ پر چڑھ بیٹھا اور للکارنے لگا:-

"زندگی چاہتا ہے یا موت!"

مجھ میں اس سے کہیں زیادہ سکت تھی اور تاؤ بھی آگیا۔ دم کے دم میں وہ زمین پر رگڑے کھا رہا تھا، اس کے ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے تھے اور نرخرا رُندھ گیا تھا۔ یہ دیکھ کر میں ڈرا اور اسے اُٹھانے کی کوشش کی لیکن اس نے دولتی جھاڑ کر مجھے دھکیل دیا۔ اب میں اور بھی گھبرایا۔ ایک طرف ہولیا، سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کروں۔ اس نے سر اُٹھا کر کہا:-

"خبر بھی ہے کہ تو نے کیسی مصیبت مول لی ہے؟ میں ایسی ترکیب کروں گا کہ مالک مالکن کے کان تیرے خلاف بھرے جائیں اور وہ تجھے نکال باہر کریں"

وہ مجھے یوں ڈانٹنے پھٹکارنے لگا کہ میرا خون کھول اُٹھا

لپک کر میں اس غار پر جھپٹا، پتھروں کو ہٹایا اور تابوت کو چڑیا سمیت باڑی سے پرے سڑک پر پھینک دیا اور غار کے سارے دفینے کو میں نے پانو تلے روند ڈالا۔

ساشا پر میرے انتقام کا کچھ اور ہی اثر ہوا۔ زمین پر بیٹھے منہ لٹکائے، بھنویں سکوڑے وہ چپ چاپ میری تباہ کاری کا تماشا دیکھتا رہا۔ جب میں اپنا کام کر چکا تو وہ اپنے کپڑے جھاڑتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا اور ڈراؤنے انداز میں بولا:

"اب اپنی کرنی کا پھل بھی چکھنا!۔ بچو ذرا ٹھہرو۔ میں نے جان بوجھ کر یہ سارا پاکھنڈ رچا تھا۔ یہ تو جادو کا کھیل ہے۔ او ہو!"

میں یوں زمین پر گر پڑا گویا گولی لگ گئی ہو۔ ایسا معلوم ہوا کہ جسم میں خون جم کر برف بن گیا۔ مگر ساشا نے میری طرف نظر بھی نہ اُٹھائی اور چلا گیا، جس سے اس کی سچائی پر مجھے کوئی شبہ نہ رہا تھا۔ میں نے سوچ لیا کہ صبح ہوتے ہی اس شہر سے بھاگ جاؤں تاکہ مالک، ساشا اور اُن کی بیہودگیوں سے مجھے نجات ملے۔

جب سویرا ہوا تو نئی نوکرانی نے آواز دی:

"توبہ توبہ! بیٹھے بٹھائے یہ لڑکا کل منہا بن گیا!"

اس خیال سے میرا دل بیٹھ گیا کہ جادو نے اپنا اثر دکھلانا شروع کر دیا۔

لیکن نوکرانی ہنسی کے مارے یوں لوٹ پوٹ ہوئی جاتی تھی کہ میں بھی مسکرا پڑا اور اس کے آئینے میں صورت دیکھنے لگا۔ میرا چہرا توے کی کالک سے پُتا ہوا تھا۔

"کیا یہ ساشا کی کارستانی ہے؟" میں نے پوچھا:۔
"نہیں بھئی، میری" نوکرانی نے ہنس کر کہا۔
جب میں جوتے صاف کرنے بیٹھا تو ہاتھ ڈالتے ہی پہلے جوتے میں چھپی ہوئی پن انگلی میں اُتر گئی۔
"اچھا تو یہ ہے ساشا کا جادو"
ہر جوتے میں پن یا سوئی اس ہوشیاری سے رکھی گئی تھی کہ ہر دفعہ میرے ہاتھ میں چبھ جاتی تھی۔ پھر تو میں نے بھی ٹھنڈے پانی کی صراحی لی اور نہایت اطمینان سے جادوگر کی کھوپڑی پر اُنڈیل دی جو یا تو اب تک سو رہا تھا یا جھوٹ موٹ آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔
بہر حال میری ہیبت نہ گئی۔ ہمیشہ مجھے اس تابوت کا خیال آتا جس میں سے چڑیا کے اکڑے ہوئے پنجے نکل آئے تھے اور جو نیچ اُداسی سے اوپر اُٹھی ہوئی تھی۔ آنکھوں کے آگے وہ رنگ برنگی کرنیں آجاتیں جو تابوت کا حلقہ کیے ہوئے تھیں اور اندر دھنک بنانے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔ میرے تصوّر میں وہ تابوت بڑا ہو گیا تھا۔ پرندہ زندہ ہو گیا تھا اور اس کے پنجے حرکت کر رہے تھے۔
میں نے شام کو فرار ہونے کی ٹھان لی، مگر چولھے پر کھانا گرم کرتے وقت بے خیالی میں ہنڈیا میرے ہاتھوں پر اُلٹ پڑی۔ اسپتال جانے کی نوبت آ گئی۔ اسپتال میں میں نے جو بھیانک سپنا دیکھا اب بھی یاد آجاتا ہے۔ ایک بے رنگ

بیابان میں کفن پوش انسانوں کا مجمع فریاد کر رہا تھا - اور ایک لم تڑنگ لنگڑا، بیساکھی سنبھالے، اپنی کالی ڈاڑھی کھجاتے اور گھنی بھنویں نچاتے ہوئے چیخ رہا تھا :-

"میں اعلیٰ حضرت کو اس کی رپٹ پہنچاؤں گا"

پھونس کی توشک گویا تابوت اور بیمار مردے پرندے تھے - ایسا محسوس ہوتا تھا کہ پیلی دیواریں ڈگمگا رہی ہیں چھت بادبان کی طرح ڈگر مگر کر رہی ہے اور فرش لہر کی طرح میرے پلنگ کے ارد گرد ناچ رہا ہے - یہاں کی ہر شئے اداس اور مغموم تھی - پیڑوں کی ڈالیاں جب کھڑکی سے ٹکراتیں تو ایسا لگتا کہ کسی کے ہاتھ میں چھڑی لپلپا رہی ہے - دروازے پر ایک لال بالوں والی لاش رقص کر رہی ہے اور اپنے کفن کو ہلا کر بڑبڑا رہی ہے:-

"یہاں پاگلوں کا کیا کام !"

اُدھر لنگڑا اپنی بیساکھی گھما کر وہی رٹ لگائے ہوئے تھا:-

"میں اعلیٰ حضرت تک اس کی رپٹ پہنچاؤں گا"

نانا، نانی اور پڑوسیوں سے یہی سُنتا آیا تھا کہ اسپتال میں لوگ بھوکوں مرتے ہیں - اس لیے میں نے زندگی سے ہاتھ دھو لیا - اتنے میں ایک عینک لگائے کفن پوش عورت نے قریب آ کر سلیٹ پر کچھ لکھا اور اسے میرے سرہانے ٹانگ دیا لکھنے میں چاک ٹوٹ کر میرے آس پاس بکھر گیا -

"تمھارا نام کیا ہے ؟"

"میں بے نام ہوں"

"یہ کیسے ممکن ہے۔نام بتاؤ"

"ہرگز نہیں"

"شرارت نہ کرو ورنہ بید لگیں گے"

مجھے یقین ہوگیا کہ اسپتال والے پٹائی کریں گے۔ اسی لیے میں نے اس کی باتوں کا جواب نہ دیا۔ عورت بلّی کی طرح غرّائی اور پنجے دبائے باہر چلی گئی۔

دو لیمپ جلا دیے گئے۔ زرد چراغ، چھت کی پوشش سے یوں لٹکے ہوئے تھے گویا دو آنکھیں ہیں۔ کبھی وہ جھپکتے کبھی جگمگا اُٹھتے اور ایک دوسرے سے لپٹ جاتے تھے

کمرے کے دوسرے کونے سے کسی کی آواز آئی:

"ایک ہاتھ سے تاش کس طرح کھیلوں"

"میں بھول گیا تھا کہ تمھارا ہاتھ کاٹ دیا گیا ہے"

میں اس نتیجے کو پہنچا کہ تاش کھیلنے کے جرم میں اس بیچارے کا ہاتھ کاٹ دیا گیا ہے۔ الٰہی فاقوں کی موت سے پہلے مجھے کیسے کیسے مصائب برداشت کرنے ہوں گے؟

میرے ہاتھ میں ایسی جلن ہو رہی تھی گویا کوئی پوست سے گوشت الگ کر رہا ہو۔ درد و ہراس سے میں چپکے چپکے رونے لگا اور آنکھیں بھینچ لیں کہ کوئی آنسو نہ دیکھ لے۔ پھر بھی آنسوؤں کی راہ کون روک سکتا ہے۔ وہ پلکوں سے چھن کر کنپٹی پر بہتے ہوئے میرے گالوں پر ٹپک پڑے۔

رات ہوگئی۔ سب بیماروں نے لیٹ کر اپنے کو بھورے کمبلوں

سے ڈھک لیا۔ سنّاٹا لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جاتا تھا۔ بس رہ رہ کر کسی کی یہ بڑبڑاہٹ سنائی دیتی تھی: "بے کار بات ہے۔ وہ مرد اور یہ عورت دونوں کے دونوں بد چلن ہیں۔"

اگر میرے ہاتھوں میں بل ہوتا تو میں نانی کو ضرور خط لکھتا کہ میری جان بچانا چاہتی ہو تو آؤ اور اسپتال سے مجھے نکال لے جاؤ۔ یہ تو ممکن نہ تھا۔ تاہم یہاں سے بھاگنے کے لیے کچھ تو کرنا ہی تھا۔

شب کی خاموشی ایسی گہری ہو گئی تھی گویا کبھی نہ ٹوٹے گی۔ آہستہ سے نیچے اُتر کر میں ادھ کھلے دروازے سے باہر نکل گیا۔ برآمدے میں لیمپ کے پاس بنچ پر کوئی بڈھا دھنویں کے بادل اُڑائے بیٹھا تھا مجھے اس نے دھنسی ہوئی کالی آنکھوں سے گھورا۔ اور بھاگنے کی بھی مہلت نہ دی۔

"یہ کون چل پھر رہا ہے؟ زرا ادھر تو آنا۔"

آواز کرخت نہیں۔ نرم تھی۔ میں اس کے پاس چلا گیا دیکھا کہ ایک گول گپا چہرا ہے، جس پر چھوٹے چھوٹے بالوں کی بھرمار ہے۔ مگر سر کے بال لمبے اور بکھرے ہوئے تھے، یہ معلوم ہوتا تھا کہ چاندی کا جھاڑ فانوس ہے۔ اس کے کمر بند سے چابیوں کا گچھا لٹک رہا تھا۔ اگر اس کی ڈاڑھی اور بال زیادہ لمبے ہوتے تو اس پر حضرت پطرس علیہ الرحمہ کا دھوکا ہوتا۔

"کیوں میاں۔ یہ ہاتھ کیسے جلائے ہو اور رات کو یہ سیر کیسی؟ کس نے اجازت دی؟"

دھنویں کا ایک گہرا کش میرے منہ پر پھونک کر اس نے اپنے

گرم گرم ہاتھ میری گردن میں ڈالے اور مجھے اپنی طرف کھینچ لیا:

"یہ کہو کہ ڈر لگ رہا ہی"

"جی ہاں"

"یہاں جو پہلی بار آتا ہی دہل جاتا ہی، مگر گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اور میاں تم کسی سے ڈرو نہ ڈرو مجھ سے ڈرنا فضول ہی۔ میں کسی کو پھول کی ڈنڈی سے بھی نہیں مارتا۔ تم بیڑی تو نہیں پیتے؟ نہیں نہ پیا کرو۔ ابھی تمھاری عمر ہی کیا ہی۔ برس دو برس اور ٹھہر جاؤ۔ تمھارے ابا اماں کہاں ہیں؟ یتیم ہو؟ خیر ماں باپ کا سایہ اُٹھ بھی گیا تو کیا، تمھارا کام ان کے بغیر بھی چل جائے گا۔ بس ہمت کبھی نہ ہارنا! سمجھے۔"

کتنی مدت کے بعد ایک ایسا آدمی ملا جو ایسی مہربانی اور سادگی سے مُجھ سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کی باتیں میرے دل میں گھر کر گئیں۔ انھیں سُن کر میں اس قدر خوش ہوا کہ بیان نہیں کر سکتا۔ جب وہ مجھے میرے بستر پر لٹا چکا تو میں نے کہا:

"آپ یہیں بیٹھے رہیں"

"اچھا بھئی۔ اچھا"

"آپ ہیں کون؟"

"میں؟۔ میں ہوں سپاہی۔ اصلی سپاہی۔ قزّاق!۔ میں کئی لڑائیوں میں شامل ہو چکا ہوں۔ سپاہیوں کی زندگی کا مقصد ہی جنگ ہی۔ میں ہنگری، کوہ قاف، پولینڈ، غرض کہ بیسیوں ملکوں کی فوجوں کے خلاف لڑ چکا ہوں"

"بچے، سب سے شریف پیشہ سپاہی کا ہے۔"

میں نے آنکھ بند کرلی اور پھر جو کھولی تو سپاہی کی جگہ نانی جان سیاہ سایہ پہنے بیٹھی تھیں۔ سپاہی ان کے قریب کھڑا تھا۔ نانی کہہ رہی تھیں:۔ "جل جلالہ! سب مرگئے۔ ایک نہ بچا؟"

سورج کی کرنیں کمرے میں آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔ کبھی وہ کسی چیز کو چھپاتیں، اجالتیں اور کبھی ہم سب کو جگمگا دیتی تھیں۔ یہ معلوم ہوتا کہ کوئی بچّہ شرارت کررہا ہے۔ نانی نے مجھ پر جھک کر پوچھا:

"میری جان تجھے یہ کیا ہوگیا! یہ لوگ تیری چیڑ پھاڑ کررہے ہیں، ایں؟ میں نے اس منحوس ڈڑھیل سے کہا۔"

سپاہی یہ کہتے ہوئے باہر چلا گیا "میں ابھی سب انتظام کیے دیتا ہوں۔" نانی نے اپنی آنکھوں کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا:۔

"یہ سپاہی بالاخانے کا رہنے والا ہے۔"

اب تک یہ سمجھ کر کہ یہ سب سپنا ہے، میں خاموش تھا۔ اتنے میں ڈاکٹر نے آکر میرے پھپھولوں کی مرہم پٹّی کی اور آن کی آن میں میں نے اپنے کو نانی کے ساتھ گھوڑا گاڑی پر سوار شہر کے گلی کوچوں پر چوکڑیاں بھرتے ہوئے دیکھا۔ نانی نے بتلایا: "تمھارے نانا تو پاگل ہوئے جاتے ہیں۔ اِن کی حرص اس حد کو پہنچ گئی کہ دیکھ کر گھِن آتی ہے۔ اس روز اپنے ایک نئے دوست کی دُکان سے جو پوستین فروش ہے وہ سو روپیہ مار لائے۔ ایسی لے دے ہوئی کہ تو بہ ہی بھلی!"

سورج چمک رہا تھا اور بادل اُجلے اُجلے ہنسوں کی طرح

آکاس میں تیر رہے تھے۔ ہم پل کی راہ دریائے دولوگا کے پار ہوئے۔ پہیوں تلے برف کٹ رہی تھی پُل کے تختوں کے نیچے پانی جھلک رہا تھا اور بڑے گرجا کے سرخ گنبد پر سنہری صلیب جگر مگر کر رہی تھی۔

ایک عورت ملی، جو بید مجنوں کی ٹہنیاں لیے جا رہی تھی۔ یہ کہنے کہ بہار قریب ہی اور کچھ دنوں بعد ایسٹر کا تہوار آئے گا۔

"نانی جان، میں آپ کو بہت چاہتا ہوں"

یہ سُن کر نانی کو کوئی حیرت نہ ہوئی، بلکہ اس نے سادگی سے کہا:۔

"اس کا سبب یہ ہی کہ ہم میں خون کا رشتہ ہی اور —— بڑا بول نہیں —— حضرت مریم کی دعا سے میرے چاہنے والے صرف ایک تم ہی نہیں" وہ مسکرانے لگی:۔

"حضرت مریم بھی کتنی مسرور ہوں گی کہ اس کا بیٹا دوبارا جی اُٹھے گا ...... کاش میری بیٹی زندہ ہوتی!"

یہ کہہ کر وہ چپ ہو گئی۔

باب (۲)

نانا سے آنگن میں مڈبھیڑ ہوئی جو کلہاڑی سے کچھ کاٹ رہا تھا۔ کلہاڑی اس نے اس انداز سے اُٹھائی گویا میرے سر پر دے مارے گا۔ پھر اپنی ٹوپی اتار کر طنزاً بولا:۔

"حضور پرنور کے مزاج مبارک کیسے ہیں؟ کیا فرمایا، سرکار نے؟ اب تو آپ اپنے فرائض کی تکمیل کر چکے۔ گھر رہیے اور چین کی بنسی بجائیے ...... ابے تف ہے تجھ پر ___"

"یہ سب معلوم ہے" یہ کہہ کر نانی نے اسے چلتا کیا اور کمرے میں جاکر سماوار ٹھیک کرتے ہوئے وہ بولی: "نانا جان کو اب دیوالیہ سمجھو اپنی ساری جمع پونجی منہ بولے بیٹے نکولائی کو سود پر دے دی لیکن رسید لینا بھول گئے۔ ان کے تعلقات اب کیسے ہیں یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے مگر بڑے میاں تباہ ہو گئے، سب کچھ گنوا آئے۔ یہ سزا اس لیے ملی کہ نہ تو کبھی ہم نے غریبوں کی مدد کی اور نہ مفلسوں پر رحم کیا۔ بس خدا نے بھی سوچا کہ میں ایسوں کا بھلا کیوں کروں اور ہم سے اس نے سب کچھ چھین لیا۔"

اِدھر اُدھر دیکھ کر وہ بولی:۔

"اللہ کے جلال کو رام کرنے کی میں کوشش کر رہی ہوں تاکہ وہ بڑے میاں کو بالکل ہی برباد نہ کر دے۔ چنانچہ اپنی کمائی کا پیسہ دھیلا رات کو چھپ کر خیرات کیا کرتی ہوں۔ جی چاہے تو آج تم بھی میرے

ساتھ چلے چلو۔ میرے پاس کچھ دام ہیں۔"
اتنے میں نانا آنکھ مچکاتے ہوئے آیا اور پوچھا:-
"کیوں بھئی۔ کچھ کھلانے پلانے کا بھی ذکر ہے؟" نانی نے جواب دیا:" تمھارا دیا تو کچھ نہیں ہے مگر آؤ، جی چاہے تو بیٹھو، تمھارے لیے بھی کچھ نکل ہی آئے گا۔"
نانا نے بیٹھ کر فرمائش کی۔ "انڈیلو تو۔"
کمرے کی ہر چیز اپنی پرانی جگہ پر رکھی ہوئی تھی۔ صرف وہ کونا جہاں میری ماں کا پلنگ رہتا تھا اب خالی تھا۔ نانا کی مسہری کے سرہانے دیوار پر ایک کاغذ چپاں تھا جس پر بڑے بڑے حرفوں میں چھپا ہوا تھا:-
"عیسیٰ سارے جہان پر اپنی رحمت کا سایہ کر۔ اے کہ تیرا نام آخری دم تک میری زبان پر رہے!"
"یہ کس کی تحریر ہے؟"
نانا نے کوئی جواب نہ دیا۔ مگر نانی نے ذرا دیر بعد مسکرا کر کہا:-
"اس پرزے کی قیمت سو روپیہ ہے!"
"تمھیں اس سے کیا غرض!" نانا جان چیخ پڑے:-" میں تو اپنی ساری کمائی دوسروں کو بانٹ دیتا ہوں۔"
"یہ تو اب کرنے لگے، کوئی دن وہ بھی تھے جب کسی کے لیے گرہ سے پھوٹی کوڑی بھی نہ نکلتی تھی۔"
"چپ رہتی ہے یا نہیں" نانا نے گرج کر کہا۔ اس گھر کی ریت میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی تھی۔ سب وہی پرانی باتیں تھیں۔"
کونے میں صندوق پر ایک ٹوکری رکھی تھی جس میں "کولیا" لپٹا

ہوا تھا - وہ جاگ پڑا اور اپنی دھلی دھلائی نیلی نیلی آنکھوں سے جو اُس کے پپوٹوں کے نیچے چھپی ہوئی تھیں، مجھے دیکھا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ زرد اور کمزور ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے نہ پہچانا اور چپ چاپ آنکھیں بند کر لیں۔ جب میں گھر سے نکلا تو کئی بُری خبریں سُننے میں آئیں۔ ' دیاخز' مر چکا تھا۔ ' خابی' نے شہر کی راہ سدھاری۔ ' یاز' کے پیروں نے جواب دے دیا تھا اور وہ چلنے سے معذور ہو گیا تھا۔

یہ اطلاع دیتے ہوئے سیاہ چشم کوسترم نے غصے سے کہا:-

" لڑکوں ہی کو جلدی موت آتی ہے"

" یہ نہ کہو، ایک دیاخز ہی تو مرا ہے"

" اجی ایک ہی بات ہے۔ جس نے گلی کوچوں کی زندگی سے منہ موڑ لیا اس کا جینا اکارت ہے۔ کسی سے دوستی کرو اور دل لگاؤ تو یا تو وہ مر جائے گا یا محنت مشقت کے لیے شہر بھیج دیا جائے گا۔ اب تو تمھارے احاطے میں نئے کرایہ دار آگئے ہیں۔ ایوسینکی ان کا نام ہے۔ گھر کا لونڈا نکشا تو کچھ یوں ہی سا ہے۔ اس کی دو بہنیں ہیں، ایک تو ابھی بچّی ہے۔ دوسری لنگڑی ہے، بیساکھی لے کر چلتی ہے مگر ہے بڑی خوبصورت!"

زرا ٹھہر کر وہ بولا:-

' میری اور چرکا کی جان اس پر فدا ہے، دونوں میں خوب جوتم بیزار رہتی ہے'

" دونوں سے کیا مطلب؟ اس لونڈیا سے؟"

" توبہ کرو! چرکا میں اور مجھ میں۔ لڑکی سے کبھی یونہی ذرا سی جھونٹر ہو جائے تو ہو جائے"

بس جانتا تھا کہ لڑکے تو لڑکے بڑے بوڑھے بھی عشق بازی کیا کرتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس سلسلے کا 'باب فحشیات' بھی مجھے ازبر زبان تھا۔ لہٰذا کوسترم پر مجھے ترس آیا اور اس کی غضب آلود آنکھوں اور سوکھے ساکھے بدن کی طرف دیکھنے کو جی نہ چاہا۔

اسی شام کو اس لنگڑی معشوقہ کے دیدار نصیب ہوئے۔ سیڑھیوں سے آنگن میں اُترتے ہوئے اس کی بیساکھی گر پڑی اور وہ زینے کے جنگلے کو اپنے نازک و نحیف ہاتھوں سے تھام کر بیچارگی کے عالم میں کھڑی رہ گئی۔ میں نے بیساکھی اٹھانے کی کوشش کی لیکن میرے ہاتھ پٹی میں بندھے ہوئے تھے، بہزار دقت ان سے یہ کام انجام پایا۔ میری جد و جہد کو دیکھ کر وہ زیرِ لب مسکراتی رہی اور پوچھا۔

"تم نے اپنے ہاتھوں کی یہ کیا گت بنالی؟"

"جل گئے تھے"

"اور میں چلنے پھرنے سے معذور ہوں کیا تم بھی اسی احاطے میں رہتے ہو؟ کتنے دن اسپتال رہے؟ مجھے بھی وہاں مدتوں رہنا پڑا تھا۔" اس نے ٹھنڈی سانس لی۔

"مدتوں تک!"

اس کا لباس سفید تھا، آسمانی رنگ کی جوتی پُرانی لیکن صاف سُتھری، کنگھی کی ہوئی چوٹی شانوں پر لہرا رہی تھی۔ بڑی بڑی آنکھوں میں سنجیدگی تیر رہی تھی اور ان میں ایک نیلی جوت جھک جھک کر اس کے کمھلائے ہوئے مکھڑے کو اُجال رہی تھی۔ اس کا تبسم دل فریب تھا لیکن مجھ پر کوئی اثر نہ کر سکا۔ اس کا بیمار بدن زبانِ حال سے کہہ رہا

تھا۔ واللہ، مجھے ہاتھ نہ لگانا!" میرے احباب پر ایسی کیا مصیبت آئی جو اس پر لٹو ہو گئے؟

اس نے خود بخود فخریہ انداز میں مجھے سنایا: "میں بہت دنوں سے لنگڑی ہوں۔ کسی پڑوسن سے اماں کا جھگڑا تھا، اس نے مجھ پر ٹونا کر دیا — کیا اسپتال میں تمھیں بھی ڈر لگا تھا؟"

"ہاں ہاں"

مجھے اس کے روبرو حجاب سا ہونے لگا اور میں اندر چلا گیا آدھی رات کے لگ بھگ نانی نے ہولے سے مجھے جگایا:

"چلتے ہو میرے ساتھ؟ اگر تم دوسروں کا بھلا کروگے تو یہ ہاتھ جلدی اچھا ہو جائے گا۔"

میرا بازو تھام کر وہ یوں میری رہبری کرنے لگی۔ گویا میں اندھا ہوں۔ رات اندھیری اور نم تھی سنسناتی ہوئی ہوا۔ دریا کے دھارے کو کبھی تیز تر کرتی تھی تو کبھی ٹھنڈی ریت کو میری پنڈلیوں پر اچھال دیتی تھی۔ نانی دبے پاؤں جھونپڑیوں کے بے نور جھروکوں کے قریب جاتی اور تین مرتبہ صلیب کا نشان بنا کر اپنی تین انگلیوں کے ساتھ ان کے چھجوں پر رکھ دیتی تھی۔ بے ستارہ آسمان کی طرف آنکھ اٹھا کر وہ آہستہ سے کہتی:۔

"مقدس ملکۂ آسمان، ان دکھیاروں کی مدد کر! ہم سب تیرے گنہگار ہیں، ماں!"

گھر سے ہم جتنی دور بڑھتے گئے، تاریکی اور سناٹا زیادہ ہوتا گیا آکاس کا اندھیرا اتھاہ تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ چاند ستارے ہمیشہ کے

لیے معدوم ہو گئے ۔ اتنے میں ایک کتا کہیں سے نکل کر ہم پر جھپٹا اور غرّانے لگا۔ اس کے دیدے اندھیرے میں بھی جگر مگر کر رہے تھے اور ڈر کے مارے میں نانی سے لپٹ گیا

وہ بولی: ”کوئی بات نہیں ۔ یہ تو محض کُتا ہی، اب بھوت پریت کے نکلنے کی گھڑی بیت گئی ۔ سنو وہ کوے بول رہے ہیں“

کُتّے کو پچکار کر تھپتھپاتی ہوئی وہ جھڑکنے لگی :-

”میرے نواسے کو کبھی نہ ڈرانا، این ؟“

کتا میرے پیروں سے لپٹ گیا اور اس طرح ہم تینوں آگے چلے نانی نے بارہ مرتبہ کھڑکیوں کے چھجوں پر اپنی خفیہ خیرات رکھی۔ اب اُجالا پھیلنے لگا ۔ مکانوں کی سفیدی تاریکی میں سے جھلکنے لگی ۔ گرجا گھر کا گنبد قند کے کوزے کی طرح معلوم ہونے لگا ۔ قبرستان کی دیوار بھی زرد سی ہو گئی ۔

نانی نے کہا: ”اب میں تھک گئی ، چلو، گھر کی راہ لیں ۔ جب گھر والیاں جاگیں گی تو دیکھیں گی کہ مریم نے ان کے بچوں کا کچھ سامان کر دیا ہی۔ غربت کی حالت میں پیسہ دھیلا بھی بہت ہوتا ہی ۔ بیٹے ہم لوگوں کی زندگی کس مفلسی میں بسر ہوتی ہی اور پھر بھی کوئی ان کی خبر نہیں لیتا:

سیٹھوں کو اللہ کی پروا نہیں ۔ اور روز قیامت کا کھٹکا نہیں ۔

غریبوں سے ان کو نہیں واسطہ ۔ روپیہ ہی ان کا خدا اور سگا ۔

یہ روپیہ جہنم میں ان کو جلائے !

میاں حقیقت یہی ہی ۔ مگر ہم سب کو ایک دوسرے کے لیے رہنا چاہیے، جس طرح خدا سب کے لیے ہی ۔ تمھارے آنے سے مجھے بڑی

خوشی ہوئی ۔"

دل ہی دل میں میں بھی نہال ہو رہا تھا۔ غیر مبہم طریقے پر محسوس ہو رہا تھا کہ کسی ایسے کار خیر میں ہاتھ بٹایا ہی جو تا عمر مجھے یاد رہے گا۔ وہ بھورا کتا مجھ سے بھڑ کر کھڑا تھرتھرا رہا تھا اور اپنی مہربان آنکھوں سے مجھے یوں تاک رہا تھا گویا معافی کا طالب ہو۔

"کیا یہ ہمارے ساتھ نہیں رہ سکتا؟"

"کیوں نہیں۔ اس کا جی چاہے تو شوق سے رہے۔ میں اسے ایک بسکٹ دے دوں، ابھی دو باقی ہیں۔ آؤ ہم اس بنچ پر بیٹھ رہیں میں تھک کر چور ہو گئی ہوں۔"

ہم ایک پھاٹک کے قریب کی بنچ پر بیٹھ گئے اور کتا ہمارے قدموں کے پاس بسکٹ چباتے ہوئے پڑ گیا۔ نانی نے مجھے بتلایا:

"یہاں ایک یہودن رہتی ہی۔ خدا جھوٹ نہ بلائے اس کے نوکروں کی تعداد دس سے کم نہیں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا تم موسیٰ کے احکام پر عمل کرتی ہو۔ جواب ملا، میں تو یہ سمجھتی ہوں کہ خدا میرا ہم مکان ہی اور اس سے بہتر نظام زندگی کیا ہو سکتا ہی۔"

میں نانی کے گرم گرم جسم سے ٹیکا لگا کر سو گیا۔

ایک بار پھر میری زندگی کا دھارا تیزی سے بہنے لگا۔ اس میں رنگا رنگ کی دلچسپیاں آنے لگیں، طرح طرح کے مشاہدات اسے مالا مال کرنے لگے۔ ہر روز میری روح کو کوئی نیا تجربہ ہوتا جو کبھی اسے جوش میں لاتا، کبھی پریشان کرتا اور کبھی اذیت پہنچاتا۔ بہر حال مجھے غور و فکر کے لیے مجبور کرتا۔ کچھ ہی دنوں بعد میں بھی اس لنگڑی سے ملنے

کے لیے لاکھ جتن کرنے لگا۔ جب وہ آتی تو ہم دونوں پھاٹک کی بنچ پر بیٹھ جاتے، کبھی باتیں کرتے، کبھی چُپ رہتے۔ اس کے ساتھ خاموش رہنے میں لطف آتا تھا، اس میں حد کی صفائی تھی اور اس کی آواز میں کوئل کی کوک کا رس تھا۔ وہ مجھے بڑے مزے میں قزاقوں کے حالات سنایا کرتی جن کے علاقے میں وہ اپنے چچا کے یہاں رہ چکی تھی وہ تیل کے کارخانے میں ملازم تھا۔ وہاں سے اس کا باپ جو لوہار تھا نجنی چلا گیا۔ "میرے ایک چچا تو زار کی خدمت پر مامور ہیں"۔

اِتوار اور تیوہاروں کی شام کو سڑک کے سب لوگ گھروں سے باہر نکل آتے تھے۔ لڑکیاں اور لڑکے فاتحہ خوانی کے لیے قبرستان مرد۔ مے نوشی کے لیے شراب خانے۔ عورتیں بچّوں کے ساتھ دروازے کے آگے ریت پر یا پیڑھی پر بیٹھ جاتی تھیں۔

بچّے بھانت بھانت کے کھیل رچاتے تھے۔ مائیں اچھے کھلاڑیوں کو شاباشی دیتیں اور پھسڈیوں کا مذاق اُڑاتی تھیں۔ وہ شور ہوتا تھا کہ الامان اور وہ چہل پہل رہتی تھی کہ سبحان اللہ!۔ بڑوں کی موجودگی اور دلچسپی سے ہمارا جوش دوبالا ہو جاتا تھا۔ ذرا ذرا سی باتیں ہمارے کھیل میں گرما گرمی پیدا کر دیتیں اور ہماری باہمی رقابت کو بھڑکا دیتیں۔ لیکن کوستروما یا مجھے اتنا وقت ضرور مل جاتا تھا کہ بیچ بیچ میں اس لنگڑی کے پاس دوڑ جائیں اور کہیں:

"لُڈمِلا، تم نے دیکھا 'اسکٹل' کے کھیل میں میرا نشانہ کتنا سدھا ہوا ہے!"

اس کے ہونٹوں پر ایک لطیف سا تبسّم آتا اور سر کو خفیف سی جنبش ہوتی۔

ایک وہ دن تھے کہ ہم سب دوست کھیل میں رفیق ہوتے تھے۔ مگر اب کوسترم اور جرکا مخالف بن کر طاقت یا مہارت کے مظاہروں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی جان توڑ کوشش کرنے لگے اور ایک دوسرے کو رُلا کر چھوڑتے تھے۔ حتّٰی کہ ہاتا پائی کی نوبت آجاتی۔ ایک دن تو وہ اس بُری طرح گتھ گئے کہ بڑوں کو بیچ بچاؤ کرنا اور ان کی کھوپڑیوں پر پانی انڈیلنا پڑا گویا وہ گُتّے تھے۔ لُڈملا ایک بینچ پر بیٹھی زمین پر پانو پٹکتی رہی۔ اور جب دونوں لڑاکے لڑھکتے پڑتے اس کے قریب آنے لگے تو وہ وحشت ناک آواز میں چلّائی:۔

"چھوڑ دو، چھوڑ دو!"

اس کے چہرے پر مُردنی سی چھاگئی تھی اور آنکھیں اس طرح نکل آئی تھیں جیسے اس پر کوئی جن آگیا ہو۔

ایک بار کسی کھیل میں کوسترم جرکا سے بُری طرح ہار گیا۔ فرطِ ندامت سے وہ پنساری کی دُکان میں بوری کے پیچھے چھپ گیا اور اور چُپکے چُپکے رونے لگا۔ اس حال میں اُسے دیکھ کر وحشت ہوتی تھی اس کے دانت کٹکٹا رہے تھے۔ گال کی ہڈیاں اُبھر آئی تھیں، چہرا پتھرا گیا تھا اور غضب آلود کالی آنکھوں سے بڑے بڑے آنسو ٹپک رہے تھے جب میں نے اسے دلاسا دینے کی کوشش کی تو رُندھی ہوی آواز میں بولا:

"تم دیکھتے تو رہو! میں پتھر سے اس کا سر توڑ دوں گا!"

اُدھر میاں جرکا کا دماغ آسمان پر تھا۔ وہ بیچ سڑک میں بیاہ جوگ لونڈوں کی سی مستی سے اینڈتا پھرتا تھا۔ ایک ہاتھ میں ٹوپی

دوسرا ہاتھ جیب میں بگڑے دلوں کی طرح اس نے دانت میں سے تھوکنے کی مشق کرلی تھی اور وہ فخریہ کہنے لگا:

"میں اب تمباکو نوشی کی عادت ڈالوں گا۔ دوبارہ کوشش بھی کی مگر جی متلانے لگا۔"

یہ سارا منظر میرے لیے مکروہ تھا۔ میرے دونوں دوست بچھڑ رہے تھے اور بظاہر وہی لنگڑی لڈملا اس کی ذمہ دار تھی۔ ایک روز شام کو میں آنگن کے ناب دان کا جائزہ لے رہا تھا کہ وہ لنگڑاتی اور ہاتھ مٹکاتی ہوئی میری طرف آئی۔

تین بار سر جھکا کر اس نے پوچھا:۔

"آپ کے مزاج تو بخیر ہیں۔ یہ تو کہیئے کوسترم کو آپ نے کہاں چھوڑا اور جرکا کہاں ہے؟

"جرکا سے اب ہمارا یارانہ نہیں۔ یہ تمھاری کرنی ہے۔ وہ دونوں تم پر لٹو ہیں اور ایک دوسرے کی جان کے لاگو۔"

لڈملا کا چہرہ تمتما گیا لیکن اس نے طنزاً کہا:

"خوب رہی! اس میں میرا کیا قصور؟"

"تم نے انھیں عشق بازی کی اجازت ہی کیوں دی" بگڑ کر وہ بولی "کیا میں ان سے کہنے گئی تھی"۔ پھر چلتے چلتے بولی: "یہ تو ان کی حماقت ہے۔ میں عمر میں ان سے بڑی ہوں، اب چودہ سال کی ہوں۔ لڑکے اپنے سے بڑی عمر کی لڑکیوں پر نہیں مرتے"۔ اسے ستانے کے لیے میں نے طعنہ دیا: "جی تم تو بڑی سیانی ہو۔ زرا اس دکان دار کی بہنا کو دیکھو جو چونڈا پکا کر بھی لونڈے لیے پھرتی ہے۔"

لڈملا نے پھر کر مجھے دیکھا: "تم خود بڑے ناسمجھ ہو" وہ روکھی ہو گئی اور اس کی حسین آنکھوں میں بجلی سی لپک گئی :-

"وہ عورت بدچلن ہے اور میں، میں کیا ہوں! میں ابھی کم سن ہوں اور —— لیکن جب اس ناول 'گمشدہ لکا' کا دوسرا حصہ پڑھ لو گے تو تمھیں کچھ عقل آئے گی"

وہ بکیاں بھرتی چلی گئی مجھے اس پر ترس آیا اس کے الفاظ میں ایک ایسی حقیقت پنہاں تھی جس سے میں بے خبر تھا لیکن میرے دوستوں میں اس نے ناچاقی کیوں کرا دی؟ پھر یہ خیال آیا کہ وہ دونوں پریم پاگل ہو گئے تھے - اس کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش نہ تھی -

دوسرے دن لڈملا کو منانے کے لیے میں اس کی من بھاتی مٹھائی لایا -

"زرا چکھو تو سہی"

وہ بگڑ کر بولی :

"میں تمھاری شکل دیکھنا بھی گوارا نہ کروں گی! ہماری تمھاری دوستی یہیں تک تھی" مگر دم بھر بعد اس نے مٹھائی کا ایک ٹکڑا یہ کہتے ہوئے اٹھایا: "کاغذ میں لپیٹ لائے ہوتے - تمھارے ہاتھ بڑے گندے ہیں"

"لاکھ دھونے پر بھی میل نہیں چھوٹتا"

اپنے گرم و خشک ہاتھوں میں میرے ہاتھ لے کر وہ بولی :

"تم نے ان کی کیا گت بنا رکھی ہے"

"لیکن تمھارے ہاتھ بھی تو سخت ہو گئے ہیں"

"یہ سب موتی سوئی کا کیا دھرا ہے۔ میرا وقت سینے پرونے میں گزرتا ہے۔" لمحہ بھر بعد اِدھر اُدھر دیکھ کر اس نے کہا: "اگر میری سُنو تو کسی خاموش جگہ میں چھپ کر گمشدہ لگا' پڑھ ڈالیں، کیا کہتے ہو؟"

کسی پُرسکون مقام کی تلاش میں خاصی دیر لگی کیونکہ ہر جگہ کوئی نہ کوئی رخنہ نکل آتا تھا۔ آخر کار ہم نے فیصلہ کیا کہ بہترین جگہ دھوبی گھر ہے، یہ سچ ہے کہ وہاں اندھیرا تھا مگر ہم کھڑکی کی گُر پر بیٹھ سکتے تھے۔ جہاں سے سائبان اور پڑوس کے مذبح کے بیچ کی مکروہ گلی نظر آتی تھی۔ اس جانب کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا تھا۔ اپنی لنگڑی ٹانگ اسٹول پر اور سالم پانو زمین پر ٹیک کر وہ کھڑکی کی گُر پر بیٹھ گئی اور چہرے کو پھٹی ہوئی کتاب سے چھپا کر بے معنی اور بے رنگ عبارت کا ایک لامتناہی سلسلہ چھیڑ دیا۔ تاہم میں اس سے متاثر ہوا، زمین پر بیٹھے بیٹھے میں دیکھنے لگا کہ اس کی سنجیدہ آنکھوں کی نیلی نیلی جوت کس طرح کتاب کے ورقوں پر گردش کر رہی ہے۔ کبھی کبھی وہ آب دیدہ ہو جاتی اور غیر مانوس الفاظ کی بھول بھلیوں میں اُلجھ کر اس کی آواز بھرا جاتی۔ تاہم میں ان میں سے کئی لفظوں کے معنی سمجھتا تھا۔ انھیں میں کبھی کبھی نظم کی لڑی میں پرونے لگتا، طرح طرح سے ان کی ٹھیک ملاتا۔ اور اس کاوش کا نتیجہ یہ ہوتا کہ کتاب کے مطالب میرے پلے پڑنے سے رہ جاتے۔

میری گود میں کُتا سویا کرتا تھا۔ اسے میں نے طوفان کا نام دیا کیونکہ وہ لمبا تڑنگا ہونے کے علاوہ صبا رفتار تھا اور جب بھونکتا تو ایسا لگتا کہ ہوا سنسنا رہی ہے۔

پڑھتے پڑھتے لڑکی پوچھتی: "سُن رہے ہو؟" میں سر ہلا کر

ہامی بھر دیتا۔

الفاظ کے گورکھ دھندے میں پھنس کر میں زیادہ اشتعال میں آجاتا۔ بے اختیار جی چاہتا کہ انھیں ایسی خوش ترتیبی سے بٹھاؤں کہ وہ گیت کے بول معلوم ہوں۔ جن کا ہر لفظ آسمان کے ستارے کی طرح خنداں و درخشاں ہوتا ہے۔ جب شام کا دھندلکا پھیلنے لگا تو لڈ ملا نے کتاب بند کرلی اور پوچھا:۔

"کہو کتنی اچھی کہانی ہے۔ آگے دیکھنا"

اس کے بعد اکثر ہم دونوں اس دھوبی گھر کو نوازتے۔ خوشانصیب کہ لڈملا نے اس کمبخت 'کمشدلکا' کا پنڈ چھوڑا۔ اس ـــــ مہا بھارت کی پوتھی کا تیسرا حصہ ہم پڑھ رہے تھے اور ابھی چوتھا باقی تھا۔ اگر وہ مجھ سے کتاب کے بارے میں کچھ پوچھ بیٹھتی تو مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑتا۔ سنیچر کو چھوڑ کر (جب دھوبی گھر کی بھٹی میں آگ جھونکی جاتی تھی) اور کسی دن برسات کا ہونا ہمارے لیے عید کا آنا تھا۔ ایکن میں سیلاب سا آجاتا اور پھر کوئی ہماری جانب رُخ نہ کرتا تھا۔ لڈملا کو ہمیشہ کھٹکا لگا رہتا کہ کسی کو ہماری جائے پناہ کی ٹوہ نہ مل جائے۔

مجھے بھی دھڑکا لگا رہتا کہ کہیں دھر نہ لیے جائیں۔ ہم گھنٹوں بیٹھے دُنیا جہان کی باتیں کیا کرتے تھے۔ کبھی میں نانی کی سنائی ہوئی کہانیاں دُہراتا اور کبھی لڈملا قزاقوں کے قصے سناتی۔

"وہ دیس بھی کتنا سہانا ہے!" ٹھنڈی سانس لے کر وہ کہتی "اور یہاں؟ یہاں کیا رکھا ہے؟ یہ تو بھکاریوں کی بستی ہے"

کچھ عرصے بعد ہمیں دھوبی گھر کی ضرورت نہ رہی۔ لڈملا کی ماں

کو پوستین کی ایک دُکان میں کام مل گیا اور صبح سویرے وہ گھر سے چلی جانے لگی۔ اس کی بہن اسکول کی راہ پکڑتی اور بھائی کارخانے کا رُخ کرتا۔ بارش کے دنوں میں میں لڈملا کے یہاں جاتا، چولھے چکی میں اس کا ہاتھ بٹاتا اور کمروں کی جھاڑ پونچھ کر دیتا۔ وہ ہنسی ہنسی میں کہتی: ”ہم دونوں تو میاں بیوی کی طرح ساتھ رہتے ہیں بلکہ ان سے بھی بہتر زندگی گزارتے ہیں کیونکہ شوہر اپنی بیوی کی مدد کب کرتا ہے؟“

جب پیسے ہوتے تو میں کیک وغیرہ خرید لاتا۔ چائے پی پلاکر ہم سماوار کو ٹھنڈے پانی سے دھو دیتے تاکہ لڈملا کی چڑچڑی ماں کو اس کے گرم ہونے کا شبہ نہ ہو۔ گاہے گاہے نانی بھی ہمیں دیکھنے آنکلتی تھی اگر وہ لیس بنانے یا سینے پرونے میں مشغول نہ ہوتی تو ہمیں عجیب وغریب کہانیاں سُنایا کرتی۔ جب کبھی نانا جان شہر کی ہوا کھانے چلے جاتے تو لڈملا ہمارے گھر آتی تھی اور ہم تینوں بے فکری سے جشن مناتے تھے۔

نانی کہتی تھی:۔

”اللہ رکھے ہم کیسے سُکھ چین سے رہتے ہیں! اپنی گرہ میں دام ہوں تو ہم جو چاہے کر سکتے ہیں۔“

ہم دونوں کی دوستی کو وہ سراہتی تھی۔

”لڑکے لڑکی کی دوستی میں کوئی ہرج نہیں۔ البتہ اس میں اینچ پینچ نہیں ہونا چاہیے۔“ سیدھے سادے الفاظ میں اس نے مجھے اینچ پینچ کا مطلب بھی سمجھا دیا۔ نانی کا انداز بیان دلکش تھا اور اس نے میرے ذہن نشین کر دیا کہ جب تک کلی اچھی طرح کھل نہ جائے اِسے توڑنا ظلم ہے۔ کیونکہ پھر نہ اس میں رنگ آئے گا نہ بو۔

یوں کسی اینچ بینچ کی طرف ہماری رغبت بھی نہ تھی۔ اس کے باوجود میں اور لڈّ ملا اس موضوع پر رائے زنی کیے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ جس کے متعلق لوگوں سے زبان بندی کی توقع کی جاتی ہے جنسی تعلقات اپنی مکروہ ترین شکل میں بار بار ہمارے سامنے آجاتے اور ہمیں اس قدر برافروختہ کر دیتے کہ ہم ان کے ذکر پر مجبور ہو جاتے تھے۔ لڈّ ملا کے باپ کی عمر چالیس سال کی ہوگی پھر بھی وہ بڑا سجیلا مرد تھا۔ گھونگھر والے بال اور گل مچھوں والا۔ اسے اپنی ابرو کو نچانے میں خاص کمال حاصل تھا لیکن اس کے لبوں پر گویا مہر لگی رہتی تھی۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اس کی زبان سے ایک بھی لفظ سُنا ہو۔ اپنے بچوں کو پیار کرتے وقت بھی وہ گونگوں کی طرح غوغاں سے زیادہ نہ کہتا اور بیوی کی مرمت کرتے وقت بھی خاموش رہتا۔

اتوار یا کسی تیوہار کی شام کو وہ آسمانی رنگ کی قمیص اور ایک بانکی پتلون زیب تن کیے چرمراتے ہوئے جوتے پہنے پیٹھ پر ایک ہارمونیم باجہ لٹکائے صدر پھاٹک پر یوں تن کر کھڑا ہو جاتا گویا کوئی سنتری پہرا دے رہا ہو۔ اس کے بعد وہاں میلا سا لگ جاتا تھا۔ یکے بعد دیگرے لڑکیاں اور عورتیں اس کا طواف کرنے لگتیں۔ کبھی اسے کنکھیوں سے دیکھتیں کبھی کھلم کھلا آنکھ لڑاتیں۔ اُدھر وہ مردِ خدا چٹخارے بھر بھر کر معنی خیز انداز سے ہر ایک کا جائزہ لیا کرتا تھا۔ یہ نظر بازی مکروہ تھی۔ کُتّے کتیوں کے چوچلوں کی طرح۔ اور عورتوں کے ناؤ بھاؤ بتلا رہے تھے کہ ان میں سے اپنی من چاہی کو جب وہ مرد تحکمانہ تیوروں سے دیکھے گا تو وہ گھائل ہرنی کی طرح اس کے قدموں پر بچھ جائے گی۔

لڈملا کی ماں بڑبڑاتی رہتی تھی : " متوالا سانڈ ! کل مُنہا ! " وہ اونچی اور دُبلی تھی ۔ چہرا لمبا اور رنگت جھلسی ہوئی ۔ ٹائیفائڈ کے بعد اس کے بال تراش دیے گئے تھے ۔ یوں کہو کہ اس کا حُلیہ کسی پُرانی جھاڑو سے ملتا جلتا تھا ۔

لڈملا اس کے پاس بیٹھ کر سڑک سے دھیان ہٹانے کی ناکام کوشش کرتی اور اِدھر اُدھر کی باتیں ملانے لگتی ۔

طیش سے آنکھیں مچمچا کر ماں ڈانٹ بتلاتی تھی :۔

" چپ رہ ، ری چڑیل ! " اس نے چینیوں کی سی چھوٹی چھوٹی آنکھیں پائی تھیں جن میں عجیب قسم کی چمک اور بے حرکتی تھی ۔ وہ ہمیشہ کسی نہ کسی چیز پر جمی رہتی تھیں ۔

لڈملا کہتی : " اماں آپ خفا نہ ہوں ۔ کوئی بات بھی ہوئی ۔ دیکھیے چٹائی ساز کی بیوہ نے کیسا سنگار کیا ہی "

" اگر تم تینوں میری جان کے لاگو نہ ہوتے تو میں اس مردار سے بہتر سنور نکھر سکتی تھی ۔ ارے تم سب نے تو مجھے کھا ڈالا ، چبا ڈالا "

آنسوؤں میں یہ بے رحمانہ الفاظ گھول کر ماں چٹائی ساز کی فربہ اندام بیوہ کو ٹک ٹکی باندھ کر دیکھنے لگی ۔

یہ عورت کیا تھی ایک جھونپڑی تھی ۔ اس کا سینہ چھت کی طرح اُبھرا ہوا تھا ۔ اور جب اس کے سُرخ چہرے کا آدھا حصہ سبز رومال میں چھپ گیا تو یہ معلوم ہوا کہ کسی جھلملی کے شیشے پر سورج رنگوں کا کھیل کر رہا ہی ۔ اتنے میں لڈملا کا باپ ' اوسینکو ' ہارمونکا بجانے لگا اس سے گیتوں کی برکھا سی ہونے لگی ۔ جن کی آواز دور دور تک پہنچی

اسے سُن کر پاس پڑوس کے بچّے نکل آئے اور وجد کرتے ہوئے اُس سحر طراز کے قدموں پر لوٹنے لگے۔

عورت نے اپنے شوہر کو دھمکی دی: "ٹھہرو تو سہی میں تمھیں اس کا مزا چکھاؤں گی!"

اس نے عورت کی طرف ایک نظر دیکھا لیکن زبان سے کچھ نہ کہا اُدھر چٹائی ساز کی بیوہ پاس کی ایک بنچ پر بیٹھی جھوم رہی تھی۔

قبرستان کے پیچھے کھیتوں میں دھوپ کی رنگت چمپئی ہو چلی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سڑک نہیں کوئی ندی ہے جس پر گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے رنگ برنگے کپڑوں میں لپٹے ہوئے تیر رہے ہیں۔ بچّے آندھی کی طرح اُڑے جاتے تھے۔ ہوا کی گرمی میں مستی تھی، کیف تھا۔ ریت سے ایک تیز سی بو نکل رہی تھی کیونکہ وہ دن بھر دھوپ میں تپتی رہی تھی۔ مذبح سے ایک خاص قسم کی سوندھی سی مہک آ رہی تھی۔ یہ لہو کی لپک تھی۔ پوستین کے بیوپاری کے احاطے سے چمڑا پکنے کی تیز بدبو پھیل رہی تھی۔ عورتوں کی چرچڑ، مردوں کی مبہم شور پکار، بچوں کی کلکاریاں اور ہارمونکا کا عمیق نغمہ — یہ سب مل جل کر ایک عجیب سی کیفیت پیدا کرنے لگے۔ زمین — وہ خالقِ ازل — گہرے سانس لینے لگی۔ ہر شے میں برہنگی اور گندگی کا پہلو تھا۔ یہ سارا سماں شرمناک قسم کی حیوانیت کا منظر پیش کر رہا تھا۔ تاہم وہ اس تاریک زندگی کے مستقبل میں ایمان پیدا کرتا تھا۔ کبھی کبھی اس ہنگامۂ محشر کو چیرتی ہوئی ایک آدھ دردناک اور ناقابلِ فراموش صدا آتی اور تیر کی طرح دل میں چبھ جاتی تھی:۔

"سب کے سب ایک پر ایک کیوں ٹوٹے پڑتے ہو؟ باری باری سے کیوں نہیں آتے؟"۔ "اگر ہم آپ اپنے پر ترس نہ کھائیں تو کیا کوئی غیر ترس کھانے آئے گا؟" "کیا خدا نے یہ درگت بنانے کے لیے عورتوں ہی کو پیدا کیا تھا؟"

رات ہونے لگی، ہوا میں تازگی آنے لگی اور شور مدھم پڑنے لگا۔ چوبی مکان پرچھائیوں میں ملبوس ہو کر گویا دراز قامت ہو گئے۔ سڑکوں سے بچے بچھونوں کی طرف ہانک دیے گئے۔ ان میں سے کچھ تو دیوار یا ماں سے ٹیک لگائے پہلے ہی سو چکے تھے۔ رات کے ساتھ ان کی شوریدہ سری اور ہنگامہ پروری غائب ہو چکی تھی۔ لڈ ملا کا باپ کہاں چمپت ہو گیا کوئی نہ جانتا تھا۔ گویا وہ ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ چٹائی ساز کی بیوہ کا بھی کوئی پتا نہ تھا، البتہ ہارمونکا کی آواز کہیں دور سے قبرستان کے بھی پرے سے آ رہی تھی۔ لڈ ملا کی ماں ایک بنچ پر اکڑوں بیٹھی تھی، اس کی اُبھری ہوئی پیٹھ پر کسی بلّی کا گمان ہوتا تھا۔ میری نانی ایک پڑوسن کے گھر چائے پینے گئی تھی۔ یہ پڑوسن ایک دایہ تھی۔ اس کے مٹاپے کی انتہا نہ تھی، ناک بطخ کی سی اور سپاٹ سینے پر ایک سونے کا تمغہ ہمیشہ لٹکا ہوا جو خلق خدا کی خدمت کے عوض اسے دیا گیا تھا، سارے محلّے کی کنّی اس سے دبتی تھی۔ لوگ کہتے تھے کہ وہ جادوگرنی ہے اور ایک بار جب کہیں آگ لگی تو بھڑکتے ہوئے شعلوں میں وہ کسی کرنل کی اپاہج بیوی اور تینوں بچّوں کو نکال لائی۔ وہ نانی کی بڑی دوست تھی، سڑک پر آمنا سامنا ہوتے ہی دور سے دونوں کے چہرے کھل جاتے تھے گویا اُنھوں نے کوئی مسرت انگیز تماشا دیکھا ہے۔

میں کوسترم اور لڈملا کے ساتھ صدر پھاٹک کی بنچ پر بیٹھا تھا۔ جرکا نے لڈملا کے بھائی کو کشتی لڑنے کی چنوتی دے رکھی تھی اور اس وقت وہ دونوں باہم دست وگریبان خاک پھانک رہے تھے اور غصے سے پھنکار رہے تھے۔

ڈر کے مارے لڈملا چلا رہی تھی :۔ "ارے چھوڑ دو!"

اپنے سیاہ دیدوں سے اسے چپکے چپکے دیکھتے ہوئے کوسترم گانو کے ایک سفید بالوں اور مکار آنکھوں والے بوڑھے نسکاری کی کہانی سنانے لگا۔ اس کا نام کالینین تھا اور وہ زمانے بھر میں بدنام تھا۔ اسے مرے بہت دن ہو چکے تھے۔ تاہم اس کا تابوت قبرستان میں دفن نہیں کیا گیا بلکہ دوسری قبروں سے الگ زمین کے اوپر رکھ دیا گیا۔ تابوت سیاہ تھا اور اس کے ڈھکنے پر صلیب کے علاوہ ایک بھالے اور دو ہڈیوں کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ ہر رات کو اندھیرا ہوتے ہی بوڑھا نسکاری باہر نکلتا اور کسی چیز کی تلاش میں سارے قبرستان کا چکر لگاتا رہتا تاوقتیکہ مرغ سحر کی آواز نہ سنائی دیتی۔

لڈملا کی گھگھی بندھ گئی "للہ، ایسی بھیانک کہانی نہ سناؤ!"

اتنے میں اس کے بھائی کو چھوڑ کر جرکا پکار اٹھا :۔ "جھوٹے کہیں کے! ایسی بے پر کی کیوں اڑاتا ہے؟ میری آنکھوں کے آگے اس کا تابوت دفن کیا گیا، زمین کے اوپر اس کی یادگار بنی ہوئی ہے اور بس! رہ گئی مردے کی مٹرگشت کی بات تو یہ گپ شرابی لوہار کی اڑائی ہوئی ہے۔"

کوسترم نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں اور کہا :۔

"جاکر قبرستان میں سو رہو، پھر معلوم ہوگا۔"

وہ دونوں جھگڑنے لگے اور لُڈملا نے ہر اس سے سر ہلا کر پوچھا:
"اَماں کیا مردے رات کو سیر کے لیے نکلتے ہیں؟"
اس کی ماں جو کسی دور کے خیال میں مگن تھی، اس سوال سے چونک پڑی:۔
"ہاں ہاں کیوں نہیں۔"
اسی وقت دُکاندار کے بیٹے والیک کا گزر ہماری طرف ہوا۔ اس کی مسیں ابھی بھیگ رہی تھیں اور وہ اونچا پورا تھا۔ بحث کے موضوع کو سُن کر وہ بولا:۔
"تم میں سے جو رات بھر تابوت پر سونے کے لیے تیار ہو اسے میں تین سگریٹ اور چونّی دوں گا۔ لیکن اگر وہ ڈر گیا تو اس کی گوشمالی کروں گا۔ کہو کون تیار ہے؟"
ہم سب تو گھبرا کر چُپ ہو گئے۔ البتہ لُڈمِلا کی ماں نے کہا:۔
"یہ کیا بکواس ہے؟ بچّوں کے دماغ میں تم ایسے بُرے خیال کیوں لا رہے ہو؟"
چرکا نے روکھے پن سے کہا: "ایک روپیہ سے کم میں تو میں نہیں جانے کا۔"
کوسترم نے فوراً طنزیہ انداز میں کہا:
"چونّی میں جاتے ڈر لگتا ہے؟" پھر والیک سے بولا:۔
"روپیہ دکھا دو پھر بھی وہ نہ جائے گا، محض باتیں بنا رہا ہے۔"
"اچھا روپیہ ہی سہی۔"
یہ سنتے ہی میاں چرکا دُم دبا کر چلتے بنے۔ کوسترم نے اُنگلی مُنہ

میں ڈال کر اُسے چڑھانے کے لیے زور سے سیٹی بجائی۔ مگر لڈ ملا نے کہا:
"الہٰی، کیسے شیخی خورے سے پالا پڑا ہی! میری زبان سے تو ایسا بڑا بول کبھی نہ نکلتا۔"

والیک نے للکار کر کہا: "ڈرپوک، اب کہاں بھاگ رہا ہی؟ اور اپنے کو محلّے کا سب سے بڑا لڑیت کہتا ہی!۔"

اس کی پھبتیاں سُننے کی تاب مجھ میں نہ تھی۔ یہ خوش خور لونڈا ہمیں ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ ننھے لڑکوں کو وہ ہمیشہ بُرے کام کرنے کی ترغیب دیتا، عورتوں کے فحش قصّے سُناتا اور انھیں تنگ کرنے کی تلقین کرتا۔ بچّے اس کی باتوں میں آجاتے اور اس کے بدلے خوب پٹتے بھی تھے معلوم نہیں کس وجہ سے وہ میرے کُتّے کی جان کا لاگو ہوگیا تھا۔ ہمیشہ اس بیچارے پر سنگ باری کرتا اور ایک بار تو روٹی میں سوئی رکھ کر اسے کھلا دی۔ لیکن سب سے زیادہ تاؤ مجھے اب آیا جب میں نے چُرکا کو سر لٹکائے بھاگتے دیکھا۔

میں نے والیک سے کہا: "نکالو روپیہ، میں جانے کو تیار ہوں"

مجھے چڑھاتے اور ڈراتے ہوئے اس نے روپیہ لڈ ملا کی ماں کے ہاتھ میں دیا لیکن اس نے جھٹک کر کہا:
"میں ہرگز اپنے پاس نہ رکھوں گی!" اور وہ غصّے سے چلی گئی۔

لڈ ملا کو بھی روپیہ رکھنے کی ہمّت نہ ہوئی، اس لیے والیک اور بھی اُچھلنے کودنے لگا۔ میں مجبوراً میدان چھوڑ کر جا رہا تھا کہ راستے میں نانی سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ سارا ماجرا سنتے ہی اس نے روپیہ لے لیا

اور منہ پچکا کر کہا :-

" اوور کوٹ ڈال لینا اور کمبل رکھنا نہ بھولنا کیونکہ صبح صبح سردی ہو جاتی ہے "

اس کے دلاسے سے مجھے امید بندھ گئی کہ کوئی بلا نازل نہ ہوگی والیک نے یہ شرط لگا دی کہ پو پھٹے تک مجھے تابوت پر بیٹھے یا لیٹے رہنا پڑے گا - خواہ بوڑھا کالینین قبر سے نکل بھی کیوں نہ آئے میں اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوں گا - تابوت سے اترنے کا مطلب یہ ہوگا کہ میں بازی ہار گیا -

والیک نے تاکید کی : " یاد رہے ، میں رات بھر تمہاری نگرانی کروں گا "

جب میں قبرستان کی طرف چلا تو نانی نے صلیب کا نشان بنا کر مجھے پیار کیا -

" اگر کوئی بری چیز نظر آئے تو ہلنا جلنا مت "، بس یہ کہنا کافی ہوگا : " زندہ باد مریم ! "

میں تیز قدم چل کھڑا ہوا کیونکہ اس مرحلے کو میں جلد از جلد شروع کر کے ختم کر دینا چاہتا تھا - والیک ، کوسترم اور کوئی اور لڑکا میرے ساتھ قبرستان تک نہ آیا - دیوار کودتے وقت میری ٹانگ کمبل میں پھنس گئی اور میں بھد سے گر پڑا - لیکن اس پھرتی سے سنبھل کر اٹھ بیٹھا گویا زمین نے لات مار کر کھڑا کر دیا ہو - دیوار کے پیچھے سے کسی کے قہقہے کی آواز آئی جسے سن کر میرے دل کی حرکت بند سی ہو گئی اور ایک کپکپی سارے جسم میں دوڑ گئی -

گرتے پڑتے میں سیاہ تابوت کے قریب پہنچا۔ اس کے ایک پہلو کی مٹی کھسک گئی تھی مگر دوسرے بازو سے موٹے موٹے پائے نظر آرہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ کسی نے تابوت کو اُٹھانے کی کوشش کی اور اسے ٹیڑھا کرکے چھوڑ دیا۔ تابوت کے سرے پر بیٹھ کر میں نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ پتھریلا قبرستان سفید صلیبوں سے اٹا پڑا تھا اور قبروں پر سائے ہل جل رہے تھے۔ ان کے بیچ بیچ میں بید مجنوں کی ڈالیاں جھول رہی تھیں اور ہم سایہ مزاروں کو قریب تر لا رہی تھیں۔ پرچھائیوں کی دھوپ چھاؤں میں سے گھاس کے تنکے صاف نظر آرہے تھے۔

کلیسا آسمان کا مُنہ یوں تک رہا تھا گویا کوئی برف کا جھالا اوپر سے نیچے آرہا ہو اور بے حرکت بادلوں میں ڈوبتے ہوئے دوج کے چاند کی جوت جگمگا رہی تھی۔

یاز کا باپ — وہ کاہل الوجود کسان — بڑی آلکسی سے گھنٹہ بجا رہا تھا۔ ہر مرتبہ گھنٹے کی رسّی چھت کی آہنی چادر میں پھنس کر نہایت رقت سے چرّخ چوں کرنے لگتی اور اس کے بعد گھنٹے کا ٹھنا کا سُنائی پڑتا۔ اس کی صدا پُر حسرت اور اداس تھی۔

مجھے چوکیدار کا مقولہ یاد آیا: "اللہ رحم کرے!" یہ سارا نظارہ وحشت انگیز تھا۔ رات بھیگ رہی تھی پھر بھی میں پسینے سے شرابور ہوگیا۔ اگر بوڑھے کالینن نے قبر سے باہر نکلنے کی کوشش کی تو مجھے چوکیدار کی کوٹھری تک بھاگنے کی مہلت بھی ملے گی یا نہیں؟ میں قبرستان کے چپّے چپّے سے واقف تھا۔ یاز اور دوسرے

دوستوں کے ساتھ بارہا ان قبروں میں میں کھیل چکا تھا۔ کلیسا کے قریب اُس جگہ میری ماں دفن تھی۔

ابھی سب تو نہ سوئے تھے کیونکہ گانؤ سے کسی گیت یا قہقہے کی آواز بھٹک کر مجھ تک آپہنچتی تھی۔ یا تو ریل کے بند سے (جہاں مزدور ریت کا انبار لگا رہے تھے) یا 'کاتی زوکا' کے گانو سے ہارمونکا کی گھٹی ہوئی آواز آرہی تھی۔ سرِ دیوار ہمیشہ کی طرح متوالا لوہار 'مچاکوف' کوئی دُھر بد الاپتا جارہا تھا۔ گیت سُن کر میں اسے پہچان گیا:

امّاں کا بس ایک پاپ

اُن کا پیارا ہی اپنا باپ!!

زندگی کی آخری سانسوں کو سُننے میں ایک خاص لطف ہی۔ لیکن رفتہ رفتہ سناٹا گہرا ہوتا گیا اور خاموشی یوں چھاگئی گویا کوئی ندی چڑھ کر میدان پر آجائے اور ہر چیز کو اپنے دامن میں چھپالے۔ ایسا لگتا تھا کہ ناپیدا کنار فضائے بسیط میں روح تیر رہی ہی اور وہ اسی طرح فنا ہو جائے گی جیسے روشنی کی کوئی کرن چمک کر اندھیرے میں ضم ہو جائے اور یہ روح جب فضا میں کھو جائے گی تو اپنی یاد دلانے کے لیے کوئی نشان نہ چھوڑے گی۔ لافانی صرف یہ جگمگ کرنے والے تارے ہیں زمین کی ہر شے مرمٹ جانے کے لیے ہی۔ کمل لپیٹ کر اور پانو سکوڑ کر میں کلیسا کی طرف منہ کیے تابوت پر بیٹھ گیا۔ ذرا سی جنبش کرتے ہی تابوت چرچرانے لگتا تھا اور نیچے کی ریت کھسکنے لگتی تھی۔

دو مرتبہ کوئی چیز میرے پاس آکر زمین پر گری۔ اس کے بعد ایک پتھر سنسناتا ہوا آیا۔ پہلے تو میں ڈرا مگر پھر سمجھ گیا کہ والیک اور اس

کے بھُتو مجھے ڈرانے کے لیے دیوار پار سے ڈھیلے پھینک رہے ہیں
بہرحال انسانوں کی قربت کے خیال سے دل ہی دل میں خوش ہوا۔

اب خلاف ارادہ مجھے اماں کا خیال آیا۔ ایک بار اس نے مجھے
سگریٹ پیتے پکڑ لیا اور پیٹنا شروع کیا۔ میں نے گڑگڑا کر کہا تھا:۔
"خدا را مجھے نہ ماریے۔ کیونکہ یوں بھی مجھے چکر آرہا ہے" اس کے بعد
بطور سزا جب مجھے تندور کے پیچھے کھڑا کر دیا گیا تو اماں نے نانی
سے کہا:۔

"اس لڑکے میں احساس کا مادہ ہی نہیں۔ وہ کسی کو نہیں چاہتا"
یہ سُن کر مجھے بڑا صدمہ ہوا۔ جب کبھی اماں مجھے سزا دیتی تھی تو مجھے
اس پر ترس آتا تھا۔ اس کی خاطر میں پریشان رہتا کیونکہ وہ خواہ مخواہ
میری سرزنش کرنے لگتی تھی۔ قصہ مختصر یہ کہ بچپن سے لے کر اب تک
جسے دیکھو مجھے تنگ کرتا رہا۔ مثلاً دیوار پار کے ان لوگوں کو کیا
معلوم نہ تھا کہ قبرستان میں بیٹھے بیٹھے ڈر کے مارے میرا بُرا حال
ہو رہا ہے، پھر بھی وہ مجھے زیادہ سراسیمہ کرنا چاہتے تھے۔ اس کی وجہ
جی تو چاہا کہ انھیں پکار کر کہوں ــ "کمبختو، جاؤ شیطان پورا!"
لیکن اس میں خطرے کا اندیشہ تھا۔ کون جانے، شیطان اس کا کیا اثر
قبول کرے کیونکہ ہو نہ ہو یہ ذات شریف کہیں آس پاس ہی تشریف
رکھتے ہوں گے۔ ریت میں ابرک کی بکثرت آمیزش تھی اور اس کے
ذرے چاندنی میں چمک رہے تھے۔ مجھے یاد آیا کہ کسی روز میں ایک
ڈونگی میں لیٹے لیٹے پانی کا نظارہ کر رہا تھا کہ یک بیک ایک مچھلی
اچھل کر میرے چہرے تک آئی۔ اس کی صورت پر کسی آدمی کے

گال کا گمان ہو سکتا تھا۔ لمحہ بھر اپنی گول گول آنکھوں سے مجھے تاک کر وہ ندی کی تہہ میں چلی گئی۔ اس کی ڈبکی سے ایسی آواز نکلی جیسے کوئی پتا پیڑ سے ٹپک پڑا ہو۔

غرض کہ اس وقت میرا حافظہ سرگرم کار تھا اور زندگی کے بھولے ہوئے واقعات کو زندہ کر رہا تھا تاکہ ہراس انگیز خیالات مجھ پر غلبہ نہ پانے پائیں۔

اتنے میں ایک ساہی ریت پر کھڑ بڑ کرتی ہوئی میری طرف آئی مجھے کسی بھٹنے کا خیال آیا۔ یہ ساہی اسی کی طرح پستہ قد اور صورت حرام تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے نانی کا دھیان آیا جب وہ تندور پر بیٹھ کر کہا کرتی تھی: "معبود، ان تلچھٹوں سے نجات دلا!"

حدِ نظر سے دور شہر میں سویرے کا اُجالا پھیلنے لگا۔ ہوائے صبح میرے رگ و ریشہ میں اور میری آنکھوں میں پیوست ہونے لگی۔ اب تو کمل اوڑھ کر میں لیٹ رہا۔ ہرچہ بادا باد۔

نانی نے مجھے اُٹھایا۔ کمل کھینچ کر وہ بولی:۔ "اُٹھ رے اُٹھ! سردی تو نہیں لگی اور تو ڈرا تو نہیں؟"

"ڈر تو لگا تھا مگر کسی اور سے نہ کہنا۔"

نانی نے حیرت سے پوچھا:۔ "اس میں ہرج کیا ہے۔ اگر ڈر ہی نہ لگا تو گھمنڈ کس بات کا؟"

گھر چلتے چلتے نانی نے چمکار کر کہا:۔

"بیٹے، دنیا میں خود ہر شے کا تجربہ کرنا چاہیے۔ اگر تم آپ اپنی ہمت سے نہ سیکھو گے تو کوئی اور سکھائے گا۔"

شام ہوتے ہوتے میں محلے کا ہیرو ہوگیا۔ ہر آدمی پوچھنے لگا:۔
"کیا یہ ممکن ہے کہ تمھیں ڈر نہ لگا ہو؟" جب میں جواب دیتا کہ "میں گھبرا گیا تھا" تو وہ سر ہلا کر کہتا: "اوہو، میں کہتا نہ تھا"
دکاندار مٹک مٹک کر بآبانگ دہل کہنے لگا:۔
"کالینین کی جلت پھرت کا قصہ جھوٹا ہے۔ اگر وہ چلتا ہوتا تو کیا یہ لونڈا یوں ہی بچ جاتا۔ ارے وہ تو اسے قبرستان سے نکال باہر کرتا اور اس کا نام و نشان بھی نہ چھوڑتا"
لُڈمِلا نے مجھے لطف آمیز تحیر سے دیکھا۔ نانا جان بھی خوش ہوئے غرض سب میں میری تعریف و تحسین ہوئی۔ صرف چُرکا جل کر کہنے لگا:
"اسے کیا کھٹکا۔ اس کی نانی تو جادوگرنی ہے!"

باب (۳)

میرا بھائی کولیا ستارۂ صبح کی طرح دیکھتے دیکھتے آنکھ سے اوجھل ہو گیا۔ وہ میرے اور نانی کے ساتھ ایک سائبان میں تختوں پر سوتا تھا جس پر طرح طرح کی گدڑیاں بچھا دی جاتی تھیں۔ سائبان کے دوسرے حصے میں مرغی خانہ تھا۔ ننداسی اور پیٹو مرغیوں کی کُٹ کُٹ اور پروں کی پھڑپھڑاہٹ ہم رات بھر سُنا کرتے تھے اور مرغے کی بانگ نجر ہمیں نیند سے بیدار کرتی تھی۔

نانی اس "کگڑوں کوں" پر بوکھلا کر چلاتی: "مردار کے پر نچے نہ اُڑا دوں تو سہی!"

میں جاگ چکا تھا اور درازوں سے چھن چھن کر آتی ہوئی سورج کی کرنوں اور ان میں ناچتے ہوئے خاک کے ذرّوں کا نظارہ کر رہا تھا۔ یہ ذرّے ایسے لگتے تھے جیسے کسی پریوں کی کہانی کے بول۔ تختوں میں چوہوں نے سوراخ کر دیے تھے اور ان پر تلچٹے چل پھر رہے تھے۔

مرغی خانے کی مٹی سے جو انجرے نکلتے تھے ان سے گھبرا کر کبھی کبھی میں سائبان کی چھت پر چڑھ جاتا اور احاطے کے لوگوں کا تماشہ دیکھا کرتا جن کی آنکھیں نیند کے مارے بوجھل ہوتی تھیں۔ وہ رہا ملّاح فرمنوف۔ بگڑے دل متوالا۔ جو سورج کو اپنی چپڑی بسورتی ہوئی آنکھوں سے دیکھ دیکھ کر بھالو کی سی آواز نکالا کرتا تھا۔ پھر نانا

جان جلدی جلدی احاطے میں آتے اور غسل خانے میں ٹھنڈے پانی سے منہ ہاتھ دھویا کرتے تھے، مالک مکان کی باتونی باورچن کا سارا جسم چھائیوں سے بھرا ہوا تھا اور وہ کویل سی معلوم ہوتی تھی۔ مالک مکان بذات خود کسی موٹی تازی بطخ سے مشابہ تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ اچھا خاصا چڑیا گھر تھا۔

حالانکہ یہ صبح بڑی سہانی تھی لیکن جانے کیوں میرا دل بھر آیا۔ میں نے کھیتوں میں نکل جانے کا ارادہ کیا جدھر کوئی نہ آتا تھا۔ کیونکہ اسی عمر میں مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ انسان کی موجودگی حسین سے حسین دن کو بے رنگ بنا دیتی ہے۔

ایک روز جب میں چھت پر لیٹا ہوا تھا، نانی نے مجھے آواز دی پلنگ پر لیٹے لیٹے اس نے آہستہ سے کہا:

"کولیا مر گیا"

وہ ننھا بچہ تکیے سے لڑھک کر گدّے پر بے حرکت و بے جان پڑا ہوا تھا۔ اس کی قمیص گلے سے لٹک رہی تھی۔ پھولا ہوا پیٹ اور ٹیڑھی میڑھی ٹانگیں ننگی ہو گئی تھیں۔ اس کے ہاتھ عجیب طریقے سے پیٹھ کے پیچھے بندھے ہوئے تھے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ اس نے اُٹھنے کی کوشش کی تھی۔ اس کا سر ایک طرف لٹک گیا تھا۔

بال سلجھاتے ہوئے نانی نے کہا: "شکر اللہ کا کہ وہ جنت سدھارا اگر یہ بدنصیب اپاہج زندہ رہتا تو اس کا کیا حشر ہوتا؟"

خراماں خراماں گویا رقصاں۔ نانا جان نے اسی وقت درشن دیا اور کمال احتیاط سے بچّے کی بند آنکھوں کو اپنی انگلیوں سے چھوا۔

نانی نے بگڑ کر کہا :-

"بے دُھلے ہاتھوں سے اسے کیوں چھو رہے ہو؟"

بڑے میاں نے زیر لب کہا :-

"اس انجام کو تو دیکھو! بچہ پیدا ہوا، پروان چڑھا۔ کھاتا پیتا رہا - اور یہ سب بے کار گیا"

"تم پینک میں تو نہیں ہو" نانی نے اس کا مُنہ بند کر دیا۔ نانا گم سم اس کی طرف دیکھ کر یہ کہتے ہوئے باہر چلا گیا:-

میں اس کے کفن دفن کا انتظام نہ کروں گا۔ تمھارے جی میں جو آئے سو کرو"

"تف ہی تجھ پر، ارے کل منہے بڈھے!"

میں بھی باہر نکل گیا اور جب شام ہو گئی تب کہیں واپس لوٹا دوسرے دن صبح گولیا' دفن کیا گیا۔ نماز جنازہ کے وقت میں قبر کے پاس اپنے گتے اور یاز کے باپ کے ساتھ موجود تھا، اس نے کم داموں میں قبر کھودی تھی اور اس نوازش کی یاددہانی کے لئے میرے سامنے آپ اپنی تعریف کرتا جاتا تھا۔

"دوستی کی خاطر میں نے اتنے سستے کام کر دیا۔ کوئی اور ہوتا تو اتنے ریجی لیتا"

گڑھے کے اندر سے ایک عجیب سی بدبو آرہی تھی اور جھانکا تو کیا دیکھتا ہوں کہ کالی لکڑی کے کچھ سیلے ہوئے تختے ایک کونے میں پڑے ہوئے ہیں۔ خفیف سی حرکت ہوتے ہی قبر کے آزو بازو سے ریت کی ڈھیری نیچے پھسلنے لگتی تھی۔ میں جان بوجھ کر اُٹھ کھڑا ہوا

تاکہ ریت گرے اور اُن تختوں کو چھپائے ۔

یاز کے باپ نے تمباکو کا کش کھینچ کر کہا :۔

" چلت پھرت بند کرو جی !"

نانی ننھا سا تابوت لیے آئی ۔ گور کن گڑھے کے اندر اُترا، تابوت کو سیاہ تختوں کے پاس جمایا اور پھر باہر آ کر جلدی جلدی اس پر مٹی جھونکنے لگا ۔ نانا اور نانی بھی اس کام میں بے کچھ کہے اس کا ہاتھ بٹانے لگے ۔ وہاں نہ پادری تھے نہ فقیر ۔ صلیبوں کے انبوہ میں لے دے کر صرف ہم چار جاندار تھے ۔ گور کن کو اس کی اُجرت ادا کرتے ہوئے نانی نے جھڑک کر کہا :۔

" تم نے خواہ مخواہ میری بیٹی کا تابوت اُلٹ پلٹ کر دیا !" آخر میں کرتا بھی کیا ؟ وہ نہیں تو اور کسی کی قبر سے زمین لینی ہوتی ۔ مگر پریشانی کی بات ہی کیا ہے ۔"

قبر پر لوٹ کر نانی پھوٹ پھوٹ کر روئی ۔ چلتے وقت نانا اس کے پیچھے ہو لیے ۔ ان کی آنکھیں ٹوپی کے کنارے سے ڈھکی ہوئی تھیں اور انگلیاں پھٹے ہوئے کوٹ میں پیوست تھیں ۔

یک بیک وہ یہ کہتے ہوئے آگے لپکا :۔

" اُنھوں نے بنجر زمین میں بیج بو دیا ۔" اس وقت ایسا معلوم ہوا کہ کوئی کوّا کسی لہلہاتے ہوئے کھیت کی طرف جھپٹ رہا ہو ۔

میں نے نانی سے پوچھا :۔ " یہ کہہ کیا رہے ہیں ؟"

" خدا رحم کرے ! ان کا دماغ ہی تو ٹھہرا ۔"

گرمی پڑ رہی تھی ۔ نانی ہولے ہولے چل رہی تھی ، اس کے پاؤ

گرم ریت میں دھنسے جاتے تھے۔ بیچ بیچ میں رک کر وہ رومال سے چہرے کا پسینہ خشک کرنے لگتی تھی۔ میں نے پوچھا "قبر میں وہ جو کالی کالی سی چیز تھی۔ کیا وہی اماں کا تابوت تھا؟"

نانی کو غصہ آگیا: "ہاں دیکھو تو اس ستیاناسی گنوار کو! ابھی سال بھر بھی تو نہیں ہوا اور بیچاری دار یا۔ کی ہڈیاں گلی جا رہی ہیں۔ یہ سب ریت کا کیا دھرا ہی، اس سے چھن چھن کر پانی آتا ہی۔ اگر یہی ہوتا تھا تو بہتر یہ —"

"کیا ہم سب کو مٹی میں مل جاتا ہی؟"

"سب کو۔ صرف اولیا کے سوا"

"لیکن نانی جان، آپ کے ساتھ ایسا نہ ہوگا"

وہ رک گئی اور میری ٹوپی ٹھیک کرتے ہوئے سنجیدگی سے بولی:-

"ایسی باتیں نہیں سوچتے۔ اسی میں بھلا ہی۔ سمجھے!"

لیکن اس موضوع پر خیال آرائی سے میں اپنے آپ کو باز نہ رکھ سکا۔ موت کیسی مکروہ اور قابل نفریں تھی! کس قدر ہولناک! مجھے اس کے تصور تک سے کوفت ہوتی تھی۔

جب ہم گھر پہنچے تو دیکھا کہ نانا نے چائے کے لیے میز اور کیتلی تیار کر رکھی ہی۔

"آؤ بھی چائے پیو۔ ٹھنڈ تو نہیں لگی؟ میں نے اپنے حصّے کی چائے بھی ڈال دی ہی۔ یہ ہم سب کے لیے بس ہی"

نانی کے پاس جاکر اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے وہ بولا:-

"کیوں بڑی بی؟"

نانی نے آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھا کر کہا :-

"یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟"

"اس لیے کہ خدا ہم سے ناراض ہے۔ وہ ہم سے ہر شے فرداً فرداً چھین رہا ہے۔ اگر ہاتھ کی پانچوں انگلیوں کی طرح گھر کے سب لوگ مل جل کر رہیں ——"

بارے عرصۂ دراز کے بعد نانا جان کی زبان مبارک سے حلم و مہر کے کلمات نکلے اور انھیں سُن کر مجھے امید بندھ چلی کہ بڑے میاں کی باتوں سے میرا دُکھ مٹ جائے گا اور میں قبر کے سیاہ تختوں کو بھول جاؤں گا۔ لیکن نانی کو کیا کہیے کہ کڑک کر جواب دیا :

"بڑے میاں رہنے بھی دو! ساری عمر تم بھی رونا روتے رہے اور اس سے ملا کیا؟ گھن کی طرح تم ہم سب کو کھاتے رہے اور اس نوبت کو پہنچا دیا۔"

نانا اسے دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا، بولنے کی ہمت نہ ہوئی۔

شام کو سرِ راہ میں نے لڈملا کو یہ دُکھ بیتی سنائی لیکن اس پر کوئی خاص اثر نہ ہوا۔

"یتیم پھر بھی اچھے ہیں۔ اگر ابا اماں مر جائیں تو میں بھائی کو بڑی بہن کے سپرد کر کے خانقاہ کی راہ سنبھالوں اور اس کے ایک کونے میں بچی کھچی زندگی گزار دوں۔ اس کے سوا میں کر بھی کیا سکتی ہوں! مجھ لنگڑی لولی کو بھلا کوئی کیوں بیاہنے لگا۔ اور پھر میں اپاہج بچے جننے کا گناہ اپنے سر کیوں لینے لگی۔"

دنیا دار عورتوں کی طرح وہ بھی بڑی سیانی نکلی۔ اور بس اسی شام سے میرا دل اس سے اچاٹ ہو گیا۔ سچ پوچھو تو انھیں دنوں

میری زندگی میں ایک ایسی تبدیلی ہوئی کہ ہم دونوں کا ملنا جلنا بہت کم ہو گیا۔
چھوٹے بھائی کی موت کے چند روز بعد نانا نے مجھ سے کہا:
"آج سرِ شام سو جانا اور جب میں پکاروں تو جاگ جانا۔ ہمیں جنگل چل کر لکڑیاں لانا ہے۔"
نانی نے بھی حامی بھری: "میں بھی ساتھ چل کر جڑی بوٹی جمع کروں گی۔"
گانو سے تین کوس پرے دلدل سے لگا ہوا ایک گھنا جنگل تھا۔ وہاں بے برگ اور خاک بسر درختوں کی ایک دنیا آباد تھی جس کا ایک سرا دریائے اوکا اور دوسرا اس سڑک سے ملتا تھا جو ماسکو کو جاتی تھی۔ اس سے ورے ایک سرسبز و شاداب جھاڑی تھی جس پر کسی سیاہ خیمے کا گمان ہوتا تھا۔
یہ سب کاؤنٹ شوبلوف کی ملکیت تھی مگر اس کی دیکھ ریکھ کا انتظام اچھا نہ تھا۔ پاس پڑوس کے رہنے والے اسے اپنی جائداد گردانتے تھے۔ کوئی گرے ہوئے پیڑوں کو اٹھالے جاتا تو کوئی ایندھن کی لکڑی کا سامان کرتا۔ بعضے تو اچھے خاصے درختوں پر ہاتھ صاف کرنے سے نہ چوکتے تھے۔ موسم خزاں میں لوگ رسّی اور کلھاڑی لیے جوق در جوق آتے اور سردیوں کے لیے ایندھن کے پہاڑ جمع کرکے لے جاتے۔
منہ اندھیرے ہم تینوں شبنم چشیدہ اور سرسبز میدانوں میں ہو کر چلے۔ پورب کے اوٹ سے پہاڑیوں اور میناروں سے بھی اونچے سورج سربلند ہوا۔ بے رونق روسی سورج جو ایک والہانہ انداز سے طلوع ہوتا ہے۔ اس وقت ندی کے گدلے پانی سے چھن کر ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے آرہے تھے۔ سورج مکھی کے پھول اوس کے بوجھ سے دب کر

کبھی کنمناتے اور کبھی جھک جاتے تھے ۔ رنگ برنگے سدا بہار پھول اجاڑ میدان میں اُداسی سے کھڑے ہوئے تھے ۔ "رین سندری" نامی پھول کی لال کلیاں ستاروں کی طرح چٹک رہی تھیں ۔جنگل کے سامنے پہنچے تو محسوس ہوا کہ کسی عجیب و غریب لشکر سے مورچہ چھیننے جا رہے ہیں کسی پیڑ کی ٹہنیاں گدھ یا چیل کے بازوؤں کی طرح کشادہ تھیں ۔ چیڑ کے پیڑوں پر معصوم دوشیزاؤں کا دھوکا ہوتا تھا ۔ دلدل کی ناگوار بو کھیتوں کی فضا کو بوجھل بنا رہی تھی ۔ میرا کتا اپنی سُرخ زبان لٹکائے ہانپتے ہوئے دوڑا چلا آتا تھا ۔ رُک رُک کر وہ ٹھہرتا، ہوا کو سونگھتا اور پھر حیرت سے اپنا سر ہلانے لگتا ۔ نانی کا کوٹ اور ایک پھٹی پُرانی ٹوپی پہنے نانا جان آپ ہی آپ مُسکراتے اور یوں پنجے دبائے ہوئے چل رہے تھے گویا چوری کا پکّا ارادہ رکھتے ہیں ۔ نیلی کرتی کالے لہنگے اور سفید سرپوش میں ملبوس، نانی اماں بڑے مزے میں ہمراہ تھیں ۔ان کے ساتھ رہ کر تیز قدمی کا خیال بھی بے کار تھا ۔

جنگل جتنا پاس آتا گیا، نانا کی پھرتی اتنی ہی بڑھتی گئی ۔ فضا میں ناک کو گردش دیتے ہوئے پہلے وہ سرگوشیوں میں پھر زیر لب اور بالآخر باآواز بولنے لگا ۔ وہ مسرور تھا اور اس کے بول میٹھے تھے گویا وہ سرمستی کے عالم میں تھا ۔

"یہ جنگل اللہ کے پھول بن ہیں ۔ اس کے سانس سے ان میں جان پڑی اور اس کی ہوائیں ان کی پرورش کرتی ہیں ۔ لڑک پن میں جب میں ڈونگیاں چلاتا تھا تو جگولیا[1] تک کی سیر کر آیا ۔ او ہو! کسی

---

[1] جگولیا

میری آنکھوں نے جو کچھ دیکھا ہے تجھے دیکھنا کبھی نصیب نہ ہوگا۔ دریائے اوکا کے اور چھور تک جنگل ہی جنگل ہیں اور یہی حال دریائے وولگا کے کناروں کا ہے۔ یہ سارا نظارہ کس قدر وسیع ہے اور کس قدر حسین!"

نانی تو اس موج لطافت پر ہکّی بکّی رہ گئی اور مجھے آنکھ سے اشارہ کیا۔ اِدھر ٹیسلون پر لڑکھڑاتے، گرتے سنبھلتے ہوئے نانا جان ایک بے ربط سی کہانی سناتے جاتے تھے جو اب تک میرے ذہن پر نقش ہے:۔

"ہم پانی کی راہ سارا توف سے تیل کے خالی پیپے لیے جارہے تھے۔ ہمارے کپتان کا نام 'کارل' تھا اور سارنگ ایک تاتاری تھا، آصف یا کچھ ایسا ہی سا نام تھا۔ جب ہم جگولیا پہنچے تو ہوا ٹھیک سامنے کی تھی۔ سنسنا کر منہ پر آتی اور ہمیں جھنجھوڑ کر رکھ دیتی تھی۔ کنارے اتر کر ہم کھانا پکانے لگے۔ یہ بہار کے دن تھے۔ سمندر میں کمال سکون تھا۔ اس کی موجیں اس آہستگی سے ساحل پر چڑھ آتیں جیسے پرندوں کے غول ہوا میں لہرا رہے ہوں۔ یہ تشبیہ یوں بھی صحیح ہے کہ کاسپین ساگر میں انگنت ہنس رہتے ہیں۔ بسنت رت میں جگولیا کے پہاڑ سبز پوش ہوجاتے ہیں اور سورج دھرتی پر ہُن لٹاتا ہے۔ ہم سب لیٹ گئے۔ ہم میں یگانگت بڑھنے لگی اور ایک دوسرے سے اپنے کو قریب پانے لگے۔ ندی میں سردی بھی تھی اور کہر بھی مگر خشکی پر گرمی اور مستی کی فضا تھی۔ جب جوار کا وقت آیا تو کپتان نے (جو ایک بد دماغ بوڑھا تھا)، ٹوپی سنبھال کر کہا:۔ "لڑکو، اب بڑے چھوٹے کی تمیز ختم ہوئی۔ میں تو جنگل کی راہ لیتا ہوں، تم اب مختار ہو کہ جہاں جی چاہے جاؤ" ہم تو ہکّا بکّا رہ گئے۔ کپتان صاحب کو یہ کیا

سوچا؟ ۔ کسی نگراں کے بغیر ہم کیا کر سکتے ہیں، میاں، دریائے وولگا کو سیدھی سڑک سمجھو، پھر بھی اسے طے کرنے کے لیے کسی نہ کسی کپتان کی ضرورت ہے ۔ عوام کی حالت بھیڑوں کی سی ہے، رہبر نہ ہو تو انھیں بھٹکنے سے کون روک سکتا ہے۔ بس اس خیال سے ہمارے چھکے چھوٹ گئے۔ مگر کپتان کا ارادہ مصمم تھا: ۔ "میں تم لوگوں کا گڑریا کب تک بنا رہوں میں تو اب بن باس کا تہیہ کر چکا ہوں"۔ ہم میں سے کچھ نے چاہا کہ اسے زبردستی باندھ کر رکھ لیں۔ لیکن اوروں نے رائے دی کہ 'ابھی ٹھہرو۔ اتنے میں وہ تاتار پکار اٹھا: "میں بھی کپتان کے ساتھ جاؤں گا۔" یہ بڑے افسوس کا مقام تھا۔ اب تک گزشتہ دو دوروں کی تنخواہ اسے نہ ملی تھی ۔ اور اس سفر کا ایک تہائی حصہ بھی وہ بے پیسے طے کر چکا تھا اس زمانے میں یہ اچھی خاصی رقم بن جاتی تھی اور وہ اسے چھوڑنے پر آمادہ تھا! ۔ رات بھر ہم اس امر پر بحث کرتے رہے اور نتیجہ یہ ہوا کہ سات ساتھیوں نے ہمیں الوداع کہا اور ہم صرف چودہ یا سولہ رہ گئے۔ دیکھا، ان جنگلوں کا انسانوں پر کیا اثر ہوتا ہے!" "کیا وہ ڈاکو بن گئے؟"

ممکن ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ سادھو سنیاسی بن گئے ہوں بعد میں ہم نے ان کی خبر نہیں لی۔"

نانی نے صلیب کا نشان بنا کر کہا: " مریم، انسانوں کی زندگی بھی کیسی المناک ہے"۔

"شیطان کا جذب سب کو اس کی طرف کھینچتا ہے"۔

چیڑ کی جھاڑیوں اور سیلے ہوئے ٹیلوں میں سے ہو کر ایک

پگڈنڈی گزرتی تھی جس سے ہوکر ہم جنگل میں داخل ہوئے، اب میں سمجھا کہ جنگل کی زندگی کیسی سہانی ہوسکتی ہے۔ یہاں نہ تو زبان دراز انسان ہوتے ہیں نہ ان کی کمینگی اور نفاق کے نظارے۔ یہاں رہ کر میں نانا کے کمینے پن اور اماں کی ٹوٹی پھوٹی قبر کو بھول سکوں گا۔ یہ ایسی چیزیں تھیں جن سے میرے دل پر بوجھ سا رہتا تھا۔

جب ہم ایک سوکھی جگہ پر پہنچے تو نانی نے کہا:

"آؤ بیٹھو، کچھ کھا پی لیں"

اس کی ٹوکری میں جو کی روٹی، پیاز، دہی، نمک اور کھیرے رکھے ہوئے تھے۔ یہ سازوسامان دیکھ کر بڑے میاں جھینپ سے گئے۔

"اچھی بی، میں تو کچھ کھانے کو نہیں لایا۔"

"یہ ہم تینوں کے لیے کافی ہے۔"

سرو کے ایک پیڑ کے تناور تنے کا سنبھالا لے کر ہم تینوں بیٹھ گئے ایک سوندھی سی مہک ہوا میں بسی ہوئی تھی، کھیتوں سے ہلکے ہلکے جھونکے آرہے تھے اور گھاس کے تنکے سر ہلا رہے تھے۔ نانی، بوٹیاں توڑ توڑ کر ان میں سے ہر ایک کی خاصیت مجھے سمجھانے لگی۔ بڑے میاں گری ہوئی ڈالوں کو کاٹنے لگے اور مجھے کٹی ہوئی لکڑیاں ایک جگہ جمع کرنے کا حکم دیا۔ مگر میں آنکھ بچاکر نانی کے ساتھ جھاڑیوں میں غائب ہوگیا۔ ایسا لگتا تھا کہ بھاری بھرکم پیڑوں میں کوئی بن پری اڑ رہی ہے اور جب وہ دھرتی کی طرف جھکتی تو محسوس ہوتا کہ غوطہ لگا رہی ہے۔ آپ ہی آپ وہ بڑبڑاتی جاتی تھی:

"ہم پھر اتنی جلدی آگئے۔ اب کھمبیاں کہاں ملیں گے؟ اللہ میاں

محتاجوں کا تمھیں کوئی فکر ہی نہیں۔ ان کا کھاجا کھمبیاں ہی تو ہیں۔"
میں اس کی بے خبری میں دبے پاؤں پیچھے لگا ہوا تھا تاکہ خدا، برگ و شجر اور کیڑے پتنگوں سے اس کی گفتگو کا سلسلہ نہ ٹوٹے۔ لیکن اس کی نگاہ مجھ پر پڑ ہی گئی۔" ایں کیا تو بڑے میاں کو چھوڑ بھاگا؟" سیاہ زمین پھولوں کی دل فریب وردی میں ملبوس تھی۔ اس کی طرف جھک کر نانی اس زمانے کی داستان سنانے لگی جب بنی نوع انسان کی بدعنوانیوں سے تنگ آکر خدا نے دنیا کو غرقاب کر کے سب جانداروں کو ڈبو مارا لیکن حضرت مریم نے ہر چیز کے بیج ایک پٹاری میں چھپالے اور جب سیلاب اتر گیا تو سورج سے مانتا مانگی:" اگر تو دھرتی کو بالکل خشک کردے تو سب انسان رہتی دنیا تک تیرے گن گائیں، سورج نے دھرتی کو سکھا دیا اور مریم نے سب بیج بو دیے۔ خدا دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔ ایک بار پھر مادرِ گیتی کی گود میں حیوان و انسان پیڑ پودے نظر آئے۔ خدا نے پوچھا: 'یہ کس کی کرشمہ گری ہے؟ کیا میری رحمت کی؟' جب مریم نے اصل بات بتائی تو خدا کا دل پسیجا۔ کیونکہ دنیا کا سناٹا اسے بھی اکھر رہا تھا۔ خدا نے کہا:" تم نے اچھا کیا، مریم۔"
مجھے یہ کہانی دل سے بھائی۔ لیکن کچھ حیرت بھی ہوئی میں نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا:-
" کیا یہ ممکن ہے؟ مریم تو طوفانِ نوح کے بہت بعد پیدا ہوئیں۔"
اب نانی کے حیرت زدہ ہونے کی باری آئی۔
" یہ تجھ سے کس نے کہا؟"
" اسکول کی کتابوں میں لکھا ہے۔"

اب جاکر نانی کو اطمینان ہوا اور اس نے نصیحت کی :

"ایسی باتوں کو ایک کان سے سُننا اور دوسرے سے اُڑا دینا۔ ان کتابوں میں کذب و افترا کے سوا اور لکھا ہی کیا ہی" وہ مسکرانے لگی : "بیوقوف سوچ تو سہی۔ خدا کا وجود تھا اور اس کی ماں پیدا بھی نہ ہوئی تھی۔ یہ کیسے ممکن ہی؟"

"میں کیا جانوں؟"

"واہ رے لڑکے۔ ساری پڑھائی لکھائی کے بعد بس یہ سیکھا کہ میں کیا جانوں"

"پادری نے یہ بتایا تھا کہ مریم Anna اور Joachim کی بیٹی تھی"

اب تو نانی کے غصے کی انتہا نہ رہی۔ پلٹ کر اس نے غضب آلود نگاہوں سے مجھے گھورا۔

"تو نے پھر سے ایسا کلمہ زبان سے نکالا تو میں چانٹا رسید کروں گی" ذرا ٹھہر کر اس نے مجھے سمجھایا۔ "مریم سے پہلے کوئی نہ تھا، اسی نے خدا کو جنم دیا اور پھر ---"

"اور عیسیٰ کی ماں کون تھی؟"

اب تو نانی اماں بوکھلا گئیں اور ان سے کچھ کہتے نہ بنا۔

"بتلایے، بتلایے، عیسیٰ کو کس نے پیدا کیا؟"

اپنی جیت پر میں اترا گیا کہ نانی روحانی اوہام کے گورکھ دھندے میں پھنس گئی۔ لیکن یہ خیال چنداں خوش کن نہ تھا۔

ہم جنگل کو چیرتے ہوئے اندر بڑھتے گئے جہاں سورج کی

سنہری کرنیں تاریکی کی چادر میں چھن چھن کر آرہی تھیں۔ وہاں خواب آور سرگوشیاں سنائی دے رہی تھیں جو سننے والے کو سپنوں کی دنیا میں لے جاتی تھیں۔ کہیں کوئل نغمہ زن تھی، کہیں قمری غزل خواں اور بیچ بیچ میں ٹٹیری اور ہُد ہُد کی جیسے عامیانہ پرندے اپنی بے سُری راگنی چھیڑ دیتے تھے۔ ہرے ہرے مینڈک ہماری ٹانگوں کے بیچ میں اُچھل کود رہے تھے۔ بوٹیوں کا پہرا ایک زریں تاج افعی کر رہا تھا۔ گلہری پھلوں کو کُتر رہی تھی اور اس کی جُھبّے دار دم پیڑوں کے جھرمٹ میں ناچ رہی تھی، غرض کہ جنگل جتنا گھنا ہوتا جاتا تھا، اتنا ہی دلچسپ ہوتا جاتا تھا۔

شمشاد کے تنوں پر نازک بیلیں لپٹی ہوئی تھیں اور ان پر قد آور جنوں کا دھوکا ہوتا تھا۔ وہ پھننگ پر جاکر اوجھل ہوجاتیں جہاں سے چمکتا ہوا نیلا آسمان نظر آتا تھا۔ پاؤں تلے کائی کی مخمل بچھی ہوئی تھی اور اس پر لال بیروں کی ایسی چھینٹیں پڑی ہوئی تھیں کہ لہو کی بوندوں کا گمان ہوتا تھا۔ کُھمبیوں کی تیز مہک سے مُنہ میں پانی بھر آتا تھا۔

نانی نے گہرا سانس لے کر دعا مانگی: "مریم — نورِ کائنات!"
جنگل میں اس کی حالت گھر کی اُس مالکن کی سی تھی جس کا سارا کنبا خدمت کے لیے ہاتھ باندھے کھڑا ہو۔ وہ ریچھنی کی طرح ڈگمگاتی ہوئی چلتی اور قدم قدم پر ہر چھوٹی بڑی شے پر مرحبا، سبحان اللہ کہتی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس کا ورود سارے جنگل کو گرما رہا ہے۔ اور جب کائی کے تختے اس کے پاؤں کے بوجھ سے پھٹ کر بھر بھرا جاتے تو مجھے خاص طور پر لطف آتا۔

اس منظر کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ ڈاکو کی زندگی بھی کس قدر

دلچسپ ہوگی۔ لالچی کتّوں کا مال لوٹ کر غریبوں میں بانٹ دینا بھی کیسے ثواب کا کام ہوگا۔ وہ سب خوشی اور اطمینان کی زندگی بسر کرنے لگیں گے۔ نہ آپس میں لڑیں گے نہ جھگڑیں گے اور ان کی سگ دماغی ختم ہو جائے گی۔

کاش نانی کے خدا اور اس کی مریم سے ملاقات ہو سکتی اور ہمیں بتلایا جا سکتا کہ انسانوں کی زندگی کتنی مکروہ ہے اور وہ کس طرح ایک دوسرے کو قعرِ ذلت میں گرانے کے درپئے ہیں۔ اس دنیا میں بلاوجہ کتنی گھنونی اور بیہودہ چیزیں جمع ہو گئی ہیں! اگر مریم کو میرے کہے پر یقین ہوا تو کیا وہ مجھے ایسی صلاحیت عطا نہ کرے گی کہ میں اس نظام کو سُدھار سکوں اور بہتر بنا سکوں؟ میں کم عمر ہوا تو کیا۔ ابھی عیسیٰ مجھ سے سال بھر بڑا ہوگا کہ جہاں دیدہ سیانے اس کا کہا سُنتے تھے۔

ان ہوائی قلعوں میں میں ایسا مگن تھا کہ ایک خندق میں جا گرا۔ پسلیاں چرمرا گئیں اور گردن چھل گئی۔ خندق کی تہ میں کیچڑ کے فرش پر پڑے پڑے مجھے اس خیال سے شرم آئی کہ تن تنہا یہاں سے نکلنا ناممکن ہے اور ہائے توبہ مچا کر نانی کو ڈرانا اور بھی حماقت ہے۔ تاہم، آخر کار اسے آواز دیتے ہی بنی۔ نانی نے جھٹ مجھے باہر کھینچ لیا اور صلیب کا نشان بنا کر کہا:

"اللہ تیری مہربانی کہ بھالو کا بل خالی ہے اگر وہ موا اس میں دبکا ہوتا تو تیرا کیا حشر ہوتا؟" یہ کہہ کر نانی مُسکراتے مُسکراتے رو پڑی۔

ایک چشمے کے قریب لے جا کر اس نے میرے زخموں کو دھویا، اپنے دامن کی دھجیوں سے انھیں باندھا اور ان پر کچھ بوٹیاں لپیٹ دیں۔ اس کے بعد وہ مجھے اٹھا کر ریلوے لائن کی نشان چوکی تک لائی کیونکہ مجھ میں پیدل گھر لوٹنے کی سکت نہ تھی۔

اس کے بعد میں ہر روز نانی سے جنگل چلنے کی ضد کرتا۔ وہ خوشی خوشی تیار ہوجاتی اور اس طرح ساری گرمی اور خزاں کا موسم ہم نے جڑی بوٹی اور پھل ترکاری جمع کرنے میں گزار دیا۔ نانی اسے بیچ کر جو پیسے لاتی اس سے ہمارا گزارہ مزے میں ہوجاتا۔ حالانکہ بڑے میاں سے ہم روٹی کا ٹکڑا بھی نہ مانگتے تھے۔ وہ بگڑ کر کہا کرتے "پوتی کہیں کے بھک منگے!"

جنگل میرے دل میں امن و سکون پیدا کرتا۔ وہ میرے رنج و غم کو دھو دیتا اور ساری تکلیفوں کو بھلا دیتا۔ یہی وہ دن تھے جب میری سوجھ بوجھ کو جلا ملی، گوش و نگاہ کو سُننے اور دیکھنے کا سلیقہ آیا، حافظہ تیز ہوگیا اور احساسات کا ذخیرہ وسیع ہوگیا۔

اور زیادہ قربت ہونے کے بعد میں نے دیکھا کہ وہ بوڑھی عورت ایک حیرت آباد ہی۔ میں اسے کوئی برتر ہستی سمجھنے کا عادی ہوچکا تھا جس سے بڑھ کر عاقل و دانا صفحۂ زمین میں کوئی نہ تھا۔ اور یہ تصور اب ایمان راسخ کی شکل اختیار کرتا جاتا تھا۔ مثلاً ایک شام کو ہم سفید کھمبیاں جمع کرنے نکلے۔ واپسی کے وقت جنگل کے چھور پر نانی دم لینے بیٹھ گئی اور میں پیڑ کے پیچھے ڈھونڈنے لگا کہ کوئی بچا کھچا کھا جا تو نہیں رہ گیا۔ یک بیک میں نے نانی کی آواز سُنی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ پگڈنڈی کے کنارے وہ اطمینان سے ایک کھمبی کی جڑ صاف کررہی ہے اور پاس ایک بھوکا کتا زبان لٹکائے کھڑا ہے۔

"جا رے، جا، اپنی راہ سنبھال، خدا تیرا بھلا کرے۔"

ابھی کچھ ہی عرصے پہلے 'والیک' نے میرے کتّے کو زہر دے کر مار ڈالا تھا۔ اس لیے میں اسے گھر لے جانے پر اصرار کرنے لگا۔ میں کُتّے کی راہ روک کر کھڑا ہوگیا۔ وہ عجیب طریقے سے غرّایا اور مجھے اپنی

بھو کی آنکھوں سے گھور کر دم دبائے ہوئے جنگل میں غائب ہو گیا۔ اس کی چال ڈھال کتّوں کی سی نہ تھی اور جب میں نے سیٹی بجائی تو وہ وحشیانہ انداز سے جھاڑیوں پر ٹوٹ پڑا۔

نانی نے مسکرا کر کہا: "دیکھا؟۔ پہلے تو میں بھی دھوکا کھا گئی کہ یہ کوئی کتا ہے لیکن دوبارہ دیکھنے پر مجھے اپنی غلطی معلوم ہو گئی۔ اس کی گردن اور جبڑے بھیڑیوں کے سے تھے۔ پھر تو میری سٹّی بھول گئی۔ اگر بھیڑیا ہے تو منہ کالا کرے۔ شکر کا مقام ہے کہ گرمیوں میں بھیڑیے شرارت نہیں کرتے۔"

جنگل میں نانی کبھی ڈرتی جھجکتی نہ تھی اور ہمیشہ بے بھٹکے گھر لوٹ آتی تھی۔ صرف گھاس کی بو سونگھ کر وہ بتلا دیتی کہ کس قسم کی کھمبی کہاں ملے گی۔ اور وہ اکثر اس موضوع پر میرا امتحان لیا کرتی تھی۔

"فلاں بیل کس پیڑ کو پیار کرتی ہے؟ کارآمد اور زہریلی بوٹیوں میں کس طرح تمیز کی جاتی ہے۔"

کسی پیڑ کی چھال پر ہلکی ہلکی لکیروں کو دیکھ کر نانی بتلا دیتی کہ کس کھوکھے میں گلہری رہتی ہے، پھر تو میں پیڑ پر چڑھ کر بیچاری گلہری کا گھونسلا لوٹ ڈالتا۔ جاڑوں کے لیے اس کے جمع کیے ہوئے اخروٹوں کو چرا لاتا۔ کبھی کبھی تو ایک ایک گھونسلے میں پانچ پانچ سیر اخروٹ نکل آتے تھے۔ ایک مرتبہ جب میں اس لوٹ مار میں مشغول تھا کسی شکاری نے میری داہنی پسلی میں اکٹھے سینتیس چھرّے چھید دیے۔ گیارہ کو تو نانی نے سوئی سے نکال دیا۔ باقی سالہا سال میرے جسم میں رہے اور بڑی مشکل سے نکلے۔

صبر سے دکھ جھیل جانے پر نانی نے مجھے سراہا۔ "سورما سپوت!

جس میں سب سے زیادہ صبر ہے وہی سب سے زیادہ ہوشیار رہوگا۔"

جنگلی کھاجوں کو بیچ کر اگر کچھ پیسے بچ گئے تو نانی انھیں خفیہ خیرات کہ کر کھڑکیوں پر رکھ آتی اور خود اتوار کو بھی وہ پھٹے پرانے کپڑے پہنے رہتی

نانا بگڑا کرتا: "تمھاری دھجیوں کو دیکھ کر دنیا مجھ پر ہنستی ہے۔"

"تو ہُوا کیا؟ میں تمھاری بیٹی تو ہوں نہیں اور نہ مجھے کسی نئے خصم کی تلاش ہے!"

اب ان دونوں میں ہمیشہ دانتا کلکل رہتی تھی۔ نانا چڑھ کر کہا کرتا: دوسروں سے میرے گناہ ہرگز زیادہ نہیں، لیکن مجھ جیسا کوئی مصیبت زدہ نہیں۔" نانی اسے خوب ستایا کرتی تھی: "شیطان کو ہر آدمی کی اصلیت کا علم ہے۔" مجھ سے وہ کان میں کہتی: "میرے میاں بھوت پریت سے بہت ڈرتے ہیں۔ دیکھو تو بیچارے کا کیسا پتلا حال ہوگیا ہے۔ ڈر سے نہیں تو اور کس وجہ سے یہ سوکھے جا رہے ہیں۔ ہائے بیچارے بڑے میاں!"

جنگل میں رہتے رہتے میں بڑا مضبوط اور ساتھ ساتھ وحشی بھی ہوگیا۔ اب مجھے اپنے جاننے والوں میں لُڈمِلا تک میں کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ اس کے سیانے پن سے میں اُکتا چلا تھا۔

ایک روز نانا پانی میں شرابور شہر سے لوٹے۔ خزاں کا موسم تھا، اور دھنوا ندھار بارش ہو رہی تھی۔ چوکھٹ پر کسی پرندے کی طرح پر پھڑپھڑاتے ہوئے نانا نے فتحمندی کے انداز میں کہا:

"ابے بدمعاش، کل سے تجھے ایک نئی ملازمت پر جانا ہوگا۔"

نانی نے جھلّا کر کہا: "اب کے اسے کہاں جھونکنے کا ارادہ ہے؟"

"تمھاری بہن 'منزنیا' کے بیٹے کے ہاں"

"بڑے میاں، تم نے یہ اچھا نہ کیا"

"چپ رہتی ہو یا نہیں! وہ لوگ اسے انسان بنا دیں گے" نانی نے سر جھکالیا اور کچھ نہ کہا۔

شام کو میں نے لڈ ملا کو بتلایا کہ میں شہر جا رہا ہوں، اس نے سنجیدگی سے جواب دیا: "میں بھی جلد وہیں کی راہ پکڑوں گی۔ ابا میری ٹانگ کٹوا دینا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس سے میری صحت اچھی ہو جائے گی"

گرمیوں میں وہ سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے پر نیلاہٹ چھا گئی تھی اور آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

میں نے پوچھا: "کیا تم ڈر رہی ہو"

"ہاں" یہ کہ کر وہ چپکے چپکے رونے لگی۔ سمجھ میں نہ آیا کہ اسے کس طرح دلاسا دوں کیونکہ شہر کی زندگی کا تصور میرے لیے بھی غم ناک تھا۔ دیر تک ہم ایک دوسرے سے چمٹے بیٹھے چپ چپ اپنا غم کھایا کیے اگر گرمیوں کے دن ہوتے تو میں نانی سے کہتا کہ چلیے بچپن کی طرح میرے ساتھ بھیک مانگنے نکلیے۔ ہم لڈ ملا کو بھی ساتھ لے لیتے۔ میں اسے گاڑی میں کھینچے لے جاتا۔ لیکن یہ تو پت جھڑ کے دن تھے۔ سیلی ہوئی ہوا سنا رہی تھی، آکاس کالے کالے بادلوں میں چھپا ہوا تھا۔ دھرتی کی تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں۔ فضا بوجھل اور اداس ہو رہی تھی۔

باب (۴)

از سرِ نو مجھے نگر باس اختیار کرنا پڑا۔ جس گھر میں مجھے رہنا نصیب ہُوا وہ دو منزلہ اور سفید تھا اور اس پر کسی ایسے تابوت کا گمان ہوتا جس میں سارا کنبہ دفن ہونے والا ہو۔ نیا ہونے کے باوجود ایسا معلوم ہوتا کہ اس گھر کو کوئی روگ لگ گیا ہے۔ وہ کسی ایسے بھکاری کی طرح پھیلا ہوا تھا جو اچانک امیر ہونے کی وجہ سے اپھر گیا ہو۔ مکان سڑک سے پہلو تہی کرتا تھا۔ ہر دو منزل میں آٹھ آٹھ کھڑکیاں تھیں لیکن جہاں مکان کا رُخ ہونا چاہیے وہاں صرف چار تھیں۔ نچلی کھڑکیاں ایک تنگ گلی اور آنگن کی طرف کھلتی تھیں اور اوپر کی دھوبن کے گھر کی طرف۔

سڑک کا جو تصوّر میرے ذہن میں تھا اس کے لحاظ سے وہاں کوئی سڑک نہ تھی۔ البتہ مکان کے سامنے ایک گندی گلی دائیں بائیں جاتی تھی اور اسے ایک تنگ نالی کاٹ دیتی تھی۔ ایک سمت تو وہ جیل خانے تک پھیلی ہوئی تھی اور اس کے کنارے گندگی کا ڈھیر لگا رہتا تھا۔ گلی کے اور چھور پر سڑے پانی کے دو کُنڈ تھے۔ گلی کا درمیانی حصہ ہمارے مکان کے آگے پڑتا تھا۔ آدھے حصّے میں گندگی ہی گندگی تھی اور بقیہ آدھے پر پادری پوکروسکی، نے قبضہ کرکے باغ اُگا دیا تھا۔ اس میں تپلی تپلی کھپچیوں کو لال رنگ کر ایک بیٹھک گھر بنا لیا گیا تھا۔ پتھر مارو تو کھپچیاں چرچرانے لگتی تھیں۔

اس مقام کی اُداسی اور گندگی کا بیان نہیں ہوسکتا۔ برسات

نے سڑی ہوئی زمین کو نرم کر دیا تھا اور اب وہ سُرخ ملبے کی شکل میں تبدیل ہو کر سریش کی طرح پیروں میں چپک جاتی تھی۔ اس سے پہلے میں نے اتنی چھوٹی سی جگہ میں اتنی زیادہ گندگی کبھی نہ دیکھی تھی۔ کھیتوں اور جنگلوں کی صاف ستھری فضا میں رہنے کے بعد شہر کا یہ خطہ مجھے کاٹنے لگا۔

گلی سے پرے ٹوٹے پھوٹے احاطوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا اور دور سے وہ مکان نظر آتا جہاں میں جوتے کی دُکان میں ملازم رہ چکا تھا۔ اس مکان کی قربت مجھے سخت ناگوار تھی۔

اپنے نئے مالک کو میں پہلے سے جانتا تھا۔ وہ اپنے بھائی کے ساتھ اماں کے پاس آیا کرتا اور نہایت مضحکہ خیز انداز میں "آنہ رے بابا، آنہ رے بابا" کی دھرپد الاپا کرتا تھا۔

اب بھی ان کا وہی رنگ ڈھنگ تھا۔ سگّے کی سی ناک اور لمبے لمبے بالوں والے بڑبھیا کی خوش مزاجی اور نرم دلی کم نہ ہوئی تھی۔ چھٹ بھیا، وکٹر، اب تک گھڑ مُنہا تھا اور اس کا چہرہ مہاسوں سے بھرا ہوا تھا۔ ان کی ماں یعنی میری نانی کی بہن کی عیب چینی اور بدزبانی کا وہی حال تھا۔ بڑے بھائی کی شادی ہو چکی تھی۔ اس کی بیوی بیشک حسین تھی۔ اس کی آنکھیں کالی اور رسیلی تھیں اور رنگت ہندوستانی میدے کی روٹی کی طرح صاف تھی۔ پہلے ہی دن دو بار اس نے مجھے یاد دلایا:

"میں نے تمہاری ماں کو ایک زری کے کام کا ریشمی لبادہ دیا تھا۔"

مجھے کسی طرح یقین نہ آیا کہ اس نے تحفہ دیا ہوگا اور میری ماں نے قبول کر لیا ہوگا۔ جب اس نے پھر یہی بات دُہرائی تو میں نے جواب دیا:

"تو کونسی بڑی بات ہوئی " اسے یہ بات گولی سی لگی :-
"کیا کہا ؟ ارے ، جانتا ہی تو کس سے بول رہا ہی ؟" اس کا چہرہ تمتما اُٹھا ، دیدے نکل آئے اور وہ اپنے شوہر کو پکارنے لگی -

یہ حضرت کان پر پنسل رکھے اور ہاتھ میں کمپاس لیے ہوئے باورچی خانے میں آدھمکے اور بیوی کی شکایت سُن کر مجھ سے بولے :

"تمھیں ان سے اور ہم سب سے ادب برتنا چاہیے - یہاں گستاخی نہ چلنے پائے گی " پھر جھنجلا کر بیوی سے کہا :

"اپنی بکواس سے میرا وقت خراب نہ کرو !"

"بکواس سے تمھاری مراد کیا ہی ؟ اگر تمھاری رشتے دار"

"میرے رشتے دار چولھے بھاڑ میں جائیں " یہ کہتے ہوئے مالک لپک کر باہر چلا گیا -

مجھے بھی یہ خیال ناگوار تھا کہ یہ لوگ نانی کے رشتے دار ہیں - تجربے سے مجھے معلوم تھا کہ اپنوں سے پرائے ہزار گنا بہتر ہوتے ہیں - غیروں سے زیادہ وہ ایک دوسرے کی برائیوں سے واقف ہوتے ہیں اور اس لیے ان کی بدگوئی میں رذالت کا پہلو ہوتا ہی - یہی نہیں ، ان کی حجت و تکرار کا سلسلہ بھی درازتر ہوتا ہی -

مالک مجھے پسند تھا - اپنی زلفوں کو وہ ایک خوب صورت جنبش سر سے پیچھے لوٹا کر کانوں کی آڑ میں کھونس لیتا - اسے دیکھ کر مجھے بے اختیار ' دراصل صاحب ' کی یاد آتی تھی - اکثر وہ جی کھول کر ہنستا اور اس کی بھوری آنکھیں مہر و کرم سے مجھے تکنے لگتیں ، طوطے کی سی ناک پر جھریاں گدگدی سی کرنے لگتیں -

اپنے ننھے ننھے دانتوں سے ایک ہلکی سی مسکراہٹ پیدا کرکے وہ اپنی ماں اور بیوی کو پکارتا:۔

"جنگلی مرغیو، تمھاری لڑائی کبھی بند بھی ہوگی یا نہیں" ساس بہو میں دن بھر گالی گلوج جاری رہتی تھی۔ ایسی جلدی اور آسانی سے ان میں جنگ چھڑ جاتی تھی کہ اسے دیکھ کر مجھے حیرت ہوتی۔ صبح ہوتے ہی اپنے کپڑوں یا بالوں کو سنوارے بنائے وہ دونوں چرخی کی طرح یوں دردالان کے چکر کاٹنے لگتی تھیں گویا گھر میں آگ لگ گئی ہو۔ دن بھر ان کی بھاگ دوڑ کی یہی حالت رہتی۔ صرف کھانے پینے کے لیے وہ دم لیتی تھیں اور وہ اتنا کھاتی پیتی تھیں کہ پیٹ میں زرا جگہ نہ رہے۔ پھر وہ سیر ہوکر کھانوں کے بارے میں بحث چھیڑ دیتیں اور کسی بہت بڑی جنگ کے لیے میدان تیار کرتیں۔ ساس چاہے دنیا کا کوئی بھی کھانا پکائے بہو ضرور یہ فقرہ کس دیتی:

"میری ماں اس طرح نہیں پکاتی تھی"۔ "تو یوں کہو کہ انھیں پکانا نہ آتا تھا"۔

"توبہ کیجیے، ان کی جوتی کا مقابلہ تو کوئی کرلے"۔ "ای ہی۔ تو پھر انھیں کے پاس کیوں نہیں جا رہتیں"۔

"جائیں جانے والے۔ میں تو اس گھر کی مالکن ہوں"۔

"اور میں کون ہوں؟"

اب مالک بیچ بچاؤ کرتا تھا۔

"بس بھی کرو اری کڑک مرغیو! تمھیں ہوگیا گیا ہے۔ کہیں دماغ تو خراب نہیں ہوگیا؟"

جانے کس وجہ سے اس گھر کی ہر چیز مضحکہ خیز اور نرالی معلوم ہوتی تھی۔ باورچی خانے سے کھانے کے کمرے کو غسل خانے میں سے ہو کر گزرنا ہوتا اور دانہ پانی سب اُدھر سے ہی لے جانا ہوتا تھا۔ اس بے تکے پن کی وجہ سے خوب دل لگی رہتی۔ میں اس دروازے اور زینے کی طرف جانے والے دروازے کے درمیان باورچی خانے میں سویا کرتا تھا تندور کی آنچ میری کھوپڑی کو پکا دیتی اور اِدھر زینے سے تیز ہوا سیدھے میرے پیروں پر آتی۔ سوتے وقت میں فرش سے تمام چٹائیاں اٹھا کر اپنے پیروں پر لپیٹ لیتا تھا۔

دیوان خانہ خاصا وسیع تھا لیکن اپنے دھندلے آئینوں، سستی تصویروں اور فوق البھڑک کرسیوں، میزوں کے ساتھ ویران اور اداس معلوم ہوتا تھا۔ بیٹھنے کا کمرہ چھوٹا سا تھا اور اس میں چائے کے برتن، چاندی کے چھری کانٹوں، شادی کے تحفوں اور گدی دار کرسیوں کا مظاہرہ ہو رہا تھا، اس میں تین فانوس لگے ہوئے تھے دو چھوٹے اور ایک بڑا۔

اندھیری خواب گاہ میں لمبے چوڑے پلنگ کے علاوہ صندوقوں اور الماریوں کی بھرمار تھی جس سے سوکھے تمباکو اور ایرانی بابونے کی بو آتی تھی۔ یہ تینوں کمرے ہمیشہ خالی رہتے تھے۔ سارا کنبہ چھوٹے سے کھانے کے کمرے میں گھسا رہتا تھا۔ ناشتہ ختم ہوتے ہی دونوں بھائی میز پر آمنے سامنے بیٹھ جاتے اور سفید کاغذ کے تاؤ قلم دوات اور رنگ کی پیالیاں میز میں پھیلا دیتے۔ میز کچھ ڈگمگاتی تھی۔ وہ سارے کمرے کا احاطہ کیے ہوئے تھی اور جب مالکن یا دایہ بچّے کی کوٹھری سے نکلتی تو

اسے دھکم دھکا کر کے باہر آنا پڑتا تھا۔

دکٹر چیخ پڑتا: "یہاں کیا اُدھم مچا رکھا ہی!" بیوی تیکھے انداز میں اپنے میاں سے کہتی:

"واسیا، ان سے کہ دو کہ مجھ سے سیدھے منہ بات کیا کریں"

شوہر نرمی سے جواب دیتا:۔

"اچھا مگر یہاں آکر میز کو دھکا نہ دیا کرو"

"کیا کروں، کمرا تنگ ہی اور میں ذرا تنومند ہوں" "خیر، ہم لوگ دیوان خانے میں کام کیا کریں گے" یہ سُن کر بیوی غصّے سے چلّا اُٹھتی:۔

"اوئی، ایسی کیا مصیبت آپڑی ہی کہ وہاں کام کرو"

اسی وقت غسل خانے سے ساس کا تندور کی آنچ سے تمتایا ہوا چہرا برآمد ہوا اور وہ بولی:۔

"دیکھا، واسیا، یہ خوب جانتی ہی کہ تم مصروف ہو، پھر بھی سارا گھر چھوڑ کر یہیں گھسی چلی آتی ہی"

اس پر وکٹر معاندانہ طریقے سے ہنسا اور مالک نے کہا:

"بس بھی کرو"

ادھر بہو ہٹیلی ناگن کی طرح کرسی پر گر کر پھنکار اُٹھی: "ہائے میرا دم نکل رہا ہی میرا سانس رک رہا ہی"

اب تو مالک بھی تنگ آکر۔ گرج اُٹھا:

"تم پر شیطان کی پھٹکار! مجھے کام کیوں نہیں کرنے دیتیں یہ پاگل خانہ نہیں تو کیا ہی۔ اس کا خیال نہیں کہ ان کا دوزخ بھرنے کے

لیے ہمارا خون پسینہ ایک ہوا جاتا ہے۔ ارے جنگلی مرغیو!"

پہلے پہل، ان لڑائیوں سے میں ڈر جاتا تھا۔ خصوصاً جب مالکن ایک چھری اُٹھا کر غسل خانے میں گھس جاتی اور اندر سے چٹخنی لگا کر پاگل کُتیا کی طرح غرانے لگتی۔ لمحہ بھر ہر طرف سناٹا چھا جاتا۔ پھر مالک دروازہ توڑنے کی بے کار کوشش کے بعد مجھے بلا کر کہتا: "میری پیٹھ پر چڑھ کر چٹخنی کھول دو!"

میں نے فوراً اس کی پیٹھ پر اچک کر دروازے کی ایک جھلملی توڑ دی لیکن جیسے ہی میں نے چٹخنی کھولنے کے لیے اندر سر ڈالا، مالکن نے میری کھوپڑی پر چھری کا دستہ رسید کیا۔ پھر بھی میں نے دروازہ کھول ہی دیا۔ میاں نے بمشکل تمام بیوی کو باہر کھینچا اور اس کے ہاتھ سے چھری چھین لی۔ میں باورچی خانے میں چوٹ سینکنے گیا تو پتا چلا کہ خواہ مخواہ سر اوکھلی میں دیا۔ چھری ایسی کند تھی کہ اس سے بکٹے کی ناک بھی نہ کٹے، پھر بھلا وہ کسی کے جسم میں کیا گھستی اور مالک کی پیٹھ پر چڑھنے کی کیا ضرورت تھی۔ شیشہ تو کرسی پر چڑھ کر بھی توڑا جا سکتا تھا۔ بہر حال کسی بڑے آدمی کے لیے نسبتاً یہ کام زیادہ آسان تھا کیونکہ وہ اپنے ہاتھ اوپر تک لے جا سکتا تھا۔ اس واقعے کے بعد خانہ جنگی سے میں مطلق نہ گھبراتا تھا۔

دونوں بھائی گرجا کی سنگیت منڈلی میں شریک ہوتے تھے۔ کام کرتے کرتے دھیمے سروں میں گایا کرتے تھے۔ بڑا بھائی یوں تان چھیڑتا:

دل محبوب تھا محفوظ جسمیں
وہی انگشتری کی غرق دریا

اور چھوٹا بھائی جواب دیتا:-

اسی غم میں میری جان جہاں کا

ہُوا دشوار اِس دنیا میں جینا

بچے کے کمرے سے مالکن بڑبڑانے لگتی :

"کچھ پی تو نہیں لیا ہے ؟ بچہ جاگ جائے گا" یا :

" واسیا، تم تو شادی شدہ ہو، کنواریوں کے گیت کیوں گا رہے ہو ؟ اس کا بھی دھیان نہیں کہ گھڑی بھر میں گرجا کا گھنٹا نماز کے وقت کا اعلان کرے گا"

"کیا بک رہی ہو ؟ ہم تو گرجا کا گیت گا رہے ہیں"

لیکن مالکن کی ضد تھی کہ گرجا کے گیت کسی ایسی ویسی جگہ نہیں گائے جا سکتے۔ یہی نہیں بلکہ وہ بچے کے جاگنے کا ڈر بھی دکھایا کرتی تھی۔

مالک جواب میں کہتا : " ہمیں یہاں سے بوریا بدھنا اُٹھانا ہوگا ورنہ خدا جانے کیا مصیبت آئے گی"

تین سال تک وہ اسی جگہ بیٹھے بیٹھے یہی جملہ دُہراتا رہا لیکن ہرگز ٹس سے مس نہ ہُوا۔

جب یہ لوگ دوسروں پر نکتہ چینی کرتے تو مجھے فوراً اس جوتوں کی دُکان کا خیال آتا۔ دونوں جگہ میں نے ایک ہی انداز پایا۔ یہ سمجھتے دیر نہ لگی کہ اس گھر والے بھی شہر بھر میں اپنے کو انتخاب خیال کرتے ہیں۔ اخلاقی مسائل تو گویا ان کے نوک زبان تھے گو میں قطعاً نہ سمجھ سکا کہ وہ ہیں کیا۔ اُن کی کسوٹی پر وہ ہر زید و بکر کو بڑی سختی سے پرکھا کرتے تھے۔ ان کی اس حرکت سے مجھے انتہائی نفرت تھی اور جب کبھی ان کے اخلاقی معیار کی خلاف ورزی ہوتی تو میں بہت خوش ہوتا۔

مجھے بہت کام کرنا پڑتا تھا۔ ایک نوکرانی کی ساری خدمات کے

علاوہ مجھے بُدھ کو باورچی خانے اور سنیچر کو سارے گھر کی جھاڑ پونچھ بھی کرنی ہوتی - ایندھن لانے کے علاوہ دھونا دھلانا، سودا سلف اور ترکاری کاٹنا بھی میرا ہی کام تھا -

میری اصل مالکن نانی کی بہن تھی - یہ بڑھیا بھی غضب کی طرار، تُند مزاج اور بگڑے دل تھی - پرندوں کے چہچہے کے ساتھ وہ اُٹھ بیٹھتی اور جھٹ پٹ ہاتھ مُنہ دھو کر شب خوابی کے لباس میں ہی شہ نشین کے آگے سجدے میں گر پڑتی اور دیر تک دنیا اور اپنی اولاد اور بہو کا رونا رویا کرتی -

اپنی اُنگلیوں سے ماتھے کو چھو کر وہ روکھی آواز میں کہتی : "الٰہی، میں اور کچھ نہیں مانگتی - میں صرف امن اور سکون کی بھوکی ہوں "

اس کی ہچکیاں مجھے نیند سے بیدار کر دیتیں اور میں نیم خوابی کی حالت میں کمبل کے اندر سے اس کی بددعاؤں کو سنتا اور سراسیمہ ہو جاتا خزاں کی صبح آب باراں میں دُھلی دھلائی جھلملیوں میں سے اپنی نیلگی سی روشنی پھیلانے لگتی - دھندلکے میں فرش پر بڑھیا کا ضعیف جسم جھومنے لگتا اور دونوں ہاتھ دہشت ناک طریقے سے حرکت کرنے لگتے - اس کے چھدرے بال سر کے رومال کے نیچے سے پھسل کر گردن اور شانوں پر ڈھلک آتے - رومال کو بار بار اپنے بائیں ہاتھ سے سنبھال کر وہ بڑبڑانے لگتی :- "ٹھہر بھی جا کمبخت !"

اپنے ماتھے کو زور سے پٹک کر اور سینے کو کوٹ کر وہ ماتم کرنے لگتی :-

" اور اچھے اللہ، اس نگوڑی بہو کو ایسی سزا دے کہ دُنیا کو

عبرت ہو! اس نے مجھے جس جس طریقے سے ستایا ہے اسے بھی کلپا اور تڑپا! اور میرے بیٹے کی آنکھیں کھول۔ خدا، وکٹر کو عقل دے اور اس پر اپنی رحمت کا سایہ کر!"

وکٹر بھی باورچی خانے میں سوتا تھا۔ اپنی ماں کے رونے کوسنے سے تنگ آکر وہ نندا سی آواز میں پکار اٹھتا:۔

"اماں آپ پھر نئی دلہن کو کوس رہی ہیں۔ یہ تو بڑی بری بات ہے۔"
اعتراف گناہ کے لہجے میں بڑھیا آہستہ سے کہتی:۔

"اچھا، تو تو سوتا رہ۔" پل بھر چپ رہ کر وہ دوبارہ زیادہ شدت سے کوسنے لگتی: "اللہ، ان کی ہڈیاں تک گل جائیں اور اس دنیا میں ان کے لیے کہیں ٹھکانا نہ ہو!"

نانا تک نے کبھی ایسی ہولناک بددعائیں نہ دی ہوں گی۔ یہ فریضہ ختم کرکے وہ مجھے بستر سے کھدیڑ دیتی۔ "اٹھ رے اٹھ! اگر صبح اٹھنے کی عادت نہ ڈالی تو ساری عمر اپاہج ہو کر رہے گا۔ سماوار تیار کر اور آگ جلا۔ رات کو لکڑی کاٹ لی تھی یا نہیں؟"

بڑھیا کی بیہودہ سرائی سے بچنے کے لیے میں دوڑ دوڑ کر کام کرتا لیکن اسے خوش کرنا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ باورچی خانے میں وہ کسی برفانی طوفان کی طرح سائیں سائیں کرتی پھرتی تھی:۔

"ارے بھتنے یہ شور کیوں مچا رکھا ہے۔ اگر وکٹر کی آنکھ کھل گئی تو تیری جان کی خیر نہیں! اچھا چل دکان کی راہ لے!"

ہر روز میں دلہن کے لیے سیر بھر شیرمال لایا کرتا تھا بازار سے لوٹتے ہی دونوں عورتیں مشتبہ نگاہوں سے اس کا جائزہ لیتیں اور پھر

اسے ہاتھ میں تول کر کہتیں: "ترازو میں پاسنگ تو نہیں بندھا تھا؟ نہیں؟ اچھا تو ذرا مُنھ تو کھول" اور پھر وہ فاتحانہ انداز میں چلاتیں: "دیکھنا ۔ یہ پاسنگ کی روٹی کھا گیا۔ اس کے ذرّے موئے کے دانتوں میں چپٹے ہوئے ہیں"

کام تو میں خوشی خوشی کرتا تھا۔ مکان کی جھاڑ پونچھ، برتن بھانڈوں کی دُھلائی اور کونے کھدروں کی صفائی میں مجھے ایک خاص مزہ ملتا تھا امن و امان کے لمحات میں میں نے عورتوں کو کئی بار یہ کہتے سنا:

"اس کے مختتی ہونے میں تو کوئی شک نہیں"

"اور خدا لگتی تو یہ، کہ وہ بڑا صفائی پسند ہے"

"مگر ہے کمبخت بدزبان"

"لیکن اماں اس کی تربیت ہوئی کہاں؟"

وہ دونوں مجھے ادب سے پیش آنے کی ہدایت کیا کرتی تھیں، لیکن میری نگاہ میں وہ دونوں بیہودہ تھیں ۔ وہ مجھے ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں اور اسی وجہ سے میں ان کی حکم عدولی اور ترکی بہ ترکی جواب دینے سے نہ چوکتا تھا۔ جب دُلہن نے دیکھا کہ اس کی نصیحتوں کا مجھ پر مطلق اثر نہ ہوا تو وہ بار بار مجھے یاد دلانے لگی:

"تجھے اپنی اوقات نہ بھولنی چاہیے ۔ جانتا ہے میں نے تیری ماں کو زری کے کام کا ریشمی لبادہ دیا تھا"

ایک روز مجھ سے نہ رہا گیا:

"کیا آپ چاہتی ہیں کہ میں اپنی کھال کا لبادہ بنا کر آپ کو پہنا دوں؟"

وہ گھبرا کر چلائی: "خدا خیر کرے، اس لونڈے کا بس چلے تو گھر میں آگ لگا دے!" یہ سن کر میں دنگ رہ گیا۔ اس نے یہ کیا فقرہ تراشا۔

دونوں عورتیں مالک سے میری شکایت کرنے پہنچیں اور اس نے سختی سے مجھے ڈانٹا:

"میاں بچو، اب سیدھے سیدھے بوریا بندھنا سنبھالو!" لیکن ایک مرتبہ اس نے سنجیدگی سے اپنی بیوی اور ماں سے کہا: "تم دونوں کی جوڑی بھی خوب ہے۔ یہ لڑکا انسان ہے یا خچر جو دن رات اس کی جان کھائے جاتی ہو۔ اور کوئی لڑکا ہوتا تو کبھی کا بھاگ کھڑا ہوتا۔"

یہ کھری بات سن کر دونوں عورتیں آگ بگولا ہو گئیں اور بلبلا کر رونے لگیں۔ بیوی۔ دولتی جھاڑ کر بولی:

"تم بھی نرے کاٹھ کے اُلو ہو جو اس حرام خور کو مُنہ در مُنہ شہ دے رہے ہو۔ اب تو یہ دو کوڑی کا بھی نہیں رہے گا۔ اور کچھ نہیں تو میری طبیعت کا ہی پاس کیا ہوتا۔"

بڑی بی نے جھنجھلا کر کہا:

"واسیا، خدا تیرے گناہ سے درگزر کرے! میری بات کو گرہ باندھ رکھ کہ تو اس لونڈے کا ستیاناس کر رہا ہے۔"

جب وہ دونوں بکتی جھکتی چلی گئیں تو مالک مجھ پر بپھر پڑا:

"شیطان کہیں کے، تیری وجہ سے گھر میں قیامت برپا ہو گئی ہیں تو تجھے تیرے نانا کے سپرد کر آؤں گا۔ تجھ سے چیتھڑے چُننے کے سوا اور کچھ نہیں ہونے کا۔" یہ سن کر مجھے بڑا طیش آیا:

"اس زندگی سے وہ پھر بھی ہزار گنا بہتر ہے۔ آپ تو میرے اُستاد

بنے تھے۔ لیکن اب تک مجھے جھوٹے برتن مانجھنے کے سوا کیا سکھایا ہی؟"

اس نے میرے بال پکڑ لیے ـــ زیادہ زور سے نہیں اور آنکھ میں آنکھ ڈال کر حیرت سے کہا:

"ابے تو تو بڑا سرکش ہی۔ ہمارا تمھارا نباہ نہیں ہونے کا۔ ہرگز نہیں۔"

مجھے یقین تھا کہ اس چرب زبانی کی پاداش میں نکال دیا جاؤں گا۔ لیکن دو چار روز بعد وہ موٹے کاغذ کا تاؤ۔ پنسل، پرکون اور ایک رولر لیے ہوئے باورچی خانے میں آیا۔

چھری کانٹے دھو کر اس نقشے کی نقل اُتارنا۔"

کاغذ کے ایک ورق پر دو منزلہ مکان کا نقشہ بنا ہوا تھا، کھڑکیوں اور بے تکے بیل بوٹوں کی بھرمار تھی۔

"یہ رہا کمپاس۔ جہاں لکیر ختم ہو۔ وہاں نقطہ ڈال دینا اور پھر ایک نقطے سے دوسرے تک رولر سے لکیر کھینچ دینا ـــ پہلے سیدھی، پھر آڑی۔ دیکھوں تو سہی کیا بناتا ہی۔"

اس خیال سے عین مسرت ہوئی کہ کوئی معقول کام کرنے کا موقع ملا۔ بایں ہمہ کاغذ اور کمپاس کو دیکھ کر مجھے حیرانی ہوئی کیونکہ میرے لیے تو وہ بالکل گورکھ دھندا تھا۔ بہرحال جھٹ پٹ ہاتھ دھو کر میں کام سیکھنے بیٹھ گیا۔ پہلے سیدھی لکیریں کھینچ کر ان کی جانچ کی۔ یوں غنیمت معلوم ہوئیں، صرف تین بے کار تھیں، پھر جو آڑی لکیریں بنائیں تو کیا دیکھتا ہوں کہ مکان کا رُخ مسخ ہو گیا ہی۔ کھڑکیاں مکان کے اندر گھس آئی تھیں اور ایک ہوا میں ادھر لٹک رہی تھی۔ مکان کی کرسی دوسری

منزل تک بلند ہوگئی۔ چھت کے بیچوں بیچ ایک کنگورہ نکل آیا اور چمنی میں ایک جھلملی پیدا ہوگئی!

اتنی دیر تک میں ان غلطیوں کو سُدھارنے کی بے کار کوشش کرتا رہا کہ آنکھوں میں آنسو آگئے۔ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ خلط ملط کیسے ہوا جب عقل نے مدد نہ کی تو میں نے تخیل کا آسرا ڈھونڈا۔ میں نے مکان کی دیوار، کھڑکی، چھت، گلر اور کنگورہ غرض کہ ہر طرف لنگڑے آدمیوں کے خاکے بنا دیے جو بغل میں چھتریاں دبائے ہوئے تھے۔ پھر اوپر سے آڑی ترچھی لکیریں کھینچ کر میں یہ چیستاں اپنے اُستاد کی خدمت میں لے گیا۔

سر کھجا کر اور ناک بھوں چڑھا کر وہ غرّایا:

"یہ کیا معمّا ہے؟"

میں سمجھانے کی کوشش کرنے لگا: "بارش کا سماں ہے۔ پانی کی بوندیں آڑی ترچھی گرتی ہیں اس لیے ان کے پردے میں مکان بھی اوندھا سیدھا نظر آتا ہے۔ دیکھیے یہ سب ہیں پرندے اور وہ پانی سے بچنے کے لیے گھر میں پناہ لے رہے ہیں۔ یہ کون سی انوکھی بات ہے۔ یہ لوگ گھر کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ یہ بیگم صاحبہ پھسل کر گر پڑیں اور وہ ہے پھیری والا جو لیمو بیچ رہا ہے۔"

"بہت خوب، شکریہ آپ کا۔" یہ کہہ کر مالک ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہوگیا:

او ہو! ارے اُلّو تیرے ٹکڑے کر کے چیل کووں کو کھلانا چاہیے۔"

اتنے میں مالکن وہاں آئی اور میری کارستانی دیکھ کر اپنے

میاں کو مجھے پیٹنے کی ترغیب دینے لگی۔ لیکن اس نے ہنس کر ٹال دیا:
"اس کی کیا خطا۔ میں نے بھی اسی طرح ابتدا کی تھی"
مکان کے کارٹون کو سرخ پنسل سے کاٹ کر اس نے مجھے کاغذ کا ایک اور تاؤ دیا۔
"ایک بار پھر کوشش کرو"
دوسرا نقشہ بہتر تھا، البتہ دروازے کی جگہ کھڑکی بن گئی تھی۔ لیکن مکان کو سنسان چھوڑ دینا مجھے پسند نہ آیا اس لیے میں نے اس میں بھانت بھانت کے جانور بسا دیے۔ کھڑکیوں پر عورتیں پنکھا جھلتی بیٹھی تھیں اور ان کے یار سگریٹ کے کش لگا رہے تھے۔ ان میں سے ایک کو سگریٹ سے نفرت تھی، اس لیے وہ دوسروں پر بگڑ رہا تھا۔ سیڑھی پر ایک تانگہ بان کھڑا تھا اور اس کے پاس ایک کتا لیٹا ہوا تھا۔
مالک نے گرج کر کہا: "تو نے پھر اپنی عقل لڑائی!"
میں نے معذرت کی کہ مکین نہ ہوں تو مکان کی رونق کیا۔ لیکن وہ برابر ڈانٹتا رہا۔
"بھاڑ میں جائے یہ بھنڈیلاپن! کام سیکھنا ہے تو ٹھیک سے سیکھو، یوں جھک مارنے سے کیا حاصل!
آخر کار جب میں اصل نقشے کا صحیح چربہ اُتارنے میں کامیاب ہو گیا تو اس نے میری پیٹھ ٹھونکی:
"دیکھو، تم نرے بدھو نہیں ہو، میرا کہا مانو گے تو جلدی ہی کچھ نہ کچھ سیکھ جاؤ گے" اب کے اس نے مجھے باقاعدہ ایک سبق دیا۔
"اس گھر کا نقشہ بناؤ اور ساری ترتیب صاف صاف دکھاؤ۔

میں تمھیں کچھ نہ بتاتا رہوں گا۔ اپنی سوجھ بوجھ سے کام لو۔"

"باورچی خانے میں بیٹھ کر میں اُدھیڑبن کرنے لگا کہ یہ خاکہ کیوں کر بنے لیکن اسی وقت میری نقشہ نویسی پر ایک بلائے ناگہانی نازل ہوئی۔

بڑھیا آندھی کی طرح جھپٹی اور پھنکار اُٹھی:

"اچھا تو اب آپ نقشے بنایا کریں گے۔"

بال پکڑ کر اس نے میرے سر کو میز سے اس زور کی ٹکر دی کہ ناک اور ہونٹ سوج گیا۔ کاغذ پھاڑ کر اس نے کمپاس وغیرہ پھینک دی اور پھر چوتڑ بجا کر فخریہ انداز میں بولی:

"آنکھوں دیکھتے میں ایسی بے انصافی نہ ہونے دوں گی۔ سگا بھائی تو در بدر کی خاک چھانے اور کوئی اٹھائی گیرا آ کر گھر کا ہنر سیکھ جائے!"

مالک دوڑا ہوا آیا پیچھے پیچھے اس کی بیوی بھی آئی اور ہنگامہ برپا ہو گیا۔ تینوں چیختے چلاتے ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے۔ اور جب مطلع صاف ہوا تو عورتیں کونے میں رو بسور رہی تھیں اور مالک مجھ سے کہہ رہا تھا:

"لڑکے، کچھ عرصے کے لیے تجھے ہی اپنے ارادے سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ دیکھ لیا اس کی وجہ سے کیسا فساد ہو گیا۔"

مجھے اس پر ترس آیا۔ عورتوں کی ہائے پکار سے اس کے کان کے پردے سُن ہو گئے تھے اور اس پر بیچارگی اور اعتراف شکست کی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ اس سے پہلے ہی مجھے علم ہو چکا تھا کہ بڑھیا کو میری تعلیم قطعاً ناگوار ہے اور اسی وجہ سے نقشہ بنانے سے پہلے میں اس سے پوچھ لیا کرتا۔

"اور کوئی کام ہو تو بتا دیجیے۔"

ناک بھوں چڑھا کر وہ بولتی :

"کوئی کام ہوا تو کہہ دوں گی" دو چار منٹ بعد وہ خواہ مخواہ مجھے اِدھر اُدھر بھیج دیتی یا جھوٹ موٹ کہہ دیتی: "سیڑھی تو نے صاف کیا کی اور بھی گندی ہو گئی۔ کونوں میں منوں کوڑا بھرا پڑا ہی۔ جا اور ٹھیک سے صاف کر آ !"

جا کر میں ہر طرف سے دیکھتا مگر وہ تو آئینہ سی جھک جھک کر رہی تھی۔

بڑھیا آنکھیں نکال کر کہتی : "ارے تیرا اتنا دیدہ کہ مجھ سے حجت کرے !"

ایک روز اس نے میری تصویروں پر شوربا اُلٹ دیا اور دوسری مرتبہ شہ نشین کے چراغ سے نقشوں پر تیل ٹپکا دیا۔ چلبلی لڑکیوں کی طرح وہ مجھ سے شرارت کیا کرتی اور طفلانہ بھولے پن سے اسے چھپانے کا جتن کرتی۔ آج تک میں کسی ایسے انسان سے نہ ملا جو اس بڑھیا کی طرح بات بات پر آگ بگولا ہو جائے اور جو ہر آدمی اور ہر چیز کی شکایت اس قدر شد و مد سے کرتا ہو۔ یوں تو لوگوں کو شکوہ شکایت کی عادت ہوتی ہی ہی، مگر اس زال فرتوت کو کسی کی بُرائی کر کے ایسا حظ حاصل ہوتا تھا گویا وہ گانا گا رہی ہی۔

اپنے بیٹے سے اس کی محبت جنون کی حد تک پہنچ گئی تھی اور دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی، لیکن جب اس شفقت کا اظہار انتہائی شکل میں ہوتا تو میں دہل جاتا تھا۔ نماز صبح کے بعد گاہے گاہے وہ تندور پر باہیں ٹیک کر کھڑی ہو جاتی اور زیر لب گنگنانے لگتی :-

"میری آنکھوں کا تارا ! میرے جگر کا ٹکڑا ! میرے خون کا جوہر !

فرشتوں کا نورِ نظر — سو رہا ہے - سوئے جا، میری جان - کاش تیری روح مسرت بخش خوابوں کا نظارہ کرے! سپنے میں اپنی ہونے والی دلہن کو دیکھنا جس کا حسن عالم انتخاب ہو، جو راج کماری یا سوداگر زادی ہو! اور تیرے دشمن پیدا ہوتے ہی فنا ہو جائیں۔ تیرے دوست سو سو سال جییں اور لڑکیاں اس طرح تیرے پیچھے لگی رہیں جیسے مرغیاں مرغے کے پیچھے!"

میرے لیے یہ دعائیں حد درجہ مضحکہ خیز تھیں۔ بدتمیز اور کاہل الوجود وکٹر اور لگڑ بگھے میں کوئی فرق نہ تھا - ویسی ہی بھونڈی سی ناک اور ضدی اور بے رنگ مزاج - کبھی کبھی ماں کی سرگوشیوں سے اس کی آنکھ کھل جاتی اور وہ نندا سی آواز میں کہتا:

"لاحول ولاقوۃ، اماں! آخر تم میرے منہ پر کیا پھونکیں مار رہی ہو۔ تم نے تو جینا حرام کر دیا۔"

کبھی تو بڑھیا ہنس کر یہ کہتی ہوئی چپکے سے چل دیتی: "اچھا، بابا، سو جا، سو جا رے اکل کھرے، سو جا۔"

لیکن کبھی یہ بھی ہوتا کہ وہ پیر پٹک کر یوں ہانپنے لگتی گویا تالو میں آگ لگ گئی ہو۔ اور اس کے منہ میں بد دعائیں تلملانے لگتیں۔

"ایں؟ تو اپنی ماں پر لاحول بھیج رہا ہے۔ پھٹکار ہے تجھ پر ارے بدزبان لونڈے۔ شیطان نے مجھے ورغلایا کہ لاڈ پیار سے تیرا ستیاناس کر دیا۔"

بڑھیا فحش گالیاں دینے سے بھی نہ چوکتی تھی - اس کی باتیں سن کر دل کانپ جاتا تھا۔ اسے نیند بہت کم آتی تھی، کبھی کبھی تو رات میں کئی کئی بار چونک کر تندور سے نیچے کود پڑتی اور مجھے جگا دیتی۔

"کون ہی؟"

"چلاّ مت!" کان میں یہ کہہ کر وہ صلیب کا نشان بناتی اور اندھیرے میں کسی چیز کو گھورنے لگتی۔

"میرے اللہ! اچھی مریم! یا حضرت الیاس، مجھے ناگہانی موت سے بچانا!"

تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں سے وہ چراغ روشن کرتی۔ اس کا گول مٹول چہرا بُری طرح سوجا ہوا ہوتا اور اس کی بھوری آنکھیں مچر مچر کرتی ہوئی پریشانی کے عالم میں گرد و پیش کی ٹوہ لینے لگتیں جن کی ہیئت اس وقت کچھ سے کچھ ہو جاتی۔ باورچی خانہ یوں تو بڑا تھا مگر الماریوں اور صندوقوں کی بہتات کی وجہ سے رات کو چھوٹا سا معلوم ہوتا تھا۔ چاندنی بے تکلف چھن چھن کر اندر داخل ہوتی، چراغ کی لو جھومنے لگتی اور چھریاں برف کے ٹکڑوں کے مانند جگمگانے لگتیں۔ فرش پر پڑی ہوئی کالی پتیلیوں پر آنکھ کے چہروں کا دھوکا ہوتا۔

بڑھیا یوں سنبھل سنبھل کر تنور سے نیچے پیر رکھتی گویا ندی میں اُتر رہی ہی۔ اور ننگے پاؤں ٹٹول ٹٹول کر کنارے کی طرف جاتی جہاں ایک ٹوٹی ہوئی صُراحی کسی کٹے ہوئے سر کی طرح طاق میں رکھی تھی۔ ہانپتے کانپتے پانی ڈکوس کر وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتی۔ کھڑکی کے پٹ پر نیلا نیلا پالا جما ہوتا تھا

آہستہ آہستہ وہ دعا مانگنے لگتی: "خدا مجھ پر رحم کر! چراغ گُل کر کے وہ گھٹنوں کے بل گر پڑتی اور تیکھی آواز میں پوچھتی: "اللہ کوئی ایسا بھی ہی جو مجھ سے محبت کرتا ہو؟ جس کو میری ضرورت ہو؟"

دوبارہ تندور پر اُچک کر وہ چمنی کی ڈھبری کھولتی اور دیکھتی کہ دود کش اپنی جگہ پر ہی یا نہیں - اس کے ہاتھ دھنویں سے سن جاتے اور عجیب بات ہی کہ عین اسی وقت وہ کھٹ سے سو جاتی، گویا کسی دست غیب نے اسے سُلا دیا. جب مجھے اس پر غصہ آتا تو میں سوچا کرتا کہ کیا افسوس کا مقام ہی کہ اس بڈھی کا بیاہ نانا جان سے نہیں ہوا! ان دونوں کی جوڑی بھی کیا خوب ہوتی -

اکثر وہ مجھے تنگ کرتی رہتی، لیکن کبھی کبھی اس کے سوجے ہوئے چہرے پر اُداسی چھا جاتی، آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آتے اور وہ حسرتناک آواز میں مجھ سے کہتی:

"تم سمجھتے ہو کہ میری زندگی بڑے مزے میں گزر رہی ہی، ایں؟ میں نے بچے جنے، انھیں پال پوس کر بڑا کیا اور اس کا اجر کیا ملا؟ چوبیس گھنٹے ان کی خدمت میں لگے رہنا اور بس - کیا تم سمجھتے ہو کہ مجھے اس سے مزا ملتا ہی؟ میرے بڑے بیٹے نے دُنیا سے نرالی چھوکری گھر میں ڈال رکھی ہی - کیا یہ میری خوشنودی کا باعث ہی؟ کہو کہو؟"

میں صفائی سے جواب دیتا: "نہیں یہ بات تو نہیں ہی -

"خدا تجھے بڑی عمر دے" اس تائید کے بعد وہ نہایت بےحیائی سے اپنی بہو کا ذکر کرنے لگتی:

ایک بار مجھے اس کے ساتھ غسل خانے جانا پڑا اور میں نے نک سے سک تک اس کا معائنہ کیا - ارے اس میں کچھ تو ہو جس پر ناز کر سکے - کیا کوئی اسے خوب صورت کہہ سکتا ہی؟"

میاں بیوی کے تعلقات پر وہ بڑے بھکڑپن سے رائے زنی کرتی تھی۔ پہلے تو اس انداز سے مجھے اُبکائی آیا کرتی لیکن پھر میں نے اس کی تقریریں کو کان لگا کر سُننے کی عادت ڈال لی کیونکہ میں سمجھ گیا کہ ان میں کسی نہ کسی حد تک ایک تلخ حقیقت پنہاں ہے۔

میز پر مُکّا مار کر وہ پھنکار اُٹھتی:

"عورت مجسّم طاقت ہے۔ اس نے خدا تک کو چکما دے دیا۔ کیا یہ سچ نہیں ہے۔ حوّا نہ ہوتی تو ہمارے لیے جہنّم کیوں بنائی جاتی۔ ٹھیک ہے یا نہیں؟"

عورت کی طاقت کا ذکر آتے ہی اس کی زبان قینچی کی طرح چلنے لگتی۔ گویا وہ کسی کو یہ سنا کر مرعوب کرنا چاہتی ہے۔ مجھے اس کا وہ جُملہ خوب یاد ہے: "حوّا نے اللہ تک کو جُل دیا"

ہمارے احاطے سے لگی ہوئی ایک شاندار عمارت تھی جس میں آٹھ فلیٹ تھے۔ چار میں فوجی افسر رہتے تھے اور پانچویں میں چھاؤنی کا پادری۔ احاطے میں افسروں کے خادموں اور اردلیوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی اور انھیں لبھانے کے لیے دھوبنیں اور نوکرانیاں چونچلے دکھایا کرتی تھیں۔ باورچی خانوں میں رومان کا سیلاب اُمنڈ پڑا تھا جس میں مارپیٹ گالی گلوج اور ہائے پُکار کے بھنور پڑ رہے تھے۔ سپاہی کبھی آپس میں اور کبھی مالک مکان کے نوکروں سے لڑتے اور عورتوں کو پیٹا کرتے تھے۔

اگر گُناہ بھی کوئی چیز ہے تو ہمارے احاطے کو "گُناہ آباد" کہنا چاہیے۔ ہٹے کٹے لونڈوں کی سرکش خواہشات یہاں اُس وحشیانہ شکل میں ظاہر

ہوتی تھیں جسے لوگ بداخلاقی سے تعبیر کرتے ہیں۔ انسانیت سوز شہوت پرستی جاہلانہ ستم پروری اور بیہودہ لاف زنی — یہ اس زندگی کے عناصر تھے اور میرے مخدومِ طعام کی ہر مجلس میں اس پر خوب خوب نقد و تبصرہ فرمایا کرتے۔ اس پیرزال کو محلے کی رتی رتی خبر رہتی اور دوسروں کے مصائب کا ذکر کرتے وقت وہ خوشی سے نہال ہوجاتی تھی۔ جوان عورت اِن قصّوں کو سُن کر ہونٹوں ہونٹوں میں مسکرایا کرتی تھی۔ ہنسی کے مارے وکٹر کا بُرا حال ہوجاتا لیکن مالک ناک بھوں چڑھاکر کہتا:

"بس بھی کرو اماں!"

بڈھی جھک کر جواب دیتی: "ای ہی! تو کیا میں زبان سی لوں!"

اور وکٹر اسے برابر شہ دیتا رہتا:

"نہیں اماں، تمھیں کون منع کررہا ہے؟ آخر اپنے گھر میں بھی کسی کی زبان بندی ہوتی ہے؟"

آج تک میری سمجھ میں نہ آیا کہ گھر والوں کے آگے بھی بیہودہ سرائی کا کسی کو کیا حق ہے۔

بڑا بیٹا اپنی ماں پر ترس بھی کھاتا تھا اور اس پر کڑھتا بھی تھا۔ اُس کے ساتھ تنہائی میں بیٹھتے وہ بہت گھبراتا تھا کیونکہ ایسے موقعوں پر بڑھیا اپنی بہو کے خلاف شکایتوں کا دفتر کھول دیتی اور پھر روپیہ بھی طلب کر بیٹھتی۔ وہ جلدی سے ایک آدھ روپیہ یا چونی اٹھنّی اسے تھماکر کہتا:

"اماں، تمھاری خاطر میں ہاتھ نہیں روکتا لیکن یہ کوئی اچھی بات نہیں۔"

"لیکن مجھے تو فقیروں کے لیے دام چاہئیں، گرجا گھر میں موم بتی

بھی جلاتی ہی۔"

"خیر، یہ سب تو تمھاری باتیں ہیں۔ تم وکٹر کا ستیا ناس کررہی ہو۔"

"ارے تجھے اپنے سگے بھائی کی چاہ نہیں۔ اس سے بڑا گناہ کیا ہوسکتا ہی۔"

ایسے موقعوں پر وہ اسے سو سلام کرکے وہاں سے فوراً جمپت ہوجاتا تھا۔ اپنی ماں سے وکٹر اجڈپن اور بیہودگی سے پیش آتا۔ وہ بلا کا لالچی اور پیٹو تھا۔ اتوار کو بڑی بی کیک بنایا کرتی اور ان میں سے کچھ ہمیشہ ایک مرتبان میں چھپاکر میرے پلنگ کے نیچے اٹھا رکھتی۔ کھا پی کر وکٹر ان کیکوں کا جائزہ لیتا اور بگڑکر کہتا؛

"بڈھی ڈھڈو، کہیں کی! تھوڑے اور بنالیتی تو کیا ہاتھ ٹوٹ جاتے؟"

"جلدی سے کھالے ورنہ کوئی دیکھ لے گا۔"

"میں سب سے کہ دوں گا کہ تم کس طرح کیک چرایا کرتی ہو۔"

ایک روز مرتبان کھول کر میں نے دو کیک چٹ کردیے جس کے بدلے وکٹر میری جان لیتے لیتے رہ گیا۔ وہ مجھ سے اتنی ہی نفرت کرتا تھا جتنی میں اس سے۔ وہ ہمیشہ مجھے چھیڑا کرتا اور دن میں تین بار اپنے جوتے مجھ سے صاف کراتا۔ جب میں برآمدے میں سوتا تو وہ دروازہ کھول کر میرے سر پر تھوکنے کی کوشش کرتا۔

ان لوگوں کی بول چال مجھے بالکل ناپسند تھی۔ نانا نانی کی دُھلی دُھلائی زبان سُننے کے بعد اب کسی قسم کی بیہودہ سرائی سُننے کی تاب مجھ میں نہ تھی۔ مثلاً "آب زمزم کا پانی" یا "چین گھگھو" کی ترکیبیں کس قدر احمقانہ تھیں۔

میں سوال کر بیٹھتا: کیا یہ کہنا جائز ہے؟" وہ سب منہ چڑھا کر کہتے:
"واہ اُستاد جی! کہیں کان کترانے کو جی نہیں چاہ رہا؟" لیکن
'کان کترنے' کا محاورہ بھی مجھے غلط معلوم ہوا۔ "کپڑا کترنا" تو صحیح ہے
لیکن 'کان کترنا' کہاں کی زبان ہے۔ اُنھوں نے بہتیرا ثابت کرنا چاہا کہ
کان بھی کترے جاسکتے ہیں لیکن مجھے قائل نہ کرسکے۔ اور میں نے فاتحانہ
شان سے کہا:

"میرے کانوں کا تو آپ بال بھی بیکا نہ کرسکے۔"

ہر طرف میں نے حیا سوزی، چرب زبانی اور بے رحمی کے نظارے
دیکھے۔ گو 'کنون' میں طوائفیں بھی تھیں اور چکلا گھر بھی، لیکن وہ اس مقام
سے ہزار درجہ بہتر تھا۔ کنون کی گندگی اور حیوانیت کی تہ میں ایک ایسی چیز تھی
جس سے اس روگ کا سبب سمجھ میں آسکتا تھا —— افلاس، فاقہ کشی اور مسلسل
محنت۔ لیکن یہاں کے لوگ اپھرے ہوئے کبوتروں کی طرح اینڈتے پھرتے
اور کام کی طرف سے نہ کسی کو پریشانی تھی نہ حیرانی۔ ایک قسم کی گھن لگا دینے
والی اور سڑاند پیدا کرنے والی تھکاوٹ ہر زن و مرد پر طاری تھی۔

میری زندگی یوں ہی کیا کم سخت تھی کہ نانی گاہے ادھر آئے اور
اسے سخت تر بنا جائے۔ وہ ملازموں کی سیڑھی سے ہوکر باورچی خانے
میں داخل ہوتی، مریم کی مورت کو سلام کرتی اور پھر اپنی چھوٹی بہن کے
آگے سر جھکاتی۔ اس کی یہ تسلیم گویا میرے دل میں نشتر سا چبھوتی۔

میری مالکن نہایت بے دلی اور لاپروائی سے نانی کے سلام کے
جواب میں کہتی: "اچھا، تم ہو بی اکولینا!"

"نانی اماں کی اس وقت کایا پلٹ سی ہو جاتی تھی۔ لبوں پر انکسار

کی مہر اور چہرے پر افسردگی کی پرچھائیں دروازے کے پاس کی نیچ پر وہ کمال عجز سے بیٹھ جاتی اور کسی مجرم کی سی خاموشی اختیار کر لیتی۔ بہن کی کسی بات کے جواب میں وہ کچھ کہتی تو اس کی آواز آہستہ اور نیازمندانہ ہوتی۔ یہ سب دیکھ کر میں انگاروں پر لوٹنے لگتا اور جھنجھلا کر کہتا :۔

"تم یہاں آتی کیوں ہو؟"

وہ محبت سے مجھے چمکار کر جواب دیتی :۔

"چپ بھی رہ۔ کیا تو اس مکان کا مالک ہے"

"اس لونڈے کی نہ پوچھو۔ اسے کتنا بھی پیٹو یا ڈانٹو۔ یہ دخل در معقولات سے باز نہیں آتا" یہ کہہ کر مالکن لعنت ملامت کا سلسلہ چھیڑ دیتی تھی۔

وہ بڑی حقارت سے اپنی بہن سے پوچھتی :

"تو یوں کہو کہ بھیک پر تمھارا گزارہ ہے"

"قسمت کا کھیل ہے"

"جہاں شرم و حیا نہ ہو، قسمت نگوڑی کیا کرے گی"

"آخر عیسٰی کو بھی گداگری کرنی پڑی تھی"

"یہ جاہلوں اور کافروں کا قول ہے اور تم بھی ایسی نادان ہو کہ ان پر ایمان لے آئیں! عیسٰی تو خدا کا بیٹا تھا۔ بھیک اس کی جوتی مانگتی! لکھا ہے کہ وہ مرنے والوں کے عذاب و ثواب کا حساب لینے کے لیے زمین پر اُترے گا اور بہنا یاد رکھو کہ تمھاری ہڈیاں گل سڑ جائیں پھر بھی تم اپنے کو اس دن چھپا نہ سکوگی۔ وہ تمھیں اور تمھارے میاں کو نخوت کی سزا دے رہا ہے۔ تم سے وہ میرا انتقام لے رہا ہے کیونکہ جب تم امیر تھیں

میں نے تمھارے آگے بیہودہ ہاتھ پھیلایا تھا ۔"

نانی نے بڑے ضبط سے جواب دیا: "میں نے سکت بھر تمھاری مدد کی اور جانتی ہوں کہ اللہ مجھے اس کا اجر دے گا ۔"

"ارے ایسا کون سا سونے کا کنگن پہنا دیا تھا۔ وہ بھی کوئی دینے میں دینا ہوا ۔"

نانی اپنی بہن کی بکواس سے تنگ آگئی۔ اس کے عاجزانہ لہجے کو سن کر میں دنگ رہ گیا کہ آخر نانی سے یہ کیسے برداشت ہوتا ہے۔ ان موقعوں پر اس کے تئیں میری محبت کافور ہو جاتی تھی ۔

ایسے میں اگر بہو کا آنا ہوتا تو وہ خوش دلی سے نانی کو سلام کر کے کہتی :

"آئیے گول کمرے میں۔ چلیے ، اُٹھیے بھی !"

مالک بڑے تپاک سے اسے ہاتھوں ہاتھ لیتا :۔

"یہ آئیں بی اکلینا ، سارے عاقلوں کی نانی ! بھلا کہو تو کیسی ہو اور میاں کشرین کا کیا حال ہے؟"

نانی باغ باغ ہو کر جواب دیتی :

"خدا رکھے ، کیا اب بھی تم صبح و شام کام میں جٹے رہتے ہو؟"

"اور کیا ۔ قیدیوں کی طرح جب دیکھو یہ چکی ہے اور میں ہوں ۔"

نانی اس سے مہر و محبت سے باتیں کرتی لیکن اس کا انداز اب بزرگانہ ہوتا ۔ کبھی کبھی مالک میری والدہ کا ذکر چھیڑ دیتا :

"وروراکی کیا پوچھو ! عورت کیا تھی ہیرو ئن تھی ۔"

اس کی بیوی نانی کو مخاطب کر کے کہتی :

"یاد ہے آپ کو وہ لبادہ جو میں نے مرنے والی کو دیا تھا۔ وہی جس کے سیاہ ریشم پر گوٹا کناری ٹکی ہوئی تھی۔"

"لو، بھلا میں کبھی بھول سکتی ہوں۔"

جب دونوں عورتیں ننھے بچّے کو دیکھنے چلی جاتیں اور میں میز سے میلی پیالیاں اٹھانے لگتا تو مالک مجھ سے کہتا:

"تمھاری نانی بہت ہی شریف خاتون ہے۔"

میرا دل یہ سُن کر لبریز احسان ہو جاتا۔ جب نانی کو میں تنہا پاتا تو دل کے درد کو چھپانا ناممکن ہو جاتا۔

"تم یہاں آتی کیوں ہو؟ کیا تم ان کے برتاؤ کو ——"

"او لیشا، میں سب کچھ دیکھ سکتی ہوں" یہ کہتے وقت اس کے پیارے چہرے پر میٹھی سی مسکراہٹ جگمگا اٹھتی اور میرا ضمیر بے چین سا ہو جاتا۔ میں بھی کتنا نادان تھا۔ نانی سب کچھ سمجھتی، سب کچھ دیکھ سکتی تھی۔ اس وقت میری روح پر جو کچھ گزر رہی تھی اسے بھی وہ تاڑ سکتی تھی۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر جب اسے اطمینان ہو جاتا کہ کوئی نہیں آرہا ہے تو مجھے گلے لگا کر بھرّائی ہوئی آواز میں کہتی:

"ارے ظالم، تو یہاں نہ ہوتا تو میں تھوکنے بھی نہ آتی۔ کیا یہ میرے کوئی ہوتے سوتے ہیں؟ تیرے نانا بیمار ہیں اور اُن کی تیمار داری کرتے کرتے میں تھک گئی ہوں۔ نہ کام کیا جاتا ہے، نہ پاس پیسے ہیں اُدھر میرے بیٹے میکائیل نے ساشا کو نکال دیا ہے۔ اب اس کے کھانے کپڑے کا بار مجھ پر ہے۔ ان لوگوں نے تیری تنخواہ چھ روبل ماہانہ طے کی تھی۔ تجھے یہاں چھ مہینے ہونے کو آئے لیکن شاید اب تک رُپی

کے نام کانی کوڑی بھی نہیں ملی "۔ پھر کان میں کہنے لگی:

" یہ لوگ شاکی ہیں کہ تو کہنا نہیں مانتا، انھیں تیری سرزنش کرنی ہوتی ہے۔ جو بھی ہو، میری جان، ابھی یہ جگہ نہ چھوڑنا۔ دو سال اور صبر کر، پھر تو مضبوط ہو جائے گا تو ہمت تو نہ ہارے گا؟"

میں نے نانی سے وعدہ کر لیا۔ بڑی مصیبت کا سامنا تھا یہ بھی کوئی زندگی تھی۔ کیسا تنگ و تاریک ماحول تھا۔ بس روپیوں کا جنجال تھا ورنہ میں ہمیشہ خواب کی سی حالت میں ہوتا تھا۔ کبھی بھاگ جانے کو جی چاہتا لیکن کم بخت، سردیاں شروع ہو چکی تھیں۔ راتوں کو برفانی طوفان آتے، ٹھنڈی ہوائیں مکانوں کے باہر سنسناتیں اور برگ و شجر پالے کی مار کھا کے جواب دے دیتے۔ ایسی حالت میں بھلا مجھے کہاں پناہ ملتی؟

مجھے باہر جانے کی اجازت نہ تھی۔ اور سچ یہ ہے کہ اس موسم میں باہر نکلنا قہر تھا۔ سرما کا چھوٹا سا دن گھر کے دھندوں میں پلک مارتے بیت جاتا۔ البتہ سنیچر اور اتوار کو مجھے گرجا گھر جانا ہی پڑتا تھا۔

کلیسا مجھے بہت مرغوب تھا۔ کسی تاریک اور خاموش گوشے میں کھڑے ہو کر شہ نشین کا نظارہ کرنے میں بڑا لطف آتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ وہ قندیل کی تیز تیز روشنی کی لہروں میں تیر رہا ہے۔ مورتوں کی پرچھائیں ہولے ہولے جھومنے لگتی۔ پادریوں کے مخملی لبادوں میں ہلکی سی سرسراہٹ ہوتی۔ قندیل کی شعاعیں سنہری مکھیوں کی طرح ہر طرف بکھر جاتیں اور عورتوں اور بچوں کے سروں پر گل تاجوں کا گمان ہوتا۔ جب باجا بجتا تو گرد و پیش کی ہر شے اس سے ہم آہنگ ہو جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ یہ کسی دیومالا کی دنیا ہے۔ کلیسا جھولے کی طرح تاریک فضائیں

جھومنے لگتا تھا۔

کبھی کبھی مجھے گمان ہوتا کہ کلیسا کسی جھیل کے اندر چھپا ہوا ہے اور اس کی زندگی سارے کائنات سے مختلف ہے۔ اکثر میں نیم خوابی کی حالت میں نغموں پر تال دیتے ہوئے جھومنے لگتا جیسے شہد سے چھتا بھرپور ہو، ویسے ہی نانی کی شاعری میرے دل و دماغ پر رچی ہوئی تھی۔

کلیسا میں میں دعائیں نہ مانگتا تھا۔ نانی کے خدا کی موجودگی میں نانا کے بگڑے دل خدا کی حمد و ثنا سے مجھے شرم آتی تھی۔ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ میری طرح اسے بھی اس قسم کی دعائیں ناپسند ہیں۔ محض اس وجہ سے کہ وہ سب کتابوں میں لکھی ہوئی تھیں۔ اور کوئی سبب نہیں کہ اگر یہ پڑھا لکھا ان سے واقف ہے تو اکیلا خدا ہی ان سے ناواقف ہو بس اسی لیے جب آئے دن کے جھگڑے ستاتے یا کوئی غم مجھے نڈھال کر دیتا تو میں اپنے لیے آپ دعائیں نظم کر لیا کرتا تھا۔ جب اپنی مصیبتوں کا خیال آتا تو الفاظ بلا تکلف ایک فریاد کی صورت میں مرتب ہو جاتے:

اللہ، میں ہوں کتنا دکھیا!
مجھ کو جھٹ پٹ بڑا بنا دے
جلدی یہ سب پاپ کٹا دے
جینا ہے دشوار۔ اللہ۔ جینا ہے جنجال!
یہ بڑھیا شیطان کی خالا
سر پر لیے کھڑی ہے بھالا
کیسی مصیبت سے ہے پالا
جینا ہے دشوار۔ اللہ۔ جینا ہے جنجال!

اب تک مجھے ان خود ساختہ دعاؤں میں سے کئی یاد ہیں بچپن کے رجحان زندگی پر ایک امٹ لکیر کھینچ جاتے ہیں اور اکثر اس پر گہرا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔

گرجا گھر میں میرا دل بہت لگتا تھا۔ ویسا ہی سکون ملتا جیسا جنگلوں یا کھیتوں میں۔ میرا ننھا سا دل جو غم آشنا اور اس بے معنی زندگی کی آلائش سے آلودہ ہو چکا تھا، یہاں آکر ایک دھندلے مگر رنگین خواب میں کھو جاتا۔ میں کلیسا صرف اس وقت جاتا جب ہر طرف برف باری ہوتی برفانی طوفان فضا میں رقص کرتے، ایسا معلوم ہوتا کہ آسمان بھی جم کر یخ ہو گیا ہے اور اس کے نیچے بادلوں کی بجائے برف کی چادریں لہرا رہی ہیں اور زمین یوں بے حرکت ہو جاتی گویا اب کبھی زندہ نہ ہو گی۔

جب راتیں خوشگوار ہوتیں تو مجھے شہر کی سڑکوں پر گشت کرنے میں لطف آتا تھا۔ میں تاریک اور سنسان گوشوں میں پھرا کرتا۔ کبھی یوں پھسلتا چلا جاتا گویا پر نکل آئے ہیں اور میں چاند کے ساتھ آکاش میں تیر رہا ہوں، میرا سایہ سامنے لرزتا چلتا، برف پر بچھی ہوئی روشنی کی کرنوں کو ڈھانکتے اور مضحکہ خیز طریقے سے لہراتے بل کھاتے ہوئے چوکیدار ہاتھ میں ڈنڈا لیے بھیڑ کی کھال پہنے ایک کتے کے ساتھ ساتھ گلی کوچوں کا چکر کاٹا کرتا۔ مکانوں سے آدمی نکل کر سڑکوں پر گم ہو جاتے اور کتا ان کے پیچھے لپک پڑتا۔ کبھی کبھی رنگیلی حسینوں کا جھرمٹ عاشقوں کی ٹولی کے ساتھ محوِ خرام ہوتا اور مجھے محسوس ہوتا کہ میری طرح یہ بھی کلیسا سے نکل کر آئی ہیں۔

کبھی کسی روشن دان سے ایک عجیب قسم کی مہک آتی جو کسی ایسی زندگی کا پتا دیتی جس سے میں ہنوز نا مانوس تھا۔ میں کھڑکی کے پاس

رُک کر اس مہک کو خوب سونگھتا اور سوچنے لگتا کہ اس مکان کے لوگ کس طرح رہتے سہتے ہیں۔ یہ نماز کا وقت تھا پھر بھی یہ سب رقص و سرود میں مصروف تھے۔ اندر ایک ستار بج رہا تھا جس کی میٹھی آواز روشن دان سے ہوکر باہر بکھر جاتی تھی۔

دو سنسان سڑکوں کے چھوٹے چھوٹے مکان مجھے خاص طور پر اپنی طرف متوجہ کرتے تھے۔ یاد آتا ہے کہ ایک تیوہار کے موقع پر چاندنی رات میں اِدھر سے گزرتے گزرتے ایک عجیب قسم کی آواز سُن کر میں ٹھہر گیا۔ یہ آواز بھاپ کی لہروں کے ساتھ روشن دان سے باہر آرہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی مُنہ بند کرکے زور سے گارہا ہے۔ بول تو سمجھ میں نہ آئے لیکن گانے کی دھن جانی پہچانی تھی۔ آواز ایسی پاٹ دار تھی کہ سنگت کا باجہ دب سا گیا تھا۔ میں سامنے کے پُل پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ یہ وایولن کیسا پرسوز نغمہ چھیڑ رہا ہے کہ کلیجے میں چبھن سی ہوتی ہے۔ کبھی سب مل کر ایسے اونچے سُروں میں گاتے کہ سارا گھر تھرا جاتا اور کھڑکیوں کے شیشے کانپنے لگتے۔ میری آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے اور چھت سے پانی کی بوندوں نے گر گر گویا ان کی اشک شوئی کی۔

اس دوران میں چوکیدار چپ چاپ میرے قریب آکر کھڑا ہوگیا تھا ایک دھکا دے کر بولا:

”یہاں کیوں بیٹھے ہو بھئی؟“

”گانا سُن رہا ہوں“

”سبحان اللہ! اب جاتا ہے یا نہیں!“

میں وہاں سے بھاگ کر کنوتیاں کاٹتے ہوئے پھر اس کھڑکی تلے

آکر کھڑا ہوگیا۔ لیکن اب گانا بند ہوچکا تھا اور دریچوں سے ہنسی مذاق کی آواز آرہی تھی اور وہ اُس غم انگیز نغمے سے اس قدر مختلف تھی کہ مجھے صدمہ سا ہوا۔ اب میں ہر سنیچر کی رات کو اس مکان کی طرف آتا لیکن صرف ایک بار بہار میں پھر وہ وایولن سُننا نصیب ہوا۔ آدھی رات تک وہ نوا سنج رہا اور جب میں اپنے گھر لوٹا تو میری خوب مرمت ہوئی۔

زمستانی آسمان کے سائے میں اس شب خرامی سے میں نے بہت کچھ پایا میں جان بوجھ کر آباد محلوں سے دور رہتا کیونکہ وہاں روشنی ہی روشنی تھی اور یہ اندیشہ کہ مالک کے دوست احباب مجھے دیکھ نہ پائیں۔ پھر تو اسے معلوم ہوجاتا کہ میں کلیسا سے فرار ہوجاتا ہوں۔ سنسان گلیوں میں نہ تو کوئی متوالا مجھے چھیڑتا نہ کوئی بیسوا یا پولیس والا۔ اگر کھڑکیوں پر برف نہ جمی ہوتی اور پردے نہ چڑھے ہوتے تو میں نیچے کے کمروں کا تماشا بھی دیکھ سکتا تھا۔

ان میں بھانت بھانت کی عورتیں نظر آتی تھیں، کوئی دعا مانگ رہا ہے، کوئی بوسے لے رہا ہے، کہیں جھگڑا ہو رہا ہے تو کہیں تاش کا کھیل۔ غرض کہ ایک گندی ہوئی دنیا کی جیتی جاگتی تصویر یہاں دیکھنے میں آتی تھی۔

ایک کمرے میں کیا دیکھتا ہوں کہ دو عورتیں — ایک کی چڑھتی جوانی دوسری کی اُترتی جوانی، کرسیوں پر بیٹھی ہیں۔ ان کے سامنے اسکول کا ایک لڑکا بیٹھا کچھ پڑھ رہا ہے۔ چھوٹی بھوں تانے غور سے سُن رہی ہے۔ اتنے میں بڑی یک بیک چہرے کو ہاتھ سے چھپا کر زار و قطار رونے لگی اور اس کے شانے فرطِ جذبات سے کانپنے لگے۔ لڑکے نے کتاب پھینک دی اور جب چھوٹی جھک کر باہر چلی گئی تو وہ اُس کالی زلفوں والی حسینہ کے آگے دو زانو بیٹھ گیا اور اس کے ہاتھوں کو پ

در پے بوسے دینے لگا۔

ایک دوسری کھڑکی سے جھانک کر دیکھا کہ کسی اونچے پورے ڈھیل مرد نے ایک سرخ پوش عورت کو اپنے گھٹنوں پر بٹھا رکھا ہے۔ وہ اسے یوں جھلا رہا تھا جیسے وہ کوئی بچّی ہو۔ وہ کچھ گا بھی رہا تھا کیونکہ اس کا منہ کبھی کھلتا کبھی بند ہوتا اور دیدے گویا پھٹے پڑتے تھے۔ عورت ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہوئی جاتی تھی اور اس کی ٹانگیں ہوا میں ناچ رہی تھیں۔ مرد نے اسے ٹھیک سے بٹھا کر پھر گانا شروع کیا اور عورت دوبارہ کھلکھلا کر ہنس پڑی دیر تک میں یہ تماشا دیکھتا رہا اور صرف اس وقت ٹلا جب یہ محسوس ہوا کہ شاید رات بھر یہ لوگ یہی ناٹک کرتے رہیں گے۔

ایسے بہت سے نظارے دیکھنے میں آئے اور ان میں سے کئی مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے۔ اکثر میں ان میں اس طرح کھو جاتا کہ رات گئے گھر لوٹنے کی سدھ آتی۔ میرے آقا اس رویّے سے بھڑک گئے اور کرید کرید کر پوچھنے لگے:

"بتاؤ تو سہی تم کس گرجا کو گئے تھے اور کون پادری نماز پڑھا رہا تھا؟"

وہ لوگ شہر کے سب پادریوں کو جانتے تھے۔ انھیں تو یہ بھی معلوم ہو جاتا تھا کہ فلاں روز کون سی حکایت بیان کی جائے گی۔ اس مضمون کے یہ لوگ ماہر تھے اور آسانی سے میری اُڑان گھائیوں کو پکڑ سکتے تھے۔

میرے نانا کا خدائے قہار ان دونوں عورتوں کا بھی معبود تھا۔ اس کا نام سدا ان کے وردِ زبان ہوتا اور لڑتے جھگڑتے وقت وہ ایک دوسرے کو دھمکاتیں:

"ذرا ٹھہر تو سہی، پھر دیکھنا خدا تجھے اس کی کیا سزا دیتا ہے۔ تیرا

ستیاناس نہ کردے تو میرا نام بدل دینا !"

عیسوی رمضان کے مہینے میں ایک اتوار کو بڑھیا نے ملائی کے سموسے بنانے کی کوشش کی لیکن سب کے سب جل گئے۔ آگ کی لپٹ سے بوکھلا کر وہ چلا پڑی: "خدا تجھے غارت کرے!" اتنے میں کڑاہی کی بو کو سونگھ کر اس کا چہرا تمتما اُٹھا اور اسے زمین پر پٹک کر وہ چیخ کر بولی: "ارے اس میں گوشت کس نے تلا! یہ برتن تو ناپاک ہے۔ ابھی اسی دن تو میں نے صاف کیا تھا۔"

گھٹنوں کے بل گر کر وہ گڑگڑانے اور بسورنے لگی:-

"خدا، مجھ پاپن کو معاف کر! اپنی رحمت کے صدقے میرے گناہوں سے درگزر کر! ایک نادان بڑھیا پر ستم نہ توڑ۔"

جلے ہوئے سموسے کُتے کی نذر ہوئے۔ برتن پھینک دیا گیا۔ لیکن بہو ساس کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑ گئی۔

"یہ کیا غضب کیا کہ رمضان کی نیاز گوشت کے برتن میں تیار کرنے چلیں۔"

وہ اپنے خدا کو ہر معمولی سے معمولی معاملے میں گھسیٹے پھرتی تھیں وہ بیچارہ ان کی بے کار اور بے معنی زندگی کے ہر قضیے میں دخل دینے پر مجبور تھا۔ اس طرح اِن کے ٹچے پن پر جھوٹے بڑپن کا ملمع ہوگیا تھا گویا وہ ہر کام اپنے معبود کی خاطر کرتی ہیں۔ اس بے رنگ خلا میں خدا کی موجودگی میرے لیے ہراس کا باعث تھی۔ میں بلا ارادہ کونے کھدروں میں جنات کے وجود کو محسوس کرنے لگا اور رات کو تو ڈر کے مارے جان نکل جاتی یہ خوف اس گوشے سے ہویدا ہوتا جہاں ایک چراغ شب و روز روشن

رہتا تھا۔

شہ نشین کے برابر ایک بڑی سی کھڑکی تھی۔ ناپیدا کنار نیل گوں فضا کھڑکی کے اندر جھانکا کرتی اور اگر کوئی وہاں تیز سی جنبش کرتا تو ہر شے اس نیلے سمندر میں غوطہ لگا کر چپ چاپ گویا ستاروں کی طرف اُڑ جاتی تھی۔ وہاں جہاں موت کا سا سکون تھا۔ اسی طرح جیسے کوئی سنگ ریزہ پانی میں ڈوب جائے اور کوئی صدمہ نہ دے۔

معلوم نہیں اس ہول سے مجھے کیسے نجات ملی۔ بہر حال بہت جلدی یہ سودا میرے سر سے اُتر گیا۔ نانی کے نیک دل خدانے مجھے سہارا دیا۔ بس اسی زمانے میں مجھ پر یہ حقیقت عیاں ہوئی کہ خواہ مخواہ کوئی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور جب تک مجھ سے گناہ سرزد نہ ہو مجھے سزا نہیں مل سکتی۔ یہ قانون زندگی نہیں کہ بے گناہوں کو تکلیف پہنچے اور دوسروں کے کرتوتوں کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہو۔

اتوار کو بھی میں گرجا گھر سے فرار ہونے لگا۔ خصوصاً بہار کے دنوں میں جن کے اذن پر لبیک نہ کہنا میرے لیے ناممکن تھا اور اگر مجھے خیرات کے لیے دونی ملی تو سمجھیے کہ میری شامت آگئی۔ پانسے خرید کر نماز کے دوران میں میں برابر کھیلا کرتا اور لامحالہ دیر سے گھر پہنچتا۔ ایک روز جب میں فاتحہ اور خیرات کا سارا سرمایہ یوں ضائع کر چکا تھا تو پادری کشکول کو گردش دیتے ہوئے سامنے سے گزرا اور میں نے بڑی پھرتی سے اس میں سے دونی اُڑالی۔

جُوا کھیلنے کا مجھے بڑا شوق تھا بلکہ اس پر میری جان جاتی تھی پھرتی اور چُستی کی مجھ میں کمی نہ تھی اور تھوڑے ہی عرصے میں سارے محلے میں

میری دھاک بیٹھ گئی۔

اب مجھے عشائے ربّانی میں شرکت کا حکم ہُوا اور اعتراف گناہ کی رسم ادا کرنے کے لیے میں پڑوس کے پادری پوکروسکی کی خدمت میں پہنچا۔ میرا خیال تھا کہ یہ بڑا سخت آدمی ہوگا اور پھر میں نے اسے ستانے میں کوئی کسر بھی نہ چھوڑی تھی۔ اس کے باغ کی بارہ دری میں، میں نے سنگ باری کی تھی اور اس کے بچّوں سے میری کشتی بھی ہو چکی تھی۔ اگر پادری کو یاد آگیا تو ایسے ایسے بیسیوں گناہ مجھ سے سرزد ہو چکے تھے مجھے اس کا دھڑکا لگا ہوا تھا اور کلیسا میں اپنی باری کا انتظار کرتے وقت میرا دل ہراس سے بیٹھا جا رہا تھا۔

لیکن پادری نے کُشادہ پیشانی سے میرا خیر مقدم کیا:۔

"اوہو، یہ تو میرا پڑوسی ہے! اچھا گھٹنوں کے بل بیٹھو اور بتلاؤ کہ تم نے کون کون سے گناہ کیے ہیں؟"

میرے سر کو اس نے ایک مخملی کپڑے سے ڈھک دیا اور اگر اور موم کی بو سے میرا دم گھٹنے لگا۔ نہ تو منہ سے آواز نکلتی تھی اور نہ کچھ بولنے کو جی چاہتا تھا۔

"اپنے بزرگوں کی فرماں برداری تم نے ہمیشہ کی یا نہیں؟"

"جی نہیں۔"

"تو کہو کہ مجھ سے گناہ ہوا۔"

جانے کیسے میں آپ ہی آپ کہہ اٹھا:

"میں نے چوری بھی کی تھی۔"

پادری نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا: "کیسے اور کہاں؟"

میں نے تین گرجا گھروں کے نام گنائے۔

"بچے، یہ تو بُری بات ہے۔ سمجھے؟"

"جی ہاں سمجھ گیا۔"

"تو کہو کہ میں نے گناہ کیا۔ تم نے چوری کیوں کی؟ کیا بھوکے تھے؟"

"کبھی تو روٹیوں کے لیے اور کبھی اس لیے کہ میں گھر کے پیسے ہار گیا تھا اور نیاز کی روٹی گھر لے جانا ضروری تھا۔"

پادری زیر لب بڑبڑاتا رہا اور پھر اِدھر اُدھر کی باتیں پوچھ کر یک بیک زور سے گرج پڑا۔

"کبھی کوئی ممنوعہ کتاب تو نہیں پڑھی؟"

یہ سوال میری سمجھ میں نہ آیا اور میں نے پوچھا:

"کیسی کتابیں؟"

"جن کا پڑھنا منع ہے۔ کوئی پڑھی تھی؟"

"میں نے تو نام بھی نہیں سُنا۔"

"اچھا، تو تیرے سب گناہ بخش دیے گئے۔ کھڑا ہو جا۔"

میں اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا، اس کے چہرے سے نرمی اور مہربانی عیاں تھی۔ لیکن میرا ضمیر بے چین سا ہو گیا۔ یہ رسم ادا کرنے کے لیے بھیجتے وقت میرے آقاؤں نے مجھے خوف سے سراسیمہ کر دیا تھا اور میرے ذہن میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ چھوٹے سے چھوٹے گناہ کو بھی نہ چھپانا۔

"پادری صاحب! میں نے آپ کے باغ میں پتھر بھی پھینکے تھے۔"

اس نے سر اُٹھاکر میرے پرے کسی چیز کو گھورا اور کہا:
"بہت بُرا کیا۔ اچھا اب چلتے بنو!"
"آپ کے کتے کو میں نے پیٹا تھا۔"

پادری نے جواب میں صرف اتنا کہا: "اب کس کی باری ہے!"

وہاں سے لوٹتے وقت ایسا معلوم ہُوا گویا مجھے دھوکا دیا گیا ہے۔ اعتراف گناہ کی رسم کا نام لے کر مجھے کتنا ڈرایا گیا تھا۔ لیکن درحقیقت یہ کس قدر غیر دلچسپ تھی۔ ممنوعہ کتابوں کا ذکر البتہ دلچسپ تھا۔ لیکن اس کے متعلق میں کچھ نہ جانتا تھا۔ اب مجھے اس اسکول کے لڑکے کا خیال آیا جو دو عورتوں کو کتاب پڑھ کر سنا رہا تھا۔ "دراصل صاحب+" کی بھی یاد آئی جن کے پاس موٹی موٹی کتابوں کا انبار تھا اور ان میں عجیب و غریب تصویریں تھیں۔

دوسرے دن مجھے چھٹی ملی اور عشائے ربانی میں شرکت کا حکم ہُوا! اب کے ایسٹر آتے آتے موسم ڈھل چکا تھا۔ برف عرصہ پہلے پگھل چکی تھی۔ سڑکیں سنسان تھیں اور گرد کے بادل چھا رہے تھے۔ دن سہانا تھا۔ کلیسا کے پاس چند مزدور پانسا کھیل رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ نماز میں دیر ہے۔ لگے ہاتھوں زرا کھیل لوں۔

"کیوں بھئی، مجھے بھی کھیلنے دوگے؟"

ایک چیچک رو لال بندر نے اکڑ کر کہا: "پہلے نقل کا ایک پیسہ رکھو" میں نے بھی گھمنڈ سے جواب دیا: "لو میں جھی پر تین پیسے لگاتا ہوں"۔ چونی بھنا کر میں نے تین پیسے کی بازی لگا دی۔ قسمت نے یاری

+ جلد اول - میرا بچپن۔

کی، میں پہلے دانوں میں چھ پیسے جیت گیا۔ اب تو میں پھول کر کپّا ہو گیا۔ اتنے میں ایک کھلاڑی بولا: "اس لونڈے پر نظر رکھنا ورنہ یہ جیت کر چلتا ہو جائے گا۔"

یہ سُن کر مجھے جوش آگیا اور سینہ ٹھونک کر میں نے کہا:۔ "چار پر دونّی! لیکن میرے بڑبول کا کسی پر اثر نہ ہوا۔ البتہ ایک لڑکا چلّایا "میں اس شیطان کے بچّے کو خوب جانتا ہوں یہ قسمت کا بڑا دھنی ہے"۔

ایک دُبلا پتلا مستری، جس کے جسم سے پوستین کی بو آتی تھی، ناک بھوں چڑھا کر بولا:۔ "یہ شیطان کا بچہ ہے؟ ایں — خوب —"

پانچ کا پانسا پھینک کر اور میری دونّی کو انٹی میں دبا کر وہ کھلکھلایا: "کیوں بیٹا کیا حال ہے؟"

"سات پر اکنّی"

اس اُلٹ پھیر میں میری جیت ہار ہوتی رہی۔ لیکن جب میری باری آئی تو میں نے ساری جمع پونجی کی بازی لگا دی اور ہار گیا، اسی وقت عشائے ربانی ختم ہو گئی۔ گھنٹے بجنے لگے اور کلیسا میں سے لوگ نکلنے لگے۔

سمور فروش نے میرے کان کھینچنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا: "تو بیاہا ہے یا بن بیاہا"۔ میں اس کے ہاتھ نہ آیا اور اپنے ایک ہم عمر سے جو اتوار کے کپڑے پہنے ہوئے تھا، دریافت کیا:

"کیوں بھئی، تم عشائے ربانی میں شریک ہوئے تھے؟"

"قیاس تو یہی کہتا ہے، تمھیں اس سے مطلب؟" اس لونڈے نے حقارت سے مجھے گھورا۔

میں نے سادہ لوحی سے کہا: اس تقریب میں کون سی رسمیں ادا ہوتی ہیں پادری کیا منتر جپتا ہے اور اس کا نام کیا تھا، یہ سب مجھے بتا دو۔"

اس کم بخت نے مجھے دھکا دیا اور گلا پھاڑ کر بولا:۔

"ابے کافر، تو کلیسا کا بھگوڑا ہے۔ میں تجھے کچھ نہ بتاؤں گا۔ گھر پر تیری کُندی ہو تو مزا آئے۔"

گھر لوٹتے وقت مجھے یقین تھا کہ مجھ سے جرح ہوگی اور بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ لیکن مجھے دعا دے کر بڑھیا نے فقط اتنا پوچھا۔"

"پادری کو کتنے پیسے دیے؟"

میں نے تڑ سے جواب دیا: "پانچ پیسے۔"

"تین اس نے اپنے حصّے کے لیے ہوں گے۔ پھر بھی تو دو نی اُڑا گیا، کیوں بے نامعقول۔"

یہ بہار کا شباب تھا۔ ہر سال بسنت ایک نئے برن میں آتی اور مجھے پہلے سے زیادہ دلارام معلوم ہوتی۔ نئی گھاس اور پیڑوں کی کچّی چھال سے عجب مستانہ سی خوشبو آتی۔ دل بے اختیار چاہتا کہ کھیتوں میں نکل جاؤں اور زمین پر لوٹتے ہوئے پرندوں کے زمزمے سنوں۔ لیکن مجھے تو سردیوں کے کپڑے جھاڑ پونچھ کر صندوقوں میں بند کرنے تھے۔ پھر تمباکو کے پتّے کاٹنا، جھاڑو دینا اور صبح سے شام تک ایسی خدمات انجام دینی تھیں جو میرے لیے وبال تھیں۔

سمجھ میں نہ آتا کہ چھٹّی کے اوقات کس طرح گزاروں۔ اس محلّے میں دلچسپی کا کوئی سامان نہ تھا اور اس کی سرحد سے باہر جانے کی اجازت مجھے نہ تھی۔ ہمارے احاطے میں تھکے ہارے مزدوروں

گندے باورچیوں اور دھوبنوں کی بھیڑ رہتی تھی اور ہر شام کو ایسے گھنونے تماشے دیکھنے میں آتے کہ جی چاہتا میں اندھا ہو جاؤں۔

غلام گردش میں بیٹھ کر میں قینچی سے رنگین کاغذ کاٹ کاٹ کر اس کے پھول بناتا اور انھیں شہتیروں پر چپکا کر مجھے ذرا سی خوشی ہوتی۔ دل کہتا کہ کسی ایسی جگہ چلیے جہاں لوگ کم سوتے ہوں، کم جھگڑتے ہوں، دن رات اللہ میاں سے شکوہ شکایت نہ کرتے ہوں، اور دوسروں کے عیوب پر اتنی دُرشتی سے نکتہ چینی نہ کرتے ہوں۔

ایسٹر کے بعد والے سنیچر کو ایک مشہور خانقاہ سے مریم کا بُت ہمارے شہر مہمان آیا۔ اور دو ہفتے کلیسا میں بیٹھ کر نمازیوں کی بخشش کا اعلان کرتا رہا۔ ایک روز یہ بت ہمارے گھر بھی آ دھمکا میں باورچی خانے میں برتن دھو رہا تھا کہ بہو نے فرط وجدان سے چیخ کر کہا:۔

"بڑا دروازہ کھول دے۔ خانقاہ کا شہ نشین ہمارے یہاں لایا جا رہا ہے"

میں اس وقت غلاظت کی پوٹ بنا ہوا تھا۔ پھر بھی نیچے لپکا اور دروازہ کھول دیا۔ ایک نوجوان جس کے داہنے ہاتھ میں شمع دان اور بائیں میں اگر دان بولا:۔

"کیا اس گھر کے سب لوگ سو رہے ہیں؟ لو ہاتھ لگاؤ"

دو آدمی وزنی شہ نشین کو سیڑھی پر گھسیٹنے لگے میں نے اس کا ایک سرا اپنے گندے ہاتھوں اور کندھوں پر لے لیا۔ ایک راہب میرے پیچھے پیچھے خوابیدہ آواز میں بھجن گانے لگا:۔

"پربھو عیسیٰ مسیح، میرے پران کے بچیّا!"

مجھے دل ہی دل میں کوفت ہونے لگی: "خدا کی ماں مجھ سے ناراض ہے۔ کیونکہ میں نے ناپاک ہاتھوں سے بت کو چھوا ہے۔ ممکن ہے وہ میرے ہاتھوں کو مفلوج کر دے۔"

ایک کمرے کے کونے میں شہ نشین دو کرسیوں پر صاف چادر بچھا کر رکھ دیا گیا۔ اور اس کے آزو بازو دو راہب جو فرشتوں کی طرح گبرو جوان تھے۔ تن کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے بال گھونگھر والے آنکھیں کٹیلی اور ہونٹ رسیلے تھے۔

دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھ گئے۔

"اے آسمانی ماں"، بڑے پادری نے یہ ترانہ چھیڑا اور تمام وقت اپنے کان کی لو کو تلاش کرتا رہا جو اس کے بڑے بڑے بالوں میں گم ہو گئی تھی۔

راہب بھی مری ہوئی آواز میں گانے لگے: "خدا کی ماں تو ہمیں بخش دے!"

مریم مجھے جی جان سے پسند تھی۔ نانی کا بیان تھا کہ انسانیت کی راحت کے لیے مریم نے دنیا میں پھول پودے اُگائے اور حسن و عشق کو پیدا کیا جب بت کو سلام کرنے کا وقت آیا تو یہ دیکھے بغیر کہ بڑے کیا کر رہے ہیں، میں نے بُت کے ہونٹوں اور گال کو چوم لیا۔ اس کے بعد ہی دو آہنی ہاتھوں نے مجھے کمرے سے نکال باہر کیا۔ یہ یاد نہیں کہ راہب اور پادری کب دفان ہوئے۔ ہاں یہ خوب یاد ہے کہ سب گھر والے فرش پر مجھے گھیر کر بیٹھ گئے اور سخت پریشانی اور حیرانی کے عالم میں مجھ پر نازل ہونے والی مصیبتوں کا ذکر کرنے لگے۔

مالک نے نرمی سے مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا: "پادری سے کہ کر اس کی تربیت کا انتظام کرانا چاہیے۔"

"کندۂ ناتراش! کیا تجھے یہ نہ معلوم تھا کہ ہونٹوں کو نہ چومنا چاہیے؟ ارے، تجھے اسکول میں یہ بھی نہ بتلایا گیا؟"

کئی دن تک میں دھڑکتے ہوئے دل سے سوچتا رہا کہ دیکھوں اب کیا حشر ہوتا ہی۔ میں نے شہ نشین کو گندے ہاتھوں سے چھو دیا تھا، غلط طریقے سے اس کی تعظیم کی تھی۔ پھر مجھے اس کی سزا ملنا لازمی ہی۔ لیکن خدا کی ماں نے میرے نادانستہ گناہ کو — جس کی ترغیب محبت کے جذبے نے کی تھی — معاف کردیا۔ یا اس کی سزا ایسی معمولی تھی کہ ان خدا کے بندوں کی مار دھاڑ میں مجھے اس کا علم بھی نہ ہوا۔

کبھی کبھی بڑھیا کو جلانے کے لیے میں یاد دلاتا:-

"معلوم ہوتا ہی کہ مریم میرا گناہ بھول گئی۔" بڑھیا تلملا کر کہتی :-

"زرا ٹھہر جا، پھر پتا چلے گا۔"

شہتیروں کو رنگین کاغذ، پنّی یا پھول پتّی سے آراستہ کرتے ہوئے میں جو جی میں آتا گایا کرتا۔ البتہ اسے کلیسا کی حمد کی دُھن میں ضرور ڈھال لیتا:

کوٹھری میں بیٹھا ہوں میں — قینچی ہی ایک ہاتھ میں
جب دیکھو تب کاغذ کاٹوں — جان ہی بس ناک میں
گر کُتّا میں بن جاتا — تو جنگل جنگل پھرتا
لیکن ان سب کو دیکھو — گھر باندھ مجھے بٹھلایا
باہر گر اُٹھ کر جاؤں — تو مار دھاڑ میں کھاؤں

بڑھیا کی نگاہ جو اس آرائش پر پڑی تو وہ بھی ہنس پڑی :-
" باورچی خانے کو بھی اسی طرح سجا دے "
ایک دن مالک بھی میری کارگزاری دیکھنے آیا اور بولا : " تو بھی عجیب لڑکا ہے ، شگوف ! خدا جانے تو بڑا ہو کر مداری بنے گا یا جادوگر - میری تو عقل کام نہیں کرتی " یہ کہہ کر اس نے مجھے انعام میں ایک بڑی دوّنی دی -
اپنے شاہکاروں کے بیچ میں میں نے اس دوّنی کو ایک تار سے باندھ کر لٹکا دیا - کچھ دنوں بعد وہ غایب ہو گئی - ہو نہ ہو یہ اس بڑھیا کی کارستانی تھی -

---

باب (۵)

بہار کا جادو چل ہی گیا اور میں گھر سے بھاگ نکلا۔ ایک روز صبح سویرے میں نان بائی کے یہاں روٹی لینے گیا۔ وہ اپنی بیوی سے جھگڑ رہا تھا اور آنکھوں دیکھتے اس نے بیچاری کے سر پر ایک ادھ سیرا پٹک دیا۔ وہ باہر بھاگی اور سڑک پر گر پڑی۔ ہر طرف سے لوگ دوڑ پڑے۔ عورت کو ڈنڈا ڈولی کر کے گاڑی میں رکھا اور یہ جلوس اسپتال چلا۔ میں بھی بے دیکھے بھالے اس کے ساتھ ہو لیا اور نادانستہ دریائے وولگا کے کنارے جا پہنچا۔ اس وقت میرے ہاتھ میں دو رُبل تھے۔

بہار کا آفتاب محبت کا نور برسا رہا تھا۔ وولگا موج در موج سامنے رواں تھی اور دُنیا میں جان سی آگئی تھی۔ اور مجھے دیکھو کہ اب تک کنویں کے مینڈک کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس لیے میں نے تہیہ کر لیا کہ نہ تو آقا کے یہاں جاؤں گا اور نہ 'کنون'۔ وعدہ خلافی کے ڈر سے نانی کے پاس جاتے جھجک ہوتی تھی۔ پھر نانا کے طعن وطنز کا بھی ڈر تھا۔

دو تین دن تو میں ندی کنارے چہل قدمی کرتا رہا۔ نیک دل قلی مجھے روٹی اور اپنے سائبان میں سونے کے لیے جگہ دے دیتے۔ آخر کار ان میں سے ایک نے مجھ سے کہا:

"لڑکے، یوں ٹابک ٹوئیاں مارنے سے کیا حاصل؟ نیکی، نامی اگن بوٹ میں جا۔ وہاں ایک مشعلچی کی ضرورت ہے"۔

لم ترنگ اسٹیورڈ سیاہ ریشم کی کلاہ پہنے ہوئے تھا عینک

کے اندر سے مجھے گھور کر بولا:۔

"دو روبل مہینہ ملے گا۔ کہاں ہے تمھارا پاسپورٹ!"

میرے پاس پاسپورٹ کہاں سے آیا۔ اسٹیورڈ نے سوچ کر کہا:۔ "اپنی ماں کو بلا لاؤ"

میں نانی کے پاس دوڑا گیا۔ اسے میری تجویز پسند آئی اور کہ سُن کر نانا کو میرے پاسپورٹ کے انتظام کے لیے بھیجا۔

اسٹیورڈ نے ہمارا جایزہ لے کر کہا: "ٹھیک ہے، آؤ میرے ساتھ"

وہ مجھے بوٹ کے اندر لے گیا۔ جہاں ایک دیو قامت خانساماں سفید ٹوپی اور سفید اپرن میں ملبوس فروکش تھا۔ اس وقت وہ بیک وقت سگار اور چائے پی رہا تھا۔ اسٹیورڈ نے اس کے حضور میں مجھے پیش کر کے کہا: "مشغلچی!"

وہ تو چلتا بنا اور خانساماں اپنی کالی موچھوں کو نچا کر غرّانے لگا:

"سستے داموں کوئی بھتنا بھی ملے تو یہ لوگ نوکر رکھ لیں"

غصّے سے اپنے پٹّی دار بالوں کو جنبش دے کر اس نے ٹانگیں پھیلائیں اور اپنی کالی کالی آنکھوں کو پھاڑ کر چلاّیا:۔

"تم کون ہو جی؟"

یہ آدمی مجھے ایک آنکھ پسند نہ آیا۔ سفید پوشی کے باوجود اس کی گندگی زبانِ حال سے شکوہ سنج تھی۔ اس کی اُنگلیوں اور کان سے بال گھاس پات کی طرح اُگ آئے تھے۔

جواب میں میں نے بس اتنا کہا: "میں بھوکا ہوں"

یہ سنتے ہی اس کا غصّہ مسکراہٹ میں تبدیل ہوگیا - اس کے موٹے موٹے گال کنپٹیوں تک پھیل گئے۔ بڑے بڑے دانت کھُل گئے۔ مونچھیں نیچے لڑھک پڑیں اور یک بیک وہ کسی ماںتا کی ماری موٹی تازی ماں کی صورت میں نظر آنے لگا۔

اپنی پیالی صاف کر کے اس میں اس نے میرے لیے چائے بنائی۔ روٹی اور قیمے کا برتن میری طرف بڑھا کر بولا:

"سب چٹ کرجا۔ تیرے ماں باپ تو زندہ ہیں؛ تو چوری کر سکتا ہے یا نہیں؟ کوئی مضایقہ نہیں کیونکہ یہاں سب چور ہی چور ہیں۔ تجھے خود ہی معلوم ہوجائے گا۔"

وہ بات کیا کرتا تھا، بھونکتا تھا۔ اس کا چہرا گویا چٹیل میدان تھا۔ جس کے بیچوں بیچ ناک کے اردگرد سرخ رگوں کا جال سا بچھ گیا تھا۔ لال مولی کی سی ناک مونچھ پر دھری ہوئی تھی۔ اس کا نچلا ہونٹ بے طرح موٹا تھا۔ دہانے کے کونے میں ایک سگریٹ سُلگ رہا تھا۔ وہ ابھی ابھی نہا کر نکلا تھا۔ اس کی گردن اور ماتھا پسینے سے شرابور تھا۔

جب میں چائے پی چکا تو اس نے ایک روبل کا نوٹ دے کر کہا: "لپک کر اپنے لیے دو اپرن تو خرید لا! یا ٹھہر، میں خود چل کر خرید دوں۔"

ٹوپی ٹھیک کر کے وہ میرے آگے ہولیا۔ جب وہ چلتا تو اس کا بدن تھلتھلانے لگتا اور ریچھ کے پنجوں کی طرح اس کے پیر ڈیک پر کھڑبڑ کرنے لگتے۔

رات کو ہماری کشتی سے بائیں طرف کی چراگاہوں کا رُخ کرتے

وقت چاند کی تابانی بڑھ جاتی ۔ ہمارا دقیانوسی اگن بوٹ تیز رفتاری سے ناواقف تھا اور اس کا پنکھا پہلے پانی پر کبھی زور سے اور کبھی دھیرے سے گردش کرتا ۔ سیاہ ساحل اسے پاس بلاتا اور اس کی پرچھائیں پانی پر تیرا کرتی ۔ اس سے پرے کسانوں کی جھونپڑیاں دلفریب طریقے سے چمکا کرتیں ۔ گانو سے لڑکیوں کے گیتوں اور قہقہوں کی آواز آتی رہتی ۔

ہمارا بوٹ ایک سرخ بجرے کو رسّی سے باندھ کر کھینچے لا رہا تھا اس کا ڈیک لوہے کی سلاخوں سے گھیر کر پنجرے کی طرح بنا دیا گیا تھا اور اس میں وہ قیدی بند تھے جنھیں دیس نکالے یا قید کی سزا ملی تھی ۔ بجرے کی نوک پر کسی سنتری کی سنگین قندیل کی مانند دمک رہی تھی ۔ بجرے پر سناٹا تھا ۔ چاندنی اُسے اشنان کرا رہی تھی اور لوہے کی سلاخوں کے پیچھے کچھ مدھم پرچھائیاں چل پھر رہی تھیں ۔ یہ قیدی تھے جو وولگا کو آخری بار سلام کر رہے تھے ۔ پانی کی موجیں گویا کبھی رو پڑتی تھیں اور کبھی کھلکھلا دیتی تھیں ۔ یہاں بھی کلیسا کی سی خاموشی تھی اور ویسی ہی تیل کی بو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی ۔

بجرے کو دیکھ کر مجھے بچپن کے پہلے دن یاد آئے ۔ استراخان سے نجنی کا وہ سفر، اماں کا پتھریلا چہرا اور پیاری نانی جس نے مجھے اس سخت مگر دلچسپ زندگی سے پہلے پہل دوچار کیا ۔ نانی کا خیال آتے ہی زندگی کی ساری برائی اور سیہ کاری ڈھل جاتی اور ہر شے لطیف و شریف معلوم ہونے لگتی تھی ۔ انسان بہتر اور برتر دکھائی دینے لگتے ۔

راتوں کا حسن مجھ پر ایسا اثر کرتا کہ آنکھوں میں آنسو آ جاتے ۔

خاص طور پر یہ بجرا جو کسی تابوت کی طرح تھا اور شب کی وسعت میں ندی کی گود میں چپ چاپ پڑا ہوا تھا۔ مجھے اداس بنا دیتا۔ ساحل کا اُتار چڑھاؤ تخیل کو جوش میں لاتا اور جی چاہتا کہ دوسروں کا کچھ بھلا کر چلوں۔
ہمارے ہم سفروں کا گینڈا ہی الگ تھا۔ یہ سب کے سب خواہ بوڑھے ہوں یا بچّے، مرد ہوں یا عورت، ایک قبیل کے تھے۔ ہمارا اگن بوٹ سُست رفتاری میں اپنا جواب آپ تھا جن مسافروں کو کام ہوتا وہ کسی تیز بوٹ کی تلاش کرتے لیکن ہمارے یہاں دنیا بھر کے نٹھلوں کی بھیڑ رہتی۔ انھیں گانے اور کھانے کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ صبح سے شام تک وہ میلے چھری کانٹوں اور جھوٹے برتنوں کا انبار لگا دیتے۔ دن کو سہ پہر کے وقت اور رات کو دس سے بارہ تک مجھے زیادہ کام نہ ہوتا، کیونکہ اس اثنا میں مسافروں کی توجہ شراب نوشی کی طرف ہوتی تھی۔ طعام خانے کے سب داروغہ بھی اس وقت چھٹی مناتے سموری خانساماں اپنے نایب جاکوف اونچ اور میکسم کے ساتھ بیٹھا چائے پیا کرتا۔ ہم رکابی میں سرجی، اسٹیورڈ بھی ہوتا۔ اس کبڑے کی آنکھوں میں گویا تیل بھرا ہوا تھا اور چہرا چیچک کے داغوں سے لالہ زار تھا۔ اس کا مینڈک کا سا منہ کانوں تک چر جاتا اور میکسم اپنی بے رنگ اور پتھرائی ہوئی آنکھوں سے ان سب کو گھورا کرتا۔
خانساماں اپنی گونج دار آواز میں اکثر بڑبڑایا کرتا: "ایشائی وحشی!"
مجھے یہ سنگت بالکل ناپسند تھی۔ توندل اور گنجا جاکوف ہمیشہ عورتوں کا ذکر کیا کرتا اور وہ بھی گندے طریقے سے۔ اس کا چہرا

زرا پھیکا پھاکا تھا اور اس پر نیلی نیلی پھنسیاں تھیں۔ اس کے ایک گال پر مسا تھا جس میں سُرخ بال اُگ آئے تھے۔ وہ انھیں ایک سوئی میں لپیٹ کر اکھاڑ دیا کرتا۔ جب کبھی بوٹ پر کوئی خوش مذاق اور جوان عورت نظر آتی تو وہ بھکاریوں کی طرح اس کی خدمت میں مصروف ہوجاتا۔ اس عورت سے وہ بہت گھُل گھُل کر باتیں کرتا۔ بس یہ معلوم ہوتا کہ کوئی کُتّا زبان سے اسے چاٹ رہا ہے۔ جانے کیوں مجھے اکثر خیال آتا کہ ایسے فربہ اندام کو کہیں کا جلّاد بننا چاہیے تھا۔

"عورتوں کو پھانسنے کی تدبیر ہر مرد کو آنا چاہیے" سرجی اور میکسم کو وہ یہ سبق دیا کرتا۔ اور وہ نہایت مرعوب ہوکر اپنے ہونٹ چاٹنے لگتے۔

"ایشیائی!" سخت بزاری کا اعلان کرتے ہوئے خانساماں یہ لفظ زبان پر لاتا اور مجھے حکم دیتا:

"پیشکوف، چل!"

اپنی کوٹھری میں جاکر وہ برف خانے کی دیوار پر پڑے ہوئے جھولے پر لیٹ جاتا اور ایک مجلد کتاب دے کر مجھ سے کہتا: "زرا پڑھنا تو اسے!"

"— اگر ستاروں کی کرنیں چھتری سی بنا دیں تو سمجھنا چاہیے کہ انسان کی دُنیا اور عاقبت دونوں سنور گئیں"

سموری سگریٹ کا دھنواں پھونکتے ہوئے غرّایا:

"گدھے کہیں کے۔ پہلے تو لکھا تھا —"

"بائیں چھاتی کھولنے کا مطلب ہے دل کا بھولاپن

"کس کی چھاتی؟"

"یہ کچھ لکھا نہیں ہی"

"تو سمجھو کہ عورت کی چھاتی - اور وہ بھی کسی فاحشہ کی چھاتی"

آنکھیں بند کیے اور ہاتھ سرہانے رکھے ہوئے وہ لیٹا رہتا۔ اس کی ادھ بجھی سگریٹ منہ کے کونے میں اٹکی رہتی۔ بیچ بیچ میں زبان سے سگریٹ کو لوٹا کر وہ ایسا کش کھینچتا کہ اس کے سینے سے غرغراہٹ سی اُٹھتی اور چہرہ دھوئیں کے بادل میں چھپ جاتا۔ کبھی مجھے گمان ہوتا کہ وہ سوگیا ہی اور میں جھٹ اس کمبخت کتاب کو بند کر دیتا جس سے زیادہ غیر دلچسپ کوئی چیز نہ تھی۔ لیکن وہ جھلا کر کہتا:-

"رُک کیوں گیا، آگے پڑھ"

"بزرگ نے کہا — دیکھو بھائی سورن —"

"سو پورن کہو"

"یہاں تو سورن لکھا ہی"

"یہ جادو ہی جادو - اس کے بعد کوئی نظم ہی، ذرا وہاں سے تو پڑھنا"

میں پڑھنے لگا:-

کافرو، کیوں کُرید کرتے ہو
سُن رکھو یہ ہی راز سربستہ
گیت پریوں کا تم نہ گاؤگے

ناچ ——————

سموری نے روک کر کہا: "ٹھہرنا ذرا یہ تک بندی ہی۔ شاعری

نہیں۔ دینا تو مجھے کتاب۔"

غصّے کے مارے وہ کتاب کے موٹے موٹے ورقوں کو جلدی جلدی اُلٹنے لگا اور پھر اسے چٹائی پر پھینک دیتا۔

"کوئی دوسری کتاب تو اُٹھانا۔"

افسوس کہ ان کا فولادی صندوق کتابوں سے بھرا ہوا تھا۔ کسی کا نام "امن کے اصول" تھا تو کسی کا "توپ خانے کی کہانی"۔ "زہریلے کیڑوں کے مارنے کی ترکیب" پر بھی ایک رسالہ تھا۔ یہ کتابیں خدا جانے کہاں سے شروع ہو کر کہاں ختم ہوتی تھیں۔ کبھی کبھی خانساماں مجھے حکم دیتا کہ سب کتابوں کو دھوپ دوں اور ان کے نام پڑھ کر سناتا جاؤں جیسے ہی میں اس کی ہدایت پر عمل شروع کرتا، وہ بھڑ پڑتا۔

"یہ کیا بکواس ہے؟ تو میاں کیوں رہا ہے؟ ایسا تیز پڑھا کہ خاک سمجھ میں نہ آیا۔ اور اس "گربواس" سے مجھے مطلب کیا ہے!"

الفاظ جو پتھر کے روڑوں کے سے تھے میرے دماغ کا کچومر نکال دیتے اور ان کا تلفظ کر کے زبان لڑکھڑانے لگتی۔ تاہم بے اختیار جی چاہتا کہ انھیں بار بار دُہرایے، شاید اسی طرح ان کا مطلب سمجھ میں آجائے۔ بوٹ کے باہر موجوں کی راگنی جاری تھی۔ ڈیک کا سماں بھی کس قدر دلچسپ تھا جہاں ملاحوں اور مسافروں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ کوئی تاش کھیلتا، کوئی گانے گاتا، کوئی کہانی سناتا۔ دل کہتا کہ ان میں چل کر بیٹھیے، مزے مزے کی باتیں سنیے۔ دریا کا نظارہ کیجیے۔ کنارے کے درختوں اور چراگاہوں کو دیکھیے جن کے بیچ بیچ میں پانی کے کنڈ شیشے کے ٹکڑوں کی طرح دھوپ میں جگمگا رہے تھے۔

حالانکہ ہمارا بوٹ ساحل ساحل نہیں جا رہا تھا، پھر بھی دور سے گھنٹوں کی آواز آتی اور یاد دلاتی کہ پاس ہی کہیں گانو بھی ہیں اور کسان بھی۔ ماہی گیروں کے ڈونگے پانی پر ناچ رہے تھے۔ کہیں کوئی گانو نظر آجاتا، کہیں ننھے ننھے بچّے ندی میں نہاتے ہوتے اور کہیں آدمی ریت پر چلتے پھرتے ملتے۔ ندی کے بیچوں بیچ سے دیکھو تو یہ سارا نظارہ نہایت پر لطف تھا۔ ہر چیز رنگین کھلونے کی سی لگتی۔

جی چاہتا کہ ساحل اور اُس بجرے دونوں سے پیاری پیاری باتیں کیجیے۔ بجرے میں میرے لیے کشش کے بڑے سامان تھے۔ گھنٹوں میں اسے تاکا کرتا۔ اگن بوٹ رسّی کے بل اسے یوں کھینچے لیے جاتا تھا گویا وہ کوئی جانور ہو۔ میں چاہتا تھا کہ ان قیدیوں کو اچھی طرح دیکھ لوں جو حیوانوں کی طرح اس کے اندر ٹھونس دیے گئے ہیں۔ جب وہ ایک بندرگاہ پر اُتارے گئے تو میں گھس بیٹھ کر پل کے پاس جا کھڑا ہوا۔ میرے پیچھے پیچھے دس دس کی ٹولی میں یہ قیدی آئے۔ وہ اپنے تھیلوں کے بار سے جھکے ہوئے تھے۔ ان کی زنجیریں بج رہی تھیں اور ان کے قدم ایک رفتار سے اُٹھتے تھے۔ ان میں جوان بھی تھے اور بوڑھے بھی، بدصورت بھی تھے اور خوبصورت بھی۔ غرض کہ ان میں اور معمولی آدمیوں میں کوئی فرق نہ تھا، سوا اس کے کہ ان کے کپڑے جُدا تھے اور بال بھدے طریقے سے منڈے ہوئے تھے۔ غالباً یہ ڈاکو تھے لیکن نانی نے مجھے سُنایا تھا کہ ڈاکوؤں میں خوبیاں بھی ہوتی ہیں۔ سموری جو اُن سے زیادہ خونخوار معلوم ہوتا تھا۔ زور سے بول اُٹھا:

"الٰہی، مجھے اس انجام سے بچانا۔"

ایک بار میں نے اس سے پوچھا :-

"یہ کیوں کہتے ہو؟ اپنا اپنا پیشہ ہی - تم کھانا پکاتے ہو تو یہ لوٹ مار کرتے ہیں "

"میں کھانا تیار کرتا ہوں - پکانا تو عورتوں کا کام ہی " یہ کہہ کر سموری زور سے ہنسا - پھر کچھ سوچ کر بولا :- " آدمی آدمی کا فرق عقل سے معلوم ہوتا ہی - کوئی ذہین ہوتا ہی، کوئی معمولی سمجھ کا اور کوئی نرا احمق - ذہانت کے لیے اچھی کتابیں پڑھنا چاہیے - طلسم اور جادو کے قصّے اور ہر مضمون اور ہر قسم کی کتاب پڑھنا چاہیے، پھر خود تمیز آجائے گی کہ کون سی کتاب اچھی ہی اور کون سی بُری "

ہمیشہ وہ مجھ سے کہا کرتا :-

"پڑھنے میں کوتاہی نہ کرنا - اگر کوئی کتاب پہلی بار سمجھ میں نہ آئے تو دوبارہ پڑھ، پھر بھی سمجھ میں نہ آئے تو پانچ دس بار پڑھتا چلا جا "

سموری جہاز کے ہر کارندے سے درشتی سے گفتگو کرتا - اپنے ہونٹ یوں لٹکا کر گویا وہ سخت بیزار ہی اور مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے وہ ان کی طرف الفاظ یوں پھینکتا گویا وہ پتھر ہیں - لیکن مجھ سے وہ محبت سے پیش آتا - یہ دوسری بات ہی کہ اس کی عنایت میں ایک ایسا پہلو بھی تھا جو مجھے خوف زدہ رکھتا - کبھی کبھی مجھے خیال آتا کہ وہ بھی نانی کی بہن کی طرح خبطی ہی - کسی کسی موقع پر وہ کہہ اُٹھتا :

"پڑھنے لکھنے سے کیا فایدہ "

دیر تک وہ آنکھیں بند کیے لیٹا رہتا - وہ سانس بھی تحکمانہ انداز میں لیتا اور اس کا بڑا سا پیٹ برابر ہلتا رہتا - اس کی اُنگلیاں سینے

پر پڑے پڑے ان دیکھی سوئیوں سے ان دیکھے موزے بُنا کرتیں۔ اتنے میں وہ یک بیک بڑبڑانے لگتا:

"ایک اپنے کو ہی دیکھو۔ قدرت نے تمھیں دماغ دیا ہی، تم زندہ رہ سکتے ہو۔ مگر یہ برکت سب کے لیے نہیں، اور جنھیں ملتی ہی وہ بھی برابر برابر نہیں۔ کاش سب کی کھوپڑیاں ایک سی ہوتیں لیکن یہ ممکن نہیں۔ کچھ کو سمجھ ملتی ہی کچھ کو نہیں اور کچھ تو ایسے ہیں جو سمجھنا بھی نہیں چاہتے۔"

ٹوٹے پھوٹے جملوں میں مجھے وہ اس زمانے کے قصے سُنایا کرتا جب وہ سپاہی تھا۔ ان قصوں کا کوئی ماحصل نہ تھا اور ان سے مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ پھر یہ بھی تھا کہ وہ کوئی قصہ شروع سے نہ سُناتا بلکہ جو حصہ جب یاد آجاتا سُنا دیتا۔

"کمپنی کے کپتان نے سپاہی کو بُلاکر پوچھا: "تم سے سارجنٹ نے کیا کہا تھا؟" سپاہی نے من وعن سب بتلادیا کیونکہ حق گوئی سپاہی کا فرض منصبی ہی — اور سارجنٹ نے اسے یوں دیکھا گویا وہ کوئی بت ہو اور سر جھکا کر چل دیا۔"

یہ کہتے کہتے سموری کو غصہ آگیا اور دھوئیں کے بادل اُڑاتے ہوئے وہ غرّانے لگا:

"مجھے کیا خبر تھی کہ یہ کہنے سے فائدہ ہوگا اور یہ کہنے سے نقصان۔ بہرحال سارجنٹ کو قلعہ میں قید کردیا گیا اور اس کی ماں نے کہا — ہائے اللہ! میں کس قدر جاہل ہوں!"

گرمی پڑ رہی تھی اور گویا ہر شی جنبش ولرزش میں تھی۔ بوٹ

کی آہنی دیواروں سے پانی کی موجیں ٹکراتیں اور بوٹ کا پچھا کبھی اوپر اُٹھ کر پھر نیچے گر جاتا۔ ہر دو طرف روشنی کا عکس ناچ رہا تھا اور اس کے بیچ میں ندی کا دھارا اپنی راہ بھاگ رہا تھا۔ کچھ فاصلے پر ہرا بھرا کنارہ جھلک رہا تھا۔ پیڑوں پر مردنی سی چھائی ہوئی تھی۔ جس کے کان ہر قسم کی آواز کو پہچانتے ہوں وہ ضرور کہتا کہ فضا اس وقت گم سم سی ہے۔ صرف بوٹ کے عرشے پر بیٹھے ہوئے فوجی ہو حق میں مصروف تھے۔

میں کچھ انمنا سا ہو رہا تھا۔ نہ کچھ سننے کو جی چاہتا نہ کام کی طرف دل مایل ہوتا۔ بس یہ خواہش ہوتی کہ چلیے کہیں گھنی چھاؤں میں بیٹھیے۔ جہاں باورچی خانے کی بدبو اور گھُمس نہ ہو۔ وہاں لیٹے لیٹے ادھ کھلی آنکھوں سے اُس ساکن زندگی کو تاکا کیجیے جو پانی کے ساتھ بہی جا رہی تھی۔

اتنے میں خانساماں نے زور سے حکم دیا: "آگے بڑھو!"

جہاز کا داروغۂ رسد تک سموری کا خوف کھاتا تھا اور کم سخن داروغۂ طعام کے تو ہوش و حواس جاتے رہتے۔

سموری اسے ڈانٹ کر کہتا: "ابے سؤر کے بچّے! چور، ایشیائی — زرا اِدھر تو آنا"

خلاصی اور جہازی اس کا ادب کرتے اور اس کی عنایت کے منتظر رہتے: انھیں یخنی کا گوشت بانٹ کر وہ ان کے بال بچّوں کی خیر خبر پوچھا کرتا۔ سفید روس کے رہنے والے خلاصی سب سے ادنیٰ درجے کے آدمی سمجھے جاتے تھے دھنوئیں کے مارے ان کا رنگ کبوتری سا

ہوگیا تھا اور اس میں تیل کی سی چمک آگئی تھی۔ لوگ ان سے ہمیشہ چھیڑ چھاڑ کیا کرتے تھے

جب سموری نے یہ سنا تو تاؤ کے مارے اس کی مونچھیں کھڑی ہوگئیں، چہرہ تمتما اٹھا اور وہ ان خلاصیوں پر گرج پڑا: "احمقو، تم ان سب کے طعنے کیوں سہہ لیتے ہو۔ انھیں منہ توڑ جواب کیوں نہیں دیتے"

سارنگ نے جو صورت شکل کا اچھا مگر طبیعت کا چڑچڑا تھا، اس سے کہا:۔

"اجی، یہ مشرک ہیں، ان کے قول و فعل کا اعتبار کیا"

یہ کہنا تھا کہ خانساماں نے اسے سر دھڑ سمیت اٹھا لیا اور ہوا میں جنبش دے کر کہا:

"ایسی پٹخنی دوں گا کہ ہڈی پسلی چور ہو جائے گی"

ان دونوں میں برابر تکرار رہتی تھی۔ کبھی کبھی تو ہاتا پائی بھی ہو جاتی لیکن سموری کبھی مار نہ کھاتا تھا۔ طاقت کے اعتبار سے وہ دیو تھا اور پھر کپتان کی بیوی ــــ جس کا چہرہ مردانہ اور بال لونڈوں کے سے تھے اس کی طرف دار تھی۔

خدا جانے وہ کتنی وڈکا (روسی شراب) پیا کرتا لیکن میں نے اسے کبھی نشے میں نہیں دیکھا۔ بیداری کے ساتھ ساتھ اس کی مے نوشی شروع ہوتی اور وہ چار گھونٹ میں ساری بوتل خالی کر دیتا۔ اس کے بعد شام تک وہ بیر کے خم کے خم لنڈھاتا رہتا۔ اس کے چہرے کی رنگت بدلنے لگتی اور آنکھوں کی پتلیاں پھیل جاتیں۔

دن چڑھے کبھی کبھی وہ گھنٹوں کسی خیال میں غرق رہتا اور چپ چاپ اُفق بعید کو تاکا کرتا - ایسے موقعوں پر سب لوگ اس سے خایف ہو جاتے لیکن مجھے اس پر بڑا ترس آتا۔ مشعلچی باورچی خانے سے پسینے میں شرابور اور گرمی میں جُھلسا جُھلسایا باہر آتا - اور دور سے اپنی گنجی کھوپڑی کو کھجا کر اور بازو ہلا کر کہتا :-

"مچھلی خراب ہوگئی"

"گوبھی کی بُھجیا تو ہے"

"لیکن اگر مچھلی کے شوربے یا قورمے کی فرمایش ہوئی ؟"

"تو کہہ دو کہ تیار ہے - یہی مچھلی وہ مزے لے لے کر کھائیں گے"

ایک آدھ مرتبہ میں ہمت باندھ کر اس کے پاس جاتا وہ بوجھل نگاہوں سے مجھے گھور کر پوچھتا :

"کیا چاہتے ہو؟"

"کچھ نہیں"

"تب تو ٹھیک ہے"

ایسے ایک موقع پر میں نے سوال کیا :-

"یہ سب آپ سے ڈرتے کیوں ہیں؟ آپ تو اتنے نیک ہیں"

خلاف توقع اسے غصہ نہ آیا :

"میں صرف تمہارے لیے نیک ہوں"

لیکن پھر اس نے سادگی اور صفائی سے کہا :

"یہ بھی سچ ہے کہ میں سب کا بھلا کرتا ہوں لیکن اسے ظاہر نہیں کرتا - جہاں لوگوں کو یہ معلوم ہوا اور وہ جان کو آگئے۔ جو ان سے

مہربانی سے پیش آئے وہ اسی کو کچلنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ جانا زرا بیر تولاتا۔"

بوتل ختم کرکے مونچھوں کو چاٹتے ہوئے وہ بولا:
"لڑکے، اگر تو اتنا کم عمر نہ ہوتا تو میں تجھے بہت کچھ سکھاتا۔ کسی سے بات کرنے کو جی چاہتا ہی۔ لیکن تو کتابیں ضرور پڑھا کر۔ ان میں تجھے سب کچھ مل جاسے گا۔ کتابوں کو بے کار نہ سمجھنا . . . بیر پیے گا؟"
"مجھے تو پسند نہیں۔"
"شاباش! یہ تو تیری سعادت مندی ہی۔ شراب جس کے منہ لگ جائے اس سے بڑا کوئی بدنصیب نہیں۔ وڈکا کو شیطان کا موت جانو۔ اگر میں امیر ہوتا تو تیری تعلیم کا انتظام کرتا۔ جاہل اور جانور میں کوئی فرق نہیں، دونوں کو یا تو ہل میں جوتنا چاہیے یا مارکر کھا جانا چاہیے۔ ان پڑھ کا کام یہ ہی کہ اپنی دم ہلایا کرے۔"
کپتان کی بیوی نے اسے گوگول[۵۱] کی ایک کتاب دی۔ میں نے "خونین انتقام" نامی افسانہ پڑھا اور بہت محظوظ ہوا۔ لیکن سموری نے بگڑ کر کہا:
"واہیات! گڈا گڈی کی کہانی! اور کوئی کتاب نہیں رہ گئی تھی؟"
یہ کتاب واپس کرکے وہ دوسری لایا اور غصے سے بولا: "تارس[۵۲] — کمبخت کا پورا نام بھی تو یاد نہیں رہا۔ کہتی ہی کہ اچھا ناول ہی، کس کے لیے اچھا ہی؟ اس کے لیے ہو تو ہو لیکن مرا چہ! بال کٹوائی

---

۵۱ مشہور روسی مصنف۔
۵۲ گوگول کا شہرہ آفاق ناول تارس بلبا۔

ہے۔ کبھی اس کے کان بھی کٹ جائیں تو مزا آئے۔"

کتاب میں ایک ایسا مقام آیا کہ تارس اپنے بیٹے کو لڑنے کی چنوتی دیتا ہے۔ یہ سن کر خانساماں ہنس پڑا:

"بھئی خوب کہی! تیرے پاس علم ہے تو میرے پاس طاقت ہے اس کا جواب کیا ہو سکتا ہے؟ شتر بے مہار!"

وہ کان لگا کر ایک ایک لفظ سنتا اور بیچ بیچ میں بڑبڑاتا جاتا۔

"واہیات! ایک وار میں کسی کے جسم کو آدھوں آدھ کاٹ دینا ہرگز ممکن نہیں۔ اور نیزہ اوپر کون پھینکتا ہے۔ وہ گر کر ٹوٹ جائے گا یا نہیں۔ ارے، سپہ گری میرا آبائی پیشہ ہے۔"

لیکن جب تارس نے اپنے بیٹے کو قتل کر دیا تو خانساماں جھولے سے اتر کر فرش پر بیٹھ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ آنسو ٹپاٹپ گرنے لگے اور وہ ہچکیاں لے کر کہنے لگا: "اللہ، میرے اللہ!"

پھر وہ یک بیک مجھ پر برس پڑا:

"ابے شیطان کے بچے، تو پڑھتے پڑھتے رک کیوں گیا۔"

اور جب مرنے والا اپنے باپ کو بلاتا ہے: ابا آپ کہاں ہیں۔ تو سموری کے غم و اندوہ کی انتہا نہ رہی:

"یہ انجام ہوا! ہائے کیسے افسوس کا مقام ہے لیکن جو بھی ہو یہ تارس مرد تھا۔ ٹھیک ہے یا نہیں؟ وہ مرد تھا۔"

کتاب میرے ہاتھ سے لے کر وہ غور سے اسے دیکھتا رہا اور اس کی جلد آنسوؤں سے بھیگ گئی۔

"بڑی اچھی کتاب ہے، روح کو جگانے والی کتاب ہے۔"

اس کے بعد میں نے اُسے کئی کتابیں پڑھ کر سُنائیں، گو ہمارے ذوق میں سخت اختلاف تھا۔

ایک روز میں نے اُسے بتایا کہ ایسی بھی کتابیں ہیں جن کا پڑھنا منع ہی رات کے اندھیرے میں چھپ چھپا کر کوئی اُنھیں پڑھ لے تو پڑھ لے۔ یہ سُن کر خانساماں کی آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ گئیں:

"ایں، پھر سے تو کہنا؛ ابے تو نے یہ کیا گپ لگائی ہی۔"

"گپ کی ایک ہی رہی۔ پادری نے مجھے خاص تاکید کی تھی۔ اور سُنی سُنائی نہیں آنکھوں دیکھی کہتا ہوں۔ میں نے خود لوگوں کو ایسی کتابیں پڑھتے اور اُن پر دیدے کھوتے دیکھا ہی۔"

سموری نے گھور کر پوچھا:

"یہ رونے والا کون تھا؟"

"وہ عورت جو سُن رہی تھی اور دوسری تو دراصل ڈر کے مارے بھاگ گئی۔"

آنکھوں کو ہتیلی سے ڈھانک کر وہ بولا:۔

"تم نیند میں ہوگے، خواب دیکھ رہے ہوگے۔" پھر وہ ذرا دیر کے لیے چُپ ہوگیا: "لیکن یہ بھی عجب نہیں کہ ابھی کئی بھید مجھ سے چھپے ہوئے ہیں۔ میری عمر ہی کیا ہی اور میری فطرت —— خیر اس کا ذکر ہی کیا ——"

گھنٹہ بھر وہ اسی قسم کی باتیں کرتا رہا۔

رفتہ رفتہ مجھے مطالعے کا شوق ہوگیا اور اس میں مجھے مزا ملنے لگا۔ کتابوں کی دُنیا کہیں زیادہ اچھی تھی، کیونکہ یہ روز مرہ کی

زندگی میرے لیے سخت تر ہوتی جاتی تھی۔

خانساماں کا دل بھی پڑھنے میں لگتا تھا۔ اور اکثر وہ مجھے کام سے روک کر حکم دیتا: "پیشکوف، میاں کوئی چیز تو سنانا۔"

"ابھی دھونے دُھلانے کو بہت پڑا ہی۔"

"میکسم سب کُچھ کرلے گا۔"

اپنے نایب سے وہ میرا کام لیتا۔ اور وہ بغض کے مارے برتن بھانڈے توڑ دیتا۔ اُدھر جہاز کا داروغہ مجھے دھمکاتا:

"میں تجھے یہاں نہ ٹکنے دوں گا۔"

ایک روز میکسم نے جان بوجھ کر تسلے کے میلے پانی میں چھوٹے گلاس چھوڑدیے۔ میں نے بے جانے بوجھے تسلا سمندر میں انڈیل دیا۔ اور پانی کے ساتھ وہ گلاس بھی بہہ گئے۔

سموری نے داروغہ سے کہہ دیا: "یہ میری غلطی تھی۔ جو نقصان ہوا میرے نام لکھ لیا جائے۔"

طعام خانے کے خدمت گار بھی میری جان کے بیری ہوگئے:

"ابے کتاب چاٹو۔ کیا تجھے اسی ٹلّہ نویسی کی تنخواہ ملتی ہی؟"

چنانچہ وہ مجھے تنگ کرنے کے ہزار طریقے سوچتے، ارادۃً میرا کام بڑھاتے اور برتنوں کو خواہ مخواہ میلا کردیتے میں سمجھ گیا کہ اب میری خیریت نہیں ہی۔ میرا اندازہ صحیح نکلا۔

ایک روز شام کو بوٹ کے کونے میں ایک لال منحنی سی عورت کسی لڑکی کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ لڑکی پیلا کوٹ اور گلابی کرتی پہنے ہوئے تھی۔ دونوں شراب کے نشے میں مست۔ عورت کبھی مٹکتی کبھی مُسکراتی

اور ہر آنے جانے والے کو سلام کر کے کہتی : " دوستو، میری خطا کو معاف کرنا، چلّو بھر زیادہ پی گئی ہوں۔ بات یہ ہے کہ مجھ پر مقدمہ چلا اور اس میں میری گلو خلاصی ہوگئی اسی خوشی میں پی پلا رہی ہوں "

اور لونڈیا بھی بے نور آنکھوں سے مسافروں پر چتونوں کی کمند پھینک رہی تھی۔ ایک بار عورت کو دھکّا دے کر وہ بولی :

تیری شکل پر پھٹکار — تیری اصل کا سب کو پتا ہے !"

یہ دونوں دوسرے درجے میں سفر کر رہی تھیں اور ان کے کیبن کے ٹھیک سامنے جاکوف ایوجن اور سرجی سوتے تھے۔

تھوڑی دیر میں عورت تو کہیں چمپت ہوگئی اور اس کی جگہ سرجی آکر بیٹھ گیا۔ اور اپنی مینڈک کی سی تھوتھنی کو ادھر اُدھر نچانے لگا۔

رات کو میں کام کاج سے نبٹ کر میز پر سونے کے ارادے سے لیٹا ہی تھا کہ سرجی نے آکر کہا :-

" ابے اُٹھ تو سہی ! ہم نے تیرے بیاہ کا انتظام کیا ہے ! " اس وقت وہ پیے ہوئے تھا اور جب میں نے اس کے ہاتھ کو جھٹکا دیا تو اس نے مجھے ایک لپڑ رسید کیا اور بولا :- " آتا ہے یا نہیں "

میکسم بھی دوڑ پڑا اور یہ دونوں متوالے مجھے گھسیٹتے ہوئے کیبن کی طرف لے چلے۔ لیکن اس کے دروازے پر سموری جاکوف کو تھامے ہوئے کھڑا تھا۔ لونڈیا نے اس کے کولھے پر کہنی مار کر نشیلی آواز میں کہا : " راستہ صاف کرتے ہو یا نہیں "

سموری نے ان دونوں نابکاروں سے مجھے نجات دلائی اور بال پکڑ کر دونوں کی کھوپڑیوں کو اتنا ٹکرایا کہ وہ زمین پر نظر آئے۔

"ایشیائی کہیں کے!" اس نے گھڑک کر جاکوف سے کہا اور مجھے سامنے ہانکتے ہوئے حکم دیا: "بھاگ اس شیطان پورے سے!"

میں تو نو کدم اوپر بھاگا۔ بادل چھائے ہوئے تھے اور ندی کا پانی کالا کالا سا معلوم ہوتا تھا۔ بوٹ کے پیچھے پانی کی دو بھوری بھوری لہریں کٹ کر دونوں کناروں کی طرف بھاگی جارہی تھیں اور ان کے بیچوں بیچ اسیروں کا بجرا اپنے راستے پر رواں تھا۔ کبھی دائیں کبھی بائیں روشنی کی کرنیں نظر آتیں لیکن وہ کسی چیز کو روشن نہ کرسکتی تھیں۔ ساحل کے نشیب و فراز میں وہ دم کے دم جھلک کر اوجھل ہوجاتی تھیں۔ اور اس کے بعد سارا منظر تاریک تر اور مہیب تر ہوجاتا تھا۔

خانساماں میرے پاس آکر بیٹھ گیا اور ٹھنڈی سانس بھر کر سگریٹ کا لمبا کش کھینچا۔

"تمھیں وہ اُس لونڈیا کے پاس لے جاتے تھے، ایں؛ بدمعاش کہیں کے! میں نے سب سُن لیا تھا۔"

"کیا آپ نے اُسے اُن کے پنجے سے چھڑا لیا؟"

"اُس مردار کو!" خانساماں نے لڑکی کو خوب بُرا بھلا کہا اور پھر اُداسی سے کہا:

"یہ فتنہ و فساد کی فضا ہی۔ اس بوٹ کو دیہات سے بدتر سمجھو کبھی کسی دیہات میں رہے ہو؟"

"نہیں۔"

"دیہات میں دُکھ درد کے سوا کچھ نہیں، خاص طور پر سردی کا موسم تو عذابِ جان ہوتا ہی۔"

سگریٹ پانی میں پھینک کر وہ دم بھر چُپ رہا، پھر بولا:

"بیٹا مجھے افسوس ہی کہ تم ان حرام خوروں میں آ پھنسے ہو۔ مجھے ان پر بھی ترس آتا ہی۔ کسی اور موقعے پر وہ ایسی حرکت کرتے تو میں نہ جانے کیا کرتا۔ شاید میں ان کی بخشش کے لیے دعا مانگتا۔ کُتّے کے پلّو، تم یہ کیا کرتے ہو؟ آنکھوں کے اندھو، تم کس پھیر میں ہو؟"

اگن بوٹ نے زور کی سیٹی بجائی، قندیلوں نے جگمگا کر تبلایا کہ بندرگاہ کہاں ہی، تاریکی کو چیر کر ہر طرف سے روشنی کی کرنیں جگمگانے لگیں۔

بستی کی عورتیں جو بھونڈے پن میں اپنا ثانی نہ رکھتی تھیں کنارے سے لکڑی کے کندے ٹھیلوں پر لاد لاد کر لا رہی تھیں۔ پیٹھ پر بوجھ لادے وہ دو دو کی جوڑی بنائے ایندھن گھر کے آگے آتیں اور لکڑیاں اُتار کر ریکنے لگتیں:

"لکڑی ہی لکڑی!"

جہازی کبھی اُن کی چھاتیاں مسلتے، کبھی اُن کی ٹانگیں ٹیلتے اور عورتیں واویلا مچاتی ہوئی مردوں سے اُلجھ پڑتیں اور وہ دھول دھپّا کرتیں کہ توبہ! یہ نظارہ میں نے بارہا دیکھا۔ ہر سفر میں ہر بندرگاہ پر جہاں کہیں بوٹ پر ایندھن آیا یہی تماشا دیکھنے میں آیا۔

اب مجھے محسوس ہونے لگا گویا میں بوڑھا ہو گیا ہوں اور سالہا سال سے جہاز رانی کر رہا ہوں۔ ہفتے مہینے یا سال بھر میں جو کچھ ہونے والا تھا وہ گویا میری آنکھوں کے سامنے تھا۔

جب پو پھٹی تو کیا دیکھتا ہوں کہ بندرگاہ سے پرے کے ٹیلے پر چیڑ کے پیڑوں کا جنگل ہی۔ ٹیلوں اور جھاڑیوں میں عورتیں کلیلیں کرتی، ہنستی

ہنساتی آجا رہی ہیں۔ جب وہ اپنے ٹھیلوں کو کھینچ کر لے جاتیں تو اُن پر سپاہیوں کا گمان ہوتا۔

آپ ہی آپ میرا دل بھر آیا۔ آنسو پلکوں کے نیچے مچلنے لگے۔ میں نے بہ مشکل ضبط کیا اور "بلیاخن" ملّاح کے ساتھ فرش دھونے لگا۔

بلیاخن منحنی سا آدمی تھا۔ وہ کچھ بجھا بجھا سا رہتا اور ہمیشہ الگ تھلگ بیٹھا رہتا۔ جب دیکھیے کسی کونے سے اس کی چبھتی ہوئی آنکھوں کی چمک نظر آتی تھی۔

"میرا اصل نام بلیاخن نہیں بلکہ ———— ہے۔ تم یوں سمجھو کہ میری ماں فاحشہ تھی اور میری بہن کا بھی یہی حال ہے۔ ان کی قسمت میں یہی لکھا تھا میاں صاحب زادے، قسمت کے نوشتے میں جو لکھا گیا سو امٹ ہے۔ لاکھ جتن کرو، پر بھاگ کا بدا نہیں ٹلتا۔"

پھر جھاڑ پونچھ کرتے ہوئے وہ بولا:۔

"تمھیں کیا معلوم کہ عورتیں کیا تباہی پھیلاتی ہیں! بھیگی لکڑی دیر تک دھنواں دیتی اور پھر یک بیک دہک اٹھتی ہے۔ مجھے ان باتوں سے کیا غرض اور کیا دلچسپی۔ لیکن خدا نخواستہ اگر میں عورت کے روپ میں جنم لیتا تو ضرور گندے نالے میں ڈوب مرتا۔ پھر نہ تو میں کسی کو نقصان پہنچا سکتا اور میری بخشش بھی ہو جاتی۔ لیکن دنیا میں رہو تو وہی گیلی لکڑی کا حال ہوگا۔ میاں، زنخوں کو احمق نہ سمجھو۔ یہ بڑے فرزانہ ہیں، قدرت کے رموز کو خوب سمجھتے ہیں اور عبادت الٰہی کے لئے چھوٹے موٹے عیشوں کو تج دیتے ہیں۔"

اسی وقت کپتان کی بیوی حمام میں سے نہا کر لہنگا اٹھائے باہر نکلی

وہ سڈول اور اونچی پوری تھی اور اس کا چہرہ بھی بھولا بھالا تھا جی چاہا کہ اس کا دامن پکڑ لوں اور التجا کروں کہ :۔" للہ مجھ سے دو باتیں کر لو"

اگن بوٹ دھیرے دھیرے کنارے سے ہٹنے لگا۔ بلیاخن نے صلیب کا نشان بنا کر کہا :۔

"لو کوچ کا وقت آگیا!"

باب (۶)

سراپلیا کی بندرگاہ پر میکسم نے اگن بوٹ کی خدمت گاری کو خیرباد کہا۔ چلتے وقت وہ کسی سے نہ ملا، خاموشی اور سنجیدگی سے باہر چلا گیا۔ اس کے پیچھے وہ رنگیلی عورت چٹک مٹک کرتی ہوئی مگر لڑکی کے بال بکھرے اور آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ کپتان کے کیبن کے باہر سرجی دیر تک دوزانو بیٹھا رہا اور اس کی چوکھٹ پر سر ٹیک کر کہتا جاتا تھا:-

"مجھے معاف کیجیے! یہ میرا نہیں، بلکہ میکسم کا قصور ہے!"

جہازیوں اور مسافروں کو معلوم تھا کہ سرجی جھوٹ کہہ رہا ہے۔ تاہم وہ سفارش کرتے: "جانے بھی دیجیے، معاف کر دیجیے"!

لیکن کپتان نے ان کی ایک نہ سُنی بلکہ ایسی لات رسید کی کہ وہ منہ کے بل گر پڑا۔ آخر کار، سرجی کی خطا معاف کی گئی اور سرجی جھٹ پٹ چائے کی کشتی اُٹھائے عرشے کی طرف بھاگا۔ اور وہ کُتّے کی طرح مسافروں کا منہ تکنے لگا۔

میکسم کی جگہ جو آدمی آیا وہ کبھی سپاہی رہ چکا تھا؛ اس کی کھوپڑی چھوٹی، آنکھیں بھوری اور لال، جسم دُبلا پتلا تھا۔ مشعلچی نے چھوٹتے ہی اسے مرغیاں کاٹنے کا کام سپرد کیا۔ دو کے سوا باقی سب اس کے ہاتھ سے نکل بھاگیں۔ مسافر جوان کے پیچھے لپکے تو کئی سمندر میں کود پڑیں۔ اب سپاہی صاحب مرغیوں کے دڑبے کے پاس بیٹھ کر زار و قطار

رونے لگے۔

سموری نے بگڑ کر کہا: "ابے مرغ، تجھے ہو کیا گیا ہی؟ سپاہی بھی کہیں روتے ہیں؟"

سپاہی نے زیرِ لب کہا: "میں تو بلم ٹیر ہوں!"

یہ کہ کر ان حضرت کی شامت آگئی۔ آدھ گھنٹے میں سارے بوٹ کو اس مذاق کی خبر ہوگئی اور جسے دیکھو اس پر پھبتی کسنے لگا۔ لوگ پاس آکر اسے گھورتے اور پوچھتے:۔

"یہی ہیں وہ ذات شریف!"

پھر وہ حقارت سے قہقہہ مار کر ہنس پڑتے تھے۔

پہلے تو سپاہی نے نہ ان لوگوں کو دیکھا اور نہ ان کے قہقہوں کو سنا، دیر تک وہ اپنی پھٹی ہوئی قمیص کی آستین سے آنسوؤں کو یوں پونچھتا رہا گویا انھیں چھپانے کی کوشش کر رہا ہو۔ لیکن دفعتاً اس کی بھوری آنکھیں غصے سے چمک اُٹھیں اور وہ اپنی دیہاتی بولی میں بولا:۔

"تم پر خدا کی مار! کیا کوئی تماشا بنا رکھا ہے۔"

اب تو مسافر اور بھی شیر ہوگئے۔ کبھی اسے چڑاتے، کبھی اس کے کپڑے کھینچتے۔ وہ اس سے یوں چہل کرنے لگے گویا وہ کوئی بندر ہی۔ اور چھیڑ خانی کا یہ سلسلہ کھانے کے وقت تک جاری رہا۔ کھاتے وقت کسی نے لکڑی کا چمچ اس کے اپرن (پیش بند) کے پس بند سے باندھ دیا۔ جب وہ چلتا تو چمچ جھولنے لگتا اور لوگ بے تحاشہ ہنسنے لگتے۔ لیکن وہ غریب گھرے چوہے کی طرح بوکھلایا ہوا تھا اور اسے اس نئی ستم ظریفی کی خبر نہ تھی۔

سموری چپ چاپ بیٹھا یہ ماجرا دیکھ رہا تھا۔ مجھے سپاہی پر ترس آیا اور میں نے پوچھا ——————— : "کیا میں اُسے چمچ کا حال بتلا دوں؟"

سموری نے اشارے سے اجازت دے دی۔

جب میں نے سپاہی کو آگاہ کیا تو اس نے چمچ کو بند سے کھول کر فرش پر پھینک دیا، اُسے پاؤں تلے کچل ڈالا اور پھر دونوں ہاتھوں سے میرے بال پکڑ لیے۔ جب ہم دونوں ایک دوسرے سے گتھ گئے تو مسافروں کو تفریح کا نیا سامان ملا اور وہ گھیرا ڈال کر ہماری کشتی کا تماشا دیکھنے لگے۔

سموری نے اُن سب کو الگ کیا، ایک تھپڑ مجھے رسید کیا اور پھر سپاہی کی گوشمالی کی، جب سب نے سپاہی کو خانساماں کی گرفت میں پھدکتے اُچکتے دیکھا تو تالی اور سیٹی کی صدا سے فضا گونج اٹھی اور ہنسی کے مارے اُن کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔

"بلم ٹیر! خانساماں کی توند کو نہ چھوڑنا!"

ان وحشیوں کی خوشی پر مجھے ایسا غصہ آیا کہ جی چاہا لکڑی کا کندا اٹھا کر ان سب کی کھوپڑیاں توڑ کر رکھ دوں۔

سموری سپاہی کو چھوڑ کر جنگلی سور کی طرح ان بدقماشوں پر پل پڑا اور خوفناک طریقے سے دانت نکال کر چلایا :-

"چلو اپنے بلوں کو! چلتے ہو یا نہیں!"

اس اثنا میں سپاہی پھر مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ لیکن اب کے سموری نے اُسے بغل میں داب لیا اور نل کے پاس لا کر اس کی بندر کھوپڑی پر

پانی کی بارش کرنے لگا اور اُس کے بدن کو اِس پھرتی سے پانی کے نیچے گھمانے لگا گویا وہ کوئی کپڑے کا گڈا ہی۔

جہازی، سارنگ اور کپتان کے میٹ کو لے کر دوڑ پڑے۔ ازسرِ نو مسافروں کی بھیڑ لگ گئی۔

سپاہی اپنے اڈّے پر بیٹھ کر موزوں کو نچوڑنے لگا۔ حالانکہ وہ نرے سوکھے تھے۔ لیکن اُس کے چکنے بالوں سے پانی ٹپک ٹپک کر مسافروں کے دل میں گدگدی پیدا کر رہا تھا۔

"انجام جو بھی ہو، میں اس لونڈے کو قتل کر کے چھوڑوں گا!" سپاہی نے اعلان کیا۔

سموری نے کپتان کے میٹ سے کچھ کہا۔ جہازیوں نے مجمع کو منتشر کر دیا اور جب کوئی نہ رہا تو سموری نے سپاہی سے پوچھا:

"یہ کہو کہ تمھارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے!"

اس نے کوئی جواب نہ دیا، مجھے ڈراونے طریقے سے دیکھتا رہا اور ساتھ ہی ساتھ اپنے کو ضبط کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

سموری نے ڈانٹ کر کہا: "ابے شیطان چپ رہتا ہی یا نہیں"

سپاہی نے جواب میں کہا "جناب، یہ بے ملک کی نوابی کس برتے پر!"

اس بے تکے جواب نے خانساماں کا مُنہ بند کر دیا۔ اُس کی رگوں کا اُبھار اُتر گیا۔ اور وہ حقارت سے تھوک کر مجھے لیے ہوئے وہاں سے ہٹ گیا۔ میری حالت نہایت مضحکہ خیز تھی اور میں سموری کے پیچھے چلتے چلتے مُڑ مُڑ کر سپاہی کو دیکھتا جاتا تھا۔ سموری نے تفکر آمیز لہجے میں کہا:

"کس جنگلی سے واسطہ پڑا ہی۔ تمھاری کیا رائے ہی؟"

اتنے میں سرجی دوڑا ہُوا آیا اور آہستہ سے کہا:
"وہ تو خودکشی پر آمادہ ہی"
"کہاں ہی وہ نابکار؟" یہ کہہ کر سموری بھاگا۔
داروغہ کی کوٹھری کے آگے سپاہی بڑا سا چھرا ہلاتے ہوئے کھڑا تھا۔ اُس چُھرے سے مرغیوں کو ذبح کرنے اور لکڑی چھیلنے کا کام لیا جاتا تھا وہ بالکل کُند ہوگئی تھی اور اس میں آری کے سے دندانے بن گئے تھے آس پاس لوگ کھڑے اس مسخرے کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ اس کے نتھنے پھڑک رہے تھے، دہانا لٹکا ہُوا تھا، ہونٹ کانپ رہے تھے اور وہ چیختا جاتا تھا: "ظالم ہیں، سب ظالم ہیں!"
جب وہ پتلون کے اندر قمیص کھونسنے لگا تو کسی نے مجھے مخاطب کرکے کہا:
"یہ شخص خودکشی کرنے چلا ہی، اور اسے اندیشہ ہی کہ کہیں پتلون نیچے نہ اُتر جائے!"
ہنسی کے مارے سب کا بُرا حال تھا۔ کسی کو گمان بھی نہ تھا کہ یہ شخص اپنی جان لے مرے گا اور نہ مجھے اس کا یقین تھا۔ لیکن سموری نے اس کے چہرے کی رنگت تاڑ کر سب کو اپنی توند کے زور سے ڈھکیل دیا اور کہا:۔ "احمقو، جاؤ، منہ کالا کرو!"
وہ اُن سب کو 'احمق' کے لقب سے مخاطب کرتا تھا۔ اسے ہنسی سمجھیے لیکن اس امر میں کیا شک تھا کہ یہ سب صبح سے لے کر شام تک کوئی ایسا فعل نہ کرتے تھے جسے احمقانہ نہ کہا جائے۔ جب سب چلے گئے تو سموری نے سپاہی کا ہاتھ تھام کر کہا:۔

"لاؤ یہ چھرا مجھے دے دو۔"

چھرا میرے سپرد کر کے خانساماں سپاہی کو اس کی کوٹھری میں پہنچا آیا۔

"اب چپکے سے پڑ کر سو جاؤ۔ کیا تم پر کوئی بھوت سوار ہے؟"

سپاہی سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

"لڑکا تمھارا کھانا اور تھوڑی سی شراب لاتا ہے ووڈکا پیتے ہو؟"

"کبھی کبھی پی لیتا ہوں۔"

"دیکھو لڑکے کو ہاتھ نہ لگانا۔ اس بیچارے نے تو تمھارا کچھ نہیں بگاڑا۔ میرے قول پر یقین کرو۔"

"یہ کمبخت میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں؟"

سموری نے روکھے پن سے کہا: "میں کیا تبلاؤں؟"

باورچی خانے میں آ کر وہ کہنے لگا:

"ان بیہودوں کے ہاتھ یہ کاٹھ کا الّو خوب پھنسا! بیچارا اللہ میاں کی گائے ہے۔ لڑکے - اچھے خاصے آدمی کو پاگل بنا دینا کچھ مشکل نہیں۔ اسے دق کیے جاؤ اور رفتہ رفتہ وہ باولا ہونے لگے گا۔"

جب میں روٹی، گوشت اور دارو لے کر کوٹھری میں گیا تو سپاہی اسی کونے میں بے حس و حرکت بیٹھا ہوا عورتوں کی طرح چپ چپ رو رہا تھا

سینی میز پر رکھ کر میں نے کہا:

"آؤ کچھ کھا لو۔"

"دروازہ بند کر دو۔"

"پھر تو بڑا اندھیرا ہو جائے گا۔"

"نہیں بند کر دو، ورنہ وہ سب اندر گھس آئیں گے۔"

کھانا رکھ کر میں چلا آیا۔ سپاہی کی شکل دیکھ کر میں بےچین ہو جاتا تھا کیونکہ میرا دل ترس اور رحم سے بھر آتا اور میں اُداس ہو جاتا۔ نہ جانے کتنی مرتبہ نانی کی زبانی میں یہ سُن چکا تھا:۔

"کسی کو مصیبت زدہ پاؤ تو اُس پر ترس کھاؤ۔ ہم سب کسی نہ کسی صورت میں درد کے مارے ہوئے ہیں۔ زندگی سب کے لیے اجیرن ہے۔"

سموری نے پوچھا: "کھانا پہنچا آئے؟ سپاہی کیا کر رہا تھا؟"

"مجھے اس پر بڑا رحم آیا۔"

"لونڈے! تجھے کیا ہو گیا ہے؟"

"ایسے آدمیوں پر رحم کیسے نہ آئے؟"

سموری نے چمکار کر مجھے پاس بٹھلا لیا:۔

"رحم کا جذبہ بےکار نہیں جاتا، لیکن اس کا ذکر فضول ہے۔"

پھر مجھے جھٹک کر وہ یک بیک بول اُٹھا:

"یہ تیرے رہنے کی جگہ نہیں۔ لے، سگریٹ پی۔"

مسافروں کے وحشیانہ رویے کا مجھ پر ایسا اثر ہوا کہ بیان نہیں کر سکتا سپاہی کو جس طرح اُنھوں نے دق کیا اس میں ایک غیر انسانی پہلو تھا اور اس کے غم پر وہ جس خوشی کا اظہار کر رہے تھے، اس سے درندگی کی بو آتی تھی۔ کسی کو تنگ کر کے خوش ہونے میں جنھیں مزا ملے انھیں کیا کہا جائے! اور انسان انسان کے دُکھ پر خوش کیسے ہو سکتا ہے؟

اب کیا دیکھتا ہوں کہ یہ سب بھلے مانس شامیانوں کے نیچے خم لنڈھا رہے ہیں یا تاش کھیل رہے ہیں۔ کئی تو سنجیدگی سے دانائی کی باتیں بھی کر رہے تھے اور کچھ ندی کا نظارہ اس طرح کر رہے تھے کہ وہم بھی

نہ ہو سکتا تھا کہ ابھی ابھی یہ لوگ سڑیوں کی طرح تالیاں پیٹنے اور سیٹی بجانے میں مصروف تھے۔ حسب دستور وہ سب نٹھلے بن میں وقت کاٹ رہے تھے۔ صبح سے شام تک وہ اگن بوٹ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک یوں مٹرگشت کرتے جیسے سورج کی کرن میں مٹی کے ذرے اوپر نیچے آ جا رہے ہوں۔ ہر گھاٹ پر آٹھ آٹھ دس دس کے غول سامان سے لدے پھندے نیچے اُتر جاتے اور ان کی جگہ لینے کے لیے انھیں کے قماش کے آدمی بوٹ پر سوار ہو جاتے۔

لیکن اس آوا جائی کا ہماری زندگی پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ آنے والوں کی گفتگو کے موضوع بھی وہی ہوتے جو جانے والوں کے تھے — زمین مزدوری، خدا، عورت اور اسی قسم کی چیزیں۔ اور ان کے بیان کا انداز بھی بندھا بندھایا ہوتا۔ "یہ مشیت ایزدی ہے کہ ہم مصایب برداشت کریں۔ صبر و شکر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اپنی اپنی قسمت ہے۔"

ایسی باتیں سن کر مجھے بُرا بھی لگتا اور غصہ بھی آتا۔ مجھے ہر قسم کی گندگی سے نفرت تھی اور اسی طرح اپنی ذلت یا توہین کو میں ہرگز برداشت نہ کر سکتا تھا۔ آخر میں نے کسی کا بگاڑا کیا تھا اور نہ وہ بے گناہ سپاہی اس بے غیرتی کا مستحق تھا۔ ہنسی ہنسی میں بیچارے کی یہ دُرگت ہو گئی۔

میکسم جیسا نیک دل تو نکال دیا گیا اور سرجی جیسا بدباطن جہاز پر رہ گیا۔ حیرت کا مقام تو یہ تھا کہ یہی مسافر جو کسی سیدھے سادے آدمی کو ستا ستا کر دیوانہ بنا دیں۔ جہازیوں کی گالی گلوج کے آگے چپ ہو جاتے تھے اور ان کی ڈانٹ ڈپٹ کا اُن سے کوئی جواب نہ بن

پڑتا تھا۔

سارنگ نے اپنی حسین مگر شریر آنکھیں چمکاکر آواز دی: "ارے تم لوگ عرشے پر کیوں جمگھٹ لگائے ہوئے ہو۔ اگر بوٹ جھونکا کھائے گا تو سب اُلو کے پٹھے پانی میں دفن ہو جائیں گے۔"

"اُلو کے پٹھے" دُم دباکر دوسرے عرشے کی طرف سدھارے لیکن وہاں سے بھی انھیں یوں ہانک دیا گویا وہ سب بھیڑ بکری ہوں۔

"پھٹکار ہی تم پر نابکارو!"

گرمیوں میں لوہے کے نمگیرے دن بھر دھوپ میں تپ کر رات کو آگ برسانے لگتے اور ان کے نیچے لیٹنا قیامت تھا۔ مسافر کیڑے مکوڑوں کی طرح عرشے میں نکل آتے اور جہاں جگہ ملتی پڑ جاتے۔ مگر ہر گھاٹ پر جہازی انھیں لوہے کی چھڑوں سے جگا دیتے: "راستہ روکے کیوں پڑے ہو جی؟ اپنے بل میں جاکر کیوں نہیں سوتے؟"

نیند کے مارے گرتے پڑتے یہ لوگ اپنی اپنی راہ چلے جاتے تھے۔ جہازی کچھ اُن سے اونچے طبقے کے نہ تھے۔ کپڑے مختلف ہونے سے کیا ہُوا۔ اس کے باوجود وہ مسافروں پر پولیس والوں کی طرح دھونس جماتے تھے۔ بظاہر یہ لوگ بڑے دبّو اور ڈرپوک تھے۔ لیکن اسی بزدلی کے خول سے ہنگامہ پروری اور بے معنی بیرحمی کی چنگاری نکلتی اور اس میں لطف کا کوئی پہلو نہ ہوتا۔ یوں محسوس ہوتا کہ خود انھیں اپنی منزل کا پتا نہیں۔ انھیں اس کی مطلق پروا نہ تھی کہ وہ کس جگہ بوٹ سے اُتار دیے جائے ہیں۔ کنارے پر اُتر کر وہ گھڑی دو گھڑی ٹھہرتے اور پھر اسی یا کسی اور بوٹ پر سوار ہو کر سفر پر روانہ

ہو جاتے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ سب گم کردہ راہ ہیں، ان کا کوئی نہیں ہے اور یہ دُنیا اُن کے لیے کوئی انوکھی جگہ ہے۔ ان میں سے ہر ایک اوّل درجے کا بزدل تھا۔

ایک مرتبہ کیا ہُوا کہ آدھی رات بیتے مشینوں میں کوئی چیز بھٹی اور توپ دغنے کی سی آواز ہوئی۔ عرشے میں دھنواں ہی دھنواں ہو گیا اور انجن خانے کے ہر سوراخ سے دھنوئیں کے بادل اُٹھنے لگے۔ کسی نے اندھیرے میں سے چیخ کر کہا:۔

"جلدی سے لال سیسہ اور فلیتہ تو لانا!"

میں انجن خانے کے پاس ہی اس میز پر سوتا تھا جس پر برتن دھوئے جاتے تھے۔ دھماکے اور دھکے نے مجھے جگا دیا۔ عرشے پر سنّاٹا تھا انجن گویا زور سے سسک رہا تھا اور بڑی درپی ہتوڑے کی آواز آ رہی تھی۔ اتنے میں یک بیک سب مسافر ایک ساتھ چلّانے لگے اور پھر جو ماجرا دیکھا وہ نہایت حیران کن تھا۔

کُہر کی ہلکی سی سفید چادر کو چیر کر بکھرے ہُوئے بالوں والی عورتیں اور مچھلیوں کی سی گول گول آنکھوں والے مرد ہر طرف دوڑنے لگے۔ بقچے، صندوق بیگ اٹھائے گرتے پڑتے، ایک دوسرے کو کچلتے اور خدا کی دُہائی دیتے ہوئے کُہرام مچانے لگے۔ بڑا خوفناک منظر تھا ––– اور ساتھ ساتھ دلچسپ بھی۔ میں تو ان کے پیچھے یہ دیکھنے کے لیے لپکا کہ اب یہ خُدا کے بندے کیا کرتے ہیں۔

زندگی میں ہنگامۂ شب کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ لیکن میں فوراً سمجھ گیا کہ مسافروں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ بوٹ کی رفتار سست نہ ہوئی تھی،

اور آنکھوں کے سامنے بچاؤ پیٹی[1] کی قطار لگی ہوئی تھی ۔ چودھویں کا چاند نور پاشی کر رہا تھا ۔ تاہم مسافر سارے عرشے پر وحشیوں کی طرح اُچھل کود رہے تھے اور ان کا ہاتھ بٹانے کے لیے بچے کھچے لوگ بھی وہاں آ دھمکے تھے ۔ ایک پانی میں کود پڑا ، پھر دوسرا ، پھر تیسرا ! ایک پادری اور دو کسانوں نے ایک بنچ پر وہ ڈنڈے برسائے کہ اس کے پرخچے اُڑ گئے ۔ کسی نے مرغیوں کو ڈربے سمیت اٹھا کر پانی میں پھینک دیا ۔ عرشے کے بیچوں بیچ کپتان کے لیے جو سیڑھیاں تھیں ، ان کے سامنے ایک کسان سر پٹک پٹک کر بھیڑیے کی طرح غرّانے لگا :-

"میں گنہگار ہوں ـــــ"

ایک موٹے میاں جن کے جسم مبارک پر خیر سے پاجامے کے سوا اور کچھ نہ تھا ، اپنا سینہ کوٹ کر آواز لگانے لگے !

"کافرو ڈونگیوں پر سوار ہو جاؤ !"

دیکھتے ہی دیکھتے جہازی دوڑے آئے ، لوگوں کی گردن ناپ کر ان کی کھوپڑیوں کو ناریل کے پھلوں کی طرح ٹکرّ دی اور انھیں فرش پر پٹک دیا ۔ سموری بھی رات کے کپڑے پہنے اوور کوٹ ڈالے ٹھمک ٹھمک کرتا وہاں آیا اور یوں لکچر بگھارنے لگا :

"اگر ذرا بھی غیرت باقی ہی تو چلّو بھر پانی میں ڈوب مرو ۔ آخر تم نے یہ کیا اُدّھم چوکڑی مچا رکھی ہی ؟ بوٹ کھڑا تو نہیں ہوا ؟ اس کی رفتار میں فرق تو نہیں آیا ؟ اور کنارا بھی کچھ دور نہیں ، وہ سامنے نظر آ رہا ہی ۔ جو احمق پانی میں کود پڑے ، ان کے لیئے بچاؤ پیٹی پانی

(۱) LIFE BELT وہ پیٹی جسے کمر میں کس لینے سے ڈوبتے نہیں ۔

ہیں اُتار دی گئی ہے اور اُن کی جان بچانے کی ذمہ داری ہم پر ہے۔ وہ دیکھو دو ڈونگیاں ——"

یہ کہ کر وہ تیسرے درجے کے مسافروں کی چندیا یوں سہلانے لگا کہ وہ فرش چومتے نظر آئے۔

ابھی یہ ہنگامہ فرو نہ ہُوا تھا کہ ایک بیگم صاحبہ سموری کے سر پر آ سوار ہوئیں اور چیخ سے اسے دھمکا کر فرمانے لگیں: "ارے تیری یہ ہمت؟"

ایک صاحب نے جو پانی میں شرابور ہو رہے تھے اس کا ہاتھ تھام کر اور اپنی موچھوں کو چوس کر چڑچڑے پن سے کہا:۔

"بیوقوف کہیں کی اُسے ہاتھ نہ لگانا!"

سموری تو حیرت کا پُتلا بن کر رہ گیا۔ مجھ سے پوچھنے لگا:

"بھئی بات کیا ہے؟ یہ عورت چاہتی کیا ہے؟ میں نے تو اسے پہلے کبھی دیکھا بھی نہیں! یہ ایک ہی رہی۔"

ایک کسان جس کی ناک سے لہو ٹپک رہا تھا چلایا:

"انھیں انسان کون کہتا ہے، ڈاکو ہیں ڈاکو!"

اس سے پہلے میں بوٹ پر دو بار ایسی ہی گڑبڑ دیکھ چکا تھا اور دونوں مرتبہ مسافروں کو دھوکا ہوا تھا۔ تیسری بار مسافروں نے دو چور پکڑے۔ ان میں سے ایک پردیسیوں کے لباس میں تھا گھنٹہ بھر چوروں کی پٹائی ہوتی رہی اور جہازیوں کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ جب بمشکل تمام جہازی چوروں کو ان کے ہاتھ سے چھڑا لے گئے تو مسافر بڑبڑانے لگے: "چور چور موسیرے بھائی۔ جہاز والے کون سے شریف ہیں، جو ان بدمعاشوں کا ساتھ نہ دیں۔"

چوروں کی ایسی مرمت ہوئی کہ وہ بیہوش ہو گئے تھے جب اگلے گھاٹ پر انھیں پولیس کے حوالے کیا گیا تو وہ اپنے پیروں پر کھڑے بھی نہ ہو سکتے تھے۔

اور بھی کئی موقعے آئے جب میرے جذبات بیحد مشتعل ہوئے اور سمجھ میں نہ آیا کہ لوگ اچھے ہیں یا بُرے، شریف ہیں یا شریر۔ میں یہ بھی نہ سمجھ سکا کہ وہ کس وجہ سے اتنے بے مہر ہیں، اور کسی پر مہربانی کرتے انھیں شرم کیوں آتی ہے۔

میں نے سموری کے آگے یہ مسئلہ پیش کیا۔ لیکن اس نے دھنوئیں کا بادل اُڑاتے ہوئے بگڑ کر کہا:

"تم نے یہ کیا بکواس مچا رکھی ہے؟ آخر دو ولپے جو ٹھہرے۔ کوئی دانا ہے۔ کوئی نادان۔ بس علم حاصل کیے جاؤ اور زبان پر لگام لگائے رکھو۔ اگر اچھی کتابیں ہاتھ لگ جائیں تو تمھارے سب سوالوں کا جواب مل جائے گا"

میں نے اُسے خوش کرنے کے لیے کتابوں کا تحفہ دینے کی ٹھانی چنانچہ کزان میں میں نے پانچ پیسے میں "پیٹر دی گریٹ کو بچانے والے سپاہی کی کہانی" خریدی۔ بدقسمتی سے اس وقت خانساماں کے مزاج بگڑے ہوئے تھے اور وہ شراب پی رہا تھا، اس لیے میں اکیلے وہ کتاب پڑھنے لگا۔ اس کی عبارت اتنی دلچسپ اور آسان تھی کہ میں اس میں کھو گیا مجھے یقین تھا کہ اسے پڑھ کر میرا اُستاد بھی بہت محظوظ ہوگا۔ لیکن جب میں نے یہ ہدیۂ عقیدت پیش کیا تو اس نے بے کچھ کہے سُنے اسے پھاڑ کر پانی میں پھینک دیا۔

درشتی سے وہ بولا: "چغد کہیں کے، یہ رہی تیری کتاب! دن

رات اسے توتوں کی طرح سبق رٹائے جاؤ اور یہ ہی کہ پھر لے دے کر چاند کی اماں کے قصّوں پر آجاتا ہی!" پانوٹیک کر وہ زور سے گرجا: "مجھے ایسی بیہودہ کتابوں سے کیا واسطہ! اس میں جو کچھ لکھا ہی کیا وہ حقیقت پر بنی ہی؟ بتا تو سہی؟"

"میں کیا جانوں؟"

"ابے، میں تو جانتا ہوں۔ اگر کسی کا سر کٹ جائے تو اس کا دھڑ ہوا میں نہیں کھڑا رہتا، زمین پر گر پڑتا ہی اور اس کا ساتھی کھلیان میں کیوں چھپنے لگا؛ سپاہی ایسے گدھے نہیں ہوتے۔ کوئی کھلیان میں آگ لگا دیتا تو بچّو کا پتا بھی نہ چلتا۔ سمجھ میں آیا؟"

"جی ہاں۔"

"ہوں۔ مجھے زار پیٹر کا رتی رتی حال معلوم ہی اور اس کتاب میں جو کچھ لکھا ہی سفید جھوٹ ہی۔ چل منہ کالا کر۔"

خانساماں کی منطق کو تو میں مان گیا لیکن کتاب کی کشش بہر حال باقی رہی۔ میں نے یہ قصّہ پھر سے خریدا اور پڑھا۔ لیکن عجب، کہ اب کے معلوم ہوا کہ در اصل وہ واہیات ہی۔ میں سخت حیران ہوا اور اس واقعے کے بعد خانساماں کی عزّت میرے دل میں دُگنی ہو گئی۔ ایک وہ تھا کہ دن رات ناک بھوں چڑھائے ایک گت سے یہی کہے جاتا کہ:

"تجھے بہت کچھ سیکھنا ہی! یہ جگہ تیرے رہنے کی نہیں۔"

میں بھی جانتا تھا کہ مجھے یہاں وقت نہ گنوانا چاہیے۔ مجھ سے سرجی کا برتاؤ بہت بُرا تھا کئی بار میں نے دیکھا کہ چائے کے پیالے یا چمچ چُرا کر وہ مسافروں میں بانٹ رہا ہی۔ یہ تو صریحًا چوری تھی۔ سموری مجھے جتا چکا تھا

کہ اپنی میز کے برتن دوسرے خدمت گاروں کے حوالے نہ کرنا۔

اب یہاں رہنا میرے لیے وبال ہوگیا اور میں بوٹ سے نکل کر جنگل کی طرف بھاگنے کو تڑپنے لگا، لیکن سموری مجھے روکے رہا۔ وہ مجھ سے زیادہ شفقت سے پیش آنے لگا اور جہاز کی ہنگامہ پرور زندگی بھی مجھ پر جادو کرنے لگی۔ بندرگاہوں میں تو مجھے کوئی لطف نہ آتا اور میں ہمیشہ کسی چلت پھرت کے انتظار میں رہا کرتا۔ جی چاہتا کہ جہاز ہمیشہ حرکت میں رہے اور ہر روز نئے شہروں اور نئے لوگوں کا تماشہ ہو۔ لیکن یہ زندگی زیادہ عرصے تک کیوں کر چل سکتی تھی۔ اس کا سلسلہ ایک دن اچانک ٹوٹ گیا۔ ہم کزان سے نجنی کی طرف جارہے تھے۔ شام کو داروغہ نے مجھے بلایا اور میرے آنے کے بعد دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ سموری منہ بنائے چوکی پر بیٹھا تھا۔ اسے مخاطب کرکے داروغہ نے کہا:

"یہ ہی تمہارا شعلچی"

سموری نے سختی سے پوچھا: "کیا تم نے چائے یا کھانے کے برتن سرجی کو دیے ہیں؟"

"وہ میری غیر حاضری میں خود برتن اُٹھالے جاتا ہے"

داروغہ نے کہا: "اگر یہ موجود نہ ہوتا تو اسے معلوم کیوں کر ہوتا"

سموری نے ٹانگیں کھجاتے ہوئے کہا:

"جواب دینے سے پہلے اچھی طرح سوچ لو"

میں سوچ میں پڑگیا۔ داروغہ چشمے کے اندر سے مجھے گھور رہا تھا۔ اور گمان ہوتا تھا کہ اس کے آنکھیں ہیں ہی نہیں۔

داروغہ کبھی شور نہ مچاتا تھا۔ وہ آہستہ چلتا اور زیرلب بولتا۔ گاہے

گا ہے کسی سوراخ سے اُس کی جُگّی ڈاڑھی اور بے نور آنکھیں ہویدا ہوتیں اور دم کے دم میں غایب ہوجاتیں۔ سونے سے پہلے وہ شہ نشین کے آگے بہت دیر دو زانو بیٹھا رہتا۔ دروازے کی دراڑ سے میں دیکھتا تو اس پر کسی سیاہ پلندے کا دھوکا ہوتا۔ مجھے یہ راز نہ معلوم ہو سکا کہ وہ دعا کس طرح مانگتا ہے کیونکہ وہ بیٹھے ہوئے شہ نشین کو تاکنے، ٹھنڈی سانس بھرنے اور ڈاڑھی کھجانے کے سوا اور کچھ نہ کرتا تھا۔

زرا دیر ٹھہر کر سموری نے سوال کیا:

"سرجی نے کبھی تمھیں پیسے دیے تھے؟"

"نہیں۔"

"کبھی نہیں؟"

"جی نہیں، کبھی نہیں۔"

سموری نے داروغہ سے کہا: "یہ لڑکا کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔"

لیکن وہ کمبخت بولا: "بات ایک ہی ہے۔"

"اِدھر تو آنا!" خانساماں نے کہا۔ لیکن وہ خود میرے قریب آیا اور سر کو تھپک کر بولا:

"نادان کہیں کے! اور میری عقل پر بھی تو پتھر پڑ گئے تھے۔ مجھے تیری خبرگیری کرنا چاہیے تھی۔"

نتیجہ میں داروغہ نے مجھے برخاست کر دیا۔ مجھے آٹھ روبل ملے۔ اب تک اتنی بڑی رقم میں نے نہ کمائی تھی۔

سموری نے رخصت کے وقت کہا:

"دنیا میں آنکھیں کھول کر رہنا ہوگا۔ مُنہ کھول کر سفر کرنا پڑے درجے

کی حماقت ہی۔"

کالی پوت کی بنی ہوئی تمباکو رکھنے کی تھیلی اس نے یادگار کے طور پر مجھے دی: "عمدہ قسم کا ہاتھ کا کام ہی۔ میری مُنہ بولی بیٹی نے میرے لیے بنایا تھا۔ اچھا، الوداع، کتابیں پڑھا کرو۔ ان سے بڑا مُعلّم کوئی نہیں۔"

مجھے گود میں اٹھاکر اس نے پیار کیا۔ مجھے اس پر اور اپنے آپ پر بڑا ترس آیا۔ جب وہ قلیوں کو دھکیل کر اپنے بھاری بھرکم جسم کے ساتھ اگن بوٹ پر چڑھنے لگا تو مجھے بے اختیار رونا آگیا۔ بعدازاں اس جیسے کئی آدمیوں سے میں دوچار ہُوا۔ جو اپنی نیکی کے باوجود دنیا میں اکیلے ہوتے ہیں اور دوسروں کی زندگی سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

باب (۷)

نانا اور نانی از سرِ نو شہر میں رہنے لگے تھے۔ جب میں ان کے پاس گیا تو غصّے کے مارے میرا خون کھول رہا تھا۔ لیکن میرا دل اُداس تھا مجھ پر چوری کا الزام کیوں لگایا گیا تھا۔

نانی نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا اور فوراً چائے کی کیتلی آگ پر چڑھا دی نانا جان نے حسب عادت طعنہ دے کر کہا:

"کچھ بچایا بھی یا سب اُڑا دیا؟"

کھڑکی کے پاس بیٹھتے ہوئے میں نے جواب دیا: "جو کچھ میرے پاس ہی وہ میری ملکیت ہی۔" اس کے بعد جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکال کر میں فاتحانہ انداز سے دھوئیں کے چکر بنانے لگا۔

نانا نے مجھ پر نگاہیں گاڑ کر کہا: "سبحان اللہ، یہ ماجرا ہی! تم نے یہ شیطانی چرخہ کب سے شروع کیا ہی؟ کر آمدی و کہ پیر شدی!"

میں نے شیخی سے کہا: "مجھے تو تحفے میں تمباکو کی تھیلی بھی ملی ہی!"

نانا نے چُرمرا کر کہا: "تمباکو کی تھیلی؟ یہ تو تیری گپ ہی مجھے چڑانے کو کہہ رہا ہی، ایں؟"

اپنے پتلے مگر مضبوط ہاتھ پھیلائے اور ہری آنکھیں گاڑ کر وہ مجھ پر جھپٹا۔ لیکن میں نے دبک کر اپنا سر اس کے پیٹ سے یوں ٹکرایا کہ بڑے میاں فرش پر نظر آئے۔ دیر تک وہ حیرت سے مُنہ کھولے مجھے دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ پھر آہستہ سے بولے:

"تو نے اپنے نانا کو یعنی مجھے گرا دیا؟ اپنی ماں کے باپ کو!"
اپنے کرتوت کی نوعیت سمجھے بغیر میں نے جواب دیا:
پُرانے زمانے میں آپ مجھے سیکڑوں بار ٹپک چکے ہیں۔"
ہلکے پھلکے نانا جان زمین سے اُٹھ کر میرے پاس آ بیٹھے۔ اور پھرتی سے سگریٹ میرے ہاتھ سے چھین کر کھڑکی کے باہر پھینک دیا پھر گھبرائی ہوئی آواز میں کہا:
"پاگل کہیں کے؛ تو جانتا نہیں کہ تا عمر اس گناہ کا انتقام خدا تجھ سے لیتا رہے گا؟ پھر نانی کو مخاطب کر کے کہا: "بڑی بی تم نے نہیں دیکھا؟ اس نے مجھے گرا دیا، پٹک دیا! مُنا کچھ۔ اسی سے پوچھ دیکھو۔"
نانی نے اُلٹ کر پوچھا بھی نہیں، بال پکڑ کر مجھے پیٹنا شروع کیا اور ہر لپڑ کے ساتھ کہتی گئی:
"اس کی سزا یہ ہے — یہ ہے۔"
چوٹ تو نہ آئی، لیکن یہ میری سخت توہین تھی، خصوصًا نانا کے قہقہے تو زہر لگ رہے تھے۔ یہ حضرت ایک کرسی پر اُچک گئے اور تالی پیٹ پیٹ کر کہنے لگے:
"بہت ٹھیک — بہت ٹھیک۔"
میں اپنے کو چھڑا کر سایبان میں بھاگا اور ایک کونے میں جا کر پڑ گیا اور ذلت اور اذیت کے عالم میں سماوار کی گنگناہٹ کو سننے لگا۔
تھوڑی دیر بعد نانی میرے پاس آئی اور جھک کر کان میں کہا:
"بیٹے، کوئی خیال نہ کرنا کیونکہ میں نے تجھے کوئی چوٹ تو نہیں پہنچائی مجھے تجھ پر خفا ہونا پڑا کیونکہ بڑے میاں اب ضعیف ہو گئے ہیں۔ ان کی

دلجوئی لازم ہے۔ انھوں نے اپنی ہڈی پسلی توڑلی ہے اور دکھ انھیں گھن کی طرح کھا رہا ہے۔ تم کبھی انھیں رنج نہ پہنچانا۔ تم اب کوئی دودھ پیتے بچے نہیں میری نصیحت کو یاد رکھنا۔ ادیشا، بڑے میاں کی حالت بچوں کی سی ہوگئی ہے۔"

اس کی باتوں نے مرہم کا کام کیا۔ مجھے اپنے کیے پر شرم آئی اور دل کے غبار کو دھوکر میں نے اسے گرمجوشی سے گلے لگالیا۔ ہم نے ایک دوسرے کو پیار کیا۔ پھر نانی نے کہا:

"جاکر ان کے پاس بیٹھو۔ وہ کچھ نہ کہیں گے، ہاں ان کے آگے سگریٹ نہ پینا۔ رفتہ رفتہ وہ اس کے بھی عادی ہوجائیں گے۔"

جب کمرے میں آکر میں نے نانا کی طرف نظر دوڑائی تو بے ساختہ ہنس پڑا۔ اب وہ بچوں کی طرح خوش تھا۔ اس کا چہرا کھلا ہوا تھا اور وہ ٹانگیں ہلاتے ہوئے انگلیوں سے اپنے لال بال سلجھا رہا تھا۔

"کیوں بے بکرے مجھے پھر سینگ مارنے آیا ہے! واہ رے ڈاکو ہے نا اپنے باپ کا بیٹا! کافر کہیں کے! گھر آکر صلیب کا نشان بنانا تو دور رہا، جھٹ سگریٹ پینے لگا۔ ہت تیرے بونا پارٹ کی دم میں کھٹ کھٹا! تین پیسے کا لونڈا!"

میں دم سادھے رہا۔ بڑے میاں کے الفاظ کا ذخیرہ ختم ہوچکا تھا اور سانس بھی پھول چکا تھا لیکن چائے کے وقت اس نے پند و نصیحت کا دفتر کھولا۔

"خوف خدا انسان کے لیے ضروری ہے، اسے منہ زور گھوڑے کی لگام سمجھو۔ خدا کے سوا ہمارا دنیا میں کوئی دوست نہیں۔ آدمی آدمی

کا دشمن ہے۔" اس آخری جملے سے تو مجھے اتفاق تھا لیکن اور باتوں سے مجھے کوئی سروکار نہ تھا۔

"اب تم متر بنا خالہ کے گھر کی راہ لو۔ جاڑے کے دن وہیں کاٹو اور بہار میں پھر کسی اگن بوٹ پر ملازم ہو جاؤ۔ متر بنا کے گھر والوں سے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ بہار میں چمپت ہو جاتا ہے۔"

"اسے دھوکے بازی کیوں سکھاتے ہو" نانی نے بات کاٹ کر کہا۔ حالانکہ ابھی ابھی وہ نانا کی آنکھ میں دھول جھونکنے کے لیے مار پیٹ کا سوانگ رچ چکی تھی

نانا نے فتویٰ دیا: "جھوٹ بغیر اس دنیا میں گزارہ نہیں۔ کہو تو سہی کہ دوسروں کو دھوکا دیے بغیر کون زندہ رہ سکتا ہے؟"

شام کو جب نانا نماز میں مصروف تھے، میں نانی کے ساتھ کھیت کی طرف نکل گیا۔ جس جھونپڑی میں ہم رہتے تھے وہ شہر کے باہر تھی اور اس جگہ کے پاس تھی جہاں کبھی نانا کا اپنا مکان تھا۔

نانی نے ہنس کر کہا: "لو بھئی، جہاں تھے، گھوم پھر کر وہیں آ گئے۔ بڑے میاں کو تو مرتے دم بھی کسی کروٹ چین نہیں، ان کے پیروں میں تو چکر ہے۔ یہ جگہ بھی انھیں ناپسند ہے لیکن مجھے تو اچھی لگتی ہے۔"

میلوں تک کھیتوں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ ان کے بیچ بیچ میں کھائیاں تھیں اور ایک طرف انھیں جھاڑیاں اور دوسری طرف شاہراہ کے درخت گھیرے ہوئے تھے۔ کھائیوں کے کنارے گھاس اُگ آئی تھی اور اس کے تنکوں کو ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنیں لالہ زار بنا رہی تھیں۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے انھیں ہلا ڈلا رہے تھے۔ پاس کی پگڈنڈی پر شہر کے لڑکے

لڑکیاں چل پھر رہے تھے - داہنی طرف دور جاکر قبرستان کی چہار دیواری تھی - بائیں طرف پیڑوں کے جھرمٹ میں یہودیوں کی قبرگاہ چھپی ہوئی تھی۔ آس پاس کی بستی جس سے مفلسی ٹپکتی تھی - زخمی زمین کے آگے سجدہ ریز تھی شہر کے باہر جو چھوٹے چھوٹے مکان تھے وہ اپنی تنگ کھڑکیوں سے گویا سہمے ہوئے خاک آلودہ راستوں کو تاکا کرتے تھے - سڑکوں پر میلی اور بھوکی مرغیاں پھرا کرتی تھیں - خانقاہ کی طرف ڈکراتی ہوئی گائیں جا رہی تھیں - چھاؤنی سے فوجی موسیقی کی آواز آ رہی تھی -

ایک شرابی سے مڈبھیڑ ہوئی جو ہارمونکا باجا لیے ہوئے تھا - لڑکھڑا کر متوالی آواز میں وہ بولا :

"میں ضرور تیرے پاس آؤں گا — خواہ اِدھر کی دنیا اُدھر ہوجائے"

دھوپ میں آنکھ مچمچاتے ہوئے نانی نے کہا :

"نا سمجھ، تو جا کہاں رہا ہے - گھڑی بھر میں گر کر کسی کھائی میں پڑ رہے گا، اور نیند میں تیرا سارا مال چوری ہوجائے گا - یہ ہارمونکا، جو تیرا دل بہلاتا ہے، یہ بھی تیرے پاس نہ رہے گا"

میں نے نانی کو اگن بوٹ کے سب حالات سنائے، وہاں کے ہنگامے کے بعد یہاں کی بے لطفی مجھے مطلق گوارا نہ تھی - نانی خاموشی اور غور سے میری باتیں سنتی رہی، ویسے ہی جیسے میں اس کی باتیں سنتا تھا - جب میں نے سموری کا ذکر چھیڑا تو نانی نے صلیب کا نشان بنا کر کہا :

"وہ نیک دل ہے خدا کی ماں اس کی نگہبان ہو - وہ دراصل شریف

ہی۔ تم اسے کبھی نہ بھولنا۔ اچھائی کو ہمیشہ یاد رکھنا اور بُرائی کو بھول جانا۔"
یہ کہتے مجھے بڑی شرم آئی کہ بوٹ سے نکالا کیوں گیا لیکن جی کڑا کر کے
میں نے یہ بھی سنا دیا۔ نانی نے اس کا کوئی اثر قبول نہ کیا۔ بس اتنا کہا:

"تم ابھی کم عمر ہو، تمھیں جینے کا اندازہ نہیں آیا۔"

"سب لوگ ایک دوسرے سے یہی کہتے ہیں، تمھیں جینا نہیں آتا۔ کسان، جہازی، مترنیا خالہ اور اس کا بیٹا۔ لیکن جینے کا ڈھب کیوں کر آتا ہی؟"

نانی نے ہونٹ کاٹ کر سر ہلایا:

"خود مجھے نہیں معلوم۔"

"پھر بھی آپ دوسروں کی سی نکتہ چینی کرتی ہیں؟"

"کیوں نہیں۔ میاں بُرا نہ ماننا۔ تم ابھی بچے ہی ہو، دنیا کو کیا سمجھو. اور سچ پوچھو تو اس گورکھ دھندے کو کون سمجھ سکتا ہی؟ بدمعاشوں کی بات ہی اور ہی۔ اپنے نانا کو دیکھو، کتنے ذہین اور عالم ہیں، لیکن ان کی عقل بھی کام نہیں کرتی۔

"اچھا یہ تو کہیے کہ آپ نے کیسی زندگی گزاری؟"

"میرا ذکر نہ چھیڑو۔ بھلی بُری گزر ہی گئی، زندگی کا کوئی ایک سانچا نہیں ہوتا۔"

لوگ ہمارے پاس سے آجا رہے تھے اور ان کی لمبی لمبی پرچھائیاں بھی پیچھے ڈگمگا رہی تھیں۔ پیروں کے نیچے سے جو گرد اُٹھتی وہ دھوئیں کی طرح پرچھائیں پر چھا جاتی۔ اب شام کی اُداسی زیادہ بوجھل ہو گئی تھی نانا کی بربڑاہٹ کی صدا کھڑکی میں سے باہر آ رہی تھی۔

"اللہ تجھے تیرے جلال کا واسطہ کہ مجھے اپنے قہر کا شکار نہ بنانا!"
نانی نے مُسکرا کر کہا:
"انھوں نے بھی اللہ میاں کا ناک میں دم کر دیا ہے۔ ہر روز یہی رٹ ہے کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں اور اب کسی چیز کی حاجت نہیں، لیکن جب دیکھو زبان پر شکایت ہے۔ اور کسی نہ کسی کا گلہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ شام کو جب اللہ میاں ان حضرت کی دعا سنتے ہوں گے تو ہنس کر کہتے ہوں گے:
کشرین نے پھر اپنی توتا کہانی شروع کر دی۔
چلو بیٹے، اب سونے کا وقت ہو گیا۔

میں نے فیصلہ کیا کہ گانے والی چڑیوں کو پکڑنے کا پیشہ اختیار کروں۔ مجھے یقین تھا کہ اس سے خاصے پیسے ملا کریں گے۔ میں چڑی ماری کروں اور نانی انھیں بیچ لائے۔ یہ سوچ کر میں نے جال، لاسا، پھندا، پنجرا سب کچھ خرید لیا۔ صبح سویرے میں تو جھاڑی کی ایک کھائی میں جال بچھا کر بیٹھ گیا اور نانی ٹوکری لیے اِدھر اُدھر بچی کھچی شکر قندیاں تلاش کرنے لگی۔

ستمبر کا تھکا تھکایا سورج ابھی ابھی نکلا تھا۔ بادلوں نے اس کی بے نور کرنوں کو چھپا لیا تھا اور وہ ترچھی ہو کر رُپہلی نقاب کی طرح میرے چہرے کو ڈھک رہی تھی۔ کھائی کے اندر اب تک اندھیرا سا تھا اور اس میں سے ہلکی سی کہر اُٹھ رہی تھی۔ اس کا ایک کنارا تو چٹیل تھا لیکن دوسرا گھاس پھوس اور رنگ برنگی پتیوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ جب ہوا چلتی تو پتیاں ہر طرف بکھر جاتیں۔

زمین پر پودوں کے بیچ بیچ میں قمری[1] کی غزل خوانی سن لیجیے۔ مرجھائی

---

(۱) نوٹ اگلے صفحے پر ملاحظہ ہو۔

ہوئی گھاس میں سے بھانت بھانت کے چنچل پنچھی اپنی لال گلال کلغیاں ہلا رہے تھے۔ کہیں چھوٹے چھوٹے توتے پر پھڑپھڑا کر شور پکار مچا رہے تھے اور ان کی حرکتوں کو دیکھ کر شہر کے نوجوانوں کی یاد آتی تھی جو اتوار کے دن بانکے ترچھے بنے پھرا کرتے ہیں، اپنی پھرتی اور چالاکی کے زعم میں یہ ہر چیز کی کرید کرتے اور انجام کار یکے بعد دیگرے میرے جال میں آ پھنستے۔ انھیں تڑپتا دیکھ کر میرا دل پسیجا لیکن کیا کروں کہ اب اس معاملے میں میرا نقطۂ نظر قطعاً تجارتی ہو گیا تھا۔ ان سب چڑیوں کو پنجرے میں رکھ کر میں نے بورے سے ڈھک دیا اور اندھیرے میں وہ چپ ہو گئیں

میناؤں کی ایک ٹولی ناگ پھنی کے جھرمٹ کے آس پاس کھیل رہی تھی۔ ہر طرف دھوپ پھیل آئی تھی اور پرندے خوشی کے مارے کلک رہے تھے۔ اسکول کے بچوں کی طرح کوئی مینا یہاں پھدکتی کوئی وہاں اچکتی۔ 'لارک' نے فضا میں کسی شہد کی مکھی کو پکڑ لیا تھا اور اسے نہایت احتیاط سے کسی کانٹے میں پھنسا کر اب زمین پر بیٹھا اپنی چور گردن سے گرد و نواح کا جایزہ لے رہا تھا۔ ایک بلبل خاموشی سے ڈالیوں پر جھول رہا تھا اور اسے معلوم نہ تھا کہ میں اسے پکڑنے کو کتنا بیتاب ہوں۔ ایک لال توتا اپنے غول سے بھاگ کر کسی اونچے پیڑ پر آ بیٹھا تھا۔ خود پسندی میں وہ کسی جنرل سے کم نہ تھا اور اپنی چونچ کو گھما پھرا کر غصے میں یوں چیخ رہا تھا گویا کسی کو چنوتی دے رہا ہو۔

---

(۱) یہاں اور اس سے آگے کئی یورپین پرندوں کے نام آتے ہیں مثلاً
SIS KIN, TIT MOUSE, GOLD FINCH, وغیرہ
ترجمے کی آسانی اور روانی کے لیے انھیں ہندوستانی پرندوں کے نام سے بدل دیا گیا ہے
اس سے اصل پرندوں کی وضاحت تو نہیں ہوئی لیکن بیان کا سلسلہ نہیں ٹوٹتا (مترجم)

سورج جتنا اوپر چڑھتا جاتا، پرندوں کی تعداد بھی اتنی ہی بڑھتی جاتی اور ان کی خوش الحانی کی گونج چار سو پھیلتی جاتی۔ کھائی کے اندر سے گویا خزاں کے گیت سُنائی دے رہے تھے، گو کہ ہوا کی متواتر سرسراہٹ سے پیڑ پودے ہل جُل رہے تھے اور پرندوں نے شورِ قیامت مچا رکھا تھا لیکن وہ سُریلا مگر اداس نغمہ اپنی شان الگ رکھتا تھا۔ اس میں مجھے گرمی کے موسم کی الوداع سُنائی دے رہی تھی۔ میرے سوا کوئی ان کا مطلب نہ سمجھ سکتا اور یہ تان گویا ایک گیت کے روپ میں بدل گئی۔ مجھے گزرے ہوئے دن یاد آنے لگے۔ اسی وقت کہیں سے نانی کی پکار سنائی دی:

"اولیشا، تو کہاں چھپا بیٹھا ہے!"

وہ پگڈنڈی کے کنارے بیٹھی تھی۔ ایک رومال پر اس نے روٹی ککڑی اور سیب پھیلا رکھے تھے۔ ان کے بیچ میں شیشے کا بہت ہی خوبصورت ساغر رکھا ہوا تھا۔ اس کے منہ بند پر نپولین کی تصویر بنی ہوئی تھی اور اندر ووڈکا شراب بھری ہوئی تھی۔

نانی نے فرطِ احسان مندی سے کہا: "الٰہی کیسا سُہانا سماں ہے!"

"میں نے ایک گیت بنایا ہے۔"

"خوب! میں بھی تو سنوں۔"

میں نے اُسے اپنی تک بندی سُنائی جو میری دانست میں شاعری سے کم نہ تھی:-

گرمی کے سورج الوداع   تو ہم سے ہوتا ہے جُدا
جاڑے کا موسم آگیا   میں دیکھتا ہوں برملا

نانی نے سنی ان سنی کرکے کہا:-

"مجھے بھی ایک ایسا گیت یاد ہی، لیکن وہ اس سے بہتر ہی۔" پھر وہ گنگنانے لگی :-

گرمی کا سورج چلا سکھی
جھاڑی کی اوٹ میں سونے کو!
میں ساجن بن رہ گئی سکھی
بسنت کی رین میں رونے کو!
جب بھور بھئی میں اکیلی تھی
پھولوں کی جان کو رونے کو!
کھیتوں میں کس کے سنگ پھروں
جب دی ہو جوانی کھونے کو!
میری اچھی سکھی، میری پیاری سکھی!
میرے دل کو نکال لے سینے سے
اور برف میں کردے اس کو دفن
کیا مجھ کو ملے گا جینے سے!

میری شاعری کا گھمنڈ تو نہ ٹوٹا، لیکن یہ گیت مجھے جی جان سے پسند آیا اور اس اکیلی کنواری پر مجھے بڑا ترس آیا۔

نانی نے کہا: "یہ ہی دُکھے ہوئے دل کی آہ۔ یہ کسی کنواری کا بنایا ہوا گیت ہی۔ بیچاری نے بہار کے مزے بھی نہ لوٹے تھے کہ اس کے پیارے نے بے وفائی کی اور شاید کوئی دوسرا گھر ڈھونڈ لیا۔ یہ بیراگن دُکھ کے مارے رونے لگی۔ جب تک اپنے پر نہ بیتے سچائی اور صفائی سے بیان نہیں ہو سکتا۔ دیکھو اس دل جلی کے گیت میں کیسی تاثیر ہی۔"

جب پہلی چڑیا دس آنے میں بکی تو اس کے تعجب کی انتہا نہ رہی۔ "بھئی کمال ہوگیا! میں تو سمجھی تھی کہ یہ کھیل ہی کھیل ہے۔ اور اب دیکھو تو چاندی کٹ رہی ہے!"

"نانی، آپ نے تو اسے کوڑیوں کے مول بیچ دیا۔"

"ایں، یہ بات ہے؟"

بازار کے دن، چڑیوں کی قیمت ایک ایک روبل تک پہنچ گئی اور نانی حق حیران رہ گئی۔ کھیل ہی کھیل میں کتنی کمائی ہو سکتی ہے۔

"عورتوں کو دیکھو کہ دن بھر کپڑے دھو کر یا جھاڑو دے کر بہ مشکل چونی اٹھنی کماتی ہیں اور اس لونڈے کو دیکھو کہ ہوا میں سے رُپے نکالتا ہے! تاہم پرندوں کو قید کرنا اچھا نہیں۔ اویشا، تجھے یہ دھندا تج دینا چاہیے۔"

لیکن مجھے تو اس میں مزا ملتا تھا۔ ایک تو اس میں آزادی تھی اور پھر یہ کہ پرندوں کے سوا کسی کو کوئی تکلیف نہ ہوتی تھی۔ اب میں نے اپنے اوزار بھی درست کیے۔ پرانے چڑی ماروں نے مجھے گر کی باتیں سکھائیں۔ میں چڑیاں پکڑنے کے لیے تین تین کوس نکل جاتا تھا۔ دریائے وولگا کے کنارے کے جنگل کی خبر لاتا تھا جہاں چیڑ کے پیڑوں میں کئی انوکھے اور قیمتی پرندے رہتے تھے۔

کبھی کبھی تو میں شام کو نکلتا اور رات بھر میدانوں اور سڑکوں پر کیچڑ اور پانی میں مارا مارا پھرا کرتا۔ میری پیٹھ پر موم جامے کا تھیلا ہوتا جس میں چڑیوں کا کھاجا اور پنجرے ہوتے۔ ہاتھ میں موٹا سونٹا ہوتا پت جھڑ کی راتیں ٹھنڈی اندھیری اور ڈراونی ہوتیں۔ سڑکوں کے آس پاس بجلی کے مارے ہوئے پیڑوں کے ٹھنٹھ اپنی ٹہنیوں سے میرے سر کو

سہلایا کرتے۔ بائیں جانب ایک پہاڑی کے نیچے دریا بہا کرتا اور اس میں کبھی کبھی ڈونگے اور بجرے مشعلوں کی روشنی میں جگمگا اٹھتے۔ ان کی پتواریں پانی میں چھپ چھپاتیں، سیٹیاں بجتیں اور یوں لگتا کہ وہ تحت الثریٰ کی طرف جا رہے ہیں۔

سڑکوں کے آس پاس کہیں کہیں گانو بھی تھے اور وہاں کے بھوکے اور چڑچڑے کتے مجھ پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ مجھے دیکھ کر دہشت کے مارے چوکیدار کی گھگھی بندھ جاتی:۔

"تو کون ہے بابا؟ بھوت ہے تو قبرستان کی طرف جا۔"

ادھر میں ڈرتا کہ کہیں میرے پنجرے ونجرے نہ چھن جائیں اور میں اسے اکنی تھما کر رام کر لیتا۔ تکونوئی۔ گانو کا چوکیدار تو میرا دوست بن گیا اور جب کبھی مجھے دیکھتا متفکر ہو کر کہتا:۔

"یہ اندھیری رات اور تیری ٹانک ٹوئیاں! یار، تو بھی مرگھٹ کے بھوت سے کم بہادر نہیں۔"

اس چوکیدار کا نام نفر ونت تھا وہ پستہ قد اور سفید ریش تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی سادھو سنت ہے۔ جیب سے ایک شکر قند ایک سیب اور کچھ سنگھاڑے نکال کر مجھے دیتے ہوئے وہ بولا:۔

"لے میرے یار، کھا جا اور پربھو عیسیٰ کے بھجن گا۔"

پھر مجھے گانو کی سرحد سے باہر پہنچا کر بولا: "جاؤ، خدا کے سپرد کیا۔"

پو پھٹتے پھٹتے میں اس جنگل کی خبر لایا، جال پھیلا کر زمین پر لیٹ گیا اور دن نکلنے کا انتظار کرنے لگا۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ پت جھڑ کی گہری نیند برگ و شجر پر طاری تھی۔ کہرا اتنا گہرا تھا کہ پہاڑی کی لمبی چوڑی

چراگاہ بھی آنکھ اوجھل ہوگئی تھی۔ دریا نے اسے دو حصّوں میں کاٹ دیا
تھا۔ اس کے پار دونوں حصّے مل کر پھر جدا ہوگئے تھے اور کہر میں ان کا
اور چھور نظر نہ آتا تھا۔ دور پار، پیڑوں کی اوٹ سے سورج ایسے منچلے
پن سے طلوع ہو رہا تھا گویا اسے کوئی جلدی نہیں ہے۔ جنگل کے کنارے
کنارے دیے جھلملا رہے تھے اور یہ سارا نظارہ میرے دل میں ایک عجیب
سی کیفیت پیدا کر رہا تھا۔ چراگاہوں سے کہر کے پردے اُٹھنے لگے اور
وہ سورج کی روشنی میں چمکنے لگیں۔ پھر جنگل جھاڑی پر سے بھی تاریکی کی
چادر اُٹھنے لگی۔ چراگاہیں تو گویا چاندی میں نہانے لگیں۔ سورج نے دریا
کی ساکن موجوں کو ایک نظر دیکھا ہی تھا کہ یہ محسوس ہوا کہ وہ آسمان کی
طرف اُچھل رہی ہیں۔ دن کا بادشاہ جیسے جیسے آسمان پر چڑھتا گیا سوکھی
ساکھی اور گیلی ٹھنڈی زمین میں گرمی آنے لگی اور ہر طرف سوندھی سوندھی سی
مہک پھیلنے لگی۔ ہوا ایسی دُھلی دُھلائی تھی کہ زمین کی وسعت حدِ نظر تک اور
اس سے بھی دور پھیل گئی۔ افق پر ہر شئے فضا میں تیرنے لگی اور ماورا کی
طرف چلنے کا اشارہ کرنے لگی۔ یہ حیرت انگیز نظارہ میں نے بارہا دیکھا،
اور ہر مرتبہ قدرت نے میرے لیے ایک نئے عالم کی تخلیق کی اور اس میں
ایک نیا حسن دکھایا۔

مجھے سورج سے ایسی محبّت تھی کہ اس کا نام آتے ہی ولولہ پیدا ہوتا
اس نام میں گویا کوئی گھنٹی چھپی ہوئی تھی۔ آنکھیں بند کرکے سورج کے آگے
لیٹنے میں مجھے بڑا مزا آتا اور جب اس کی کرنیں پتلیوں میں سے چھن چھن کر
تلوار کی انی کی طرح میری طرف بڑھتیں تو میں انھیں ہاتھوں میں پکڑنے کی
کوشش کرتا۔ نانا نے کبھی مجھے ایک قصّہ سُنایا تھا جس میں ان لوگوں

کا ذکر تھا جو سورج کی پرستش سے انکار کرتے تھے۔ اپنے تصور میں میں ایسے لوگوں کو سیاہ باطن اور مفسد سمجھتا تھا۔ جب سورج نکلتا تو بے اختیار میرے ہونٹوں پر تبسم آجاتا۔

مجھ پر دیودار کے پیڑوں کا سایہ ہوتا اور ان سے اوس کی بوندیں ٹپکا کرتیں۔ جہاں سایہ ہوتا وہاں پودوں کے سروں پر برف کی ہلکی سی لکیر نظر آتی۔ بارش نے گھاس کو کچل دیا تھا اور اس کے تنکے زمین کی طرف جھک گئے تھے۔ لیکن سورج کے نکلتے ہی وہ تازہ دم ہوگئے اور ہر طرف ایک خفیف سی حرکت سنائی دی گویا اشجار تازہ دم ہوگئے۔

چڑیوں میں بھی جاگ پڑ گئی۔ گیندوں کی طرح وہ ڈال ڈال پھدکنے لگیں۔ ہدہد دیودار کی پھننگ پر اپنی چونچ تیز کرنے لگا۔ شیاما اپنی دم ہلاتی ہوئی گانے لگی اور اپنی کالی کالی آنکھوں سے میرے جال کو مشتبہ انداز سے دیکھنے لگی اور یک بیک یہی جنگل جو کچھ دیر پہلے سنسان تھا سرود خانہ بن گیا اور ہزاروں پرندوں کے زمزموں سے گونج اٹھا۔ قدرت نے ان سے زیادہ پاک و صاف جاندار پیدا نہیں کیے اور انھیں دیکھ کر انسان نے فرشتہ، پری، اور براق کا تصور کیا۔

ان ننھے غزل خوانوں کو پکڑتے مجھے دکھ ہوتا تھا اور انھیں پنجروں میں بند کرتے وقت تو واقعتاً میرا کلیجہ پھٹتا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ انھیں دور ہی سے دیکھا کیجیے۔ لیکن ایک تو شکار کا خبط، دوسرے پیسوں کی چاہت نے میری نرمی کو دھو ڈالا۔

دوپہر تک شکار ختم کرکے میں گھر کی طرف چل کھڑا ہوا۔ میں نے سڑک کا رُخ نہ کیا کیونکہ گانو کے لونڈے یقیناً پنجرے چھین کر میرا جال

پھاڑ ڈالتے۔ ایک بار مجھے اس کا تجربہ ہو چکا تھا۔

گھر پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی۔ تھکن اور بھوک کے مارے میرا بُرا حال تھا۔ بااین ہمہ احساس ہوا کہ مجھے ایک نیا سبق ملا ہے اور آج میری طاقت زیادہ ہو گئی ہے، شاید عمر بھی بڑھ گئی ہے۔ اِسی نئی طاقت کی برکت تھی کہ میں لاپروائی سے بڑے میاں کی پھبتیوں کو سنتا رہا۔ جب نانا نے دیکھا کہ اس کورے گھڑے پر پانی ٹھہرتا ہی نہیں تو وہ سنجیدگی سے بولا: "یہ دھندا منحوس ہے، اسے تج دو! چڑیوں کے برتے آج تک کوئی پیٹ نہیں پال سکا۔ کوئی اور راستہ ڈھونڈو اور اپنی ذہانت کو یوں ضایع نہ کرو۔ زندگی یوں برباد کرنے کے لیے عطا نہیں ہوئی ہے۔ انسان خدا کا دماغ ہے اور اسے دُنیا میں کچھ کرنا چاہیے۔ اسے ایک سکہ سمجھو جو اگر سود پر چلایا جائے تو ایک سے تین ہو جاتا ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ جینا بہت آسان ہے یہ محض خام خیالی ہے۔ دُنیا تاریکی میں چھپی ہوئی ہے، اس میں چلنے کے لیے ہر آدمی کو اپنی اپنی مشعل جلانی ہوتی ہے۔ قدرت نے اتنا دیا ہے کہ ہر آدمی کا ہاتھ بھر سکے، لیکن انسان اپنی مٹھی بند رکھنا چاہتا ہے۔ ہر ایک کو مضبوط ہونا چاہیے لیکن کوئی کمزور ہو تو اسے چالاک ہونا چاہیے۔ کمزور کے لیے نہ تو جنت میں جگہ ہے نہ جہنم میں۔ دوسروں کے ساتھ مل جل کر رہو لیکن اپنے کو ہمیشہ اکیلا سمجھو۔ کبھی کسی پر اعتبار نہ کرو۔ اپنی آنکھوں پر بھروسا کروگے تو ہر چیز اپنی اصلیت میں نظر آئے گی۔ زبان کو بے لگام نہ ہونے دو، زبان ہلانے سے کوئی کام نہیں بنتا، لیکن چاندی سے ناممکن بھی ممکن ہو جاتا ہے۔ اور چاندی قوت بازو سے پیدا ہوتی ہے۔ تم نہ تو احمق ہو نہ فقیر جو دولت کو لعنت کہتے ہیں۔"

اس انداز سے نانا گھنٹوں بات چیت کر سکتے تھے اور مجھے ان کی تقریر حفظ ہوگئی تھی۔ تقریر کا اسلوب مجھے مرغوب تھا لیکن ان کے مطالب سے مجھے اختلاف تھا۔ ان کی گفتگو سے یہ ظاہر تھا کہ انسان کی آزادی کی راہ میں دو روڑے ہیں ـــــ ایک تو خدا دوسرے خلق خدا۔

کھڑکی کے پاس بیٹھ کر نانی تکلی چلایا کرتی۔ دیر تک نانا کی باتیں سُن کر وہ یک بیک کہ اُٹھتی :-

"خدا کی ماں کی مرضی کے آگے کسی کی نہیں چلتی!" بڑے میاں گرج کر جواب دیتے :

"چلی ہیں مجھے خدا کی باتیں بتانے۔ مجھے خدا کا رتی رتی حال معلوم ہے۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ احمق خدا کے بنائے ہوئے ہیں؟۔"

میری رائے میں قزاق اور سپاہیوں سے زیادہ دنیا میں کوئی خوش نہ تھا۔ خوشی اور سادگی سے وہ وقت بسر کرتے تھے۔ جب دھوپ ہوتی تو وہ صبح صبح ہمارے گھر کے پاس آتے۔ کھیتوں میں اِدھر اُدھر بکھر کر وہ عجیب و غریب تماشے کرتے۔ ہاتھوں میں بندوق لیے وہ کھیتوں میں دوڑتے، کھائیوں میں چھپ جاتے اور بگل کی آواز آتے ہی پھر شور مچاتے ہوئے باہر نکل آتے۔ ہمارے گھر کی طرف وہ سنگینیں تانے بگ ٹُٹ دوڑتے چلے آتے، اور ان کے تیور ایسے ہوتے گویا وہ اینٹ پتھر کے اس ڈھیر کو پل بھر میں ڈھاکر رکھ دیں گے۔ میں بھی ان کے ساتھ ہُرّے کا نعرہ لگاتا اور جوش میں ان کے ساتھ دوڑتا چلا جاتا۔ ڈھول کی جنگی دُھن مجھ میں برباد کاری کا جذبہ پیدا کرتی۔ جی چاہتا کہ کچھ توڑ ڈالوں یا دوسرے

لڑکوں کو ہیٹ کر رکھ دوں۔ سستاتے وقت سپاہی مجھے سگنل دینا یا بندوق چلانا سکھاتے تھے۔ کبھی ان میں سے کوئی جھوٹ موٹ میرے پیٹ میں سنگین چبھوتا اور ڈپٹ کر کہتا:

"مسل ڈالوں اس لکوڑے کو!"

سنگین چمچما اُٹھتی اور گمان ہوتا کہ وہ کوئی زندہ سانپ ہے جو ابھی پھنکار اُٹھے گا۔ اس میں خوف سے زیادہ لطف کا پہلو تھا۔

ڈھولچی نے مجھے انگلی سے ڈھول بجانا سکھایا۔ کلائی پکڑ کر وہ ڈھول کی موگری مجھے تھما دیتا اور کہتا:۔

"بجاؤ تو سہی! ایک — دو — رم ٹم! بائیں ہولے۔ داہنے زور سے!" اس دوران میں اس کی آواز غضبناک ہو جاتی اور وہ خوفناک طریقے سے مجھے گھورنے لگتا تھا۔

میں پریڈ کے اختتام تک سپاہیوں کے ساتھ کھیت کھیت مارا مارا پھرتا اور بعد میں انھیں پہنچانے کے لیے شہر کے باہر چھاؤنی تک جاتا۔ راستے میں میں اُن کے پُرشور گیتوں کو سُنتا اور اُن کے چہروں کو ٹکر ٹکر تاکا کرتا جو سب کے سب ٹکسال سے نکلے ہوئے نئے روپیوں کے سے تازہ تھے۔ خوش باش انسانوں کا یہ گروہ جب ایک چال سے سڑکوں پر سے گزرتا تو میرا دل ان کے لیے دوستی کے جذبے سے معمور ہو جاتا۔ جی چاہتا کہ میں بھی ان میں اسی طرح سما جاؤں جیسے کسی ندی یا جنگل میں۔ یہ لوگ بالکل نڈر تھے اور ساری دُنیا کو فتح کر سکتے تھے۔ وہ کیا نہ کر سکتے تھے۔ وہ سب سادہ مزاج اور نیک دل معلوم ہوتے تھے۔

لیکن ایک دن جب وہ سستا رہے تھے تو ایک نوجوان افسر نے مجھے موٹا سا سگریٹ دے کر کہا: "لو اسے پی جاؤ۔ اور کوئی ہوتا تو نہ دیتا۔ اور میاں تمھیں بھی یہ عزّت بخشنے کو جی نہیں چاہتا۔"

میں سگریٹ کے کش کھینچنے لگا۔ وہ کچھ پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا اور دفعتاً سگریٹ میں سے شعلہ بھڑکا جس نے میری انگلیوں کو اور میری ناک پلک کو جھلسا دیا۔ زہریلا سا دھنواں نکلا جس کی وجہ سے مجھے اُچھو لگ گیا جلن اور گھبراہٹ کے مارے میں پھرکی کی طرح ناچنے لگا اور سپاہی جو مجھے گھیر کر کھڑے ہو گئے تھے ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ میں گھر کی طرف بھاگا اور قہقہوں اور تالیوں نے مجھے رخصت کیا کسی نے مجھے ڈرانے کے لیے کوڑا بھی پھٹکارا۔ چہرے اور ہاتھوں میں جلن ہو رہی تھی اور آنکھوں سے پانی بہ رہا تھا۔ لیکن جسمانی تکلیف سے زیادہ وہ روحانی اذیت تھی جس نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ کسی کو دُکھ دے کر یہ بھلے مانس اتنے خوش کیوں ہو رہے تھے؟

گھر جا کر میں ایک کونے میں دیر تک بیٹھا سوچتا رہا کہ اس قسم کے بے معنی بے رحمی کا راز کیا ہے۔ جس کا مشاہدہ میں کئی بار کر چکا تھا۔

میں قزاقوں میں بھی گھل مل چکا تھا اور ان کی چھاؤنی میں آنے جانے لگا تھا۔ قزاقوں کا ڈھب دوسرے سپاہیوں سے جدا تھا — اس وجہ سے نہیں کہ ان کا لباس زیادہ خوب صورت تھا یا وہ بہتر شہ سوار تھے بلکہ اس لیے کہ ان کی بولی ٹھولی الگ تھی اور ان کا ناچ گانا بھی جداگانہ شان رکھتا تھا۔ شام کو گھوڑوں کی ملائی دلائی کے بعد سب لوگ اصطبل کے قریب جمع ہوتے اور وہاں ایک قزاق پاٹ دار آواز میں گایا کرتا۔

نغمے کے غم ناک بول فضا میں دور دور تک پھیل جاتے۔ گاتے وقت اس کی آنکھیں بند ہو جاتیں، اور گمان ہوتا کہ گاتے گاتے ابھی وہ بے دم ہو کر گر پڑے گا۔ اس کی قمیص کا گلا کھلا ہوتا اور اس کے اندر سے ہنسلی کی ہڈی تانبے کی طرح چمکتی۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ سرتاپا تانبے کا پتلا معلوم ہوتا تھا۔ اس کی پتلی پتلی ٹانگیں یوں ہلا کرتیں گویا زمین میں زلزلہ آگیا ہے اور وہ ایک جگہ نہیں ٹھہر سکتا۔ ہاتھ پھیلائے ہوئے جب وہ الاپتا تو یوں لگتا کہ وہ مجسم صدا ہے اور کچھ نہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے وہ انسان نہ رہتا تھا، دھات کا کوئی ساز بن جاتا تھا۔ وہ اپنی ساری طاقت، ساری تمنا، اپنی روح تک کو نغمے میں سمو دیتا تھا اور میں سہم جاتا تھا کہ اس کے بعد کہیں یہ مر نہ جائے۔

اس کے ساتھی ہاتھ باندھے، دم سادھے گانے کی تان میں ڈوب جاتے۔ تالیوں سے گانے پر ٹیک دے کر وہ ایسے اشتیاق سے بزم آرائی کرتے گویا کسی کلیسا کی حمد میں شامل ہیں۔ اس وقت وہ سب شہ نشین کے بُت معلوم ہوتے تھے اور ایک لمحے کے لیے ساری دنیا سے ان کا تعلق منقطع ہو جاتا تھا۔ گانا لمبا تھا۔ اس میں وسعت بھی تھی اور گہرائی بھی جب میں اس گویے کی تان سنتا تو دنیا ومافیہا سب کچھ بھول جاتا۔ یہ بھی یاد نہ رہتا کہ میں جوان ہوں یا بچہ۔ اس وقت موسیقی کے سوا کائنات میں کچھ نہ رہتا تھا۔

اور جب رفتہ رفتہ نغمہ گر کی تان فضا میں ڈوب جاتی تو گھوڑوں کی لمبی سانس سُنائی دیتی۔ گویا انھیں بھی اپنے وطن کی یاد سُنائی دے رہی ہے اور خزاں کی شب اپنا جادو پھونکنے لگتی تھی۔ میرا دل جذبات کی شدت سے دھڑکنے لگتا اور ساری کائنات کے لیے اس میں محبت

کا دریا موجزن ہو جاتا۔

وہ قزاق میری نگاہ میں کوئی معمولی آدمی نہ تھا۔ وہ کسی دوسرے جہان کا رہنے والا تھا۔ اس سے بات کرنے کی مجھے جرأت نہ ہوتی تھی کبھی اس نے مجھ سے کوئی سوال کیا تو میں نہال ہو گیا اور جھینپ کے مارے میری زبان سے کوئی لفظ نہ نکلا۔ میں کسی وفادار کتے کی طرح اس کے ساتھ رہنے کو تیار تھا۔ میں صرف یہ چاہتا تھا کہ اس کا ساتھ ہو اور اسے گاتے ہوئے سنا کروں۔

باب (۸)

جب برف باری شروع ہوئی تو نانا مجھے دوبارہ اپنی سالی کے گھر لے گیا: "وہاں رہ کر تیرا بگڑتا کیا ہے"، اُس نے کہا۔

موسم گرما میں میں زندگی کے ایک ایسے دور سے گزر چکا تھا جس نے مجھے زیادہ طاقت ور اور ہوشیار بنا دیا تھا۔ اس کی وجہ سے یہ گھر مجھے بالکل اجاڑ اور منحوس معلوم ہونے لگا۔ گھر والوں کی بیماری کا تانتا کبھی ٹوٹتا ہی نہ تھا۔ الابلا کھا کر وہ اپنے پیٹ خراب کر لیتے اور پھر ایک دوسرے کو اپنی شکایتوں کی تفصیل سُنایا کرتے۔ بڑھیا اُسی تلخ انداز میں خدا سے دعا مانگا کرتی۔ اس کی بہو کا جسم ہلکا پڑ گیا تھا لیکن اس کی سُست رفتاری سے یہی اندازہ ہوتا کہ وہ حاملہ ہے بچّے کے کپڑے سیتے ہوئے وہ ہمیشہ ایک گیت ایک سُر میں گایا کرتی تھی:-

میرا ننھا سا بھیّا گاڑی ہانکے گا
میں بیٹھوں گی ٹم ٹم میں بن ٹھن کر!

اگر اس وقت کوئی کمرے میں چلا جائے تو وہ گانا بند کر کے غصے سے چیخ اُٹھتی:-

"کیا چاہیے بابا!"

مجھے یقین تھا کہ اُسے اُس کے سوا اور کوئی گیت نہیں آتا۔

شام کو دیوان خانے میں میری طلبی ہوتی اور حکم ہوتا کہ "اگن بوٹ پر جو کچھ بیتی ہو وہ سناؤ"۔

میں دروازے کے پاس کرسی پر بیٹھ کر رام کہانی چھیڑ دیتا۔ یہاں کے بے رنگ زندگی سے مختلف کسی دُنیا کے تصور سے میں خوش ہوتا تھا اور داستان کے دوران میں ان کی موجودگی کو بھول جاتا تھا۔

عورتوں نے پانی کا سفر کبھی نہ کیا تھا۔ وہ پوچھتیں:

"بڑا ڈر لگتا ہوگا، کیوں؟"

میری سمجھ میں خاک نہ آیا کہ ڈرنے کی کیا بات ہی۔

"ارے بوٹ جو اُلٹ جائے تو سب ڈوب کر مر جائیں یا نہیں"

مالک تو کھلکھلا کر ہنس پڑا لیکن یہ جاننے کے باوجود کہ جہاز آسانی سے نہیں ڈوبتے، میں انھیں قایل نہ کر سکا۔ بڑھیا کو تو یقین راسخ تھا کہ بوٹ پانی پر نہیں تیرتے بلکہ ندی کی تہ میں پہیے لگا کر اسی طرح چلتے ہیں جیسے بیل گاڑی زمین پر۔

"لوہے کی چیز بھلا پانی پر تیر سکتی ہی؟ اور یہ تو کہو کہ کلھاڑی کیوں نہیں تیر سکتی؟"

"لیکن ڈول تو نہیں ڈوبتا"

"واہ رے عقل کے پورے! ڈول اور جہاز کا کوئی مقابلہ ہی"

سموری اور اس کی علم دوستی کے تذکرے کو انھوں نے نہایت حقارت سے سُنا۔ بڑھیا نے تڑاق سے کہا کہ احمقوں اور کافروں کے سوا کوئی کتاب نہیں لکھتا۔

"حضرت داؤد کی لکھی ہوئی حمد کو کیا کہیے گا؟"

"وہ تو کلام ربانی ہی اور پھر خود داؤد نے اپنی جسارت کے لیے خدا سے معافی مانگی تھی"

"یہ کہاں لکھا ہے!"

"میری ہتیلی پر! جب تک تیری پٹائی نہ ہو تیری کھوپڑی میں عقل کی بات نہ سمائے گی۔"

دنیا کا جو بھی موضوع ہو اس پر اس پیر سال کی زبان قینچی کی طرح چلتی تھی اور وہ کسی قسم کی تردید برداشت نہ کر سکتی تھی۔

"فلاں شہر میں ایک تاتار کی موت ہوئی اور اس کی روح منہ کے راستے نکلی تو سب نے دیکھا کہ اس کا رنگ کالا ہے۔"

"روح؟" میں حیرت سے بول اٹھا۔ اس نے بگڑ کر کہا:

"تاتار کا بھوت! بیوقوف کہیں کا۔"

بہو کو بھی کتابیں ناپسند تھیں: "نو عمری میں کتابیں پڑھنا برا ہے۔ میری بستی میں ایک کنواری دن رات کتب خوانی کرتی تھی۔ نتیجہ ہوا کہ وہ پادری پر فریفتہ ہو گئی۔ اس کی بیوی نے سرِ عام لونڈیا پر ایسی لے دے کی کہ بیان نہیں کر سکتی۔"

کبھی کبھی میں سموری کی کتابوں کے رٹے ہوئے جملے دہرایا کرتا تھا۔ ان میں سے ایک میں لکھا تھا: "درحقیقت کسی ایک آدمی نے بارود ایجاد نہیں کی۔ یہ تحقیقات اور مشاہدات کے ایک طویل سلسلے کی آخری کڑی تھی۔" معلوم نہیں کیوں مجھے یہ جملہ یاد رہ گیا۔ خصوصاً "درحقیقت" کی ترکیب بہت پسند آئی —— اس حد تک کہ مجھے دوسروں کے مذاق کا تختۂ مشق بننا پڑا۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔

ایک روز جب میرے آقاؤں نے ارشاد فرمایا کہ اگن بوٹ کا کوئی قصہ سناؤ، میں نے جواب میں کہا:

"درحقیقت، کہنے کو کچھ نہیں رہا۔"

وہ سب حیران رہ گئے اور بیک آواز بول اُٹھے:

"کیا کہا؟ پھر سے تو کہنا۔"

چاروں نے ہنس ہنس کر دُہرانا شروع کیا:

"درحقیقت! واللہ!"

مالک نے کہا: "صاحب زادے تمھاری جُملہ سازی نے کام نہ بنایا۔"

کچھ عرصے تک وہ سب مجھے چڑاتے رہے۔" جی درحقیقت صاحب، زرا فرش پر جھاڑو کے ایک دو ہاتھ تو مار دیجیے۔"

اس بیہودہ سرائی پر غصّہ تو کیا آتا، البتہ سخت حیرت ہوئی۔ میں اُداس رہنے لگا اور اس کیفیت کو دور کرنے کے لیے ضرورت سے زیادہ کام کرنے لگا کیونکہ کام کے وقت مجھے اپنی خامیوں کا احساس نہ ستاتا تھا۔ گھر میں دو چھوٹے بچّے تھے۔ مالکوں کو کوئی آیا پسند نہ آتی تھی اور زیادہ عرصے کوئی نہ ٹک پاتی تھی۔ چنانچہ بچّوں کی دیکھ ریکھ اور ان کے کپڑوں کی دھلائی میرے ہی ذمہ تھی اور ہر ہفتے مجھے گھر بھر کے کپڑے دھونے کے لیے تالاب جانا پڑتا تھا۔ یہاں دھوبنیں مجھے چھیڑتیں:

"ارے نکھٹو، یہ تو عورتوں کا کام ہے!"

کبھی کبھی وہ مجھے اتنا چھیڑتیں کہ میں اُنھیں کپڑوں سے مار بیٹھتا۔ وہ بھلا مجھے کیوں چھوڑ دیتیں۔ تاہم ان میں خوش مزاجی اور زندہ دلی کی کمی نہ تھی۔

اس تالاب کو ایک نالہ ندی سے ملا دیتا تھا۔ نالہ شہر اور ایک

میدان کے بیچ سے ہوکر گزرتا تھا۔ ایک پُرانے دیوتا "پارلو" کے نام پر میدان کا نام رکھا گیا تھا۔ اس میدان میں شہر والے سیر و تفریح کے لیے آیا کرتے تھے۔ نانی کہا کرتی تھی کہ اس کے بچپن میں لوگ پارلو دیوتا کو پوجتے اور اُس پر چڑھاوا چڑھایا کرتے تھے۔ ایک چاک کو تارکول سے رنگ کردہ پہاڑی پر سے لڑھکا دیتے اور دیکھتے رہتے کہ وہ ندی میں جاکر گرتا ہے یا نہیں۔ اگر ندی میں گرا تو سمجھا جاتا کہ دیوتا نے چڑھاوے کو پسند کیا اور موسم گرما خوش حالی کا پیام لائے گا۔

شوخی و طراری میں ان دھوبنوں کا جواب کون ہو سکتا تھا۔ شہر کے سب حالات اُن کے نوک زبان تھے۔ جن تاجروں یا افسروں کا کام انھیں ملتا تھا، اُن کے قصے وہ مزے لے لے کر سُناتیں۔ جاڑوں میں ندی کے برف سے زیادہ ٹھنڈے پانی میں کپڑے دھونا کسی غلام ہی کا کام تھا۔ دھوبنوں کے ہاتھ کی چمڑی تک ٹھنڈ کے مارے اُدھڑ جاتی تھی۔ ان کے چہرے بھی برف اور پالے سے کھُرچ جاتے تھے۔ وہ کپڑے دھوتی جاتیں اور اُن کی آنکھوں سے پانی ٹپکتا رہتا۔ پھر بھی وہ ہمت نہ ہارتیں اور برابر چہڑ کرتی جاتی تھیں۔

ان میں سب سے زیادہ حاضر جواب "نتالیا" نامی دھوبن تھی اس کی عمر کوئی تیس سال ہوگی۔ اس کے چہرے پر تازگی تھی، بدن میں پھُرتی، آنکھوں میں مسکراہٹ اور زبان میں جادو۔ سب اس کی عزت کرتے۔ سہیلیاں ہر معاملے میں اس سے مشورہ کرتیں اور لباس کی صفائی کام کی اچھائی اور لڑکی کو ہائی اسکول میں پڑھانے کی وجہ سے سب اس کی تعریف کرتے تھے۔ جب بیٹھ پر کپڑوں کے گٹھر لادے

وہ پہاڑ پر سے ہانپتی ہوئی اُترتی تو دھوبنیں خوش ہوکر پوچھتیں :۔

"یہ کہو کہ لڑکی کیسی ہے؟"

"شکریہ، وہ خیریت سے ہے اور جی لگاکر پڑھ لکھ رہی ہے۔"

"خدا رکھے، کسی دن وہ بیگم کہلائے گی۔"

"اسی لیے تو میں نے اس کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام کیا ہے۔ یہ جٹک مٹک کرنے والی بیگمیں کچھ آسمان سے تو اُتریں نہیں۔ ہماری تمھاری طرح اسی زمین کی رہنے والیاں ہیں۔ ان میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں۔ جس کے پاس جتنا زیادہ علم ہو وہ اتنا ہی زیادہ حاصل کرسکتا ہے اور جو جتنا حاصل کرتا ہے، اتنا ہی عزت دار ہوتا ہے، خدا جب ہمیں پیدا کرتا ہے تو ہم نادان ہوتے ہیں، لیکن جب وہ ہمیں واپس بلاتا ہے تو توقع رکھتا ہے کہ ہم عاقل و فاضل ہوں گے۔ اور اسی لیے سب کو علم حاصل کرنا چاہیے۔"

جب وہ کچھ کہتی تو سب دھوبنیں محوِ حیرت ہوکر کان لگائے اس کی باتیں سُنتیں۔ وہ منہ کے سامنے اور پیٹھ کے پیچھے اس کی تعریف کرتیں اور اس کی ذہانت و فراست پر حیران ہوتیں۔ لیکن کوئی اس کی نقل نہ اُتار سکتی۔ اس نے کلائی کے لیے چمڑے کی آستین سی لی تھی جس کی وجہ سے ہاتھ پانی میں نہ بھیگتے تھے۔ سب نے اس ترکیب کی داد دی لیکن کسی کو توفیق نہ ہوئی کہ ویسی ہی چیز بنالے۔ جب میں نے اس شال کی نقل کی تو سب نے میرا مذاق اُڑایا :۔

"تو بھی کیسا مرد ہے کہ عورت کی نقل کرتا ہے۔"

اپنی بیٹی کے بارے میں نتالیا کہتی: "خدا نے چاہا تو بیگموں کی

کی تعداد میں ایک کا اضافہ ہو جائے گا۔ یہ کوئی معمولی بات ہی؟ لیکن ممکن ہی کہ تعلیم ختم کرنے سے پہلے ہی وہ مر جائے۔ اور یہ دیکھو کہ اسے کتنی محنت کرنی ہوتی ہی۔ بخلوف کی لڑکی کو دیکھو۔ پڑھتے پڑھتے اُستانی ہوگئی۔ اور اُستانی ہونے کے بعد سارے مصایب سے نجات مل جاتی ہی۔"

"لیکن شادی ہو جائے تو پھر اس دردسری سے کیا حاصل"۔ کسی تیسری نے لقمہ دیا:۔" عورت کی عقل اس کے دماغ میں نہیں رہتی!"

جب وہ اس طرح کھُل کھیلتیں تو سننے والے کو اُلجھن سی ہوتی۔ میں جانتا تھا کہ جہازی سپاہی یا کسان عورتوں کا ذکر کس پیرائے میں کرتے ہیں۔ میں نے مردوں کو بارہا ڈینگ ہانکتے سُنا تھا کہ وہ عورتوں کو کس طرح جُل دیتے ہیں، کس طرح دام میں لاتے ہیں۔ میں محسوس کرتا تھا کہ عورتوں سے ان کا رویہ مخالفانہ ہی۔ لیکن عموماً ان کی شیخی میں کوئی ایسی بات ہوتی جو ان کی دروغ گوئی کی قلعی کھول دیتی اور ظاہر ہو جاتا کہ اس میں حقیقت آٹے میں نمک کے برابر ہی۔

دھوبنیں آپس میں اپنی محبت کے چرچے نہ کرتی تھیں۔ لیکن مردوں کا ذکر وہ تمسخر اور حقارت سے کرتی تھیں اور مجھے یقین ہو چلا تھا کہ عورت مرد سے زیادہ قوی ہی۔

ایک بار نتالیا نے کہا: " خواہ مرد بھائی بندوں اور دوستوں سے بھی نہ ملے لیکن وہ جھک مار کر عورت کے پاس آتا ہی"۔ یہ سُن کر ایک بڑی بی نے پلپلی آواز میں کہا: " تو اور کہاں جائے؟ بڑے بڑے ولی اللہ خدا کے سوا اگر کسی سے ملتے ہیں تو عورت سے!"

گندے کپڑوں کی دھلائی کے ساتھ بے شرمی اور بے حیائی

کے یہ تذکرے، ایک ایسے راز سربستہ کی عقدہ کشائی جس سے سب جانداروں کی تخلیق ہوتی ہے — اس سے مجھ میں نفرت کا جذبہ پیدا ہوتا اور مجبوراً میری توجہ اُن 'رومانوں' کی طرف جاتی جن کا جال ہر طرف پھیلا ہوا تھا میرے لیے 'رومان' اور تاریکی میں چھپی ہوئی بداخلاقی میں کوئی فرق نہ رہا۔

بہرحال دھوبنوں کا ساتھ ہو یا کسانوں اور سائیسوں کا — مجھے اس گھر کی فضا سے ہزار گنا زیادہ پسند تھا۔ کیونکہ وہاں کی گھٹی ہوئی زندگی میں کبھی کوئی تبدیلی نہ ہوتی تھی۔ ایک سی بات چیت اور ایک سا معمول جس کی وجہ سے میں ہمیشہ ہر طرف گھٹن سی محسوس کرتا تھا۔ میرے مالکوں کو غذا، نیند، بیماری اور ان سے متعلق چھوٹی موٹی پریشانیوں کے علاوہ اور کوئی کام نہ تھا۔ ان کی بحث کا دایرہ گناہ اور موت کے اندر رہتا تھا، اور موت کا خیال انھیں ہمیشہ لرزہ براندام رکھتا تھا۔ وہ ایک دوسرے سے یوں چپکے رہتے جیسے چکی میں پسنے سے پہلے گیہوں کے دانے۔ فرصت کا وقت میں آنگن میں لکڑیاں چیرنے میں گزارتا تاکہ وہاں مجھے کوئی ستانے نہ آئے لیکن وہاں بھی نوکر چاکر آکر دنیا اور اس کی مصیبت کے قصے چھیڑ دیتے تھے۔

دوسرے تو زیادہ نہ آتے، ہاں ارموخن اور سدوروف کا گزر روز ہوتا تھا۔ ارموخن اونچا پورا تھا لیکن اس کی آنکھیں بے نور اور کھوپڑی مُٹھی بھر کی تھی۔ وہ پرلے درجے کا کاہل اور جاہل تھا۔ یوں تو بہت آہستہ چلتا لیکن کسی عورت پر نگاہ پڑتے ہی آنکھ مٹکا کر یوں جھپٹتا گویا ابھی اس کے قدموں پر گر پڑے گا۔ نوکرانیوں اور دایاؤں کو وہ جس آسانی سے پھانس لیتا تھا، اس کی وجہ سے سارے محلے والے

اس سے جلتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ اس کی حیوانی طاقت کا لوہا بھی مانتے تھے۔ سدوروف دُبلا پتلا، کم سخن اور مردہ دل تھا۔ اسے تاریک کونوں کی طرف گھورنے کی عادت تھی اگر وہ کچھ کہتا بھی تو دھیرے دھیرے ورنہ چپ چاپ کسی گوشے کی طرف آنکھ گاڑے بیٹھ جاتا تھا:۔

"کیا دیکھ رہے ہو بھئی؟"

"کچھ نہیں۔ اُدھر ایک چوہا دوڑتا پھر رہا ہے۔ مجھے چوہے پسند ہیں کیونکہ وہ بڑی آہستگی سے چلتے پھرتے ہیں۔"

یہ نوکر مجھ سے محبت نامے لکھوایا کرتے۔ یہ مشغلہ دلچسپی کا باعث تھا لیکن سدوروف کے خط لکھتے ہوئے زیادہ لطف آتا تھا۔ ہر سنیچر کو وہ اپنی بہن کو "تولا" شہر خط بھیجا کرتا تھا۔

اپنے باورچی خانے میں لے جاکر وہ میز پر میرے پاس بیٹھ جاتا۔ اور سر کو زور سے کھجاکر میرے کان میں کہتا:۔

"شروع کرو۔ پہلے القاب اور سلام دعا۔ میری جان سے زیادہ عزیز بہن۔ ہمیشہ تندرست اور خوش رہو۔۔۔ میاں جانتے ہی ہو کہ خط کیسے شروع کرنا چاہیے۔ اس کے بعد لکھو: "تمھارا بھیجا ہوا روبل ملا، آخر اس کی ضرورت کیا تھی۔ تاہم میں شکرگزار ہوں۔ یہاں مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں، عافیت کی زندگی ہے، عافیت خاک ہے۔ جانوروں سے بدتر زندگی ہے لیکن یہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ ابھی وہ بچی ہی ہے، صرف چودہ سال عمر ہے۔ اسے یہ سب کیوں بتلاؤں۔ چلو اسی مضمون کو اچھی طرح لکھ ڈالو۔ اپنا کمال دکھلاؤ۔"

خط لکھواتے لکھواتے وہ بائیں طرف سے مجھے دھکیلنے لگتا، زور زور سے

میرے کان میں آئیں شائیں بکنے لگتا :-
"لکھو : اگر کوئی میٹھی میٹھی باتیں کہے تو اس پر ہرگز بھروسا نہ کرنا۔ وہ تجھے دھوکا دے کر تیری زندگی برباد کرنا چاہتا ہی۔"

کھانسی روکتے روکتے اس کا چہرہ تمتما جاتا تھا اور آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔ میز پر جھک کر وہ مجھ پر لد جاتا اور میں جھڑک کر کہتا :
"لکھوں کیا خاک، جب تم مجھ پر لدے بیٹھو ہو۔"

"معاف کرنا۔ چلو آگے لکھو : اور سفید پوشوں پر تو قیامت تک یقین نہ لانا۔ یہ رنگے ہوئے سیار نظر پڑتے ہی ہر لڑکی کی عاقبت خراب کرنے کے منصوبے گانٹھنے لگتے ہیں۔ ان کی زبان بڑی چکنی چپڑی ہوتی ہی۔ اور اگر کچھ بچا سکو تو پادری کے پاس جمع کر دو بشرطیکہ پادری ایماندار ہو۔ لیکن بہتر یہی ہی کہ جمع پونجی زمین میں دفن کر کے رکھو اور جگہ کو اچھی طرح یاد رکھو۔"

کھڑکی کی کھڑکھڑاہٹ اور برتنوں کی کھٹر پٹر میں اس کی سرگوشیوں کو سمجھنا آسان نہ تھا۔ رہ رہ کر میں کالک سے ڈھکے ہوئے تندور اور برتن رکھنے کے پٹرے کو دیکھنے لگتا تھا جس پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ باورچی خانہ گندگی سے اٹا ہوا تھا، جدھر دیکھو کھٹمل رینگ رہے ہیں اور جلے ہوئے تیل کی بدبو آرہی ہی۔ تندور کے اوپر ایندھن کی لکڑیوں میں تلچٹے رینگ رہے تھے۔ یہ سب دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔ اس سپاہی اور اس کی بہن پر مجھے بڑا ترس آیا۔ یہ کہاں کا انصاف تھا کہ انسانوں کو اس قسم کی زندگی بسر کرنے کے لیے مجبور ہونا پڑے ؟

سدوروف کی باتوں پر دھیان نہ دے کر جو جی میں آئے میں لکھتا

گیا۔ خط کو میں نے غم واندوہ کے بیان سے بھر دیا۔ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولا:

"تم نے بہت کچھ لکھ دیا۔ اب وہ سمجھ جائے گی کہ کن بلاؤں سے دور رہنا چاہیے۔"

میں نے جھڑک کر کہا: "اسے خواہ مخواہ خوف زدہ کیوں کرنا چاہتے ہو۔" حالانکہ میں خود ہر طرف خطرہ محسوس کرتا تھا۔

سپاہی نے گلا صاف کر کے ہنستے ہوئے کہا:

"تم بھی عجیب آدمی ہو۔ کسی سے نہیں ڈرنا چاہیے! یہ تو کہو کہ شریف زادوں اور اللہ میاں کے متعلق کیا رائے ہے؟ - انھیں ہوّا سمجھو ہوّا!"

جب اس کی بہن کا خط آتا تو وہ بیتاب ہو کر کہتا: "للہ، جلدی سے پڑھ دے، دیکھوں تو کیا لکھا ہے۔"

اس بے معنی، چند سطری خط کو وہ کئی کئی بار پڑھوا کر سنا کرتا تھا۔

سدوروف رحم دل اور نیک مزاج تھا لیکن عورتوں کے معاملے میں اوروں سے بہتر نہ تھا۔ ان سے وہ بھی وحشی درندوں کی طرح پیش آتا تھا۔ یہ واقعات میری آنکھوں کے آگے ہوتے تھے اس لیے چاہوں یا نہ چاہوں ان سے چشم پوشی ممکن نہ تھی۔ ان کا آغاز و انجام کسی ناپاک خواب کی طرح ہوتا۔ سدوروف پہلے عورت کے دل میں حلم و رحم کے جذبات پیدا کرتا۔ پھر سبز باغ دکھا کر اسے اُمنگ میں لاتا۔ اور اس سے لطف اندوز ہونے کے بعد ارموخن کو اپنی کامیابی کا افسانہ سناتا — ایسے تلخ انداز میں گویا اسے قہراً وجبراً کوئی کڑوی دوا پینی پڑی ہو۔ یہ

دیکھ سُن کر مجھے طیش آتا اور میں پاپیوں سے پوچھا کرتا کہ وہ عورتوں کو دھوکا کیوں دیتے ہیں اور ان سے سب لے دے کر آپس میں ان کا مذاق کیوں اڑاتے ہیں، ان سے بدسلوکی کیوں کرتے ہیں۔

جواب ملتا " ایسی چیزوں کی جانچ پڑتال تمہارے لیے اچھی نہیں۔ کون کہتا ہے کہ یہ گناہ نہیں۔ لیکن تم ابھی کم عمر ہو، اتنی جلدی اس کوچے کی تلاش نہ کرو "

لیکن ایک دن سدوروف نے مجھے ایسا جواب دیا جو مجھے آج تک یاد ہے۔ کھانستے ہوئے وہ کہنے لگا: " تم سوچتے ہو گے کہ عورت کو خبر نہیں کہ مرد اُسے دھوکا دے رہا ہے۔ یہی تمہاری غلطی ہے۔ وہ خوب جانتی ہے۔ لیکن وہ جان بوجھ کر دھوکا کھانا چاہتی ہے۔ یہ ایسا چکّر ہے کہ دونوں فریق ایک دوسرے کو دھوکا دیتے ہیں۔ یہ ایک شرم ناک حقیقت ہے محبت کا کیا ذکر۔ یہ وقتی تفریح ہے اور بس۔ جب تم بڑے ہو گے تو خود معلوم کرلو گے۔ یہی وجہ تھی کہ آدم و حوّا دونوں باغ عدن سے نکال دیے گئے اور اسی فریب دہی و فریب خوردگی سے دنیا کے آلام کی ابتدا ہوئی۔"

اس کے بیان میں ایسا درد اور خلوص تھا کہ ان " رومانوں " سے میری نفرت قدرے کم ہو گئی۔ اس کے بعد سدوروف سے میری دوستی بڑھنے لگی۔ البتہ ارموخن سے میں نفرت کرتا تھا اور اسے چھیڑنے یا ستانے کا موقع ڈھونڈا کرتا تھا۔ اور اپنے منصوبے میں میں اکثر کامیاب ہوجاتا۔ اور وہ بھی انتقام لینے کی غرض سے میرے پیچھے پڑا رہتا۔ لیکن بیوقوفی کی وجہ سے اس کی کوئی تدبیر نہ چلتی۔

عورت کا ذکر آتے ہی سدوروف کہ اُٹھتا: " یہ شجر ممنوعہ ہے! "

میں بھی اس فتوے پر صاد کرنے کو تیار تھا۔ ہاں یہ ہرگز تسلیم نہ کرسکتا تھا کہ سارے دُکھ درد کی واحد وجہ عورت کی ذات ہے۔ میں نے غم دیدہ عاشق بھی دیکھے تھے۔ لیکن چاہنے والوں کی آنکھ میں چمک بھی دیکھی تھی اور ایک خاص قسم کی نرمی۔ دلوں کا ملنا اور خوشی سے رقص کرنا میرے لیے بھی موجب مسرّت تھا۔

بااین ہمہ یہ کہنا ہی پڑتا ہے کہ فی الجملہ یہ ماحول میرے لیے غیر دلچسپ تھا کیونکہ وہ محدود تھا اور اس میں کوئی تبدیلی نہ ہوتی تھی۔ ان جانی پہچانی مورتوں کے سوا مجھے اور کچھ نہ سُجھائی دیتا تھا۔

ایک روز سپاہیوں کی زبانی میں نے ایک واقعہ سُنا جس کا مجھ پر بڑا اثر ہُوا۔ یہیں کہیں ایک پردیسی رہتا تھا جو شہر کے بہترین درزی کی دُکان پر ملازم تھا۔ اس کی بیوی جو بانجھ تھی صبح سے شام تک کتابیں پڑھنے کے سوا کوئی کام نہ کرتی تھی۔ اس احاطے میں جہاں ہر دم شرابیوں کا غل غپاڑہ رہتا، وہ دونوں کونے کے ایک فلیٹ میں سب سے الگ تھلگ اپنی زندگی گزار رہے تھے۔ نہ وہ کہیں جاتے نہ کوئی ان کے پاس آتا۔ بہت ہوا تو چھٹی کے دن ناٹک دیکھنے چلے گئے۔

شوہر صبح سے رات بیتے تک مصروف رہتا۔ بیوی جو بظاہر پستہ قد لڑکی معلوم ہوتی تھی، ہفتے میں دو بار کتب خانے جایا کرتی۔ چلتے وقت وہ ایک پانْو پر زیادہ زور دیتی گویا لنگڑا رہی ہو اور اس کے ہاتھ میں کتابوں کا بستہ ہوتا۔ اس میں بناوٹ کا نام نہ تھا سادگی، صفائی وتازگی اس کی شکل صورت سے عیاں تھی۔ اس کا چہرا بھولا بھالا تھا آنکھیں تیز — اور اس کی ہر چیز ایسی سگھڑ تھی کہ وہ چینی کی گڑیا معلوم

ہوتی تھی - سپاہی طعنہ دیتے کہ ڈیڑھ پسلی کی عورت ہے، اسی لیے لنگڑا کر چلتی ہے لیکن مجھے اس کی یہ ادا بھی پسند تھی اور میں احاطے میں رہنے والے افسروں کی بیویوں سے زیادہ اس کی عزت کرنے لگا - ان عورتوں کی زبانیں گز گز بھر کی تھیں، لباس شوخ اور تڑک بھڑک نظر فریب - تاہم ان میں کوئی ایسی بات تھی جو گمان دلاتی کہ یہ گھر کے کباڑ کے ساتھ عرصے کسی تاریک گوشے میں پڑی ہوئی تھیں۔

درزی کی ننھی منی بیوی کو احاطے کے لوگ دماغ بھری کہا کرتے - روایت تھی کہ کتاب پڑھ پڑھ کر وہ ایسی حواس باختہ ہوگئی ہے کہ گھر بار دیکھنے کے قابل نہیں رہی - اس کا میاں سودا سلف لینے خود بازار جاتا ہے اور نوکرانی سے بھی اسے ہی نبٹنا پڑتا ہے یہ نوکرانی جو قد و قامت میں توپ خانے سے کم نہ تھی، خود بھی پردیسن تھی - اس کی ایک آنکھ کی جگہ گہرا سا سوراخ تھا اور دوسری آنکھ سے ہمیشہ پانی گرا کرتا - لوگ کہتے کہ وہ بھی اپنی مالکن کی طرح ناکارہ ہے - اسے روزمرہ کے کھانے پکانے بھی نہ آتے تھے اور ایک بار تو وہ شلغم کے دھوکے میں مولی اٹھا لائی تھی - یہ کتنا بڑا گناہ تھا!

اس عمارت میں یہ تینوں اجنبی تھے - انھیں دیکھ کر مجھے ایک مینا کا خیال آتا جو برف سے بچنے کے لیے ایک گندی کوٹھری میں گھس آئی جہاں کھٹملوں اور پسوؤں کے سوا کوئی نہ رہتا تھا۔

اردلیوں نے مجھے بتلایا کہ افسروں نے درزی کی بیوی سے بڑا اوچھا مذاق کیا ہے - باری باری سے وہ ہر روز اسے خط لکھتے اور اپنی محبت کا اظہار کرتے، ہجر و وصل کا ذکر کرتے - وہ غریب اپنے سیدھے پن میں انھیں جواب دیتی اور التجا کرتی کہ مجھے دق نہ کیجیے، میں کسی کو رنج

دینا نہیں چاہتی لیکن آپ کی چارہ جوئی کے لیے خدا سے دعا کے سوا کر ہی کیا سکتی ہوں۔ جب کسی ایک افسر کے پاس اس کا خط آتا۔ سب مل کر اسے پڑھتے اور پھر کسی نئے آدمی کے نام سے دوسرا خط تحریر کرتے۔

یہ قصہ مجھے سُنا کر اردلیوں نے اُس شریف خاتون کو بہت بھلا بُرا کہا۔ ارموخن نے ببانگ دہل کہا: "یہ کبڑی اول درجے کی پھوہڑ ہے۔" سدوروف نے بھی ہامی بھری: "کوئی بھی عورت ہو اسے دھوکا کھانے میں مزا آتا ہے۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی پھنستی ہے۔"

مجھے یقین نہ آیا کہ درزی کی بیوی کو اس شرارت کا پتا ہے اور میں نے فوراً تہیہ کیا کہ اسے باخبر کر دوں۔ میں دیکھتا رہا کہ نوکرانی کب گودام میں جاتی ہے اور اندھیری سیڑھی پر اُچک کر اُس خاتون کے باورچی خانے میں پہنچا۔ وہاں کسی کو نہ پا کر میں دیوان خانے کی طرف مڑا۔ وہ میز کے پاس بیٹھی ایک ہاتھ میں سنہرا پیالہ لیے۔ دوسرے ہاتھ سے کتاب تھامے اُسے پڑھ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ چونک پڑی اور کتاب کو سینے سے دبا کر گھبرائی ہوئی آواز میں بولی:۔

"تم کون ہو؟ کیا چاہتے ہو!"

میں ایک سانس میں خدا جانے کیا کیا کہہ گیا کیونکہ ہر لمحے یہ ڈر لگا ہوا تھا کہ کہیں وہ کتاب پھینک نہ مارے۔ وہ ایک آرام کرسی پر آسمانی رنگ کا لبادہ پہنے ہوئے بیٹھی تھی اور اس کے گھونگھردار سنہرے بال شانے پر بکھرے ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ بہشت سے کوئی اُتر آئی ہے۔ پہلے تو اس کے تیور غضبناک تھے لیکن رفتہ رفتہ اس کے ہونٹوں پر ایک تعجب آمیز تبسم آیا۔

جب میں سارا ماجرا سُنا چکا اور پھر اپنے کیے پر شرما کر دروازے کا رُخ کیا تو اس نے حکم دیا :-

"ٹھہر جاؤ۔"

پیالی کو کشتی پر اور کتاب کو میز پر رکھ کر اس نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا :

"تم بھی کس کینڈے کے لڑکے ہو! زرا ادھر تو آنا۔" میں سہمتا ہوا اس کے پاس گیا۔ اس نے میرے ہاتھوں کو اپنی چھوٹی چھوٹی ٹھنڈی اُنگلیوں سے تھپکاتے ہوئے کہا :-

"سچ کہتے ہو کہ تمھیں کسی نے سکھا پڑھا کر نہیں بھیجا؟ - نہیں خیر مجھے یقین ہی کہ کسی اور نے تمھیں اس کی ترغیب نہیں دی۔"

میرا ہاتھ چھوڑ کر اس نے آنکھ بند کر لی اور آہستہ سے کہا :-

"سپاہی میرا ذکر اس طرح کرتے ہیں؟"

میں نے زور دے کر کہا : "آپ اس مکان کو چھوڑ ہی دیں تو اچھا ہو۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ کہیں آپ ان کے جھانسے میں نہ آجائیں۔" اس پر وہ ہنس پڑی اور پوچھا :

"کچھ پڑھنے لکھنے کا بھی شوق ہی تمھیں؟"

"ہی تو سہی لیکن اس کے لیے میرے پاس وقت کہاں۔"

"اگر شوق ہو تو وقت بھی نکل آتا ہی۔ اچھا جاؤ، شکریہ تمھارا۔"

اس نے میری طرف ایک چونّی بڑھائی۔ مجھے اسے لیتے شرم آئی

لیکن اس کی خفگی کا بھی خیال تھا۔ باہر جاتے ہوئے میں نے یہ سکّہ اوپر کی سیڑھی پر رکھ دیا۔

اس عورت نے میرے خیالات کو ایک نئی رعنائی بخشی۔ گویا میرے لیے ایک نئی صبح کی روشنی پھیلی۔ کئی دن تک میری دنیا میں اُجالا رہا اور اپنے تخیّل میں میں اُسی کمرے میں رہا کیا، جہاں وہ عورت آسمانی رنگ کے لباس میں کسی حور کی طرح فروکش تھی۔ اس کے گرد و پیش کی ہر شے میں ایک غیر مرئی دلکشی تھی۔ اس کے قدموں کے نیچے ایک سنہرا قالین بچھا ہُوا تھا۔ دریچے کے رُپہلے شیشوں سے زمستاں کا ٹھنڈا دن اندر جھانکتا تاکہ اس کی قربت سے گرمی حاصل کر سکے۔ رہ رہ کر جی چاہتا کہ ایک بار پھر اُس کا دیدار ہو۔ اگر کتاب مانگنے کے بہانے اُس کے گھر جاؤں تو کیسی رہے؟

میں نے اس خیال پر عمل بھی کیا۔ اب کے بھی وہ اُسی جگہ کتاب پڑھتی ہوئی ملی۔ لیکن اس کے منہ پر لال رومال بندھا ہُوا تھا اور آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ مجھے سیاہ جلد کی ایک کتاب دیتے ہوئے اس نے رُندھے ہُوئے گلے سے کچھ کہا۔ لینے کو تو میں نے کتاب لے لی لیکن چلتے وقت میرا دل بجھا ہُوا تھا۔ کتاب کو میں نے اپنی کوٹھری میں کپڑوں اور کاغذوں میں لپیٹ کر چھپا دیا کیونکہ یہ بھی کھٹکا لگا ہُوا تھا کہ کوئی دیکھ پائے گا تو شامت آ جائے گی۔

گھر میں ایک مصور رسالہ آتا تھا لیکن اسے کوئی نہ پڑھتا تھا تصویریں دیکھنے کے بعد اُسے خواب گاہ کی الماری میں بند کر دیا جاتا اور سال کے سال جلد بندھوا کر پلنگ کے نیچے رکھ دی جاتی۔ فرش کے ایک

کونے میں "مجلۂ مصوری" کی تین جلدیں عرصے سے پڑی ہوئی گندے پانی میں سڑا کرتی تھیں۔ مالک ایک روزانہ اخبار بھی خریدا کرتا لیکن شام کو اسے پڑھ کر بڑبڑاتا:-

"یہ کیا بکواس ہے۔ آخر اس خرافات نویسی سے ان کا مقصد کیا ہے؟"

سنیچر کو اپنی کوٹھری کی صفائی کرتے وقت مجھے اس کتاب کی یاد آئی۔ اسے کھولتے ہی پہلے صفحے پر اس سطر پر نظر پڑی: "انسانوں کی طرح مکانوں کی بھی اپنی شخصیت ہوتی ہے۔ ہر مکان کی ہیئت جدا ہوتی ہے۔" یہ حقیقت ایسی بیّن تھی کہ میں دنگ رہ گیا اور کھڑکی کے آگے کھڑا تب تک پڑھتا رہا جب تک ٹھنڈ سے اکڑ نہ گیا۔ شام کو جب سب لوگ کلیسا کو سدھارے، میں باورچی خانے میں کتاب سے جُٹ گیا۔ اس کے ورق خزاں دیدہ پتیوں کی طرح زرد و پارینہ تھے۔ میرے لیے گویا ایک جہانِ نو کا دروازہ کھلا، جس میں نئے نام اور نئے اوصاف تھے۔ اُس کے ہیرو سربلند اُس کے جلّاد سرنگوں —— اور یہ سب اُن لوگوں سے قطعاً مختلف تھے جس سے مجھے واسطہ پڑتا تھا۔ یہ ایک ناول تھا جس میں اور ناولوں کی طرح واقعات کی بھرمار تھی اور ایک عجیب و غریب لیکن ہنگامہ خیز زندگی کا ذکر تھا۔ اس ہر سطر سادہ پرکار تھی۔ گویا بین السطور میں ملگجی سی روشنی چھپی ہوئی ہر نیک و بد کو اجال رہی تھی۔ کبھی محبت اور کبھی نفرت کے جذبے کو ترغیب ملتی اور پڑھنے والا مجبور ہو جاتا کہ کردار کی زندگی کے بھول بھلیاں میں کھو جائے اور اس کے عقدے کو حل کرنے کی کوشش کرے۔ مجھے پڑھتے پڑھتے جوش آتا کہ فلاں کی مدد کروں

فلاں کا مقابلہ کروں - اور بالکل بھول جاتا کہ یہ طلسمِ زندگی محض کاغذی ہی اور حقیقت سے بہت دور۔

ناول کے کردار کی کشمکش میں میں سب کچھ بھول جاتا کبھی ایک واقعے کو پڑھ کر دل خوشی سے اچھلنے لگتا اور کبھی دوسرے واقعے کو پڑھ کر دل پر مُردنی سی چھا جاتی -

دھیان اُس وقت ٹوٹا جب صدر دروازے کی گھنٹی بجی - میں سمجھ گیا کہ گھنٹی کیوں بج رہی ہی -

شمع جل چکی تھی - شمعدان جسے میں نے صبح ہی دھویا تھا - اب موم سے اٹ گیا تھا - اپنے گناہ کے آثار پر پردہ پوشی کرنے کے لیے میں باورچی خانے میں تاک جھانک کرنے لگا - کتاب تو تندور میں چھپا دی اور جلدی جلدی لیمپ ٹھیک کرنے لگا - اتنے میں دایہ دوڑی آئی -

" ہت تیرے بہرے کی ! سُنا نہیں کہ گھر والے دروازے پر دستک دے رہے ہیں "

میں نے جھپٹ کر دروازہ کھول دیا -

مالک نے تیکھے پن سے کہا : " سو رہا تھا کیا ؟ "

اس کی بیوی سیڑھی پر ٹھمک ٹھمک کر چڑھتی ہوئی شکایت کرنے لگی کہ باہر کھڑے کھڑے مجھے سردی لگ گئی - بڑھیا نے بھی جلے پر نمک چھڑکا باورچی خانے میں شمعدان پر اس کی نگاہ کیسے نہ جاتی بس پیچھے پڑ گئی کہ تو کر کیا رہا تھا - میں یہاں " ٹک ٹک دیدم ، دم نہ کشیدم " کا مضمون تھا - کہاں وہ سیرِ کوہسار ، اور کہاں یہ چٹیل میدان - میں سخت ہراساں ہُوا کہ کہیں کتاب ان کے ہتھے نہ چڑھ جائے - بڑھیا نے گھر سر پر اٹھا لیا

کہ آج یہ لونڈا آگ لگانے کی ترکیب کر رہا تھا۔ کھانے کے وقت اس نے سب سے کہا:

"دیکھ لی اس کی کرتوت۔ اگر یہ اسی طرح آگ سے کھیلتا رہا تو سارا محلہ راکھ کا ڈھیر ہو جائے گا۔"

کھاتے کھاتے اس چنڈال چوکڑی نے مجھے وہ جلی کٹی سُنائی کہ الٰہی توبہ۔ میرے تمام کردہ ناکردہ گناہوں کا دفتر کھلا اور چاروں نے بیک زبان میرے لیے جہنّم کی سزا تجویز کی۔ مگر میں بھی خوب سمجھتا تھا کہ انھیں نہ میرے بھلے کی پرواہ ہے نہ میرے بُرے کی۔ بلکہ وہ اس لیے بکے جا رہے ہیں کہ کوئی شغل رہے۔ کتاب کے آدمیوں کے مقابلے میں یہ کیسے اناڑی اور بیوقوف تھے۔

کھانا ختم کرکے وہ اپھرائے ہوئے کبوتروں کی طرح بسیرا کرنے چلے گئے۔ اللہ میاں کو اپنی بد دعاؤں سے دق کرکے بڑھیا بھی تندور پر پڑ گئی۔ اب میں چپکے سے اُٹھا اور جائے پناہ سے اس پیاری کتاب کو نکال کر کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ چمکتے ہوئے چاند نے دنیا کو نورستان بنا رکھا تھا، تاہم چھپائی ایسی باریک تھی کہ کچھ نہ پڑھا گیا۔ اِدھر یہ کُرید تھی کہ کسی نہ کسی طرح کتاب ختم ہو۔ میں نے پیتل کا ایک برتن اُٹھا کر چاند کی کرن کے آگے رکھا اور اس سے کتاب پر روشنائی جھلکائی لیکن یہ تدبیر بھی نہ چلی۔ لہٰذا میں شہ نشین کے سامنے کے آسن پر کھڑا ہو کر دیے کی جوت میں پڑھنے لگا۔ شومیٔ قسمت کہ تھکن کے مارے مجھے وہیں نیند آ گئی۔ آنکھ تب کھلی جب بڑھیا کے مکّے مجھ پر پڑ رہے تھے اور اس کے شور نے قیامت برپا کر دی تھی۔ وہ کتاب کے

پٹھے سے بھی مجھے بُری طرح مار رہی تھی۔ غصّے کے مارے اس کا بُرا حال تھا۔ اور اپنی لمبی قمیص، ننگے پاؤں اور کھلے ہوئے بالوں میں اس پر کسی چڑیل کا گمان ہوتا تھا۔ وکٹر اپنے چھجّے سے چیخ پڑا:

"اماں، خدا کے لیے سونے دو! تم نے تو جینا اجیرن کر دیا ہی۔"

اور میں اس تشویش میں تھا کہ کتاب اس کے ہاتھ لگ گئی ہی، وہ اسے سلامت نہ چھوڑے گی۔

ناشتے کے وقت میرا مقدمہ پیش ہوا۔ مالک نے سرد مہری سے پوچھا:۔

"یہ کتاب تمھیں کس نے دی؟"

عورتیں پاگل کتیوں کی طرح بھونکنے لگیں، اور وکٹر نے حقارت سے کتاب کے اوراق کو سونگھ کر کہا:۔

"توبہ توبہ! اس میں سے بدبو کیسی آرہی ہی۔"

جب اُنھوں نے یہ سُنا کہ کتاب پادری کی ہی تو وہ بھونچکّے رہ گئے اور بگڑ کر کہنے لگے کہ پادریوں کو ایسی کتابیں نہیں پڑھنا چاہیے۔ تاہم ان کا غصہ کچھ ٹھنڈا پڑا۔ اور مالک نے از سرِ نو ایک طویل تقریر کتب خوانی کے خلاف میرے گوش گزار کی۔

"ریل گاڑیوں پر ڈاکہ ڈالنے اور قتل کرنے والے مجرموں کے علاوہ کوئی کتاب نہیں پڑھتا۔"

مالکن نے ناک بھوں چڑھا کر کہا:

"ای ہٹو بھی! باؤلے تو نہیں ہوئے ہو؟ اس موئے کو ایسی باتیں نہ سکھاؤ۔"

وہ کتاب لے کر میں سدوروف کے پاس پہنچا اور سارا ماجرا سنایا اس نے ایک صاف تولیے میں کتاب لپیٹ کر صندوق میں چھپا دی اور بولا :-

" ان خبطیوں کے کہے پر کان نہ دو - یہاں پڑھنے آجایا کرو، کسی کو کانوں کان بھی خبر نہ ہوگی - اگر میری غیر حاضری میں آؤ تو شہ نشین کی آڑ سے چابی نکال لینا ۔"

میرے مالکوں نے اس کتاب پر جیسی لے دے کی تھی اس کی وجہ سے میری نگاہ میں اُس کی قدر قیمت بہت بڑھ گئی مجھے اس سے کیا غرض تھی کہ کتاب پڑھنے والوں میں ڈاکو اور قاتل بھی ہوتے ہیں - مجھے تو پادری کا وہ سوال یاد تھا جو اس نے اقرار گناہ[1] کی رسم میں کیا تھا اور طالب علم ایک حسینہ کو جو کتاب سُنا رہا تھا اس کا تماشا اب تک نہ بھولا تھا - نانا جان اور سموری وغیرہ ممنوعہ کتابوں کا جو ذکر کیا کرتے تھے اُس کا بھی خیال تھا -

مجھے محسوس ہونے لگا کہ کسی بہت بڑے راز کا مجھ پر انکشاف ہونے والا ہے - میری کیفیت دیوانوں کی سی ہوگئی - اس کتاب کو میں جیسے تیسے کرکے ختم کر دینا چاہتا تھا اور ہمیشہ ڈرتا رہتا کہ سدوروف اُسے کہیں گم نہ کر دے - اگر ایسا ہوا تو درزی کی بیوی کو کیا جواب دوں گا -

بڑھیا مجھ پر نظر رکھتی کہ کہیں میں سپاہی کی کوٹھری کا رُخ نہ کروں اور ہمیشہ طعنہ دیتی رہتی :

" کتاب چاٹو! کتابیں گناہ کی ترغیب دیتی ہیں - ذرا اُس درزن

---

(۱) Confession

کو دیکھ، کتابوں نے نہ اسے دین کا رکھا نہ دنیا کا افسروں کے ساتھ چھنالے کے سوا وہ اور کیا کر سکتی ہے۔ دن کو وہ ان کے ساتھ مزے اُڑاتی ہے۔ مجھے سب سیاہ سفید معلوم ہے!"

میری زبان پر یہ جملہ آتے آتے رہ جاتا کہ "یہ بہتان ہے، وہ ایسی نہیں ہے" لیکن درزی کی بیوی کی حمایت میں کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی کہ کہیں بڑھیا سمجھ نہ جائے کہ کتاب اس کی دی ہوئی ہے۔

کئی دن میں بوکھلایا سا رہا۔ اور کتاب کی طرف سے ایسا اندیشہ رہا کہ راتوں کو نیند نہ آئی۔ اسی اثنا میں درزی کی ملازمہ نے مجھے ٹوکا کہ وہ کتاب واپس چاہیے۔

دوپہر کے کھانے کے بعد جب سارا گھر قیلولے میں تھا میں جھینپتا جھجکتا ہوا درزی کی بیوی کے آگے حاضر ہوا۔ اس کی چھب میں سر مو فرق نہ آیا تھا۔ البتہ سج دھج مختلف تھی۔ وہ ایک بھورے لہنگے پر کالے رنگ کا مخملی جیکٹ پہنے ہوئے تھی اور گلے میں ایک خوبصورت صلیب لٹک رہی تھی۔ یہ کہتے کہتے کہ میں کتاب ہنوز ختم نہ کر سکا کیونکہ مجھے پڑھنے کی ممانعت ہے، میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ شرم کے ساتھ ہی ساتھ اس عورت کے دیدار کی مسرت میری رقت کا باعث تھی۔

اپنی ترچھی بھنوں کو تان کر وہ بولی: "کیسے احمق ہیں یہ لوگ! تمہارا مالک ذرا اپنا منہ تو دیکھے۔ خیر، تم اپنے کو نہ کڑھاؤ، میں اسے پرچہ لکھ بھیجوں گی۔"

میں گڑگڑا اُٹھا: "للّٰہ، ایسی غلطی نہ کیجیے گا۔ وہ آپ کا مذاق اُڑائیں گے اور بُرا بھلا کہیں گے۔ کیا آپ نہیں جانتیں کہ سارے

احاطے کے لوگ آپ پر ہنستے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ ڈیڑھ پسلی کی عورت ہیں!"

کہنے کو تو میں یہ کہ گیا لیکن اسی آن احساس ہوا کہ ایسا توہین آمیز کلمہ کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ اپنے ہونٹ مسوسنے لگی اور غصّے میں ہاتھ بھینچنے لگی۔ میری تو یہ حالت ہوئی کہ کاٹو تو لہو نہ تھا بدن میں لیکن وہ حسینہ دم بھر میں اپنے آپے میں آگئی۔ ہنستے ہنستے کرسی پر گر پڑی اور بار بار یہ کہنے لگی:۔

"واہ ری حماقت! میری توبہ بھلی!" زرا دیر بعد مجھ پر آنکھیں جما کر پوچھا "تم بھی کتنے عجیب ہو، سب سے انوکھے ہو!"

وہاں جو آئینہ رکھا تھا، اس میں میں نے اپنی شکل پر نظر ڈالی تو کیا دیکھا کہ چپٹی سی ناک کے دائیں بائیں اُبھری ہوئی ہڈیاں ہیں۔ ماتھے پر تازہ چوٹ کا نشان ہے اور بال جو مدّتوں سے نہ تراشے گئے تھے ہر طرف بکھرے ہوئے ہیں۔ اس شکل کو عجیب کہ لیجیے، یہ آپ کی مرضی۔ لیکن یہ ظاہر تھا کہ اس میں کشش کا کوئی پہلو نہ تھا۔

"تم میری دی ہوئی جوتی ڈیوڑھی پر ڈال گئے تھے۔ یہ کیوں؟"

"مجھے اس کی ضرورت نہ تھی"

اس نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا: "تو پھر کیا کیا جائے؟ اگر وہ تمھیں پڑھنے کی اجازت دے دیں تو یہاں آنا اور شوق سے کتابیں

لے جانا"

میز پر تین کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ انھیں میں نے حسرت سے دیکھا عورت نے اپنا نرم و نازک ہاتھ میری طرف بڑھا کر کہا:

"اچھا، خدا حافظ!"

میں نے دور سے اس کا ہاتھ چھوا اور جلدی سے باہر چلا آیا۔

باب (۹)

پڑھنے لکھنے کے شوق نے میری جو جو دُرگت بنائی وہ مجھے خوب یاد ہے۔

درزی کی بیوی کی کتابیں میرے خیال میں بیش قیمت اور نایاب تھیں اور چونکہ یہ کھٹکا لگا رہتا تھا کہ بڑھیا نہ جانے کب انھیں آگ میں جھونک دے، اس لیے میں نے دوبارہ ان کا رُخ نہ کیا۔ ان کے بدلے میں پھٹی پُرانی سستی کتابیں لانے لگا جو اُس دُکان میں مل جاتی تھیں جہاں میں ہر روز صبح سویرے روٹی خریدنے جاتا تھا۔

دُکان دار کی خاص صفت اس کی بدمزاجی تھی۔ جب دیکھو یہ مردِ خدا پسینے میں تر نظر آتا۔ اس کا جھُرّی دار سفید چہرہ پھنسیوں سے لالہ زار تھا اور آنکھوں میں سیاہی کا نام نہ تھا۔ پھولے پھولے ہاتھوں میں بھونڈی بھونڈی اُنگلیاں ان سب پر طرفہ تھیں۔ اس کی دُکان میں شام کو نٹھلے مردوں اور آوارہ چھوکریوں کا ہجوم ہوتا۔ میرے مالک کا بھائی بلا ناغہ وہاں بیر پینے اور تاش کھیلنے پہنچتا۔ اکثر میں اُسے کھانے کا بُلاوا دینے جاتا اور دیکھتا کہ دُکاندار کی رنگیلی بیوی وکٹر یا کسی اور کے آغوش میں بیٹھی ہوئی ہے۔ دُکاندار ان باتوں کا بُرا نہ مانتا تھا۔ خود اس کی بہن اس کی آنکھوں کے سامنے شرابیوں، سپاہیوں اور آنے جانے والوں سے چوما چاٹی کرتی رہتی۔ ان ترکیبوں کے باوجود دُکان کی چول ڈھیلی ہی رہتی تھی۔ وجہ یہ بتلائی جاتی تھی کہ کاروبار نیا نیا ہے

یہ بہانہ ہی بہانہ تھا کیونکہ دُکان کُھلے کئی مہینے گزر چکے تھے۔ دُکاندار بلا تکلف اپنے گاہکوں کو برہنہ تصویریں دکھلاتا اور ان کے نیچے لکھی ہوئی فحش عبارت کو نقل کرنے کی ترغیب دیتا۔

یہی ذات شریف مجھے اِدھر اُدھر کی کتابیں کرایے پر دیا کرتے۔ ان میں سے زیادہ تر بے سر پیر کی کہانیاں ہوتیں اور ان کی عبارت میں بھی کوئی خوبی نہ ہوتی۔ ہاں اگر کبھی کسی درویش کی سوانح عمری مل گئی تو میں اسے بڑی دلچسپی سے پڑھتا تھا۔ اس میں بیان کیے ہوئے واقعات میرے دل میں ولولہ پیدا کرتے اور مجھے "در اصل صاحب" یا نانا نانی کے افسانوں کے ہیرو کا خیال آجاتا تھا۔

یا تو میں لکڑی کاٹتے وقت سایبان میں پڑھتا یا اپنی تنگ و تاریک کوٹھری میں۔ اگر کوئی کتاب بہت دلچسپ ہوئی یا اسے ختم کرنے کی جلدی ہوئی تو رات کو چپکے سے موم بتی جلالی۔ لیکن بڑھیا کو کسی نہ کسی طرح سُن گُن مل جاتی اور وہ مجھ سے چھپا کر موم بتی کی لمبائی ناپنے لگتی اگر صبح موم بتی چھوٹی ملی تو بڑھیا ہائے توبہ سے گھر سر پر اٹھا لیتی۔ کبھی کبھی وکٹر اپنے بستر پر سے جھنجھلا کر کہتا:-

"اماں، تم نے تو جینا حرام کر دیا ہی۔ یہ لونڈا کتاب پڑھنے کے لیے موم بتی جلاتا ہی مجھے خوب معلوم ہی کہ وہ دُکان سے کتابیں کرایے پر لاتا ہی۔ یقین نہ آئے تو اس کی کوٹھری میں دیکھو۔"

بڑھیا لپ جھپ کوٹھری میں جاتی اور کتاب کو جلا کر راکھ کر دیتی۔ غصے کے مارے میں پیچ و تاب کھا کر رہ جاتا اور مطالعے کا شوق پہلے سے بھی زیادہ بڑھ جاتا۔ میرے مالک ایسے تھے کہ ان

کے گھر کوئی پیغمبر بھی آجاتا تو اسے مار مار کر سارا پڑھا لکھا بھولنے پر مجبور کر دیتے ۔ وہ اپنی زندگی میں کوئی ہنگامہ چاہتے تھے اور بس۔ اگر وہ دوسروں پر پھبتی کہنا یا نکتہ چینی کرنا چھوڑ دیتے ، تو ان کے لیے گفتگو کا اور کوئی موضوع نہ رہ جاتا ، دھیرے دھیرے وہ بولنا بھول کر گونگے ہو جاتے ۔ کسی انسان کے حسن و قبح کا اندازہ دوسروں سے اس کے تعلقات سے ہوتا ہے ۔ میرے مالک فطرتاً ناصح اور محتسب پیدا ہوئے تھے ۔ ان کا ہر جملہ لعنت ملامت یا کسی فتوے پر ختم ہوتا تھا ۔ اگر ان کی تعلیم و تربیت کے اثر سے کوئی انھیں کے خیال اور مزاج کا ہو جاتا تو وہ اسے بھی اچھا نہ کہتے ۔ یہ لوگ ۔ اسی قماش کے تھے ۔

بہرکیف ۔ میں نے اپنا مطالعہ اور بڑھیا نے کتابوں کے خلاف اپنا جہاد جاری رکھا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یک یک دکاندار نے اپنے قرض کا اعلان کر دیا جو اٹھنی سے کم نہ تھا ۔ وہ خبیث صبح شام تقاضا کرنے لگا اور دھمکی دی کہ اگر فوراً ادا نہ کیا تو گھر کے سودے کے پیسوں میں سے کاٹ لوں گا ۔

"پھر کیا ہوگا میاں مٹھو ؟" وہ شرارت سے پوچھتا ۔

مجھے تو اس کی صورت سے نفرت تھی ۔ وہ بھی یہ جانتا تھا اور اسی لیے مجھے ڈرانے دھمکانے میں اسے خاص لطف آتا تھا ۔ مجھے دیکھتے ہی وہ دانت نکال کر چکنی چپڑی آواز میں کہتا :

"قرض کے پیسے لائے ہو بھیا ؟"

"ذرا اور مہلت دیجیے ۔"

اب تو وہ بپھر کر غرّا پڑتا : "یہ کیسی بات ہے ؟ کیا میری دکان

کو خیرات خانہ تصوّر کیا ہے؟ سیدھے سیدھے نہیں دوگے تو جیل بھجوادوں گا۔"
پیسے بھلا مجھے کہاں سے ملتے کیونکہ میری تنخواہ نانا کے حوالے کردی جاتی تھی۔ لہٰذا میں بہت سٹپٹایا۔ اس قرض کا انجام کیا ہوگا جب میں نے بہت منّت سماجت کی تو اس کمبخت نے اپنے ہاتھ بڑھا کر کہا:

"اگر میرے ہاتھوں کو بوسہ دو تو تاریخ بڑھا دوں۔"

اس کے جواب میں جیسے ہی میں نے ترازو سے ادھ سیرا اُٹھایا وہ فوراً نیچے دبک گیا اور چلّایا:۔

"لڑکے پاگل تو نہیں ہُوا ہے؟ مذاق ہی مذاق میں بگڑ گیا۔"

مجھے معلوم تھا کہ وہ مذاق نہیں کرتا، اس لیے میں نے اٹھنّی چرا کر اس سے پیچھا چھڑانے کا تہیہ کیا۔ صبح جب میں فرش کی صفائی کرتا تو مالک کی جیب سے گرے ہوئے سکّے یہاں وہاں پڑے ہوئے مل جاتے۔ ایک بار تو دو رُبل لڑھک کر نیچے کی سیڑھی کے تختوں میں جا پھنسے۔ کئی روز وہ یونہی پڑے رہے اور جب میں نے لاکر مالک کو دیے تو اس کی بیوی بولی: "دیکھا تم نے! جیب میں روپیہ رکھنے سے پہلے گن لیا کرو۔" لیکن مالک میری طرف دیکھ کر مُسکرایا اور بولا:

"نہیں، یہ کبھی چوری نہ کرے گا۔"

اب جو میں نے قرض کی ادائی کے لیے چوری کا تہیہ کیا تو مجھے مالک کے الفاظ یاد آئے اور اعتماد کُشی میرے لیے ناممکن ہو گئی۔ کئی بار میں نے اس کی جیب سے پیسے نکالے اور گن کر پھر واپس رکھ دیے۔ تین دن میں اسی کشمکش میں رہا اور پھر یہ جھگڑا آپ ہی

آپ ہنٹ گیا۔ مالک خلاف توقع پوچھ بیٹھا:۔
"پیشکوف، بات کیا ہی کہ تم اداس سے رہتے ہو۔ طبیعت خراب ہی یا کوئی اور بات ہی؟"
موقع پاکر میں نے اپنی پریشانی کی اصل وجہ بلاکم وکاست سنادی وہ مُنہ بناکر بولا:۔
"دیکھا کتابیں کس مصیبت میں پھنساتی ہیں۔ ساری بُرائیوں کی جڑ یہ کتابیں ہی ہیں۔"
اٹھنی میرے ہاتھ پر رکھ کر اس نے سختی سے تنبیہ کی:۔
"خبردار جو میری ماں یا بیوی سے ذکر کیا۔ ورنہ آفت آجائے گی۔"

پھر وہ ہنس پڑا: "بھئی تو بھی اپنی دھن کا پکّا ہی۔ اور یہ اچھی بات ہی۔ خیر تم کتابوں کا پیچھا چھوڑ دو تو میں نئے سال سے کوئی عمدہ اخبار منگوانے لگوں گا اور تمھیں اسے پڑھنے کی اجازت بھی ہوگی۔"
چنانچہ شام کو چائے اور کھانے کے دوران میں مجھے ان بدذوق لوگوں کی تفریح طبع کے لیے "ماسکو گزٹ" کے علاوہ بھانت بھانت کے ناول پڑھ کر سنانے ہوتے تھے۔
باآواز پڑھنا مجھے ناپسند تھا کیونکہ اس سے میں نفسِ مضمون کو پوری طرح نہ سمجھ پاتا تھا۔ لیکن سننے والوں کے انہماک کا یہ عالم تھا کہ کرداروں کی مار دھاڑ کا حال سُن کر بڑبڑا اُٹھتے اور ایک دوسرے کو کہنی مار کر فخر سے کہتے:
"الحمد للہ، کہ ہماری زندگی ایسے امن وسکون سے گزر رہی

ہیں اور ہمیں اس قسم کے ہنگاموں سے واسطہ نہیں پڑتا۔

اکثر واقعات کا سلسلہ انھیں یاد نہ رہتا اور کردار کے نام بھی وہ بھول جاتے۔ جب میں ان کی غلطی پکڑتا تو وہ حیرت سے کہتے:

"غضب کی یادداشت ہے اس لونڈے کی!"

ان سب کی نگرانی میں اس تنگ و تاریک کمرے میں سردیوں کی شام گزارنا میرے لیے باعث کرب تھا۔ باہر رات کا سماں ایسا ڈراونا تھا کہ اس پر موت کا گمان ہوتا تھا اور رہ رہ کر برف کے تختے کڑکڑا اٹھتے تھے۔ سب لوگ یخ بستہ گھڑیالوں کی طرح گم سُم بیٹھے رہتے تھے۔ برفانی طوفان کی تندی کے آگے در و دیوار تھرانے لگتے اور چمنی سسکیاں بھرنے لگتی۔ اُدھر بچّوں کے اڑاٹے کان کے پردے پھاڑے ڈالتے تھے۔ میرا بھی جی چاہتا کہ کسی گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر خوب شور مچاؤں۔

میز کے ایک سرے پر دونوں عورتیں سینا پرونا کیا کرتیں۔ دوسرے کونے پر وکٹر بیٹا مار کر نقشوں کی نقل اتارتا اور بیچ بیچ میں پکار اٹھتا:

"میزر نہ ہلاؤ ری بلیو، مرغیو، بکریو!"

سب کے بیچوں بیچ مالک کشیدہ کاری کا فریم لیے میزپوش بنا رہا تھا۔ اس کی انگلیوں میں پیلی تتلیاں لال بتیاں اور نیلی مچھلیاں تھیں، اس شاندار میزپوش کا خاکہ خود اس نے بنایا تھا اور مہینوں سے متواتر یہی کام کر رہا تھا۔ تھکن کے مارے اس کا بُرا حال تھا اور دن کو جب مجھے فرصت ہوتی تو وہ بلا کر کہتا:

"پیشکوف، یہاں آؤ اور میرا ہاتھ بٹاؤ۔"

میں موٹے سے سوئے سے ٹانکے لگانے لگتا۔ اپنے مالک پر مجھے بڑا ترس آتا اور میں ہمیشہ اس کی مدد کے لیے تیار رہتا۔ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ ایک روز وہ نقشہ وکشیدہ اور تاش کے پتوں کو پھینک کر کوئی دلچسپ کام شروع کرے گا۔ خود وہ کبھی کبھی اپنے کام کو چھوڑ کر چپ چاپ کسی نامعلوم شئی کو تاکنے لگتا اور یہ محسوس ہوتا کہ وہ مستقبل کے لیے منصوبے باندھ رہا ہے۔ اپنے خیال میں وہ ایسا محو ہو جاتا کہ اس کے بال بکھر جاتے اور اسے ہوش نہ آتا۔ ایسے موقعوں پر اس کی بیوی جھٹ پوچھ بیٹھتی:۔

"کس دھیان میں ہو جی؟"

"کچھ نہیں، یونہی۔" کہہ کر وہ پھر اپنا کام شروع کر دیتا تھا۔

اس سوال کو سن کر میں بھوچکا رہ جاتا تھا۔ کسی سے یہ پوچھنا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے، کتنی بڑی حماقت ہے۔ اس کا جواب کیا ہو سکتا ہے۔ دماغ میں کوئی خیال یک بیک آتا ہے اور اس کا کوئی اور چھور نہیں ہوتا۔ وہ ایک طویل تصویر ہوتی ہے۔ اس منظر کی جو ہم نے کل یا سال دو سال پہلے دیکھا تھا۔ اور اس تصویر میں کوئی تسلسل و قیام نہیں ہوتا۔ وہ پرچھائیں کی طرح آتی اور چلی جاتی ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ وہ کیا اور کیوں سوچ رہا ہے۔ یا کب سوچنا شروع کرے گا اور کب بند کر دے گا۔

'ماسکو گزٹ' میں اتنا مواد تو تھا نہیں کہ ساری شام بسر ہو جائے اس لیے میں نے پلنگ کے نیچے دفن رسایل کی جلدوں پر ہاتھ صاف کیا۔ دلھن نے گھُڑک کر کہا:

"ان میں تصویروں کے سوا ہی کیا جو تیرے پلّے پڑے گا۔"

لیکن ان میں کئی ادبی جواہر پارے بھی تھے یہ انھیں کا طفیل تھا کہ مجھے رات کو باورچی خانے میں پڑھنے کی اجازت مل گئی۔

قسمت کو جو ساتھ دینا تھا تو دایہ بیمار ہوگئی اور بڑھیا بچّوں کے کمرے میں سونے لگی۔ وکٹر کو بھی میرے مطالعے میں دست اندازی کی فرصت نہ تھی کیونکہ سب کے سوتے ہی وہ کہیں چمپت ہوجاتا اور صبح کی خبر لاتا۔ اب میرے آگے صرف ایک مسئلہ تھا اور وہ روشنی کا۔ کیونکہ ساری موم بتیاں باورچی خانے سے ہٹا دی گئی تھیں اور میرے پاس انھیں خریدنے کے لیے دام نہ تھے۔ میں نے یہ ترکیب لڑائی کہ شمعدان سے موم جمع کرکرکے ایک ڈبّے میں رکھتا گیا اور اس میں کچھ تیل ڈال کر ایک بتّی رکھ دی۔ اس طرح ایک ٹمٹماتا ہوا دیا بن گیا۔ بس اسی کو لے کر رات کے وقت میں تندور کے اوپر ڈٹ جاتا تھا۔

وہ مدّھم سی جوت لگاتار کانپتی رہتی اور دھنویں سے میری آنکھوں میں جلن ہونے لگتی، اُس کے باوجود ان ضخیم جلدوں کی ورق گردانی میں مجھے بڑا لطف آتا تھا۔ ان کی تصویروں کو دیکھتے دیکھتے میں اپنے دکھ درد کو بالکل بھول جاتا تھا۔ اُنھوں نے دنیا کی وسعت کو میرے آگے لا رکھا۔ اور میں نے دیکھا کہ اس دنیا میں ویسے ہی شہر آباد ہیں جن کا ذکر افسانوں میں آتا ہے۔ تھوڑے ہی عرصے میں میرے لیے زندگی کا ایک نیا باب کھل گیا — زمین زیادہ حسین تھی جس میں انواع واقسام کی اشیا اور طرح طرح کے جاندار رہتے تھے۔ اس کے بعد میں جب کبھی دریائے وولگا کے کنارے کھڑا ہوکر اس پار دیکھتا تو مجھے یقین ہوتا

کہ اُدھر محض خلا ہی خلا نہیں ہی۔ لیکن اس سے قبل اُس پار کا نظارہ میرے لیے دل دوز تھا۔ سپاٹ چراگاہیں، چھدری جھاڑیاں بے رنگ جنگل، محسوس ہوتا کہ اُدھر کی زمین میں سناٹے کے سوا کچھ نہیں اور یہ سوچ کر میرے دل پر بھی اُداسی چھا جاتی۔ ارمان مرجھا سے جاتے، حوصلے پست ہو جاتے اور ایک قسم کا غم دل میں گھر کر لیتا۔ یہ اُداس سناٹا مجھ پر مایوسی و ناکامی کی کیفیت طاری کر دیتا تھا۔

تصویروں کی عبارت آسان پیرائے میں غیر ملکوں اور غیر قوموں کا حال بیان کرتی تھی۔ اس ضمن میں ماضی و حال کے بہت سے واقعات آجاتے اور ان میں سے کئی ایسے ہوتے جو میری سمجھ میں نہ آتے اور بڑی اُلجھن پیدا کرتے۔ کبھی کبھی مشکل الفاظ مثلاً: متاخرین، مابعد الحیات مافوق الفطرت وغیرہ پتھر کے روڑوں کی طرح سامنے آجاتے اور مجھے سخت پریشان کرتے گویا کوئی بھاری بھرکم دیو راستہ روک کر کھڑا ہو گیا ہو۔ ہر ممکن کوشش کے بعد بھی ان کے معنی سمجھ میں نہ آتے اور میرا دل بیٹھ جاتا کہ اب علم کے دروازے میرے لیے بند ہو گئے۔ گویا یہ علم کے طلسم کے سنتری تھے۔ اکثر کئی محاورے میرے دماغ میں یوں چبھ جاتے جیسے تلووں میں پھانس چبھ گئی ہو اور میں کسی دوسری چیز کے متعلق سوچنے سے قاصر ہو جاتا۔ ایک بار میں نے یہ عجیب و غریب شعر پڑھا۔

دشت و جبل ہیں زیر و زبر اب روما کی باری آئی ہی۔
ہونوں کا لشکر نکلا ہی اب دنیا کی شامت آئی ہی

یہ تو جانتا تھا کہ روما ایک شہر کا نام ہی۔ لیکن 'ہون' کس بلا کا نام ہی؟ میں اسی اُدھیڑ بن میں پھنس گیا۔

مالک کو مہربان پا کر پوچھا تو وہ تعجب سے بولا: "مجھے تو خبر نہیں شاید خدا یا شیطان کو پتا ہو۔ ہون؟ کسی وبا کا نام تو نہیں۔

پھر ناپسندیدگی کا اظہار کر کے مزید فرمایا:

"پیشکوف، تو اپنے دماغ میں یہ کباڑ کیوں جمع کر رہا ہے۔ اس سے تجھے کیا ملے گا"

بہرحال، میں تو علم حاصل کرنا چاہتا تھا، خواہ اس کا انجام نیک ہو یا بد۔

خیال آیا کہ ہو نہ ہو فوج کے پادری کو اس نادر روزگار شے "ہون" کا حال معلوم ہوگا۔ اس سدا کے روگی اور نک چڑھے بڈھے کی آنکھوں میں رتوندھی تھی، بھویں تک غایب تھیں؛ ڈاڑھی پیلی پڑگئی تھی۔ سوال سنتے ہی وہ اپنا کالا لٹھ زمین پر ٹیک کر مجھے کاٹنے دوڑا:

"ایں، تجھے اس خرافات سے کیا غرض؟"

ایک فوجی افسر میرا سوال سن کر پاگل کتے کی طرح غرا پڑا:

"کیا کہا——"

اب میں نے سوچا کہ اس معمے کا حل دوا فروش کے پاس ضرور ہوگا۔ وہ ہمیشہ مجھ سے مہربانی سے پیش آتا تھا اور اس کی آنکھوں سے جو سونے کے چشمے سے ڈھکی رہتی تھیں، ذہانت چمکتی تھی۔

اس نے جواب دیا: "ہون ایک خانہ بدوش قبیلے کا نام تھا یہ سب لوگ مر کھپ گئے، اب ان کا ذکر صرف تاریخوں میں رہ گیا ہے"

یہ سن کر مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ اس لیے نہیں کہ ہون مرکھپ گئے۔ بلکہ جس لفظ نے مجھے اس قدر پریشان رکھا تھا، اس کا مطلب

اتنا سیدھا سادہ تھا اور میرے لیے قطعاً بیکار تھا۔

ہونون نے اوروں کے ساتھ جو بُرائی کی ہو لیکن میرا یہ بھلا کیا کہ اس دوا فروش سے ملاقات کرادی۔ اس بندۂ خدا نے دنیا کا سارا علم گھول کر پی لیا تھا۔ چشمے کو ناک پر بٹھائے ہوئے وہ بولا:

"میاں، الفاظ اور پیڑ کی پتیوں میں بڑی مشابہت ہی۔ اگر ہم یہ جاننا چاہیں کہ کسی پتی کی تراش مختلف کیوں نہیں ہی تو سب سے پہلے ہمیں درخت کی جڑ اور تنے کو جانچنا ہوگا۔ اس کے لیے کتابوں کا مطالعہ ازبس ضروری ہی۔ دنیا کو ایک باغ سمجھو جس میں خوش نما اور بہار آفریں پھولوں کی کمی نہیں۔"

مجھے دوا فروش کی دُکان کی کئی بار پھیری کرنی ہوتی تھی۔ کیونکہ گھر میں چھوٹے بڑے سب کو بدہضمی کی شکایت رہتی اور مجھے ان کے لیے دوائیں مہیا کرنی پڑتیں۔ اس کی نصیحت کا یہ اثر ہُوا کہ میرے دل میں کتابوں کا احترام اور بھی بڑھ گیا۔ رفتہ رفتہ یہ حال ہوا کہ جیسے کسی متوالے کے لیے شراب، میرے لیے کتاب۔ کتابوں نے مجھ میں ایک نئی روح پھونکی جو عمل و شرافت کے جذبات سے مالا مال تھی۔ اور مجھے ترغیب دیتی تھیں کہ جرم ہو یا بہادری، کوئی کارنامہ دکھاؤں کیونکہ میں جن لوگوں میں رہتا تھا ان میں نہ یہ جرأت تھی کہ مجرم بنیں نہ یہ کہ بہادر ہوں۔ کتابوں میں میں جو کچھ پڑھتا تھا اس سے ان کی زندگی بالکل الگ تھی اور میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ زندہ کیوں ہیں۔ کم از کم مجھے تو کسی قیمت پر یہ زندگی گوارا نہ تھی، یہ طی شدہ امر تھا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ لندن، پیرس یا پراگ میں شہر کے بیچوں

بیچ گندے نالے نہیں بہتے اور نہ گھروں کے سامنے کوڑے کرکٹ کا ڈھیر ہوتا ہے۔ وہاں کی سڑکیں چوڑی اور صاف، وہاں کے مکان ہوادار اور کھلے ہوئے۔ وہاں کبھی بھی مہینے جاڑا نہیں پڑتا اور نہ عیسوی رمضان کا مہینہ آتا ہے جب "نفس کشی" کے نام پر لوگ تیل میں پکے ہوئے گگرمتے اور مٹر کے دانے کھایا کرتے ہیں۔ اس ماہِ مبارک میں پڑھنا لکھنا بھی منع تھا چنانچہ مجھ سے اُن رسایل کی جلدیں چھین لی گئیں اور میں از سرِ نو ایامِ جہالت میں رہنے لگا۔ اس زمانے میں جب میں نے تصویروں کی زندگی سے اپنے روز و شب کا مقابلہ کیا تو میری نفرت دوچند ہوگئی۔ پڑھتے وقت میں اپنے میں صحت اور قوت محسوس کرتا۔ کام کاج میں بھی مجھے مزا ملتا کیونکہ زندگی کا کوئی مقصد تو تھا۔ کام میں بڑی پھرتی سے کرتا تاکہ پڑھنے کی زیادہ مہلت ملے۔ لیکن کتابیں جو چھن گئیں تو میں کاہل و ناکارہ ہو چلا اور یہ ایک ایسی کیفیت تھی جو مجھ پر کبھی غالب نہ آئی تھی۔

یاد آتا ہے کہ انھیں بے رنگ گھڑیوں میں ایک عجیب واقعہ ہوا۔ رات کو ہم بستر پر لیٹے ہی تھے کہ کلیسا کا گھنٹا اچانک بج اُٹھا اور ہم سب چونک کر اُٹھ بیٹھے۔ ادھ ننگے مرد و زن اپنی اپنی کھڑکیاں کھول کر ایک دوسرے سے پوچھنے لگے:-

کہیں آگ تو نہیں لگی؟ خطرے کی گھنٹی تو نہیں بجی؟"

ہر طرف یہی پوچھ گچھ ہو رہی تھی۔ دروازے کھلتے بند ہوتے تھے اور اسی وقت کوئی کوئی آدمی گھوڑے پر سوار احاطے کے باہر بھاگا۔ بڑھیا چلائی کہ کلیسا لُٹ گیا لیکن مالک نے بگڑ کر کہا:

"اماں کہرام نہ مچاؤ۔ کون کہتا ہی کہ یہ خطرے کا گھنٹا ہی"۔
"تو ہو نہ ہو بڑے پادری کا انتقال ہو گیا"۔
دکٹر نے کپڑے پہن کر اپنے چھینکے سے نیچے اُترتے ہوئے کہا:
"مجھے اصل ماجرا معلوم ہی! خوب معلوم ہی!"
مالک نے مجھے حکم دیا کہ چھت پر چڑھ کر دیکھوں کہ آسمان پر لالی تو نظر نہیں آتی۔ میں نے اوپر جا کر دیکھا تو کوئی ایسی بات نہ تھی۔ گھنٹا اب تک ٹناٹن بج رہا تھا۔ اندھیرے میں لوگ اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے اور برف کو پیروں تلے کچل رہے تھے۔ میں نے واپس لوٹ کر اطلاع دی کہ آسمان کی رنگت میں کوئی فرق نہیں آیا۔
مالک نے کنٹوپ اور اوورکوٹ پہنتے ہوئے کہا: "خدا خیر کرے"۔ بادلِ ناخواستہ وہ جوتوں میں گولوش چڑھانے لگا۔
بیوی نے گڑگڑا کر کہا: "خدا کا واسطہ، باہر نہ جاؤ"۔
"واہیات! اس میں ہرج کیا ہی"۔
دکٹر بدستور سب کو چڑاتا رہا:
"مجھ سے پوچھو، مجھے سارا قصہ معلوم ہی"۔
جب دونوں بھائی باہر چلے گئے تو مجھے سماوار میں پانی رکھنے کا حکم دے کر عورتیں کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئیں۔ دم بھر میں مالک اُلٹے پانو، لوٹ آیا اور بھرّائی ہوئی آواز سے کہا:
"کسی نے زار کو قتل کر دیا!"
"قتل! کیسا قتل، کس کا قتل" بڑھیا کے اوسان جاتے رہے۔
"ایک افسر نے مجھے بتایا کہ زار کا خون ہو گیا۔ اب کیا ہو گا؟"

پیچھے پیچھے وکٹر بھی آیا اور غصّے سے بولا :

"میں تو سمجھا تھا کہ لڑائی چھڑ گئی"

پھر وہ سب چائے پیتے ہوئے کانا پھوسی کرنے لگے ۔ اب سڑکوں پر سناٹا ہوگیا تھا اور گھنٹا بھی چپ پڑگیا تھا ۔ دو روز تک یہ سب لوگ پُر اسرار طریقے سے سرگوشیاں کرتے رہے اور یہاں وہاں آتے جاتے رہے ۔ ان کے جاننے والے یکے بعد دیگرے آتے اور کوی بحث چھیڑ دیتے ۔ میں نے لاکھ سر مارا لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا ۔ اُنھوں نے اخبار بھی مجھ سے چھپا دیے ۔ میں نے سدوروف سپاہی سے پوچھا کہ زار کا خون کیوں ہُوا ۔ اس نے کان میں کہا :۔

"اس کے ذکر کرنے کی ممانعت ہی"

کچھ عرصے میں یہ ہنگامہ بھی فرو ہوگیا اور وہی چکر شروع ہوگیا ۔ زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ مجھ پر ایک آفت نازل ہوی ۔

اتوار کی صبح جب سب کلیسا سدھارے تو میں سماوار میں پانی بھر کر کمروں کی صفائی میں لگ گیا ۔ میری غیر حاضری میں ایک بچّے نے سماوار کی ٹونٹی کھول دی جس کی وجہ سے سارا پانی بہ گیا ۔ تھوڑی دیر بعد میں نے ایک عجیب سی آواز سنی ۔ باورچی خانے میں آکر کیا دیکھتا ہوں کہ سماوار کالا پڑگیا ہی اور خود بخود یوں جنبش کر رہا ہی ۔ گویا ابھی فرش پر کود پڑے گا ۔ اس کی ٹونٹی ایک طرف کو گر گئی تھی ۔ ڈھکن دوسری طرف پیتل بھی کہیں کہیں سے گلنا شروع ہوگیا تھا ۔ میں نے اس پر پانی اُنڈیلا تو وہ بھسم ہوکر نیچے گر پڑا ۔ اسی وقت باہر کی گھنٹی بجی اور بڑھیا دندناتی ہوئی اندر گھس آئی ۔ اس کے سوال کے جواب میں

میں بولا :-

"جی ہاں سماوار تیار ہی"

یہ جملہ تو میں نے گھبراہٹ کی حالت میں کہا تھا لیکن اسے میری گستاخی پر محمول کیا گیا - لہٰذا مجھے دُگنی سزا دی گئی اور سب نے مارتے مارتے میرا کچومر نکال دیا - بڑھیا نے ببول کی ڈالی سے میری پٹائی کی اس سے زیادہ چوٹ تو نہ آئی لیکن اس کے کانٹے جا بجا جسم میں چبھ گئے - رات ہوتے ہوتے میری پیٹھ پھول کر ڈبل روٹی ہو گئی اور دوسرے دن دوپہر تک ایسی ابتر حالت ہوئی کہ میں اسپتال پہنچا دیا گیا -

ڈاکٹر نے جو لاغری میں بیدِ مجنوں سے زیادہ نہ تھا ، غیر دلچسپی سے کہا : "اس معاملے کی تحقیقات ہونا چاہیے"

میرے مالک کے تو چھکے چھوٹ گئے - ڈاکٹر کے کان میں کھُسر پھُسر کرنے لگا - لیکن اس نے سر ہلا کر کہا :-

"یہ ناممکن ہی ، ہرگز نہیں ہونے کا"

پھر مجھ سے دریافت کیا :

"کیوں جی ، رپٹ کرنا چاہتے ہو ؟"

درد کی شدّت کے باوجود میں نے کہا :

"نہیں ، نہیں - آپ جلد مجھے اچھا کر دیں ، یہی بڑا کرم ہوگا"

مجھے ایک میز پر لٹا کر ڈاکٹر نے چمٹے سے کانٹے نکالنا شروع کیے اور ہنس کر کہا :

"میاں تمھارا چمڑا تو اب اتنا پختہ ہو جائے گا کہ برف یا بارش کسی کا اثر قبول نہ کرے گا"

آخر میں وہ بولا: "بھیا بیالیس کانٹے تو نکل چکے اور یہ اتنی بڑی تعداد ہے کہ تم اس پر بجا طور پر فخر کر سکتے ہو۔ کل اسی وقت مرہم پٹی کے لیے آ جانا۔ کیا تمھاری پٹائی اکثر ہوتی ہے؟"

میں نے کچھ سوچ کر کہا: "اب تو پہلے سے کم ہوتی ہے۔"

یہ سُن کر وہ زور سے ہنس پڑا: "میاں، یہ تمھارے بھلے کے لیے ہے!"

مالک سے مخاطب ہو کر اس نے کہا: "ان حضرت کی مرہم پٹی ہو چکی، کل اسی وقت اسے لے آنا۔ ایسے مسخرے کی خدمات حاصل کرنے پر مبارکباد!"

جب ہم گاڑی پر بیٹھے تو مالک نے کہا:-

"پیشکوف، مجھ پر بھی ایسی ہی مار پڑتی تھی۔ تمھارا ہمدرد ایک میں تو ہوں، لیکن میرے آنسو پونچھنے والا کوئی نہ تھا۔ لوگ بڑے ظالم اور بے درد ہوتے ہیں ــــ انسان سے رحم کی توقع نہ رکھنا۔ لعنت ہے ان جنگلی مرغیوں پر!"

راستے بھر وہ اسی طرح بڑبڑاتا رہا۔ میں اس کا ممنون بھی ہُوا اور اُس پر مجھے ترس بھی آیا۔

گھر میں میری ایسی آؤ بھگت ہوئی گویا یہ میری سالگرہ تھی۔ عورتیں بار بار اسپتال کا حال پوچھتیں۔ سب سُن کر اُنھوں نے اطمینان کی سانس لی اور میرا لاڑ پیار کیا۔ دُکھ درد میں ان کا کلیجا پسیجتے دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوتی تھی۔

میں تاڑ گیا کہ ان کی خوشی کی ساری وجہ یہ ہے کہ میں نے رپٹ نہیں کی اور موقعے سے فایدہ اٹھا کر میں نے فوراً درزی کی بیوی

سے کتابیں لانے کی اجازت مانگی۔ انھیں انکار کی جرأت نہ ہوئی۔ البتہ بڑھیا نے سر پیٹ لیا:

"یہ شیطان ہی شیطان!"

دوسرے دن میں درزی کی بیوی کے ہاں پہنچا۔ اس نے نرمی سے کہا:

"میں نے تو سنا تھا کہ تم بیمار ہو کر اسپتال میں پڑے ہوئے ہو۔ لوگ بھی کیسی بے پر کی اُڑا دیتے ہیں۔"

میں نے ہاں نا کچھ نہیں کی کیونکہ حقیقت بیان کرتے شرم آئی۔ اسے زندگی کے نجس و کثیف پہلو سے واقف ہونے کی ضرورت کیا!۔ یہ کیا کم تھا کہ اُس کی آن بان سب سے جُدا تھی۔

وہ مجھے چھانٹ چھانٹ کر قصے کہانی کی کتابیں دیتی اور انھیں میں آناً فاناً میں پڑھ جاتا اور ہمیشہ مگن رہتا۔ ایسا محسوس ہوتا کہ اس خیالی دنیا کا ایک فرد میں بھی ہوں اور یہ تصوّر میری طاقت اور ہمّت کو گرتے گرتے بچا لیتا۔ روشنی کے لیے میں وہی ترکیب کرتا اور نتیجہ یہ ہوا کہ دھنوئیں کے دیے میں پڑھتے پڑھتے آنکھوں میں درد ہونے لگا۔ بڑھیا نے رحم کھا کر کہا:

"ارے کتاب کے کیڑے کہیں تو اندھا نہ ہو جائے۔"

ان کتابوں کی آب و ہوا الگ تھی اور زمان و مکان جُدا۔ لیکن ان کا ماحصل ایک ہوتا، وہ یہ کہ: بدکار اچھوں پر ستم توڑتے تھے گو کہ یہ بُرے لوگ زیادہ ہوشیار اور تجربہ کار تھے لیکن آخر میں وہ ایسا پلٹا کھاتے کہ نیکی کی جیت ہوتی اور بدی کی ہار۔ یہ ضرور تھا کہ ناولوں کے مرد اور عورت جس "محبت" کا ذکر کرتے تھے۔ وہ مجھے بے معنی معلوم ہوتی تھی۔ یہی نہیں بلکہ مجھے اُس کے نام سے بھی گھن آتی تھی۔

کسی ناول کو شروع کرتے ہی میں اس تشویش میں مبتلا ہو جاتا کہ کون کامیاب ہوتا ہے اور کون ناکام۔ اور جیسے جیسے نقشہ صاف ہوتا جاتا میرا تخیل زیادہ دور رس ہوتا جاتا۔ کتاب ہاتھ میں نہ ہو تو بھی میں اسی کے گورکھ دھندے میں اُلجھا رہتا گویا حساب یا فلسفے کا کوئی دقیق مسئلہ پیش نظر ہے۔ اس ریاضت کا پھل یہ ملا کہ میں کتاب کے کرداروں سے روشناس ہوتے ہی ٹھیک ٹھیک بتلا دیتا کہ ان میں سے کون جنت کے مزے لوٹیں گے اور کون جہنم کی ہوا کھائیں گے۔

ان افسانوں کے اوراق میں مجھے حقیقت حیات کی ایک ہلکی سی جھلک ملی اور ایک دوسری دنیا کا مبہم سا خاکہ آنکھوں میں رچ گیا۔ مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ پیرس میں مزدور سپاہی اور دوسرے عامی اس طرح دن نہیں بسر کرتے جیسے روس کے شہروں میں۔ وہاں کے غریب بھی امیروں سے دو بدو بات کر سکتے تھے، ان سے شانے سے شانہ ملا کر چل سکتے تھے۔ ان کتابوں سے جس سپاہی کی تصویر ہویدا ہوتی تھی وہ بتلاتی تھی کہ وہ ہمارے سپاہیوں سے کہیں زیادہ انسانیت پرور ہے۔ وہ سموری خانساماں سے کسی قدر ملتا جلتا تھا۔ گو اس کی طرح تند خو اور وحشی نہ تھا ان کا دُکاندار ہمارے دُکانداروں سے زیادہ ایماندار اور معاملہ فہم تھا۔ اور پادریوں کی نہ پوچھیے۔ ان کے پادری زیادہ مخلص اور زندگی سے زیادہ قریب تھے فی الجملہ میں نے یہ اخذ کیا کہ غیر ملکوں کی زندگی ہر لحاظ سے بہتر اور وسیع تر ہے۔ وہاں کا انسان درندہ نہیں ہے۔ نہ وہاں انسان کا ویسا تمسخر اڑایا جاتا ہے۔ نہ خدا کے نام پر ایسی لے دے کی جاتی ہے۔ میں نے ان کتابوں میں ایک خاص

نکتہ یہ دیکھا کہ ان کے جلاد، مجرم یا بدمعاش بھی خواہ مخواہ ویسی بیرحمی نہ کرتے تھے اور نہ انسانیت کو فنا کرنے کا ویسا کریہہ جذبہ رکھتے تھے جس کی مثالیں میں آئے دن روس میں دیکھا کرتا تھا۔ ان کتابی مجرموں کے ظلم میں بھی کوئی قاعدہ، کوئی طریقہ ہوتا تھا۔ ان کے ظلم کو سمجھنا مشکل نہ تھا۔ لیکن میری آنکھ کے آگے جو ظلم ہوتا وہ حظ حاصل کرنے کے لیے، لطف اُٹھانے کے لیے کیا جاتا تھا۔

میری معلومات میں جتنا اضافہ ہوتا گیا، روسی اور غیر روسی معاشرت کا یہ امتیاز اتنا ہی بیّن ہوتا گیا۔ اس کی وجہ سے مجھے تعجب ہی نہ ہوتا بلکہ طیش بھی آتا تھا۔

ایک بار اس نے مجھے GREEN WOOD کی تصنیف "ایک ننھے غلام کے سچّے حالات" پڑھنے کے لیے دی۔ کتاب کا نام دیکھ کر پہلے تو اسے پڑھنے کو جی نہ چاہا۔ لیکن شروع کرتے ہی میں اس میں کھوگیا اور اسے ختم کر کے چھوڑا۔ اب سمجھ میں آیا کہ دنیا میں ہر جگہ بہت سے بدنصیب بچّوں کو ایسے ہی مصایب کا سامنا کرنا پڑتا ہے ناشکری کفر ہے، میری حالت ان سے بہر حال بہتر تھی۔

اس مصنّف نے میرے گرتے ہوئے حوصلے کو تھام لیا۔ اس کے بعد ہی مجھے ایک ادبی شاہکار پڑھنے کو ملا اس کا نام ENGENIE GRANDET تھا اور اسے 'بالزاک' نے تصنیف کیا تھا۔ اسے پڑھ کر نانا جان کا حلیۂ شریف آنکھوں کے آگے آگیا اور اس میں جو حقیقت بیان کی گئی تھی اس نے مجھے دنگ کر دیا۔ کتاب اتنی چھوٹی تھی کہ مجھے افسوس ہُوا۔ آئے دن

کے جو دکھ مجھے ہمیشہ پریشان رکھتے تھے وہ اس کتاب میں ایک نئے انداز سے پیش کیے گئے تھے جس میں غصہ یا نفرت کا جذبہ نہ تھا۔ اس سے پہلے میں نے جو کتابیں پڑھی تھیں ان میں انسانوں پر ویسی ہی لعن طعن کی گئی تھی جیسی میں اپنے گھر میں سُنا کرتا تھا۔ اور اس وعظ و پند سے اُکتا کر بدکاروں سے مجھے ہمدردی ہو جاتی اور نیکی کے فرشتوں سے چڑ سی ہو جاتی۔ مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوتا کہ تگ و دو کے باوجود انسان کی خواہشات تشنۂ تکمیل رہ جاتی ہیں اور شریفوں کو دیکھو تو کتاب کے شروع سے آخر تک ہاتھ پر ہاتھ دھرے، اللہ میاں سے لو لگائے بُت بنے بیٹھے ہیں اور حالانکہ ان پتھر کی مورتوں پر بڑے بڑے ظلم ہوتے ہیں، پھر بھی سنگ پاروں سے بھلا کس قسم کی ہمدردی ہو سکتی ہے کوئی دیوار کتنی ہی خوبصورت ہو لیکن اس کے پرے جو سیب کا درخت ہے وہاں تک پہنچنے کی کوشش کرنے والا اس دیوار سے محبت تو نہیں کر سکتا۔ مجھے تو یہی گمان ہوتا کہ نیکیوں کا جوہر ان "شریفوں" کے بار کے نیچے دبا ہوا ہے۔

گرین وُڈ یا بالزاک کی کتابوں میں فرشتے یا شیطان نہ تھے بلکہ چلتے پھرتے جیتے جاگتے انسان تھے۔ اُن کے کیے کرے میں مبالغے کا شائبہ بھی نہ تھا۔ ان کی فطرت کا تقاضا تھا کہ یہی کریں اور یہی کہیں۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ 'اچھی کتاب' کتنی بڑی برکت ہے، لیکن اچھی کتابیں ہیں کہاں؟ درزی کی بیوی کو بھی اس کی خبر نہ تھی۔

اب یہ گڑیا بھی میری نظر سے اُتر گئی۔ اس سے ملنے سے پہلے میں صاف کپڑے پہنتا، مانگ نکالتا اور اپنے کو ہر طرح بنانے سنوارنے کی کوشش کرتا۔ لیکن میرے سب جتن اکارت جاتے۔ میں یہ توقع

لے کر جاتا کہ وہ مجھ سے بلا تصنع دوستانہ گفتگو کرے گی۔ لیکن مجھے دیکھتے ہی اُس کے چنچل چہرے پر مسکراہٹ آجاتی اور وہ تھکی ہوئی آواز میں پوچھتی:

"کتاب ختم کر لی ؟ پسند آئی ؟"

"بالکل نہیں۔"

ناک بھوئیں چڑھا کر وہ منمنانے لگتی :

"اس کی وجہ !"

"یہ سب باتیں میں کئی بار پڑھ چکا ہوں۔"

"کونسی باتیں ؟"

"محبت کی۔"

آنکھیں چمکا کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑتی :

"لیکن بابا، سب کتابوں میں محبت ہی کا تذکرہ ہوتا ہے۔"

آرام کرسی میں بیٹھے بیٹھے کبھی وہ انگڑائی اور کبھی جمائی لیتی۔ کبھی اپنے ننھے ننھے پاؤں جھلاتے ہوئے کتاب کی جلد پر ناخون بجانے لگتی۔ اس موقع پر میں اس سے یہ کہتے کہتے رہ جاتا :۔

"آپ اس مکان سے چلی کیوں نہیں جاتیں۔ لوگ آپ کو محبت نامے لکھتے اور آپ کا مذاق اُڑاتے ہیں۔"

لیکن زبان تک یہ الفاظ لانے کی جرأت نہ ہوتی اور چلتے وقت میرے ہاتھ میں 'محبت' پر کوئی نئی کتاب اور دل میں افسردگی ہوتی۔

محلّے میں روز بروز اس عورت کے خلاف زیادہ پروپیگنڈا ہونے لگا اور اس پر معیوب تہمتیں لگائی جانے لگیں۔ انھیں سُن سُن کر میرا خون کھولا کرتا۔ جب میں اس عورت کے پاس نہ ہوتا تو اس پر رحم آتا۔ لیکن جب

میں اس کے سامنے ہوتا اور اس کی بھوری تیز آنکھوں، لوچدار جسم اور غیر سنجیدہ چہرے پر نگاہ پڑتی تو ساری ہمدردی رفو چکر ہو جاتی۔ بہار کے موسم میں اچانک وہ کہیں غایب ہو گئی اور چند روز بعد اس کا شوہر بھی کہیں چلا گیا۔

جب وہ فلیٹ خالی ہو گیا تو میں سنسان کمروں کی زیارت کے لیے گیا۔ ردّی کاغذ خالی ڈبّے اور ٹوٹی پھوٹی کیلوں کے سوا کہیں کچھ نہ تھا۔

آپ ہی آپ میرا دل بھر آیا۔ کاش میں درزی کی بیوی سے کہہ سکتا کہ میں اس کا کتنا ممنونِ احسان ہوں۔

باب (۱۰)

اسی زمانے میں میرے آقا کے فلیٹ کے نیچے کی منزل میں کچھ کرایہ دار آئے - ان میں ایک جوان عورت اپنی بیٹی اور بوڑھی ماں کے ساتھ تھی وہ عورت نہایت ہی حسین مگر مغرور اور تند مزاج تھی - اس کی آواز رسیلی اور گونج دار تھی - بات چیت کرتے وقت اس کا سر بلند ہوتا، آنکھوں میں نام کو جھجک نہ ہوتی - گویا ساری دنیا اس سے دور ہے اور وہ اس سے بھی پرے کی کوئی چیز دیکھ رہی ہے - ہر روز اس کا ملازم 'توبیف' ایک گھوڑا لے کر ڈیوڑھی پر حاضر ہوتا - اور وہ ایک مخملی لبادہ پہنے ہوئے برآمد ہوتی - اس کے ایک ہاتھ میں قیمتی دستے کا چابک ہوتا اور دوسرے ہاتھ سے وہ گھوڑے کی ایال سہلاتی رہتی - گھوڑا فرطِ مسرت سے تھرتھرانے لگتا اور کھُر سے زمین کو کھودنے لگتا - عورت میٹھی آواز میں "روبیر، روبیر" کہہ کر گھوڑے کو پکارتی اور اس کی کمانی دار گردن کو تھپتھپاتی - پھر ملازم کے گھٹنے پر پاؤں ٹیک کر وہ پھرتی سے زین پر اُچک کر بیٹھ جاتی اور گھوڑا فخر سے چوکڑیاں بھرتے ہوئے پھاٹک کے باہر نکل جاتا - اس کی پیٹھ پر وہ پرانے شہسواروں کی طرح جمی رہتی - اس کی خوبصورتی میں حسن کا ایک ایسا نرالا پہلو تھا جو ہمیشہ ایک نیا نکھار باقی رکھتا ہے - اسے دیکھ کر مجھے ہیلن قلوپطرہ وغیرہ تاریخی حسیناؤں کا خیال آتا تھا -

اس کے ارد گرد شہر کے فوجی افسر ہمیشہ پروانہ وار جمع رہتے

اور شام کو جب وہ بزم آرا ہوئی تو رقص و سرود کی ریل پیل رہتی۔ اس کے عشاق میں میجر ادلیوف سب سے ممتاز تھا۔ وہ اپنا لال لال منہ اُٹھائے اور چھوٹی چھوٹی ٹانگیں پھیلائے چرخی کی طرح اس ملکۂ حسن کا طواف کیا کرتا۔ گویا اس کے سارے جسم پر روغنِ قاز ملا ہوا تھا۔ گٹار (چھتارا) بجانے میں وہ اُستاد تھا لیکن اس کا طور طریقہ ایسا تھا جیسے وہ ملکہ کا غلام ہو۔

اس کی پنج سالہ گھنگھرالے بالوں والی بیٹی بھی اپنی ماں سے کم حسین نہ تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں سنجیدگی اور خاموشی بسی ہوئی تھی۔ اور وہ غور و فکر میں کھوئی ہوئی سی رہتی۔ یہ ایسی بات ہے جو بچوں میں عام طور پر نہیں پائی جاتی۔

لڑکی کی نانی صبح سے شام تک گھر بار کے دھندوں میں مصروف رہتی۔ اس کا ہاتھ بٹانے کے لیے ایک نوکر تھا جس کا نام 'توبیف' تھا۔ یہ مردِ خدا محرّمی صورت بنائے رہتا اور کبھی زبان نہ کھولتا۔ اس کے برعکس، ماما جو موٹاپے میں چھوٹی موٹی توپ سے کم نہ تھی۔ نہایت چرب زبان تھی۔ گھر میں کوئی آیا نہ تھی، اس لیے وہ لڑکی اکیلی بارہ دری میں کھیلا کرتی اور کوئی اس کی بات بھی نہ پوچھتا۔ شام کے وقت میں اکثر اس کے ساتھ کھیلا کرتا کیونکہ وہ مجھے بڑی اچھی لگتی تھی۔ وہ بھی مجھ سے ہل گئی تھی، اور اگر میرے قصے سنتے سنتے اُسے نیند آجاتی تو وہ میری گود میں سو جاتی۔ تب میں اُسے لے جاکر اس کے بستر پر سُلا آتا۔ کچھ عرصے میں وہ مجھ سے اس قدر مانوس ہوگئی کہ جب تک میں خدا حافظ، نہ کہہ لوں وہ ہرگز نہ سوتی تھی۔

جب میں رخصت ہونے جاتا تو وہ اپنے نرم ہاتھ بڑھا کر پُر وقار لہجے میں کہتی :۔

"کل تک کے لیے رخصت۔ اچھی ننا، ایسے موقعے پر کیا کہتے ہیں؟ نانی نے منہ اور ناک سے بھاپ کے بادل چھوڑتے ہوئے سکھلایا:

"خدا تمہارا نگہبان ہو!"

"کل تک خدا تمہارا نگہبان ہو! اب میں سوتی ہوں" ننھی لڑکی نے کہا اور مخملی رضائی اپنے اوپر اوڑھ لی۔

نانی نے اس کی اصلاح کی: "کل تک نہیں بلکہ ہمیشہ"

"لیکن کیا کل، اور، ہمیشہ، میں کوئی فرق ہے؟"

بچّی کو 'کل' سے محبت تھی اور ہر پسندیدہ شئے کو وہ مستقبل کے سپرد کر دیا کرتی۔ مرجھائے ہوئے پھولوں اور ٹوٹی ہوئی ٹہنیوں کو زمین میں گاڑ کر وہ معصومیت سے کہتی:

"کل یہاں باغ لہلہانے لگے گا۔"

"کل میں ایک گھوڑا خریدوں گی اور اماں کے ساتھ ہوا خوری کو جاؤں گی۔"

لڑکی ذہین تھی لیکن اس میں زندگی کی کمی تھی۔ ہنسی کھیل کے بیچ وہ یک بیک کسی فکر میں محو ہو جاتی یا اچانک پوچھ بیٹھتی:

"پادریوں کے بال عورتوں کی طرح لمبے کیوں ہوتے ہیں!"

اگر کوئی کانٹا چبھتا تو وہ اسے انگلی دکھا کر کہتی:

"ٹھہر کمبخت، میں اللہ میاں سے کہہ کر تیری مرمت کراؤں گی۔

خدا سب کو سزا دے سکتا ہے۔ اور کیا — اماں تک کو۔" کبھی اس پر ہلکی سی اداسی چھا جاتی۔ وہ مجھ سے لپٹ کر بیٹھ جاتی اور آسمان کو تکتے ہوئے کہتی:

"نانی تو کبھی خفا بھی ہو جاتی ہیں، لیکن اماں کو غصہ نہیں آتا۔ وہ ہنستی رہتی ہیں۔ لوگ اُن سے اس لیے ملنے آتے ہیں کہ وہ حسین ہیں۔ ہاں امی بہت ہی زیادہ حسین ہیں"

مجھے اس کی باتیں بہت بھاتی تھیں کیونکہ وہ ایک ایسی دنیا کی تصویر مجھے دکھاتی تھی جس سے میں قطعاً ناآشنا تھا۔ اپنی ماں کے تذکرے سے وہ خوش ہوتی تھی اور اس طرح اس نے مجھے ایک نئی قسم کی زندگی سے روشناس کیا۔ مجھے کتابوں کی پریوں کا خیال آتا اور کتابوں پر میرا اعتقاد زیادہ راسخ ہوتا جاتا۔ ایک دن میں اپنے گھر کی ڈیوڑھی پر بیٹھا گھر والوں کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ سب سیر کے لیے کہیں گئے ہوئے تھے۔ لڑکی اونگھتے اونگھتے میری گود میں سو گئی تھی۔ اتنے میں اس کی ماں گھوڑا دوڑاتے ہوئے آئی اور نیچے اتر کر پوچھا:-

"کیا بچی سو گئی؟"

"جی ہاں"

"اچھا"

ملازم نے دوڑ کر گھوڑے کی لگام پکڑی۔ ملکۂ حسن نے ہاتھ پھیلا کر کہا:

"لاؤ بچی کو مجھے دے دو"

"کہیے تو میں اسے بستر پر لٹا دوں"
"کیا بک رہا ہے!" ملکہ نے ڈانٹ کر کہا اور یوں پیر ٹپکا گویا کسی گھوڑے کو حکم دے رہی ہو۔

لڑکی کی آنکھ کھلی تو اس نے ماں کو سامنے پاکر بازو پھیلا دیے اور وہ دونوں اندر چلی گئیں۔

یوں تو مجھے ڈانٹ ڈپٹ سہنے کی عادت ہوگئی تھی لیکن اس عورت کی گھڑکی سے مجھے رنج ہُوا۔ اُس کا زبان کھولنا ہی کافی تھا، پھر بھلا کون اس کے کہے سے انکار کرتا۔

تھوڑی ہی دیر میں ماما مجھے پکارتی ہوئی آئی۔ لڑکی مچل رہی تھی کہ خدا حافظ کہے بغیر میں ہرگز نہ سوؤں گی۔

جب میں دیوان خانے میں داخل ہُوا تو فخر سے میرا کلیجا پھولا ہوا تھا کہ اس مغرور عورت کو بھی میری اہمیت کا اندازہ ہوگیا تھا۔ دیکھا کہ لڑکی ماں کے گھٹنوں پر بیٹھی ہوئی ہے اور وہ اس کے کپڑے اُتار رہی ہے۔

ماں نے کہا: "لو اب کیا کہنا ہے، یہ کھڑا ہے وہ بُھتنا"
"اے ہے، بھتنا کیوں ہونے لگا۔ یہ تو میرا دوست ہے"
"اخاہ! خیر یہ ہی سہی۔ تمھارا جی چاہتا ہے کہ اپنے دوست کو کوئی تحفہ دو؟" "ہاں ہاں، ضرور"

"تو اچھی، تم اب آرام کرو اور میں اس کے لیے کوئی تحفہ تلاش کروں۔ کہو"

لڑکی نے ہاتھ پھیلا کر کہا "خدا حافظ، کل تک خدا تمھارا نگہبان ہے"

ماں نے متعجب ہو کر پوچھا: "یہ کس نے سکھایا؟ نانی نے؟"
لڑکی نے ہاتھ پھیلا کر کہا: "خدا حافظ، کل تک خدا تمہارا نگہبان ہو۔"
"جی ہاں۔"
جب لڑکی وہاں سے چلی گئی تو ماں نے پوچھا:۔
"تمھیں انعام میں کیا دیا جائے۔"
میں نے کہا کہ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ البتہ اگر کوئی کتاب پڑھنے کو مل جائے تو عین نوازش ہو۔
اس نے اپنی مہکتی ہوئی انگلیوں سے میری ٹھڈی کو جنبش دی اور مسکرا کر پوچھا:
"تو یوں کہو کہ تمھیں پڑھنے کا شوق ہے۔ بھلا بتلاؤ تو سہی کون کون سی کتابیں پڑھ چکے ہو؟"
تبسم کے ساتھ اس کا حسن دوبالا ہو جاتا تھا۔ میں نے ایک سانس میں کئی کتابوں کے نام گنا دیے۔
میز پر کہنی ٹیک کر انگلیاں چٹخاتے ہوئے اس نے سوال کیا:
"ان کتابوں میں تمھیں کون سی بات پسند آئی؟"
اس کے جسم سے گھوڑے کے پسینے میں ملی ہوئی پھولوں کی تیز سی خوشبو آ رہی تھی۔ اس نے اپنی لمبی لمبی پلکوں میں سے مجھے کنکھیوں سے دیکھا۔ اس کی نگاہ میں سنجیدگی تھی اور آج تک مجھے کسی نے یوں نہ دیکھا تھا۔
کمرے کا کونا کونا سجا ہوا تھا۔ کھڑکیوں پر موٹے موٹے ہرے پردے آتش دان پر سنگ مرمر کے ٹائیل۔ کونے میں آبنوس کا پیانو۔ دیواروں پر سنہرے چوکھٹوں میں تصویریں اور طغرے۔ لیکن ہر شی اس ملکہ کے

حضور میں میری طرح سراپا نیاز تھی

میں نے بہ مشکل اسے سمجھایا کہ میں بڑی مصیبت سے زندگی بسر کرتا ہوں اور مطالعے سے ماحول کی کثافت قدرے دھل جاتی ہے۔

"اچھا خیال ہے۔ اب میں سمجھی۔ میں تمھارے لیے کچھ کتابیں لادوں گی لیکن اس وقت تو کوئی کتاب گھر میں نہیں۔لیکن —— ٹھہرو۔ جی چاہے تو سرِ دست یہ لے جاؤ۔"

اس نے مجھے ایک پھٹی ہوئی کتاب دی۔

"جب اسے پڑھ چکو تو دوسری جلد لے جانا۔ اس کتاب کی چار جلدیں ہیں۔"

کتاب کا نام تھا "اسرار سینٹ پیٹرس برگ"۔ میں اسے بڑے انہماک سے پڑھنے لگا۔لیکن تھوڑی ہی دور چل کر پتہ چل گیا کہ لندن یا پیرس کے اسرار، روس کی راج دھانی کے اسراروں سے کہیں زیادہ دلچسپ ہیں۔ کتاب کا صرف وہ حصہ پسند آیا جس میں 'آزادی' اور 'جبر' کی کشمکش حکایت کے پیرایے میں بیان کی گئی تھی۔

آزادی نے کہا: "میں تجھ سے افضل ہوں کیونکہ دنیا کو میری ضرورت ہے۔"

مگر جبر کے ڈنڈے نے جواب دیا: "اس سے کیا ہوتا ہے، طاقتور تو میں ہوں۔"

اس بحث کا انجام یہ ہوا کہ دونوں میں ہاتا پائی ہوگئی۔ جبر نے بیچاری آزادی کا کچومر نکال دیا اور وہ اسپتال میں جاکر مرگئی۔

اس کتاب میں انقلابی دہشت پسندوں (NIHLISTS

کا بھی ذکر آیا تھا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ بقول مصنف دہشت پسند کے رگ و ریشہ میں زہر بسا ہُوا تھا اور وہ کسی مُرغی کو آنکھ بھر کر دیکھ لے تو وہ زہر کے اثر سے تڑپ کر مرجائے۔ یہ پڑھ کر مجھے مصنف پر سخت طیش ہوا۔ لیکن میں اور کچھ نہ جانتا تھا اس لیے جل بھن کر رہ گیا۔ مجھے اس کا بھی افسوس ہوا کہ اب تک اچھی کتابوں کی قدر نہیں کر سکتا کیونکہ پورا یقین تھا کہ یہ بھی کوئی شاہ کار ہے۔ بھلا ایسی حسین و جمیل عورت معمولی کتابیں کیسے پڑھ سکتی ہے۔

جب میں کتاب لوٹانے گیا تو اس نے پوچھا:

"کتاب پسند آئی؟"

نہیں کہنے کی جرأت نہ ہوئی کہ مبادا وہ ناراض نہ ہو جائے۔ لیکن وہ ہنسی اور اپنی خواب گاہ سے ایک چھوٹی سی کتاب لے کر آئی جس پر سیاہ چمڑے کی جلد بندھی ہوئی تھی:

یہ کتاب تمھیں ضرور پسند آئے گی۔ لیکن اسے خراب نہ کرنا۔"

یہ پشکن کی نظموں کا مجموعہ تھا۔ میں انھیں شروع سے لے کر آخر تک پڑھ گیا اور مجھ پر ویسی ہی کیفیت طاری ہوئی جیسی کسی خوبصورت جگہ کو پہلی بار دیکھ کر ہوتی ہے۔ جب میں کسی ایسی جگہ کو دیکھتا ہوں تو جی چاہتا ہے کہ ایک لمحے میں اس کے چپے چپے کو چھان ڈالوں۔ اس کتاب کا مطالعہ ایسا ہی تھا جیسے جنگل اور پہاڑ سے نکل کر مسافر یکایک ایک ایسے میدان میں جا پہنچے جہاں ہر طرف پھولوں اور سورج کی کرنوں کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ تھوڑی دیر تو مسافر حیرت زدہ رہ جاتا ہے پھر وہ فرطِ انبساط سے ہر طرف دوڑنے لگتا ہے، اور جب اس کا قدم گلزار کی

زمین پر پڑتا ہی تو اس کے جسم میں خوشی کی لہر سی دوڑ جاتی ہی۔

پشکن کی شاعری کی سادگی اور رنگینی نے عرصے تک مجھے ایسا مسحور کیا کہ نثر کی طرف طبیعت مایل ہی نہ ہوتی اور دل پر جبر کرکے اسے پڑھتا۔ ان کی بعض نظمیں نانی کی کہانیوں سے ملتی جلتی تھیں اور میں ان کے معنی پر جتنا غور کرتا اسی قدر میرا تعجب اور شوق بڑھتا جاتا۔

اشعار آسانی سے یاد رہ جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہر مضمون کو وہ سنوارنے نکھارنے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ اُنھوں نے میری زندگی کو تازگی اور مسرت بخشی۔ ان نظموں نے میرے لیے کاروانِ حیات کے جرس کا کام کیا۔ دراصل، علم سے بڑی کوئی برکت نہیں۔

پشکن کے افسانوں نے مجھ پر اور بھی گہرا اثر کیا۔ آج تک میں نے ایسی آسان تحریر نہیں پڑھی تھی۔ دو چار بار پڑھنے کے بعد ہی اس کی نظمیں مجھے حفظ ہو جاتیں اور لیٹے لیٹے میں انھیں گنگنایا کرتا۔ اکثر میں اردلیوں کو یہ قصے سناتا اور وہ سُن کر ہنستے اور مجھے چھیڑتے البتہ سدوروف میرا سر تھپتھپاکر نرمی سے کہتا:-

"واقعی بڑی اچھی چیز ہی! سبحان اللہ—"

حال و قال کی یہ کیفیت بھلا میرے آقاؤں سے کب تک چھپی رہتی۔ بڑھیا بڑبڑا کر کہتی:

"ارے پڑھ پڑھ کر تیرے دیدے پھوٹ جائیں گے۔ بندر! میں سماوار کو منجھے چار دن ہو گئے۔ چمٹے سے تجھے داغوں گی۔"

مجھے ان سب کی کیا پروا تھی۔ میں تو شاعری کی دنیا میں رہتا تھا۔

اے مکر و دجل کی کالی مورت جادو اور سحر ہے تیری دنیا!

ملکۂ حسن کی عزت میرے دل میں بڑھتی گئی۔ وہ کیسی اچھی اچھی کتابیں پڑھتی ہے۔ اُس درزن کی طرح نہیں۔

جب میں بہزار تاسف کتاب لوٹانے گیا تو اس نے چمکار کر پوچھا:

"یہ نہ کہنا کہ کتاب پسند نہ آئی۔ پہلے کبھی پشکن کا نام سُنا تھا؟"

کسی اخبار میں شاعر کا ذکر پڑھا تھا، لیکن میں اس کی زبان سے سننا چاہتا تھا اس لیے کہ دیا کہ پہلے کبھی پشکن کا نام نہیں سنا۔

اس نے مختصر الفاظ میں پشکن کی زندگی اور موت کا حال سنایا اور بہار کی دیوی کی طرح مُسکرا کر کہا:

"تم نے دیکھا کہ عورت کی محبت کیسی ہلاک ثابت ہوتی ہے؟"

اب تک میں نے جو کتابیں پڑھی تھیں ان سے تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ محبت میں ہلاک کرنے اور حیات نو بخشنے — دونوں کی صلاحیت ہے۔ چنانچہ میں نے کہا:

"محبت میں خواہ کیسا ہی خطرہ ہو لیکن سبھی اس کے دام میں گرفتار ہوتے ہیں۔ اور عورتیں بھی اس کی خاطر مصایب جھیلتی ہیں۔"

اس نے مجھے دم بھر ٹیڑھی چتون سے دیکھا اور پھر جواب دیا:-

"تم یہ سمجھتے ہو! تو پھر میری نصیحت ہے کہ یہ کبھی نہ بھولنا۔"

اب اس نے دریافت کیا کہ پشکن کی کون سی نظمیں مجھے سب سے زیادہ پسند ہیں۔

میں نے ہاتھ مٹکا مٹکا کر ان میں سے کئی لفظ بہ لفظ دُہرا دیں۔

وہ خاموشی سے ٹہل ٹہل کر آموختہ سنتی رہی اور کہنے لگی:-

"مجھے تمہاری تعلیم کا انتظام کرنا ہے۔ میں اس معاملے پر غور کروں گی لیکن تم جن کے نوکر ہو وہ تمہارے رشتہ دار تو نہیں؟" جب میں نے ہامی بھری تو اس نے اس انداز سے "اوہ!" کہا گویا اُسے اس کا افسوس ہو۔

مجھے سیر و تفریح کی اجازت نہ تھی، بلکہ یوں کہیے کہ اس کی فرصت نہ تھی کیونکہ کام بہت بڑھ گیا تھا۔ مشعلچی، ماما اور بیرے کے مجموعی مشاغل کے علاوہ مجھے آقا کے اتائی کی خدمات بھی انجام دینی ہوتی تھیں یعنی نقشوں کی لمبائی چوڑائی کا حساب رکھنا اور ٹھیکے داروں کے کھاتوں کو جانچنا۔ اُدھر میرا مالک تھا کہ صبح سے شام تک کولھو کے بیل کی طرح جُتا رہتا تھا۔

اُس زمانے میں بازار میں نئی نئی عمارتوں اور دُکانوں کا اضافہ ہو رہا تھا۔ اُن کا نقشہ بنانے کا کام میرے مالک کے سپرد تھا۔ میں ان نقشوں کو پچیس رُپے کے نوٹ کے ساتھ ایک بڑے لفافے میں رکھ کر ایک مشہور عمارت ساز کے پاس لے گیا۔ اس نے رُپے اپنی انٹی میں رکھے اور یہ لکھ کر نقشہ پاس کر دیا کہ میں جائے وقوع کا معائنہ کر چکا ہوں۔ اس بھلے مانس نے نقشوں کو ایک نظر دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہ کی معائنہ تو دور رہا کیونکہ لقوے کی وجہ سے وہ چلنے پھرنے سے معذور تھا۔

میں بازار کے داروغہ اور دوسرے لوگوں کو رشوت دیا کرتا اور اس کے بدلے مجھے بھانت بھانت کے پروانے مل جاتے جن کے برتے پر میرا مالک مختلف قسم کی غیر قانونی کارروائیاں کر سکتا تھا۔ اس خدمت

کے عوض مجھے اجازت دی گئی کہ رات کو جب کبھی گھر کے لوگ باہر جائیں میں باہر ڈیوڑھی پر بیٹھے بیٹھے ان کا انتظار کروں۔ بعض اوقات میں سیڑھیوں پر گھنٹوں بیٹھے ہوئے اپنی حسین ہمسایہ کی کھڑکیوں کو تاکا کرتا اور اس کے دل فریب تکلم اور نغموں کو سنا کرتا۔

جب دریچے کھول دیے جاتے اور پردے اٹھا دیے جاتے تو کمرے کے لوگوں کو میں صاف دیکھ سکتا تھا۔ گھر کی مالکن اپنے سادہ مگر پر کار لبادے میں ملبوس۔ فضا میں تیرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

میں دل میں اُسے ہمیشہ ملکۂ حسن کے نام سے یاد کرتا تھا۔ اس محفل کا نظارہ کرتے ہوئے میں سوچتا کہ یہی وہ بزم آرائی ہے جس کا تذکرہ فرانسیسی رومانوں میں آتا ہے اور میں اداس ہو جاتا۔ طفلانہ رشک مجھے یاد دلاتا کہ ملکۂ حسن غیروں کی صحبت میں ہے اور یہ لوگ بھونروں کی مانند اس گل رعنا پر جھوم رہے ہیں۔

ان مجلسوں میں گاہے گاہے ایک مغموم سا افسر ہوتا۔ اس کی آنکھیں دھنسی ہوئی تھیں اور بھنویں گھنی گھنی۔ ہمیشہ وہ اپنے ساتھ وایولن لاتا۔ اور وہ اس ساز کا ایسا ماہر تھا کہ جب اس کے تاروں کو چھیڑتا تو راہ چلتے رُک جاتے اور سڑک پر لوگوں کی بھیڑ لگ جاتی اور تو اور میرے گھر والے بھی کھڑکی کھول کر سنتے اور اس کے کمال کی داد دیتے۔ اس سے پہلے انھوں نے ایک پادری کے ارگن کے سوا کسی کی تعریف نہ کی تھی۔ اور ان کے نزدیک کسی قسم کی بھی موسیقی سے مچھلی کے کباب زیادہ دل خوش کن تھے۔

کبھی کبھی یہ افسر گاتا بھی تھا یا شعر سناتا تھا۔ اس کی آواز بھنچی ہوئی

ہوتی، وہ عجیب طریقے سے ٹھنڈی سانس بھرتا اور اپنی بھنوؤں کو سہلاتا۔ ایک مرتبہ میں کھڑکی تلے ننھی شہزادی سے کھیل رہا تھا اور ملکۂ حسن اُس سے گانے کی فرمائش کر رہی تھی۔ وہ دیر تک انکار کرتا رہا، پھر پُرحسرت آواز میں بولا:-

نالہ پابندِ نَے نہیں ہے فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے

مجھے اس افسر پر آپ ہی آپ بڑا ترس آیا۔

جب وہ حسینہ کمرے میں تنہا ہوتی اور پیانو بجاتی تو میں خوشی سے نہال ہو جاتا۔ موسیقی مجھ پر نشے کی سی کیفیت طاری کر دیتی اور میں سب کچھ بھول کر اُس نقطے میں سمٹ آتا جہاں زرّیں روشنی کے سایے میں ایک سرو قد عورت اپنی مغرور گردن کو خم کیے پیانو پر جھکی ہوئی تھی اور اس کی انگلیاں پرندوں کی طرح ساز کے پردوں پر اُڑ رہی تھیں۔ موسیقی کو سُنتے سُنتے میں خوابوں میں کھو جاتا۔ کاش اس وقت میرے پاس دنیا کی ساری دولت ہوتی تو میں اُس پر لُٹا دیتا۔ اور اگر میں زارِ روس ہوتا تو اسی وقت ترکوں پر دھاوا بول دیتا۔ تاوانِ جنگ سے میں شہر کے سب سے اچھے محلّے میں اس کے لیے ایک محل بنوا دیتا۔ آخر وہ اس بستی میں کیوں رہے۔ جہاں سب اُس پر تہمت تراشنے کے درپے تھے۔ نوکر اور پڑوسی — جن میں میرے آقا پیش پیش تھے۔ اس عورت کے خلاف بھی ویسی ہی ذلیل اور فحش باتیں کہنے لگے جیسی وہ درزن کی بیوی کے خلاف کہا کرتے تھے۔ یہاں اس کا چرچا کرتے وقت ان کی آوازیں دھیمی ہوتیں اور وہ احتیاط سے چاروں طرف دیکھ لیتے کہ کوئی اور تو نہیں سُن رہا ہے۔ یہ ہرزہ گو اس سے خائف تھے کیونکہ وہ ایک بہت بڑے رئیس

کی بیوہ تھی۔ اس کے کمرے میں جو طغرے لگے تھے وہ سب قدیم شاہان روس کے عطا کیے ہوئے تھے جو اُس کے گھرانے میں پشت در پشت چلے آئے تھے۔ یہ بات مجھے تو پیف نے بتلائی تھی۔ یہ ملازم تعلیم یافتہ تھا اور ہر وقت انجیل کی تلاوت میں مصروف رہتا تھا۔ پڑوسیوں کو غالباً اس کا بھی خدشہ تھا کہ ملکہ کہیں ان کے چابک نہ رسید کر بیٹھے۔ سُنا گیا تھا کہ کسی بڑے آدمی کو وہ چابک سے پیٹ چکی تھی۔

بہر حال بدگوئی بہ بانگ دُہل ہو یا زیر لب —— بدگوئی ہی ہے۔ میری ملکہ دشمنوں کے بیچ رہتی تھی اور میں اس دشمنی کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

اب جو مجھ پر یہ ثابت ہو گیا تھا کہ ایک دوسری زندگی بھی ہے جس کا ماحول مختلف ہے تو یہ مکان اور اس کے مکین میرے لیے ناقابل برداشت ہو گئے۔ ان کی زندگی کند۔ چہ بچہ کی طرح تھی جس میں ہر آدمی ایک دوسرے کی بیخ کنی کے درپے تھا۔ فوج کا پادری اپاہج اور سدا روگی تھا۔ لیکن اس پر بھی مے نوشی اور عیاشی کا الزام تھا۔ میرے مالکوں کے بیان کے مطابق سب افسر اور ان کی بیویاں ساکنانِ گناہ آباد تھیں۔ سپاہی جس گھنونے طریقے سے عورتوں کا ذکر کرتے اُسے سُنا میرے لیے ممکن نہ تھا۔ لیکن سب سے زیادہ روح فرسا میرے مالکوں کا ساتھ تھا۔ میں جانتا تھا کہ دوسروں کو بُرا کہنا ان کا سب سے محبوب مشغلہ ہے۔ دوسروں کی بدیوں کا حساب رکھنا اور ان کو بُرا بھلا کہنا —— ایک ایسی تفریح تھی جس کے لیے کچھ خرچ کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ یوں کہیے کہ دوسروں کی روحوں کو یہ اپنی اُنگلی پر ٹانگ کر ان کا تجزیہ کرتے۔ وہ اپنی

زندگی کی بے رنگی اور غیر دلچسپی کا انتقام دوسروں سے لیتے کیونکہ یہ بیچارے خوش رہنے کے گناہِ عظیم کے مرتکب تھے !۔

لیکن جب یہ بدزبان ملکۂ حسن کی تضحیک شروع کرتے تو میں ایک ایسے جذبے سے مغلوب ہوجاتا جس کی ماہیت طفلانہ نہ تھی۔ ان لوگوں سے میری نفرت کی انتہا نہ رہتی۔ بے اختیار جی چاہتا کہ ہر چیز کو توڑ پھوڑ ڈالوں اور سب کو نقصان پہنچاؤں۔ اس کے ساتھ ہی خود پر اور دوسروں پر مجھے رحم آتا اور یہ رحم اس قدر دردناک تھا کہ نفرت سے بھی زیادہ اذیت بخش ہوتا۔

ان سے زیادہ میں اس عورت کو جانتا تھا اور ہمیشہ کھٹکا لگا رہتا کہ کہیں انھیں اُس سے میری قربت کا حال معلوم نہ ہوجائے۔

اتوار کو جب گھر کے لوگ کلیسا کی راہ لیتے میں صبح سویرے اُس کے حضور میں حاضر ہوتا۔ وہ مجھے اپنی خواب گاہ میں طلب کرتی اور میں اس کے اشارے پر کار چوبی منڈھی ہوئی آرام کرسی پر بیٹھ جاتا۔ ننھی لڑکی اُچک کر میرے گھٹنے پر سوار ہوجاتی۔ پھر میں اس کی ماں سے ان کتابوں کا ذکر کرتا جو اس زمانے میں پڑھی تھیں۔ وہ ایک مسہری پر آرام فرما تھی۔ اس کا جسم سنہرے رنگ کی رزائی میں ڈھکا ہوا تھا۔ اس کے سیاہ بال کچھ تو سینے اور شانے پر بکھرے ہوئے تھے اور کچھ فرش تک لٹک رہے تھے۔

میری باتیں سنتے سنتے وہ مجھ پر ایک نگاہ غلط انداز ڈال کر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہتی :۔

”ہاں یہ ٹھیک ہے“

اُس کے اس تبسم میں بھی شاہانہ انداز ہوتا۔ اس کی آواز گہری اور میٹھی تھی اور اس میں یہ صدا سمائی ہوئی تھی:۔

"مجھے اس امر کا احساس ہے کہ میں سب لوگوں سے سربلند ہوں اور ان میں سے کسی کی پابند نہیں۔"

کبھی کبھی میں اُسے آئینے کے آگے بال سنوارتے ہوئے پاتا۔ اس کی لٹیں کالے بادلوں کی طرح ہر طرف امنڈی پڑتی تھیں اور ویسی ہی گھنی دراز تھیں جیسی نانی کی۔ وہ میرے سامنے لباس تبدیل کرتی لیکن اس کی معصوم برہنگی مجھے مطلق شرمندہ نہ کرتی تھی۔ میں تو اس کے ہر عضو پر فخر کرتا تھا۔ اس کے آس پاس بھینی بھینی مہک کا ہالہ سا ہوتا جو کسی برے خیال کو اس کے قریب پھٹکنے بھی نہ دیتا تھا۔

مجھے یقین تھا کہ کھانے پینے سے اُسے کوئی خاص رغبت نہیں۔ اس کی ہستی کو ایک بلند معیار محبت روشن کرتا تھا۔

لیکن ایک روز شام کو جو میں اُس کے دیوان خانے میں داخل ہُوا تو خواب گاہ سے اس کے قہقہے کی آواز آئی۔ اس کے بعد ہی کسی مرد نے کہا:

"للّٰہ، لمحہ بھر ٹھہر جاؤ! کیسے ممکن ہے ——"

میں سمجھ گیا کہ تنت کا موقعہ ہے اور اُلٹے قدم لوٹ جانا مناسب ہے۔ تاہم، پیروں میں زنجیر سی پڑ گئی۔

"کون ہے" اس نے پوچھا: "ارے تم ہو؟ اندر آجاؤ"

خواب گاہ پھولوں کی خوشبو سے بسی ہوئی تھی۔ پردے کھینچ دیے گئے تھے اس لیے اندر دھندلکا تھا۔ عورت سر سے پانوں تک

چادر اوڑھے لیٹی ہوئی تھی اور اس کے پاس دیوار کا سہارا لیے وہی وائلن بجانے والا افسر نیم برہنگی کی حالت میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی قمیص کا بٹن کھلا ہوا تھا اور سینے پر ایک زخم کا داغ صاف نظر آرہا تھا جو کندھے سے لے کر پیٹ تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور میں نے پہلی بار اس کے چہرے پر مسکراہٹ کے آثار دیکھے۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھیں ملکہ پر اس طرح جمی ہوئی تھیں گویا وہ اوّل اوّل اس کے حسن سے روشناس ہوا ہو۔

ملکۂ حسن نے کہا: "یہ میرا دوست ہے"۔ سمجھ میں نہ آیا کہ اس کی مُراد کس سے تھی، مجھ سے یا اُس افسر سے۔

میں نے گویا دور سے یہ آواز سنی: "تم سہم کیوں گئے؟ اِدھر آؤ"۔

جب میں قریب گیا تو اس نے میری گردن میں ہاتھ ڈالا: "بڑے ہو کر تم بھی زندگی کی لذّت حاصل کروگے۔ جاؤ اب"۔

کتاب الماری میں رکھ کر، میں نے دوسری جلد نکالی اور فوراً جمیت ہو گیا۔

دل میں جیسے کانٹا سا چُبھ گیا۔ میں یہ تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ میری ملکہ کی محبت کا طریقہ بھی وہی ہے جو دوسری عورتوں کا اور نہ اُس افسر پر مجھے کسی قسم کا شبہہ ہوا۔ مجھے اس کا مسکراتا ہوا چہرا یاد آیا۔ وہ خوشی کے مارے کھِل گیا تھا اور اُس کی حالت ایسے بچّے کی سی تھی جسے بلا توقع کوئی تحفہ مل گیا ہو۔ وہ اس عورت سے محبّت کرنے پر مجبور تھا۔ اور کون ایسا تھا جو اس پر سو جان سے فریفتہ نہ ہو؟ اور اُسے

بھی ایسے عاشقِ جاں باز سے سلوک کرتا تھا۔ وہ کیسی خوش ادائی سے وایولن بجاتا تھا اور اس کا شعر پڑھنے کا انداز کتنا اچھا تھا۔

لیکن ان سب طفل تسلیوں کی اصلی وجہ یہ تھی کہ میرا فریب ٹوٹ گیا تھا۔ میں نے جو کچھ دیکھا اس نے دم کے دم ملکۂ حسن سے میرا رویہ بدل دیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں نے کوئی قیمتی شَے گم کر دی ہی اور کئی روز میں نے انتہائی رنج و غم میں بسر کیے ایک روز میں خواہ مخواہ بدمزاجی اور گستاخی سے پیش آیا اور جب میں کتاب مانگنے گیا تو اس نے تیکھے پن سے کہا:

"سننے میں آیا کہ تم نہایت بدمزاج ہو۔ پہلے میں یہ نہ جانتی تھی۔"

اب میرا پیمانۂ صبر چھلک گیا اور میں نے اُسے سُنایا کہ یہ ماحول میرے لیے کس قدر عذاب جان ہی اور اس کی بدی سُننا میرے لیے کتنا ناممکن ہی۔ پہلے تو وہ سامنے کھڑی ہو کر میرے کندھوں پر ہاتھ رکھے غور سے سب باتیں سنتی رہی پھر کُھل کُھلا کر زور سے ہنس پڑی اور مجھے ہوے سے ڈھکیل کر بولی:

"بس بھی کرو، میں سب جانتی ہوں۔ سمجھے، مجھے رتّی رتّی حال معلوم ہی۔"

پھر میرے دونوں ہاتھوں کو بھینچ کر بڑی نرمی سے کہا:۔

"تم ان باتوں پر کان نہ دیا کرو۔ اور تمھارے ہاتھ اتنے گندے کیوں رہتے ہیں؟

یہ پوچھنا ہی بے کار تھا۔ اگر میری طرح اُسے بھی برتن مانجھنے اور گندے کپڑے دھونے ہوتے، تو اس کے ہاتھوں کا روپ بھی بدل جاتا۔

"اگر کسی کو جینا آتا ہو تو دنیا اسے دشنام دیتی ہی اور لوگ اس سے

رشک کرتے ہیں۔ اور اگر اُسے جینے کا ڈھب نہ آئے تو سب اُسے حقیر سمجھتے ہیں۔" سنجیدگی سے یہ بات اس نے کہی اور مجھے اپنے پاس کھینچ کر تبسّم کے ساتھ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔

"کیا تم مجھ سے محبّت کرتے ہو؟"

"جی ہاں"

"بہت؟"

"جی، بہت"

"لیکن کس طرح؟"

"یہ کیسے کہوں"

"تم اچھے لڑکے ہو۔ محبّت مجھے پسند ہے" یہ کہہ کر وہ مسکرائی اور کچھ کہتے کہتے رہ گئی۔ "تمھیں جب فرصت ملے بے جھجک میرے پاس آیا کرو۔"

اس عنایت سے میں نے فائدہ اُٹھایا اور اس عورت کی صحبت نے مجھے بہت فائدہ پہنچایا۔ رات کو کھانے کے بعد جب میرے گھر والے سو جاتے تو میں چُپکے سے ملکہ کے دیوان خانے میں حاضر ہوتا۔ اگر وہ گھر ہوتی تو میں دیر تک اس سے ہم کلامی کا شرف حاصل کرتا۔

"تمھیں روسی کتابیں پڑھنا چاہییں اور روس کی زندگی کے ہر پہلو کو پہچاننا ضروری ہے۔"

اس نے مجھے اپنی زلف عنبریں میں پن کھونسنے کی ترکیب سکھائی اور روس کے مصنفوں کے حالات سنائے۔ بیچ بیچ میں وہ پوچھ بیٹھتی:

"بھولو گے تو نہیں؟"

پھر وہ جھنجھلا کر کہتی :

"پتھر پڑیں میری یاد پر! مجھے تمھاری پڑھائی کا انتظام کرنا ہی اور مجھے اس کا خیال نہیں رہتا۔"

کچھ وقت اس کی صحبت میں گزار کر جب میں کوئی نئی کتاب بغل میں دبائے اپنے دڑبے کو واپس لوٹتا تو محسوس ہوتا کہ میری روح دُھل دُھلا کر نکھر گئی ہی۔

اس نے مجھے کئی روسی شاہکار دیے اور انھیں پڑھ کر میرے تخیل کی دنیا منور ہو گئی، ماحول کا گرد و غبار کافور ہو گیا۔ انھیں پڑھنے کے بعد مجھ میں خود اعتمادی پیدا ہوئی کہ میں دنیا میں اکیلا نہیں ہوں اور اس میلے میں کھو نہیں سکتا۔

جب نانی مجھے دیکھنے آتی تو میں فخر و مسرت سے اُسے ملکۂ حُسن کی باتیں سُناتا اور وہ ناس سونگھ سونگھ کر مزے میں سر ہلاتی اور خوش ہو کر کہتی:

"شکر ہی خدا کا! تم نے دیکھا کہ بھلے آدمیوں کی کمی نہیں۔ آنکھیں کھول کر دیکھو تو وہ ہر جگہ موجود ہیں۔"

ایک بار اس نے کہا "کہو تو میں جاکر اس بیگم کا شکریہ ادا کروں۔"

"نہیں، اس کی ضرورت ہی کیا ہی۔"

"تم نہیں چاہتے تو خیر —— اللہ اللہ! یہ جہان کتنا جمیل ہی میں تو قیامت تک اسی زمین پر رہنا پسند کروں۔"

میری تعلیم کا کوئی انتظام نہ ہو سکا کیونکہ اسی زمانے میں ایک تیوہار کے موقعے پر ایسی مصیبت آئی کہ میں تباہ ہوتے ہوتے بچ گیا۔

تیوہار سے پہلے پہلے میرے پپوٹے ایسے سوجے کہ کئی دن آنکھیں

نہ کھلیں۔ گھر والے گھبرائے کہ کہیں اندھا نہ ہو جائے اور میں بھی سہم گیا میں ایک ماہر چشم کے پاس بھیجا گیا جس نے پپوٹوں پر چیرا لگا کر آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ کئی روز میں انتہائی کرب کے عالم میں اندھا بنا پڑا رہا۔ اندھے ہو جانے سے بڑھ کر کوئی مصیبت نہیں۔ انسان اور دنیا کے بیچ میں آنکھ، پل کا کام کرتی ہے اور جو یہ پل ٹوٹ گیا تو انسان کے لیے دنیا کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔

تیوہار کے دن میری چھٹی تھی اور میں اردلیوں سے غپ لڑانے ان کے باورچی خانے پہنچا۔ وہ سب اور تو اور سادھو، توپیف، بھی شراب کے نشے میں چور تھے، شام کو ارموخن نے سدوروف کے سر پر لکڑی کے کندے سے ایسا وار کیا کہ وہ بیہوش ہو کر گر پڑا اور مجرم یہ جا وہ جا چمپت ہو گیا۔

سارے محلے میں شور ہو گیا کہ سدوروف کا خون ہو گیا۔ سپاہی کی لاش صحن میں پڑی ہوئی تھی اور لوگ ٹولی باندھے چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ کوئی کہتا کہ پولیس کو اطلاع کرنا چاہیے۔ لیکن نہ تو کوئی پولیس کو خبر دینے گیا نہ کسی نے اس کی لاش کو ہاتھ لگایا۔

اتنے میں دھوبن نتالیا نیلا فراک اور سفید رومال اوڑھے موقعۂ واردات پر پہنچی۔ بھیڑ کو چیر پھاڑ کر وہ لاش کے پاس آئی اور اسے قریب سے دیکھ کر چیخ پڑی:۔

"الو کے پٹھو! یہ ابھی زندہ ہے! جلدی سے ٹھنڈا پانی لاؤ۔"

تماشائی بڑبڑانے لگے:۔ "پرائے پھٹے میں خواہ مخواہ ٹانگ کیوں اڑاتی ہو؟"

"پانی لاتے ہو یا نہیں!" اس نے گرج کر کہا، گویا کہیں آگ لگ گئی ہو۔ پھر اس نے زمین پر بیٹھ کر سپاہی کا خون آلودہ سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔

گھبراہٹ کے مارے اب بھیڑ چھٹنے لگی تھی۔ دھوبن کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے اور وہ غضبناک تیور سے ان بھگوڑوں کو دیکھ رہی تھی میں بالٹی بھر پانی لایا تو اس نے زخمی سپاہی کے سر اور سینے پر انڈیلنے کی ہدایت کی اور چلایا:

"مجھ پر چھینٹا نہ پڑے۔ مجھے ابھی دوستوں کے گھر جانا ہے۔"

پانی پڑتے ہی سپاہی کو ہوش آیا۔ آنکھ کھلتے ہی اس کے منہ سے کراہنے کی آواز نکلی۔

"اسے اندر لے چلو۔" تالیکا نے کہا اور دور سے اس کا دھڑ اٹھایا کہ کہیں لہنگا نہ خراب ہو جائے۔ سدو روف کو باورچی خانے میں لاکر ہم نے پلنگ پر لٹا دیا۔ اس کے چہرے کو گیلے کپڑے سے پونچھ کر بار بار جاتے ہوئے وہ کہتی گئی:

"کپڑا گیلا کر کرکے اس کے سر پر رکھتے جاؤ۔ میں جا کر ذرا اس بدمعاش ارموخن کی خبر لوں۔ یہ نابکار جب تک پیتے پیتے ڈھیر نہ ہو جائیں ان کی پیاس نہ بجھے گی۔"

سدو روف کبھی جمھائی لیتا، کبھی ہچکی لیتا اور کبھی کراہنے لگتا۔ اس کے سر سے خون کی گرم گرم بوندیں میرے پیروں پر گریں۔ اور گو کہ مجھے بڑی گھن آئی لیکن میں اس قدر حیران تھا کہ ششدر کھڑا رہا، جنبش کرنے کی جرأت نہ ہوئی

کیسے افسوس کا مقام تھا باہر سورج جگمگا رہا تھا۔ در و دیوار پر سبزہ

اُگ رہا تھا، ہر برگ و شجر پر بہار آ رہی تھی۔ ہر طرف پیڑ پودوں میں نئی نئی کونپلیں پھوٹنے لگی تھیں۔ صبح سے میں سوچ رہا تھا کہ موسم بہار کے ساتھ زندگی میں زیادہ صحت اور ستھراپن آجائے گا۔

زخمی سپاہی برابر کراہ رہا تھا۔ شراب اور پیاز کی بدبو سے دم گھٹ رہا تھا۔ کھڑکی سے لوگ منہ ڈال کر اندر جھانک رہے تھے۔ اُن کی چپٹی ناکیں بے حس چہرے اور گال پر رکھے ہوئے ہاتھ — نہایت ہی مکروہ نظارہ پیش کر رہے تھے۔

جب سدوروف کا مزاج کچھ ٹھکانے لگا تو وہ آہستہ سے بولا:۔
"مجھے ہو کیا گیا تھا؟ بھیا ارموخن کیا میں گر پڑا تھا؟" پھر کھانستے ہوئے وہ رونے لگا اور بہکی بہکی باتیں کرنے لگا: "میری پیاری بہن، ننھی منّی!"

وہ یک بیک لڑکھڑاتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا لیکن زیادہ دیر کھڑا نہ رہ سکا اور پلنگ پر گر کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کہنے لگا:۔
"انھوں نے میری جان لینے میں کیا کسر چھوڑی تھی"
اس پر مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔
"ابے تو ہنس کس بات پر رہا ہے۔ دیکھتا نہیں کہ میری جان پر بن آئی"

مجھے پے در پے تھپڑ لگاتے ہوئے وہ زیرلب کہنے لگا:
"پہلے پیغمبر الیاس، دوسرے گھڑسوار سینٹ جارج، تیسرے — تو میرے پاس نہ آنا۔ بھیڑیے کہیں کے، منہ کالا کر"
میں نے کہا: "بیوقوفی کی باتیں نہ کرو"

اس پر اُسے سخت طیش آیا اور وہ دوبارہ پلنگ سے کود پڑا :
"میری تو جان گئی اور تو —"

اپنے بھاری بھرکم پنجوں کو تول کر اس نے میری آنکھوں پر دو ہتڑ رسید کیا - میں چلّا کر دیوانہ وار باہر بھاگا - میری مڈبھیڑ دھوبن سے ہوئی جو ارمو خن کو کھینچتی ہوئی لارہی تھی : ارے گھوڑے رُک کیوں گیا، چلتا کیوں نہیں - اس کے پوچھنے پر میں نے بتلایا کہ دوسرا جانور ہوش میں آگیا ہی۔

حیرت سے وہ مجھے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی : "ہوش میں آگیا!"

پھر اُس متوالے کو دھکا دے کر بولی : "اپنے نصیبوں کو سراہو"

اپنی آنکھیں ٹھنڈے پانی سے دھوکر میں نے دیکھا کہ باورچی خانے کے اندر دونوں سپاہی گلے مل رہے ہیں، پھر اُن دونوں نے دھوبن سے لپٹنے کی کوشش کی لیکن اس نے دونوں کے کان اینٹھے اور بگڑ کر بولی :-

"کتّو اپنی تھوتھنی کو دور ہی رکھنا - سمجھا کیا ہی؟ اور خیریت چاہتے ہو تو چُپکے سے سو رہو ورنہ تمھارے مالک اگر وہ گوشمالی کریں گے کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا"

اس نے دونوں کو پلنگ اور فرش پر یوں لٹا دیا گویا وہ دودھ پیتے بچّے ہوں اور جب دونوں خرّاٹے بھرنے لگے تو باہر آئی"

"توبہ، کہاں کے جنجال میں پھنسی - مجھے تو دعوت میں جانا تھا - اُس عقل کے اندھے نے شاید تمھیں پیٹ دیا - یہ ہیں شراب کے کرتوت - صاحب زادے، کبھی شراب کے قریب بھی نہ جانا"

پھاٹک کے پاس کی بنچ پر میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا اور پوچھا کہ

کیا تمھیں متوالوں سے ڈر نہیں لگتا۔

"میاں، میں تو ہوش مندوں سے بھی نہیں ڈرتی۔ دونوں کا میرے پاس ایک ہی علاج ہے" یہ کہ کر اس نے اپنی مضبوط مٹھی دکھائی۔

"میرا مرحوم شوہر بھی اوّل نمبر کا پینے والا تھا۔ ایک بار جو وہ زیادہ پی گیا تو میں نے ہاتھ پانو باندھ کر ڈال دیا۔ جب وہ بیدار ہوا تو میں نے خوب بید لگائے کہ اسے ہمیشہ کے لیے کان ہو جائیں۔ اور ہر ضرب کے ساتھ میں کہتی گئی: شادی کے بعد شراب کو منہ لگانا گناہ ہے۔ جب دل بہلانے کے لیے عورت موجود ہے تو شراب کے قریب کیوں جاتے ہو۔ اتنی بک بک کی کہ میری زبان بھی تھک گئی۔ بس اُس دن کے بعد میاں موم کی ناک بن گئے"۔

"تمھاری قوت سے کسے انکار ہو سکتا ہے"۔ یہ کہتے ہوئے مجھے اماں حوّا کا خیال آیا جنھوں نے اللہ میاں کو بھی ایک بار چکمہ دے دیا تھا۔

نتالیا نے جواب دیا: "مرد سے زیادہ عورت کو قوّت کی ضرورت ہے۔ اسے دُگنی طاقت چاہیے کیونکہ مرد اپنے پیروں پر اکیلا کھڑا نہیں رہ سکتا"۔

اس کے الفاظ میں تلخی نہ تھی۔ بولتے وقت اس کے ہاتھ گدرائے ہوئے جوبنوں پر بندھے ہوئے تھے اور اُداس آنکھیں ناب وان پر لگی ہوئی تھیں۔ اس کی گفتگو اس قدر دل چسپ تھی کہ مجھے وقت کا خیال نہ رہا۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ مالک اور مالکن ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چلے آرہے ہیں۔ بس یہ معلوم ہُوا کہ مُرغا اور مُرغی محوِ خرام ہیں۔ ہم دونوں کو دیکھ کر اُنھوں نے معنی خیز انداز میں آپس میں کچھ کہا۔

میں لپک کر پھاٹک کھولنے گیا۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے مالکن نے

ناگن کی طرح پھنکار کر کہا :- "آپ کے عشق کا ٹٹو دھوبن کی طرف چلا ہی! ارے تو ان کم ذاتوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگا"

اس بے سر پیر کی تہمت کا میں نے بُرا نہ مانا۔ لیکن جب مالک نے کہا :- "اب اس کی عمر بھی تو ہو چلی، اس کا کیا قصور"

تو سر سے پیر تک آگ سی لگ گئی۔

دوسرے دن صبح جب میں لکڑیاں لینے آنگن میں گیا تو کسی سوراخ میں خالی تھیلی پڑی دیکھی۔ کئی مرتبہ سدوروف کے ہاتھ میں اسے دیکھ چکا تھا لیکن جب میں اس کے پاس لے گیا تو اسے ٹٹول کر وہ بلبلا اُٹھا :

"اس میں تیس روبل تھے وہ کہاں گئے۔ سیدھے سیدھے مجھے دے دو"

اس کا سر تولیے میں لپٹا ہوا تھا۔ اپنی سوجی ہوئی آنکھوں سے وہ مجھے گھورنے لگا اور یہ ماننے سے یکسر انکار کر دیا کہ تھیلی مجھے خالی ملی تھی۔ ارموخن بھی اُسے بڑھاوا دینے لگا : "ہو نہ ہو، اسی لونڈے نے چوری کی ہی۔ اس کے مالک سے کہو۔ کہیں سپاہی بھی آپس میں ایک دوسرے کا مال اُڑاتے ہیں"

اس کی بات سے میں سمجھ گیا کہ یہ حرکت اسی کی ہی اور رقم نکال کر اس نے خالی تھیلی میرے آنگن میں پھینک دی ہی۔ میں نے اس کے مُنہ پر کہ دیا :

"چور کہیں کے! چوری تو نے کی ہی"

یہ سُن کر اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ میرا قیاس صحیح ہی۔ وہ غصّے سے پیچ و تاب کھا کر چلایا :

"اپنے الزامات کو ثابت کرو۔"

میرے پاس کیا ثبوت تھا؟ ارموخن شور مچاتے ہوئے مجھے احاطے میں کھینچتا پھرا۔ سدوروف بھی ہا ہو کرتے ہوئے اس جلوس کے ساتھ ہولیا۔ لوگ کھڑکیوں سے جھانک جھانک کر یہ ماجرا دیکھنے لگے۔ ملکۂ حسن کی ماں سگریٹ کا دھنواں اُڑاتی ہوئی چپ چاپ یہ تماشا دیکھتی رہی مجھے محسوس ہُوا کہ اپنی ملکہ کی نظروں میں ہمیشہ کے لیے گر گیا اور میرے ملال کی انتہا نہ رہی۔

مجھے یاد ہی کہ سپاہی مجھے گردن پکڑے میرے مالکوں کی عدالت میں لائے اور وہ سب بیک زبان ان کے دعوے کی تائید کرنے لگے۔ مالکن نے یہ ہخ لگائی:۔

"اس کے چور ہونے میں کیا شبہہ۔ شام کو یہ دھوبن سے عشق لڑا رہا تھا اور اس کے لیے دام چاہییں۔ کنگالوں کو بھلا وہ کب منہ لگاتی ہی۔"

ارموخن نے زوروں سے کہا: "آپ بالکل صحیح فرماتی ہیں۔"

غصّے کے مارے میں پاگل ہوگیا اور مالکن کو بے نطق سنائی جس کے عوض میری خوب گندی ہوئی۔

لیکن میرے لیے سب سے زیادہ اندوہ ناک یہ تصور تھا کہ ملکۂ حُسن مجھے آوارہ اور اوباش سمجھنے لگی ہوگی۔ اب میں اس سے کبھی آنکھ نہ ملا سکوں گا۔ بہت ممکن ہی کہ اس وقت میں خودکشی کرلیتا۔ اسے میری خوش قسمتی کہیے کہ سپاہیوں نے یہ قصہ سارے محلے میں مشتہر کردیا۔ شام کو میں تنہا اپنی کوٹھری میں پڑا ہوا تھا کہ

نیچے سے دھوبن کی گونج دار آواز سُنائی دی:-

"ارے میں چُپ کیوں رہوں؟ کیا کسی کا ڈر پڑا ہے! تم سیدھے سیدھے اپنی راہ پکڑو، ورنہ تمھارے آقا سے کہہ کر وہ حجامت کراؤں گی کہ دن کو تارے نظر آنے لگیں گے۔"

میں فوراً تاڑ گیا کہ یہ غل غپاڑہ میری خاطر ہو رہا ہے۔ وہ پکار پکار کر کہہ رہی تھی:-

"کل تو نے مجھے کتنے رُپے دکھائے تھے، ایں؟ اور یہ رُپے تجھے کہاں سے ملے۔ تبلانا تو سہی۔"

خوشی کے مارے میں اُچھل پڑا اور اسی وقت سدورووف منمنایا:

"کیوں بھائی ارموخن ـــ"

"اور اس غریب لڑکے پر یہ بہتان! اس بیچارے پر بلا وجہ ظلم!"

میں باہر بھاگنے کے لیے مچل پڑا۔ جی چاہا کہ خوشی سے ناچنے لگوں اور اس دھوبن کے ہاتھوں کو بوسہ دوں۔ اتنے میں کیا سنتا ہوں کہ نیچے سے میری مالکن کہہ رہی ہے:-

"لڑکے کو اس کی بدزبانی کی سزا دی گئی۔ ورنہ تم جیسی چھنالوں کے سوا کسی کو یہ گمان بھی نہ ہو سکتا تھا کہ وہ چوری کرے گا۔"

"بیگم صاحبہ، آپ چھنالوں کی رانی ہیں اور مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ آپ مرکھنی گاے ہیں!"

مجھے اس تکرار میں ایسا لطف آیا گویا کوئی نغمہ سن رہا ہوں نتالیا کے احسان اور اپنی قابل رحم حالت پر غور کرکے مجھے رونا

آگیا۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنے جذبات کو ضبط کیا۔

میرا مالک آہستہ آہستہ کوٹھڑی میں داخل ہُوا اور ایک شہتیر کا سہارا لے کر بولا:

"بھائی پیشکوف، کیسی حیرت کی بات ہے کہ اس گورکھ دھندے سے تمھارا کوئی تعلق نہ تھا"

میں نے منہ پھیر لیا اور کوئی جواب نہ دیا۔ پھر بھی اس نے اپنی بکواس جاری رکھی:

"یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ تم نے سخت گستاخی سے کام لیا"

میں نے صرف اتنا کہا: "طبیعت ٹھیک ہوتے ہی میں آپ کے گھر کو خیرباد کہوں گا"

سگریٹ کا دھنواں اُڑاتے ہوئے وہ کچھ دیر چپ رہا اور پھر دھیرے سے بولا:

"تمھاری مرضی۔ اب تم بڑے ہو گئے ہو اور اپنا بھلا بُرا سمجھ سکتے ہو۔ تمھیں اپنی بہتری کا راستہ خود تلاش کرنا چاہیے" یہ کہ کر وہ چلا گیا اور ہمیشہ کی طرح اب کے بھی مجھے اس پر ترس آیا۔

چار دن بعد میں نے یہ گھر چھوڑ دیا۔ دل بہت تڑپا کہ ملکۂ حُسن سے رخصت ہو لوں۔ لیکن اس کے سامنے جانے کا حوصلہ نہ ہوا حالانکہ مجھے یقین تھا کہ وہ مجھے خود بُلا بھیجتی۔

ننھی شہزادی کو الوداع کہتے وقت میں نے درخواست کی:

"اپنی امّی سے کہنا کہ میں ہمیشہ ان کا شکرگزار رہوں گا"

"ضرور" اس نے مسکرا کر وعدہ کیا: "اچھا کل تک

خدا تمھارا نگہبان ہو۔"

اس سے میری دوسری ملاقات بیس سال بعد ہوئی۔ جب اس کی شادی پولیس کے ایک افسر سے ہو چکی تھی۔

باب (۱۱)

ایک بار پھر میں ایک اگن بوٹ پر مشعلچی کی خدمت پر مامور ہوگیا یہ بوٹ وسیع، کشادہ اور صاف ستھرا تھا۔ میری تنخواہ سات روبل مقرر ہوئی اور میں خانساماں کے ہاتھ تلے کام کرنے لگا۔

داروغہ کی فربہ اندامی پر طرفہ یہ کہ اس کا سر بنجر میدان کی طرح سپاٹ تھا۔ وہ دن بھر عرشے پر چہل قدمی کرتا رہتا۔ گویا کوئی جنگلی سؤر دھوپ میں سائے کی تلاش میں بوکھلایا پھر رہا ہو۔ اس کی بیوی لہنگا پھڑکاتی تتلی کی طرح یہاں وہاں اُڑتی پھرتی۔ اس کی عمر اب چالیس کے لگ بھگ تھی، صورت شکل اچھی تھی لیکن چراغ حسن میں اب روغن شباب کہاں؟ پاؤڈر کی ایسی لیپا پوتی کرتی کہ اس کے رنگین لباس پر ہمیشہ سفید بکنی سی بچھی رہتی۔

باورچی خانے پر جس خانساماں کی حکومت تھی اُسے سب 'ایوان' کہتے۔ پستہ قد، توتے کی سی ناک اور شریر آنکھیں۔ گال نیلا ہٹ لیے ہوئے اور مونچھیں اوپر چڑھی ہوئیں۔ دن بھر وہ اپنی مونچھوں کے بنانے، سنوارنے میں لگا رہتا۔ کبھی انھیں تاؤ دیتا اور کبھی جیبی آئینے میں ان کی بہار کا معائنہ کرتا۔

جہاز کا سب سے دلچسپ آدمی کوئلہ جھونکنے والا خلاصی لیگوف

تھا۔ اس کا جسم گٹھا ہوا تھا اور چوڑا چکلا چہرا پھاوڑے کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ اس کے گالوں پر جو خشخشی بال تھے اُن پر کائی کا گمان ہوتا تھا۔

وہ تاش کے اُن سب کھیلوں کا اُستاد تھا جو بازی لگاکر کھیلے جاتے ہیں اور اس کے لالچ کی کوئی حد نہ تھی۔ جب دیکھو بھوکے کتے کی طرح باورچی خانے کے طواف کو حاضر، کبھی گوشت کی اور وہ نہیں تو ہڈی کی ہی فرمائش کرتا۔ شام کو وہ خانساماں کی میز پر حاضر رہتا اور عجیب وغریب آپ بیتی کہانیاں سُنایا کرتا۔ لڑکپن میں وہ گڈریا تھا۔ ایک دن کوئی راہب اُسے پھسلا کر اُڑا لے گیا اور چار سال اسے ایک خانقاہ میں گزارنے پڑے۔

ایک مخصوص مزاحیہ انداز میں وہ سُناتا: "غالباً میں ساری عمر راہب رہتا اور کسی ستارۂ سیاہ کی طرح خدا سے لو لگائے رہتا لیکن ہماری خانقاہ میں جاتریوں کا آنا ہوا۔ ان میں ایک ہنس مکھ حسینہ بھی تھی۔ وہ کہنے لگی کہ تم تگڑے جوان اور میں بھری جوانی میں بیوہ، کنج تنہائی میں پڑی رہتی ہوں۔ میرا اپنا گھر اور نج کی دُکان ہی۔ چلے چلو مزے میں گزرے گی۔ میں اس کے ساتھ ہولیا اور تین برس اس لطف سے اس کے آغوش میں گزارے جیسے تندور میں گرم گرم ڈبل روٹی۔"

خانساماں بات کاٹ کر بولا:۔ "بھئی اگر جھوٹ بول کر جھولی بھر سکتے تو تو آج کروڑپتی ہوتا۔"

لیکوف اس اعتراض کی کوئی پروا نہ کرکے چٹکی بجاتا رہا اور پھر بلا تکلف اپنی داستان کا دوسرا باب شروع کیا:

"لیکن وہ عمر میں مجھ سے زیادہ تھی، اس لیے میرا جی اُکتا گیا اور میں اس کی بھانجی سے دل بہلانے لگا۔ جب گھر والی کو اس کا پتہ چلا تو اس نے مجھے کھڑے کھڑے باہر کیا۔"

خانساماں نے خوش ہو کر کہا:۔ "تمھارے کرتوتوں کی یہی سزا تھی۔" لیکوف نے شکر بھانکتے ہوئے سلسلہ جاری رکھا:

"فاقہ مستی کی حالت میں ایک پھیری والے سے ملاقات ہو گئی۔ اس کے ساتھ میں سارے بلقان کی خاک چھان آیا ــــ ترکی سے لے کر آسٹریا تک کا دھاوا کیا۔ ملک ملک شہر شہر ہم کاروبار کرتے پھرے۔"

خانساماں نے کہا:۔ "یوں کہو کہ چوری کرتے پھرے۔"

"نہیں اس بوڑھے پھیری والے نے سبق دیا کہ پردیس میں ہمیشہ دیانت کی زندگی بسر کرنا ورنہ کتے کی موت مارے جاؤ گے اور کوئی نہ پوچھے گا۔ ایک مرتبہ میں نے چوری کی کوشش بھی کی لیکن کچھ پلے نہ پڑا۔ میں ایک شخص کا گھوڑا کھول کر لے گیا لیکن سرِ راہ پکڑ لیا گیا، پٹائی الگ ہوئی اور کوتوالی کا منہ الگ دیکھنا پڑا۔ میرے ساتھ اصلی چور بھی گرفتار ہوا۔ مذاق ہی مذاق میں مجھ سے یہ حرکت سرزد ہو گئی۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ گھوڑے کا مالک انھیں دنوں بیمار ہو گیا اور اس نے میرے بارے میں کوئی بُرا خواب دیکھا۔ بس وہ جج کے پاس بھاگا گیا اور گڑگڑا کر بولا: "للہ، اس جادوگر کو رہا کیجیے ورنہ اس کے ٹوٹکے سے میری جان چلی جائے گی۔ اسی وقت میری گلو خلاصی ہو گئی۔"

خانساماں نے اُنگلیاں چٹخاتے ہوئے غصّے سے کہا:

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم جیسا خانہ بدوش زندہ کیسے رہتا ہے۔ ساری دنیا میں مٹرگشت کرتے پھرتے ہو اور پیٹ کے لیے کوئی کام نہیں کرنا پڑتا۔ آخر ہو تم کس مرض کی دوا"

خلاصی لیکوف نے ایک تر نوالہ منہ میں ٹھونستے ہوئے کہا:

"میں بھی اس راز سے ناواقف ہوں۔ بس تو اتنا جانتا ہوں کہ زندگی گزر رہی ہے۔ دنیا کا یہ قاعدہ ہے، کوئی باکار، کوئی بے کار ان زمینداروں سے بڑھ کر کون نٹھلا ہوگا۔ پھر بھی ان سے زیادہ آرام کسے نصیب ہے۔"

معلوم نہیں کیوں، یہ باتیں سُن کر خانساماں آپے سے باہر ہو جاتا تھا:

"تم سے زیادہ تو سُوّر بھی کارآمد ہوتا ہے۔ اس ذلالت —"

لیکوف حیران ہو کر پوچھتا: "آخر تمھاری خفگی کی وجہ کیا ہے؟ سوچو تو سہی انسان انسان میں ایسا کیا فرق ہے اور تمھاری گالی گلوج سے مجھ میں کون سی اصلاح ہو جائے گی۔"

اس کی شخصیت سے میں مسحور سا ہو گیا۔ اس کے ہر ہر لفظ پر میں حیران رہ جاتا اور پیکرِ تصویر بنا اس کی باتیں سُنا کرتا۔ میں سمجھ گیا کہ اسے زندگی کا عمیق تجربہ ہے۔ وہ کپتان اور پہلے درجے کے مُسافروں سے لے کر مہتروں تک سے ایک جیسا برتاؤ کرتا تھا اور کسی سے بات کرتے ہوئے اس کی آنکھیں نیچی نہ ہوتی تھیں۔

جب کپتان یا داروغہ کاہلی یا جوتے کے چسکے کی وجہ سے اُسے ڈانٹتے ڈپٹتے تو وہ قطعاً لاپروائی سے یہ لعن طعن سُنتا اور

ان کی دھمکیوں کا اس پر مطلق اثر نہ ہوتا۔ "درصل صاحب"[1] کی طرح اس کی شخصیت میں بھی ایک خاص قسم کی بے نیازی تھی۔ وہ اس امر سے واقف تھا کہ عوام اُسے سمجھنے سے قاصر ہیں۔

میں نے اُسے کبھی غصے کی حالت میں نہ دیکھا۔ اور وہ زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکتا تھا۔ گویا اس کے سینے میں الفاظ کا دریا موجزن تھا اور وہ رہ رہ کر باہر اُچھل آتا تھا۔ دوسروں کی بات سنتے ہوئے بھی، اس کے ہونٹ ہلتے رہتے گویا وہ اپنے آپ سے کچھ کہہ رہا ہو۔ آشنا ہو یا ناآشنا، ہر کسی سے وہ کچھ نہ کچھ کہے جاتا تھا:

"سلام بڑی بی، آپ کہاں جا رہی ہیں۔ کستوپول؟ اجی میں اس شہر کو خوب جانتا ہوں۔ وہاں میں غبیل دلین نامی تاتار کاریگر کا مہمان تھا۔ اس بڈھے کی تین بیویاں تھیں۔ بڑھاپے میں بھی وہ جوانوں کے کان کاٹتا تھا۔ اس کی بیوی جوان تھی۔ ہائے ہائے کس مزے کی عورت تھی۔"

یہ بندۂ خدا دنیا کے ہر گوشے میں رہ چکا تھا اور جانے کئی ہزار عورتوں سے تعلق رکھ چکا تھا۔ لیکن کسی کا بھی ذکر وہ تلخی یا حقارت سے نہ کرتا تھا جہاں اس کا کام ختم ہؤا، عرشے کے ہر گوشے میں اس کی صدا بلند ہوتی:

"بھائیو، تاش کھیلو گے؟ میاں دل بہلانے کے لیے اس سے اچھی کوئی چیز نہیں۔ بیٹھے بیٹھے رُپے سیدھے کرو، اس سے دلچسپ کون سی تجارت ہو سکتی ہے۔"

---

(۱) دیکھو گورکی کی آپ بیتی جلد اوّل۔

میں نے غور کیا کہ وہ چیزوں کے ساتھ اچھائی، بُرائی کی صفت نہ لگاتا تھا بلکہ انھیں دلچسپ یا عجیب وغریب ناموں سے یاد کرتا تھا۔

لوگ اسے کاہل نکھٹو کہتے۔ لیکن اس جہنم کی آگ میں وہ اتنی ہی تندہی اور محنت سے کام کرتا جتنا دوسرے لوگ۔ دوسرے خلاصیوں کی طرح وہ گرمی کی شکایت نہ کرتا تھا۔

کسی نے ایک بڑھیا مسافر کی تھیلی چرالی۔ کپتان اور مسافروں نے اس کے لیے چندہ کیا اور جب یہ رقم بڑھیا کو دی گئی تو اس نے صلیب کا نشان بناکر سب کا شکریہ ادا کیا اور بولی :۔

"بھائیو تم نے مجھے تین روپے زیادہ دے دیے"

اس پر کسی منچلے نے آواز لگائی:

"بڑی بی، یہ بھی تمھاری قسمت کے ہیں۔ باندھ لو اپنی گرہ میں"

لیکن لیکوف بڑھیا کے پاس پہنچا اور عاجزی سے بولا:

"آپ کے پاس زیادہ ہوں تو مجھے دے دیں، میں تاش کھیلوں گا"

سب لوگ ہنس پڑے کہ وہ مذاق کر رہا ہے لیکن وہ برابر اصرار کرتا رہا:

"بڑی بی۔ آپ کو اتنے روپیوں کی کیا ضرورت۔ کل آپ قبر میں سوتی ہوں گی۔ آج کا دیا لیا عاقبت میں کام آئے گا"

اس پر سب نے لعنت ملامت کی اور وہ اپنا سا منہ لے کر لوٹ آیا۔ لیکن وہ واقعتاً سخت متعجب تھا: "یہ لوگ کتنے احمق ہیں۔ یہ بیچ میں بھانجی مارنے والے کون تھے۔ بڑھیا تو خود ہی شاکی

تھی کہ اس کے پاس ضرورت سے زیادہ رُپے ہیں۔ اگر یہی تین رُپے مجھے مل جاتے تو دل خوش ہوجاتا اور کسی کے باپ کا کچھ نہ جاتا"۔

رُپے کی شکل دیکھتے ہی اس کی باچھیں کھل جاتی تھیں۔ باتیں کرتے ہوئے بھی وہ سکے اپنے کپڑوں میں ملا کرتا۔ یہاں تک کہ وہ جھل جھل کرنے لگے۔ پھر وہ انھیں محبت بھری نظروں سے دیکھتا۔

ایک دن اس نے مجھے جُوا کھیلنے کی دعوت دی۔ جب میں نے اس فن سے لاعلمی ظاہر کی تو وہ چلّایا:

"نہیں جانتا! ارے تجھے جُوا نہیں آتا اور اپنے آپ کو علامہ بتلاتا ہے۔ آ، میں تجھے مفت میں اس کے گر سکھاؤں"۔

جب اس نے دیکھا کہ میرا ہاتھ صاف ہوچلا ہے تو بولا:

"کتنے رُپے ہیں؟"

"پانچ"

"اور میرے پاس دو ہیں"۔

ظاہر ہے کہ یہ رقم اس نے بہت جلد مجھ سے جیت لی۔ میں نے سوچا کہ چاہے لاکھ کا گھر خاک ہوجائے بدلا ضرور لوں گا۔ چنانچہ اپنے کوٹ اور نئے جوتوں تک کی بازی لگادی۔ لیکن ہارتا ہی چلا گیا۔ لیکوف نے جز بز ہوکر مجھے جھاڑتے ہوئے کہا:

"تم کیا خاک کھیلوگے۔ تمھیں کچھ آتا ہی نہیں اور یہ اس لیے کہ ہارتے وقت تمھاری رگوں کا خون کھولنے لگتا ہے۔ غضب خدا کا ہر چیز کی بازی لگادی۔ جوتے تک نہ چھوڑے۔ میں اس قسم کی باتوں پر لعنت بھیجتا ہوں۔ چلو خیر۔ اپنے کپڑے واپس لے لو۔ اور اپنی رقم

بھی لیکن پوری نہیں - میں ایک روبل ضرور روک لوں گا - کیونکہ آج تم کو ایک معقول سبق سکھایا ہے - کیوں ٹھیک ہے نا؟"

میری نگاہیں شکریے سے جُھک گئیں -

اس شکریے کے جواب میں خوش ہونے کے بجائے اس نے کہا - "لاحول ولاقوۃ! میں ایسی باتوں پر تھوکتا بھی نہیں - کھیل صرف کھیل کی غرض سے - تفریح کے طور پر کھیلنا چاہیے - لیکن تم ہو کہ اس اصول کے برعکس خواہ مخواہ جھگڑنے لگتے ہو - میں کہتا ہوں کہ جھگڑنے میں بھی ذرا ٹھنڈے دل سے کام لینا چاہیے - آگ بگولا ہو کر تم کوئی نتیجہ نہیں نکال سکتے - پھر بتاؤ اپنا خون اوٹانے سے کیا حاصل؟ ابھی تم میں لڑکپن ہے - اپنے جذبات پر قابو پانا سیکھو - ایک دفعہ نہیں دس دفعہ ہار جاؤ مگر پروا نہ کرو - ہار جیت کا نام ہی زندگی ہے - جب دیکھو کہ قسمت ساتھ نہیں دے رہی تو ذرا رک جاؤ اور پھر تازہ دم ہو کر کھیلنا شروع کر دو -

رفتہ رفتہ میں اس کی باتوں میں دلچسپی لینے لگا - حالانکہ وہ اکثر مجھے لتاڑتا رہتا تھا - اس کی کہانیاں سُن کر بارہا نانی کی یاد دل میں تازہ ہو جاتی تھی - اس میں بڑی خوبیاں تھیں اور اس لیے میں اس کی طرف مائل ہوتا چلا گیا - حالانکہ اس کی لاُابالی طبیعت سے اکثر مجھے کوفت ہونے لگتی تھی -

ایک روز غروب آفتاب کے وقت نشے میں دُھت دوسرے درجے کا ایک توندل مسافر جہاز سے نیچے لڑھک گیا - اور پانی کی تیز موجیں اسے اُٹھا کر منجدھار میں لے گئیں - بس پھر کیا تھا - بیچ دریا میں جہاز

کو ٹھہرالیا گیا۔ بھاپ کی نلکی کا بند ہونا تھا کہ دھنویں کا غبار فضا میں چاروں طرف پھیل گیا۔ اور جب ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری کرنیں اس میں تحلیل ہوئیں تو ایسا معلوم ہوا گویا خون کی سُرخی تمام فضا میں پھیل گئی ہی۔ دریا کا پانی آتش سیال بن گیا تھا۔ جس کی پرجوش لہروں کے سرے پر جہاز سے کافی دور ایک سیاہ چیز اس طرح ہچکولے کھا رہی تھی گویا زندگی اور موت کے درمیان کشمکش ہورہی ہی۔ چیخ پکار کی آواز ہر سمت سے بلند ہوئی اور ہر شخص کا دل غم و افسوس کا مرکز بن گیا۔ تمام مسافر چیختے چلّاتے عرشے کے قریب آکر جمع ہوگئے۔ اس افراتفری کے عالم میں ڈوبنے والے کا ایک ساتھی جو خود بھی نشے میں دُھت اور سرخ چقندر معلوم ہوتا تھا سب کو دھکیلتا ہوا آگے بڑھا اور چلّاکر کہنے لگا:۔

”ہٹو۔ پرے ہٹو۔ میں اکیلا اس کو بچا لاؤں گا۔“

دو ملّاح کبھی کے پانی میں کود چکے تھے اور ڈوبنے والے کی طرف تیزی سے تیرتے چلے جا رہے تھے۔ کشتیاں بھی اُتار دی گئیں۔ ملاحوں کی چیخ پکار اور عورتوں کی آہ و فریاد کے درمیان لیکوف کی دل سوز آواز گونج رہی تھی۔

”وہ ضرور ڈوب جائے گا۔ ڈوبے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ وہ سر سے پانو تک کپڑوں میں لپٹا ہوا ہی جس کے باعث ڈوب جانا لازمی ہی۔ ذرا عورتوں کی مثال لو اور غور کرو کہ وہ مردوں کے مقابلے میں کیوں زیادہ جلدی ڈوب جاتی ہیں۔ محض اپنے غبارہ نُما پیٹی کوٹ کے باعث۔ جب کوئی عورت پانی میں گرتی ہی تو وہ بالکل تیر کی طرح

سیدھی تہ میں پہنچ جاتی ہے۔ ابھی تم کو معلوم ہو جائے گا کہ میری باتیں بے تکی نہیں ہوتیں۔"

اور ہُوا بھی یہی کہ سوداگر ڈوب گیا۔ پورے دو گھنٹے تک دریا کی ایک ایک موج کو پلٹ کر دیکھ لیا مگر بالکل بے سود۔ اس کے ساتھی کی حالت دیکھنے کے لائق تھی۔ اس کا سانس چڑھا ہوا تھا اور وہ رو رو کر چلّا رہا تھا:-

"ہائے ہائے۔ ہم لوگ منزل کے قریب ہیں اور وہاں پہنچتے ہی ایک قیامت برپا ہو جائے گی۔ اس کے بال بچّے سبھی اس کو لینے آئیں گے لیکن اس کو نہ پا کر کیا کہیں گے۔"

لیکوف حسرت و یاس کا مجسّم نمونہ بن کر اس کے سامنے جا کھڑا ہُوا۔ اور بڑی دل جوئی کے ساتھ اسے تسلی دینے لگا:-

"اب کف افسوس ملنے سے ہوتا کیا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ زندگی کا رشتہ کب اور کس طرح ٹوٹنے والا ہے۔ بعض لوگ پھول سونگھنے سے بیمار پڑ جاتے ہیں اور مر جاتے ہیں لیکن ہزاروں ایسے ہیں جو پھولوں کے آغوش میں پل کر جوان ہوتے ہیں اور اُن کا بال تک بیکا نہیں ہوتا۔ لیکن کچھ بھی ہو یہ دُنیا سرائے فانی ہے۔ ہم مرنے ہی کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔"

سوداگر کے سامنے وہ جیم شحیم انسان اب معلوم ہوتا تھا گویا الف لیلہ کے زمانے کا کوئی قوی ہیکل دیو نمودار ہو گیا ہے اور اپنی جادو بیانی سے اس کا غم غلط کرنا چاہتا ہے۔ کچھ دیر تو سوداگر چپکے چپکے روتا رہا۔ آنسو ٹپک ٹپک کر اس کی گھنی ڈاڑھی پر بہتے رہے اور وہ اُن کو اپنے سوگوار دامن میں جذب کرتا رہا۔ لیکن تابہ کے وہ زیادہ دیر برداشت نہ کر سکا

اور بُری طرح برس پڑا۔

"تم میرے زخموں پر نمک چھڑک رہے ہو۔ دفان ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے۔ بھائیو اس موذی مردود کو یہاں سے لے جاؤ۔ ورنہ قسم خدا کی خون خرابہ ہو جائے گا۔"

لیکوف خود ہی ٹل گیا لیکن جاتے جاتے دبے لفظوں میں کہا:۔

"خدا بچائے بعض لوگ کس قدر طرفہ تماشا ہوتے ہیں۔ جس کی بھلائی کی کہو وہی آنکھیں نکالتا ہے۔"

کبھی کبھی میں خیال کرتا کہ لیکوف ذرا گاؤدی ہے لیکن اکثر یہ بات دل میں بیٹھ جاتی کہ وہ جان بوجھ کر بے وقوف بننے کی کوشش کرتا ہے۔ میں نے بارہا اس سے کہا کہ زندگی کے ابتدائی حالات سناؤ۔ دنیا میں کہاں کہاں پھرے گھومے اور کیا کیا کچھ دیکھا۔ لیکن نتیجہ کبھی خاطر خواہ نہ نکلا۔ وہ نہایت سنجیدگی سے فلسفیانہ طریقے پر آنکھیں میچ کر ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتا اور رُک رُک کر آہستہ آہستہ کہتا:۔

"کیا پوچھتے ہو بھائی۔ خدا کی اس وسیع دنیا میں انسان ہر جگہ موجود ہے اور سبھی لوگ سادہ لوح ہیں، عیسیٰ کی بھیڑوں کی طرح۔ لیکن رنج وغم سے کسی کو چھٹکارا نصیب نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دنیا میں کسانوں کی اکثریت ہے۔ زمین کا گوشہ گوشہ اس خس وخاشاک سے اٹا پڑا ہے۔ میں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا اور خوب سیر کی۔ ایران سے یونان تک اور بلغاریہ سے رومانیہ تک۔ کون سی جگہ ہے جہاں قدم نہیں رکھا اور کون سی محفل ہے جس میں شرکت نہیں کی۔ خانہ بدوشوں تک کے ساتھ اُٹھا بیٹھا ہوں۔ تم پوچھتے ہو کہ وہ کس قسم کے لوگ ہیں ہم

ہیں اور ان میں کیا فرق ہے۔ آخر تم کیا معلوم کرنا چاہتے ہو؟ شہری بالکل ہمارے ملک کے شہریوں کی طرح اور دیہاتی بالکل ہمارے دیہاتیوں کی طرح ہیں۔ بہت سی باتوں میں مشابہت ہے۔ حتّٰی کہ بعض لوگ تو ہماری زبان بھی سمجھتے اور بولتے ہیں۔ غلط سلط سہی لیکن واقف ضرور ہیں۔ مثال کے طور پر تاتاریوں کا نام پیش کیا جا سکتا ہے۔ البتہ یونانی ہماری زبان نہیں جانتے مگر بولنے سے باز نہیں آتے جو کچھ ان کے جی میں آتا ہے بکنے لگتے ہیں۔ سننے والا صرف یہ کہہ سکتا ہے کہ کچھ الفاظ زبان سے ادا ہوئے لیکن کیا کہا۔ یہ شاید وہ خود بھی نہیں سمجھتے۔ اُن سے اشاروں میں باتیں کرنی پڑتی ہیں۔ لیکن ہمارے بڑے میاں کو بات کرنے کا ایسا سلیقہ تھا کہ یونانی بھی ان کی گفتگو سمجھ لیتے تھے۔ وہ ہونٹوں ہونٹوں میں کچھ بڑبڑائے اور بس لوگ مطلب سمجھ گئے۔ اس اعتبار سے انھیں کمال حاصل تھا۔ اور یہ بھی جانتے تھے کہ ان پر اپنا اثر کس طرح قائم کیا جائے۔ تم پوچھوگے کہ وہ لوگ کس قسم کے ہوتے ہیں؟۔ یار بڑے گھن چکر ہو۔ اچھا تم ہی بتاؤ کہ ان لوگوں کو کیسا ہونا چاہیے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ سانولے ہیں۔ اور اہل رومانیہ بھی انہی کے عقائد کو تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن بلغاریہ والے بھی سیاہ نسل ہونے کے باوجود ہم سے کوئی مذہبی اختلاف نہیں رکھتے۔ اب رہے یونانی سو وہ اور ترک قومی اعتبار سے ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔"

میں نے محسوس کیا کہ وہ دل کھول کر تمام باتیں نہیں بیان کر رہا۔ کوئی نہ کوئی راز ضرور تھا جس کی پردہ داری کی جا رہی تھی۔ رسالوں میں شائع ہونے والی تصویریں دیکھ کر میں نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ

یونان کا صدر مقام ایتھنز ہے جو نہایت قدیم ہونے کے ساتھ ساتھ خوبصورت شہر ہے۔ لیکن لیکوف نے حسب عادت اسے بھی تسلیم نہیں کیا۔ کیونکہ ہر بات کی تردید کرنا بڑی حد تک اس کی فطرت میں داخل ہوگیا تھا۔

"عزیز دوست! تم لوگوں کے بہکائے میں آگئے۔ روئے زمین پر کسی جگہ کا نام ایتھنز نہیں ہے۔ البتہ ایک مقام ایتھون ضرور ہے۔ جو شہر ہونے کے بجائے محض ایک پہاڑی ہے۔ اور خانقاہ کی وجہ سے مشہور ہے۔ عرف عام میں اسے ایتھون کی مقدس پہاڑی کہتے ہیں۔ اللہ بخشے ہمارے بڑے میاں اس کی تصویریں بیچا کرتے تھے۔ شاید تم نے کبھی نام بھی نہ سُنا ہوگا ایک شہر بلگوروڈ ہے جو دریائے دونائی کے کنارے واقع ہے۔ ظاہر ہیں شان و شوکت کے اعتبار سے وہ ہوبہو یروسلاف یا نجنی جیسا ہے۔ ان شہروں میں کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں۔ البتہ گانو۔ لیکن یہ موضوع ہی دوسرا ہے۔ رہیں عورتیں سو ان کو حسین جادوگرنیاں کہا جائے تو زیادہ موزوں ہے۔ خود میں بھی ایک کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہوکر رہ گیا۔ بھلا سا نام تھا اس کا۔ اس وقت یاد نہیں آرہا۔"

پسینے سے شرابور چہرے کو اس نے ہتیلی سے اس زور سے ملا کہ ڈاڑھی کے سخت بال چٹخنے لگے۔ گلے کی کسی گہرائی میں ہنسی کی آواز اس طرح پھنسی جیسے ڈھول پر غلاف چڑھا دیا گیا ہو۔

بعض دفعہ انسان کی یادداشت کو نجانے کیا ہوجاتا ہے۔ اور اس وقت ہم دونوں — ہاں کچھ کچھ یاد آرہا ہے۔ وہ خدا حافظ کہتے ہوئے کس بری طرح روئی تھی اور مجھ سے بھی ضبط نہ ہوسکا تھا۔ خیر۔ بہر حال۔"

اب اس نے نہایت اطمینان سے مجھے نصیحت کرنی شروع کی کہ عورت سے کیسے برتاؤ کرنا چاہیے۔

ہم عرشے کے قریب بیٹھے تھے اور خوشگوار چاندنی رات ہماری قدمبوسی میں مصروف تھی۔ کائنات کا ہر ذرہ نور وضیا میں ڈوبا ہوا تھا۔ لیکن پانی کی چادریوں چمک رہی تھی کہ ساحل سے پرے پھیلے ہوئے مرغزار دھندلے نظر آرہے تھے۔ آسمان پر سنہری شمعیں جھلملا رہی تھیں۔ یہ وہ ستارے تھے جن کو زمین کی قوتِ کشش نے تسخیر کر رکھا تھا۔ ہر چیز میں آثار حیات تھے اور سچ پوچھیے تو حیات حرکت کا نام ہے۔ اس لطیف مگر روح فرسا سناٹے میں ایک طرف سے دل سوز آواز سُنائی دی:

"آہ! ہم نے ایک دوسرے کا دامن چھوڑ دیا اور ہمیشہ کے لیے جُدا ہوگئے"

لیکوف سے کہانیاں سُننا محض تضیع اوقات تھا لیکن ان سے طبیعت نہیں اُکتاتی تھی۔ کیونکہ وہ سیدھی سادی زندگی کی تصویر ہوتی تھیں ان میں کسی قسم کا تصنع یا چھچھورا پن نہیں ہوتا تھا۔ چاند آسمان پر عریاں لاش کی طرح معلوم دیتا تھا اور نہ جانے کیوں میری طبیعت میں ایک عجیب قسم کا جنون پیدا ہو چلا تھا۔ مجھے ان دو چیزوں کی یاد ستانے لگی جن کو حاصل زندگی سمجھتا ہوں۔ ملکۂ حُسن اور اس کے سُنائے ہوئے اشعار جن کو حافظے کی لوح سے مٹا دینا غیر ممکن ہے۔

حُسن گرچہ بے نیازِ کیف نغمہ ہے ولے
گیت کے پردوں میں پنہاں حسن کی تصویر ہے

اس افسردگی کو دور کرنے کے لیے جس کی خواب آگیں کیفیات ہم پر

مسلط تھیں میں نے لیکوف کو دوبارہ جھنجھوڑ ڈالا اور ذاتی مشاہدے کے واقعات بیان کرنے کی درخواست کی۔

"تم بھی عجیب طرفہ تماشا ہو۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کو سناؤں کیا۔ کون سی جگہ ہی جہاں میں نے قدم نہیں رکھا اور کون سی چیز ہی جو میری نظر سے نہیں گزری۔ ایک خانقاہ کی بے کیف دنیا اور ایک بزم نشاط کی چہل پہل۔ میں نے امیروں کے ٹھاٹ دیکھے ہیں اور کسانوں کی بے کسی۔ کبھی خوب تر نوالے کھائے اور کبھی کئی کئی وقت کے فاقے سہنے پڑے۔"

رفتہ رفتہ بالکل اس طرح جیسے کوئی ایک پُرخار وادی میں پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا ہو کہ کہیں دامن نہ اُلجھ جائے اس نے ماضی کے دھندلے نقوش سے پردے ہٹانے شروع کیے۔

"ایک دفعہ کا ذکر ہی کہ میں گھوڑا چُرانے کے الزام میں کوتوالی میں بند تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ اب ضرور مجھ کو سائبیریا بھیج دیا جائے گا انہی خیالات میں محو تھا کہ ایک سپاہی کے چیخنے چلانے کی آواز سُنائی دی آتش دان کا دھنواں اس کے نئے مکان میں بھر گیا تھا اور یہی اس کی برہمی کا باعث تھا میں نے اس کو مخاطب کرکے کہا۔ "حضور! اگر حکم ہو تو اس مصیبت کو دور کردوں"۔ اس نے میری بات کاٹ کر بڑبڑاتے ہوئے کہا" بڑے بڑے کاریگر اس خرابی کو دور نہ کرسکے۔ ان کے مقابلے میں تیری کیا حقیقت ہی"۔ میں نے پھر جرأت کرکے کہا" کیا مضائقہ ہی، اکثر دیکھنے میں آیا ہی کہ چوہے بلیوں کے کان کتر دیتے ہیں" میں نے محسوس کیا کہ اس وقت میری ہر ہر رگ میں ایک نئی امنگ پیدا

ہو گئی ہی اور سائبیریا جانے کا خوف کچھ دیر کے لیے دل سے محو ہو کر کہیں فضا میں گم ہو گیا ہی۔ اس نے کہا۔ "اچھی بات ہی کوشش کر دیکھو۔ لیکن اگر زیادہ دھنواں نکلنے لگا تو مارتے مارتے ہڈی پسلی ایک کر دوں گا۔" میں نے صرف دو دن میں چولھے کو ازسرِ نو درست کر دیا۔ سپاہی میری کاریگری دیکھ حیران رہ گیا۔ اس نے چلا کر کہا: "ارے بے وقوف۔ کوڑھ مغز! تو کام کاج میں اس قدر ہوشیار ہی پھر بھی چوری چکاری سے باز نہیں آتا۔ آخر بات کیا ہی؟" میں نے جواب دیا۔ "سرکار! وہ تو محض دل لگی تھی۔" "ہاں، ہاں میں تو جانتا ہوں کہ وہ دل لگی تھی لیکن تیری حالت پر ترس آتا ہی۔ تو قابلِ رحم ہی۔" بھلا سوچنے کی بات ہی۔ ایک سپاہی اپنے فرائض انجام دینے میں کوتاہی نہیں کرتا اور میری حالت پر ترس بھی کھاتا ہی۔" "اچھا پھر اس کے بعد کیا ہوُا؟" میں نے دریافت کیا۔

"ہوتا کیا۔ کچھ بھی نہیں۔ بس اس کو میرے ساتھ ہمدردی تھی۔ میری حالت پر ترس کھاتا تھا۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔"

"تمھاری حالت پر رحم کھانے سے ہوتا بھی کیا ہی۔ تم ایک پتھر کی طرح بے حس ہو۔"

لیکوف ہنستے ہنستے لوٹ گیا۔

"مسخرا کہیں کا۔ تو مجھے پتھر سمجھتا ہی! لیکن خیر لوگوں کو پتھروں سے بھی ہمدردی ہو جاتی ہی۔ کیونکہ پتھر بھی ایک کارآمد چیز ہی۔ کچھ نہیں تو سڑکیں بنانے میں کام آجاتا ہی۔ لوگوں کو چاہیے کہ ہر چیز سے ہمدردی کا اظہار کریں۔ دُنیا کی کوئی چیز خواہ مخواہ دائرۂ وجود میں نہیں آئی۔ مٹی کی مثال لو۔ ہری ہری گھاس اسی میں اُگتی ہی۔"

اس قسم کی باتیں سن سن کر میں نے اندازہ لگالیا کہ لیکوف کا علم اور مشاہدہ اتنا وسیع ہے کہ میرا خیال تک اس کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا۔

ایک روز میں نے پوچھا ”باورچی کے متعلق تمھاری کیا رائے ہے؟“

اس نے خاموشی سے جواب دیا ”باورچی کے متعلق اور وہ بھی میری رائے؟ - بھلا اس کے متعلق کوئی رائے قائم کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے“

اس کا جواب بالکل معقول تھا۔ ایوآن بذاتِ خود اس درجہ نکتہ شناس اور معاملہ فہم تھا کہ وہ دوسروں کی رائے کی پروا ہی نہیں کرتا تھا۔ البتہ اس کے کردار میں ایک دلچسپ خصوصیت تھی اور وہ یہ کہ لیکوف کو بہت چاہتا تھا۔ وہ ہر وقت اس کو ڈانٹتا ڈپٹتا رہتا لیکن چاے کے وقت ہمیشہ گھسیٹ کر اپنے ساتھ لے جاتا۔

ایک روز اس نے لیکوف سے کہا ”اگر اتفاق سے تم میرے ماتحت ہوتے اور میں تمھارا حاکم ہوتا تو ایسا اُدھیڑتا کہ سانس لینے کی فرصت نہ ملتی۔ تم جیسا کاہل آرام طلب انسان ہفتے کے ساتوں دن پٹتا رہے تو ٹھیک رہتا ہے“

لیکوف نے بڑی متانت سے جواب دیا ”ہفتے کے ساتوں دن؟ - یہ تو بہت زیادہ ہے“

اس طرح سخت سست کہتے رہنے کے باوجود باورچی نجانے کیوں ہر قسم کی بچی کھچی چیزوں سے اس کے پیٹ کا گڑھا بھرتا رہتا تھا کھانے کی کوئی چیز دیتے ہوئے وہ ناک بھوں چڑھا کر کہتا ”لے نھورلے اسے“

لیکوف مزے سے لے کر اسے چٹ کر جاتا اور کہتا۔

"ایوان! میرا یہ تمام دم خم صرف تمھاری جوتیوں کا صدقہ ہی۔"

"لیکن ارے حرام خور! یہ تو بتا کہ اس دم خم سے تجھے کیا فائدہ پہنچ رہا ہی۔"

"کیا فائدہ پہنچ رہا ہی؟ بہت خوب۔ کیا اس طرح میں بہت عرصے تک زندہ نہیں رہ سکوں گا۔"

"تیری زندگی ایک حرفِ غلط کی طرح بیکار محض ہی۔ تو زندہ رہ کر بھی کیا کرے گا؟"

"دنیا میں اور بھی بہت سے بیکار لوگ رہتے ہیں۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہی کہ صرف زندہ رہنا ہی بذاتِ خود کیا کم دلچسپ چیز ہی۔ میرے دوست! بسر کیے جانا بہت پیارا مشغلہ ہی۔

"گھامڑ کہیں کا۔"

"جی۔ کیا کہا؟"

"گھا۔ مڑ۔"

"بات کرنے کا طریقہ سیکھو۔" لیکوف نے برہم ہو کر کہا اور باورچی مجھ سے بولا "سنا تم نے! ہمارا خون تک جلتے جلتے سیاہ ہو گیا۔ اس جہنمی آگ کی تپش سے جو ہر وقت چولھے میں روشن رہتی ہی۔ ہڈیوں کا مغز تک سلک اٹھا ہی۔ چربی پگل کر بہ نکلتی ہی اور انھیں دیکھو۔ یہ حرام کے لقمے کھا کھا کر سوٗر کی طرح پھول رہے ہیں۔"

"ہر شخص اپنی قسمت خود بناتا بگاڑتا ہی۔" لیکوف نے الفاظ کو چبا چبا کر کہا:۔

بھٹیوں کے اندر کوئلے جھونکنا لیکوف کے ذمّے تھا اور میں دعوے سے کہ سکتا ہوں کہ چولھے کے سامنے کھڑے ہونے کے مقابلے میں یہ کام زیادہ مشکل تھا اور اس میں آگ کی تپش بھی زیادہ محسوس ہوتی تھی مجھے بارہا رات کے وقت لیکوف کے ساتھ مل کر یہ کام کرنا پڑا ہے۔ اس لیے کافی تجربہ ہے۔ لیکن تعجب تو اس بات کا ہے کہ وہ باورچی کے سامنے کبھی حرف شکایت زبان پر نہیں لایا۔ شاید اس لیے کہ اسے اپنے کام کے متعلق کچھ مغالطہ تھا۔

وہ سب اسے بُری طرح جھاڑتے رہتے۔ نہ صرف کپتان اور انجنیر بلکہ معمولی بیلدار تک، حالانکہ وہ جانتے تھے کہ یہ کام چور نہیں ہے۔ مجھے رہ رہ کر ان باتوں پر تعجب ہوتا تھا۔ آخر یہ لوگ صحیح طریقے سے اس کی خدمات کا اعتراف کیوں نہیں کرتے؟ اس کے ساتھ دوسرے کوئلہ جھونکنے والوں کا طرز عمل نسبتاً بہت اچھا تھا۔ مگر اس کی بے تکی باتوں کا سب مذاق اُڑاتے تھے۔

میں نے ان سے پوچھا۔ "لیکوف کے متعلق تمھاری کیا رائے ہے؟ کیا وہ معقول آدمی ہے؟"

"لیکوف بڑا مرد معقول ہے۔ سب سے بڑی خوبی یہ کہ تم اسے کبھی برہم نہیں کر سکتے۔ اگر اس کے تن بدن میں آگ لگا دو تب بھی اس کا مزاج گرم نہ ہو سکے گا۔"

اس کی محنت و جانفشانی کا کیا کہنا۔ اور خوراک بھی اسی اعتبار سے بڑھی ہوئی تھی۔ جانوروں کی طرح اپنا پیٹ بھرتا اور رات کو برائے نام سوتا تھا۔ بارہا میں نے دیکھا کہ اپنی ڈیوٹی ختم کر کے وہ

سیدھا عرشے پر چلا گیا اور ساری رات مسافروں کے ساتھ غپ شپ لڑانے اور تاش کھیلنے میں بسر کر دی۔ اس طرح کہ پسینے میں شرابور میلا کچیلا لباس جوں کا توں جسم پر منڈھا رہا۔

میری نظر میں وہ ایک سربستہ راز تھا جس کی عقدہ کشائی کے بعد بہت سی حقیقتیں بے نقاب ہو سکتی تھیں۔ اور میں اس کوشش میں لگا رہتا کہ کسی نہ کسی طرح اس معمے کا حل معلوم کر لوں۔

وہ اپنی گھن دار بھنوؤں کے نیچے چھپی ہوئی آنکھوں کو ذرا مٹکا کر مجھ سے پوچھتا:

"جانِ برادر! آخر تم کس جستجو میں سرگرداں رہتے ہو۔ خدا کی قسم میں آج تک یہ بات نہیں سمجھ سکا۔ اس میں شک نہیں کہ میں نے تمام جہان کی خاک چھانی ہے۔ لیکن تم اس کی روئداد سن کر کیا کرو گے۔ عجب طرفہ تماشا ہے۔ اس کی بجائے تم ایک واقعہ سن لو جو حقیقتاً خود مجھ پر گزر چکا ہے۔"

اور اس نے بیان کیا کہ کس طرح دورانِ سفر میں وہ ایک شہر میں مقیم تھا۔ وہیں ایک نوجوان وکیل صاحب مع اپنی جرمن بیوی کے قیام پزیر تھے۔ بیوی حسین و جمیل، تندرست لیکن بے اولاد تھی۔ وکیل صاحب دق کے موذی مرض میں مبتلا تھے اور بیوی صاحبہ ایک سوداگر بچے سے دل لگا بیٹھی تھیں۔ سوداگر خود بھی شادی شدہ تھا۔ اس کی بیوی بھی حسین تھی اور تین بچوں کی ماں تھی۔ جب اسے معلوم ہوا کہ جرمن عورت اس پر فریفتہ ہو گئی ہے تو اس نے سوچا کہ لاؤ ذرا دل لگی کر لیں۔ اس نے عورت سے کہا کہ آدھی رات کو باغ میں آ کر ملو۔ اور ساتھ ہی اپنے دو دوستوں کو بلا بھیجا۔ جب وہ آ گئے تو ان کو جھاڑیوں کے پیچھے چھپا دیا۔ عورت کو

آتا دیکھ کر اس نے آہستہ سے ہدایت کی کہ اچھی طرح دبک کر بیٹھ جاؤ اور عورت سے کہا۔ "بیگم صاحبہ! میں تمھارے کسی مصرف کا نہیں ہوں۔ کیونکہ میری شادی ہو چکی ہے۔ البتہ میرے دو دوست آپ کی خدمت کے لیے یہاں موجود ہیں۔ ایک رنڈوا ہے اور دوسرا کنوارا" اُف! خدا کی پناہ! جرمن عورت غصّے کے مارے آگ بگولا ہو گئی۔ اس زور کا تھپّڑ مارا کہ سوداگر صاحب لڑھکتے نظر آئے۔ اور پھر اونچی ایڑی کا جوتا اتار کر وہ ٹھکائی کی کہ گنجی چندیا کے رہے سہے دو چار بال بھی صاف ہو گئے میں اس عورت کے ساتھ آیا تھا۔ کیونکہ میں وکیل صاحب کا ملازم تھا۔ جب گڑبڑ کی آواز سنی تو میں نے باغ کی جالی میں سے جھانک کر دیکھا۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ محبت کی داد کس طرح دی جا رہی ہے۔ عین اس وقت سوداگر کے دوست اس تنہا عورت پر جھپٹ پڑے۔ کبھی اس کے بالوں کو کھسوٹا اور کبھی اٹھا کر زمین پر پٹک دیا۔ میں نے دوڑ کر بڑی مشکل سے بیچ بچاؤ کیا اور عورت کو واپس لانے لگا۔ انھوں نے مجھ پر اینٹ پتھر کی بوچھار کی لیکن میں نے اس کی خاطر سب کچھ برداشت کر لیا۔ دفورِ غم سے اس کا بُرا حال تھا۔ رنج سے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ مجھ سے کہنے لگی "کچھ بھی ہو خاوند کے مرتے ہی میں اپنے رشتہ داروں کے پاس جرمنی چلی جاؤں گی" اور ہوا بھی یہی۔ جونہی وکیل صاحب کی آنکھ بند ہوئی اس نے اپنی راہ لی۔ وہ جتنی نیک طبیعت تھی اتنی ہی زیادہ چالاک تھی اور وکیل صاحب بھی کچھ کم رحم دل نہیں تھے۔ خدا ان کو غریقِ رحمت کرے"

بہت دیر تک میری سمجھ میں ہی نہ آیا کہ آخر اس کہانی کا سر پیر

کیا ہے اور مجھے کیوں سنائی گئی ہے۔ میں خاموشی کے ساتھ سوچتا رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ ان بہت سے واقعات میں سے ایک معمولی واقعہ ہے جو آئے دن مشاہدے میں آتے رہتے ہیں۔ دردناک ہیں لیکن اس میں کونسی خصوصیت تھی۔ یہ میں نہ سمجھ سکا۔

لیکوف نے پوچھا۔ "تمھیں یہ کہانی پسند ہے؟"

مجھے ٹھیک یاد نہیں۔ تاہم میں نے مبہم الفاظ میں چند اعتراض کیے جس کا جواب اس نے بڑی سنجیدگی سے دیا۔

"آسودہ حال لوگوں کے لیے اپنی دلچسپی کا سامان پیدا کر لینا مشکل نہیں۔ لیکن بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ نتیجہ خاطرخواہ برآمد نہیں ہوتا۔ اُنھوں نے کسی کے ساتھ چھیڑ خانی کا فیصلہ کیا، لیکن پانسا اُلٹ گیا۔ اس میں شک نہیں کہ سوداگر پیشہ لوگ بہت سمجھ دار ہوتے ہیں۔ اسی طرح تجارت کے لیے کچھ کم چالاکی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن انسان جتنا زیادہ چالاک ہوتا ہے اتنی ہی اس کی زندگی بے کیف و بے رنگ گزرتی ہے اور اس کا جی چاہتا ہے کہ کسی کے ساتھ ہنسی مذاق کیا جائے۔"

جہاز سے پرے تک دریا کا پانی پورے جوش کے ساتھ بل کھا رہا تھا۔ کف آلود لہروں کا شور کان پڑی آواز نہ سُننے دیتا تھا اور تاریکی کے پردے میں چھپا ہوا ساحل جہاز کی مخالف سمت میں تیزی سے بھاگ رہا تھا۔ عرشے پر پڑے ہوئے مسافر بے فکری سے خرّاٹے لے رہے تھے۔ ان سوئی ہوئی زندہ لاشوں کو لانگتی پھلانگتی، تپائیوں سے ٹکراتی ایک طویل عورت پُرانے زمانے کا تبرک، سیاہ لباس پہنے سر برہنہ کیے خاموشی کے ساتھ ہماری طرف بڑھتی چلی آئی۔ لیکوف نے مجھے ٹھوکا دے کر

چلکے سے کہا:

"معلوم ہوتا ہی کسی مصیبت میں گرفتار ہی۔"

اور میں نے ایسا محسوس کیا کہ دوسروں کو پریشان دیکھ کر اسے خوشی ہوتی ہی۔ اس نے بہت سے قصے سُنائے اور میں نے ان کو بڑی دلچسپی کے ساتھ سُنا۔ وہ قصے مجھے آج تک اچھی طرح یاد ہیں۔ سب کے سب دردناک، دل سوز۔ کسی ایک میں بھی ہنسی مذاق کی جھلک تک نہیں تھی۔ اس کا اندازِ بیان بھی نرالا تھا۔ خاموش و پرسکون۔ کتاب کا مطالعہ کرتے وقت بھی اتنی تنہائی محسوس نہیں ہوتی۔ کتاب پڑھتے ہوئے میں مصنف کے اصل جذبات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا غیظ و غضب، مسرت و شادمانی، رنج و غم، ہنسی مذاق۔ یہ سب کیفیات مجھ پر طاری ہوجاتی ہیں۔ لیکوف اس اعتبار سے بالکل بے حس تھا۔ اس کے دل میں کبھی جوش پیدا نہ ہوتا۔ وہ تمام واقعات کو اس طرح بیان کر دیتا گویا کسی عدالت میں مقدمے کی کارروائی جاری ہی۔ گواہ، ملزم، مستغیث اور جج اپنا اپنا خیال ظاہر کر رہے ہیں اور کسی کو اتنی اجازت نہیں کہ الفاظ پر زور دے کر بیان میں قوت پیدا کردیں۔ اس کی بے حسی پر مجھے کبھی غصہ آتا اور کبھی افسوس ہوتا لیکن رفتہ رفتہ ایک قسم کی برہمی پیدا ہوتی چلی گئی۔

زندگی اس کی نگاہ کے سامنے تندور سے بلند ہونے والے شعلے کی طرح خود کو جلاکر بھسم کر رہی تھی۔ جب کبھی وہ باورچی خانے میں آتش دان کے پاس کھڑے ہوکر اپنے جھلسے ہوئے بدنما ہاتھوں سے تندور کے اُس پرزے کو حرکت دیتا جس سے شعلے میں کمی بیشی ہوجاتی ہی تو ایسا معلوم ہوتا گویا وہ خود اپنی زندگی میں نشیب و فراز پیدا کر رہا ہی۔

"کیا اس قسم کی باتوں سے تمھیں نقصان نہیں پہنچ رہا؟"

"مجھے بھلا کون نقصان پہنچا سکتا ہے۔ میں بہت طاقتور ہوں میرے مُکّے کی ضرب کا تم نے کبھی اندازہ نہیں لگایا۔"

"میرا اشارہ گھونسے بازی کی طرف نہیں ہے۔ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا تمھاری روح بے چین نہیں رہتی؟"

"روح کو صدمہ نہیں پہنچتا۔ اسے کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچ سکتی۔ روح پر انسانی حوادث اور بیرونی صدمات کا کبھی اثر نہیں پڑتا۔

جہاز کے مسافر ملاح اور ہر کس و ناکس ہر وقت ہر گھڑی روح کے متعلق کچھ نہ کچھ خیال ظاہر کرتے رہتے تھے۔ شاید وہ اپنے کام کاج، آل اولاد، گھر بار اور کھیت کھلیان کو بھی اس قدر موضوعِ بحث نہ بناتے ہوں گے جتنا کہ روح کی حقیقتوں پر بحث کرنے کے عادی تھے۔ "روح" کا لفظ تکیہ کلام ہو گیا تھا۔ وہ زندگی اور زندگی کی چہل پہل کو بھی اسی سے تعبیر کرتے تھے۔

اس سہ حرفی لفظ کو بے موقع و بے محل ہر شخص کی زبان سے سنتے سنتے میرے کان پک گئے تھے۔ جہاں کسی نے اس کا نام لیا اور مجھے کوفت ہونے لگی اور جب کبھی کسان لوگ آپس میں لڑتے جھگڑتے وقت گالیاں بکتے تو میرا دل لرز جاتا کہ یہ اپنی روح کو کس طرح ناپاک کر رہے ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ نانی اماں روح کا ذکر کرتے وقت بڑی احتیاط برتتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ محبت، حسن اور مسرت کا انحصار صرف روح کی تازگی پر ہے اس لیے وہ اس کا احترام کرتی تھیں۔ میرا عقیدہ تھا کہ جب کوئی نیک آدمی مر جاتا ہے تو سفید پروں والے فرشتے اس کی

روح کو جسم سے نکال کر نانی اماں کے خدا کے سامنے لے جاتے ہیں۔ اور وہ اس روح کے ساتھ بہت پیار اور محبت سے پیش آتا ہی۔

ای میری پیاری پاکیزہ روح! مجھے افسوس ہی کہ تو نے دنیا میں بہت سی مصیبتیں جھیلیں اور بڑے بڑے دُکھ برداشت کیے" اور اس کے بعد نیک خدا اس روح کو فرشتوں کے چند سفید پر توڑ کر دے دیتا ہی تاکہ انھیں بازو پر لگاکر وہ جنّت کی فضا میں پرواز کر جائے۔

اس اعتبار سے لیکوف نانی اماں کا بھائی تھا۔ روح کا احترام کرنے میں وہ بھی بڑی احتیاط برتتا۔ جب لوگ اسے گالیاں دیتے تو وہ سُن کر پی جاتا اور اپنی زبان خراب نہ کرتا۔ روح کی حقیقتوں پر بحث ہوتی تب بھی وہ خاموشی کے ساتھ اپنا سر جھکا کر الگ ہو جاتا۔ میرے سوالوں پر کہ روح کس قسم کی چیز ہی، اس نے جواب دیا۔

"روح دراصل خدا کا سانس ہی"

اس جواب سے میری تسلی نہ ہوئی تو میں نے مزید سوالات کی بھرمار شروع کر دی اور آخر کار وہ تنگ آ کر کہنے لگا:

"جانِ برادر! بھلا ہم کس گنتی میں ہیں جب کہ روح کی اصل حقیقت پادری لوگ بھی نہیں سمجھ سکتے۔ کیونکہ وہ ایک سربستہ راز ہی جس تک عقل انسانی کی رسائی ناممکن ہی"

وہ میرے خیالات پر چھا جانا چاہتا اور اس کوشش میں رہتا کہ میں کسی نہ کسی طرح اس کی بات مان لوں۔ سمجھ لوں کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہی ٹھیک ہی لیکن وہ اپنی کوششوں میں کبھی کامیاب نہ ہو سکا۔

داروغہ کی بیوی اس قدر لطف و عنایات کے ساتھ پیش آتی کہ مجھے

کچھ شبہہ سا ہونے لگتا۔ صبح کے وقت منہ دھونے کا گرم پانی اس کے پاس لے جانا میرا معمول تھا۔ حالانکہ میں اس کا پابند نہیں تھا۔ یہ ذمہ داری ایک دوسری خادمہ کے سپرد تھی، جو بڑی ہنس مکھ، شوخ اور نوجوان تھی۔ جب میں اس کی تنگ و تاریک کوٹھری میں کھڑا ہوتا تو بڑی کوفت ہوتی۔ اس کا بدن کمر تک کھلا رہتا تھا اور جب میری نظر اس کے لحیم شحیم مٹیلے جسم پر پڑتی تو معلوم ہوتا کہ کسی نے بڑا سا اُپلا تھاپ کر رکھ دیا ہے۔ معاً مجھے نازک اندام سانولی سلونی ملکۂ حسن یاد آجاتی اور اس تقابل سے اور زیادہ کوفت ہونے لگتی وہ اس اثنا میں برابر بولتی رہتی۔ مجھے دھمکانی شکایتیں کرتی اور کبھی کبھی ہنسی مذاق بھی کرتی۔

میں نے سوچنے کی کوشش تو بہت کی مگر اس کی باتوں کا مطلب کبھی نہ سمجھ سکا۔ وہ اس قدر گری ہوئی اور شرمناک ہوتی تھیں کہ بیان نہیں کی جاسکتیں۔ تاہم مجھے زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ میرے رہنے کی کوٹھری اس سے دور تھی اور یوں بھی میں جہاز کے کسی معاملے میں دخل نہ دیتا تھا۔ لیکوف کی ہستی میری علمی دنیا میں ایک وسیع چٹان کی مانند حائل تھی جس کی اوٹ میں دنیا کے تمام ہنگامے میری نگاہوں سے اوجھل رہتے تھے۔ رات دن کے چوبیں گھنٹوں میں وہاں جو کچھ ہوتا بالکل اس طرح محو ہو جاتا گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔

کبھی کبھی خوابِ بیداری میں خادمہ کے الفاظ مجھے گونجتے ہوئے سنائی دیتے۔ گویا وہ مجھ سے ہنس ہنس کر کہہ رہی ہے "ارے بے وقوف! داروغہ کی بیوی تجھ سے محبت کرتی ہے۔ ذرا آنکھیں کھول اور بہتی گنگا میں ہاتھ دھولے۔ یہ مزے پھر نصیب نہیں ہو سکتے۔"

اور صرف وہی مجھ سے مذاق نہیں کرتی تھی بلکہ دوسرے خدمت گار بھی مجھے چھیڑتے تھے۔ وہ داروغہ کی بیوی کی تمام کمزوریوں سے واقف تھے۔ ایک روز باورچی تیوری بدل کر کہنے لگا:۔

"اس ہرجائی نے ہر قسم کی چیز چکھی، ہرجائے کے مزے لیے اور اب چاہتی ہے کہ چوزوں کا شوربہ بھی ہضم کر جائے۔ یہ چیز کسے نہیں بھاتی۔ بیٹا پیشکوف! ذرا آنکھیں کھول کر اس میدان میں قدم رکھنا۔"

اور لیکوف نے بھی بزرگانہ طور پر نصیحت کی:

"بالکل ٹھیک ہے، اگر تم ذرا اور بڑے ہوتے تو میری نصیحت کا رنگ بالکل مختلف ہوتا لیکن اس عمر میں مناسب یہی ہے کہ تم اپنے آپ کو بالکل سنبھالے رہو۔"

"بکو مت جی!" میں نے بگڑ کر کہا "اس قسم کی باتوں سے مجھے اُلجھن ہوتی ہے۔"

"اس میں کیا شک ہے۔"

لیکن اس کے بعد فوراً ہی اپنے گھنے بالوں سے ذرا کھیلتے ہوئے اس نے الفاظ پر زور دے دے کر معنی خیز لہجے میں کہا۔

"یہ سب سہی لیکن اس موضوع پر غور کرتے وقت عورت کے جذبات کا لحاظ بھی رکھنا پڑے گا۔ وہ بڑی بے چارگی اور کس مپرسی کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ انسانی آرزوؤں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ ایک کتے کی بھی خواہش ہوتی ہے کہ کوئی پیار محبت سے اس پر ہاتھ پھیرے۔ جس طرح پودے ہوا کی نمی سے اپنی پیاس بجھانا چاہتے ہیں، عورت ذات بھی چاؤ چونچلے اور لاڈ پیار کی بھوکی ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ

اسے ایسی باتوں سے شرم آنی چاہیے لیکن وہ کر بھی کیا سکتی ہے۔ وہ بالکل مجبور ہے۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گھورتے ہوئے کہا:

"اچھا تو کیا اس کے معنے یہ ہوئے کہ تم اس کی طرف مائل ہو۔"

"مجھے اس سے کیا واسطہ۔ کیا وہ میری ماں ہے اگر ہو بھی تو ـــ لیکن تم بھی عجب طرفہ تماشا ہو۔"

اس نے ایک خفیف قہقہہ اس طرح لگایا جیسے کسی پھٹے ہوئے نقارے پر چوب پر جائے۔

بعض دفعہ جب میں نظر ملا کر اس کی طرف دیکھتا تو بالکل ایسا محسوس ہوتا گویا میں ایک اتھاہ سمندر میں ڈوبا چلا جارہا ہوں جہاں پانی کی بجائے صرف نور ہی نور ہے۔

"لیکوف! ہر شخص کی شادی ہو چکی لیکن تم ابھی کنوارے ہو۔ آخر تم ازدواجی زندگی کیوں پسند نہیں کرتے؟"

"کیا بتاؤں؟ میں بہت سی حسین عورتوں کا منظورِ نظر رہا۔ خدا کا شکر ہے۔ لیکن کسی سے دل نہیں لگایا۔ جب کسی کی شادی ہو جاتی ہے تو اسے ایک جگہ پابند ہو کر رہنا پڑتا ہے۔ گھر بار سنبھالنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں ٹھہرا غریب آدمی۔ ذرا سی زمین ہے، زمین کا ایک معمولی ٹکڑا اور فی الحال اسے بھی چچا جان تھیائے بیٹھے ہیں۔ جب میرا چھوٹا بھائی فوج میں داخل ہونے کے بعد سپاہی بن کر واپس آیا تو چچا سے جھگڑا پڑا۔ سر پھاڑ دینے کے جرم میں وہ معاملہ عدالت تک پہنچا۔ ذرا سی بات کو خونی مقدمے کی اہمیت دے دی گئی اور انجام کار میرے بھائی

ڈیڑھ سال کے لیے جیل جانا پڑا۔ تمھیں کیا معلوم صاحبزادے! جب کوئی قیدی جیل کی فضا سے باہر نکلتا ہی تو اس کی نگاہ کے سامنے صرف ایک ہی راستہ ہوتا ہی جو پھر گھوم کر دوبارہ جیل ہی کی طرف آجاتا ہی۔ اس کی بیوی کس قدر حسین اور نوجوان تھی۔ لیکن اب ان گزرے ہوئے واقعات کی یاد تازہ کرنے سے کیا حاصل؟ جب انسان شادی کرے تو اس کے لیے لازم ہی کہ وہ ہر چیز پر حکومت کرنے کا اہل ہو۔ لیکن ایک سپاہی تو اپنی بیوی تک کا حاکم نہیں بن سکتا۔"

"تم نے کبھی خدا کی عبادت بھی کی؟"

"عجب طرفہ تماشا ہو — عبادت! ہاں کی ہی"

"کس قسم کی؟"

"ہر قسم کی"

"کیا دعا مانگتے ہو؟"

"مجھے رات کی دعائیں آتی ہیں" میں خاموشی سے کہتا "اے آسمانی باپ! جب تک میں زندہ ہوں، تیرے لطف و کرم کا مجھ پر سایہ رہے اور جب مرجاؤں تو روح کو شانتی نصیب ہو۔ مجھے محفوظ رکھ — میرے آقا! — ہر قسم کی بیماری سے — اور اسی قسم کی بہت سی باتیں"

"کون سی باتیں"

"بے شمار جو اُس وقت یاد آجائیں۔ انسان اپنی زبان سے کہے یا نہ کہے جو کچھ دل میں ہوتا ہی آسمانی باپ اچھی طرح جانتا ہی"

میرے ساتھ اس کا طرزِ عمل ہمدردانہ تھا مگر حد درجہ حیرت انگیز

ہر وقت میرے دل میں چٹیک سی لگی رہتی تھی جس طرح ایک ننھا شوخ طرار بچّہ ان باتوں کو معلوم کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے جو اسے نہیں آتیں۔ بعض دفعہ جب رات کے سناٹے میں ہم اکٹھے بیٹھتے اور پیاز کی بو فضا میں پھیلی ہوتی (کیونکہ وہ کچی پیاز کو بالکل سیب اور ناشپاتی کی طرح چبانے کا عادی تھا) تو وہ یکایک مجھے مخاطب کرکے کہتا:

"آؤ میاں صاحبزادے! کچھ شعر و شاعری سے دل بہلائیں"

مجھے بہت سی نظمیں زبانی یاد تھیں۔ ان کے علاوہ میرے پاس ایک بیاض تھی جس میں صدہا میرے دل پسند اشعار قلم بند تھے۔ میں کوئی منظوم افسانہ پڑھنا شروع کر دیتا اور وہ ہمہ تن گوش بالکل بے حس و حرکت ہو کر بیٹھ جاتا۔ احتیاطاً سانس تک نہ لیتا اور ختم ہو جانے کے بعد دل دوز لہجے میں کہتا:

"کتنی اچھی کہانی ہے۔ لطافت اور موسیقی سے لبریز۔ کیا یہ خود تمہارا کلام ہے۔ میں ایک شاعر سے ملا ہوں۔ اس کا نام پشکن ہے"

"لیکن عرصہ ہوا اس کا تو انتقال بھی ہو چکا"

"ہیں! — وہ کس طرح؟"

میں نے مختصر الفاظ میں وہ قصہ بیان کیا جو ملکۂ حسن نے مجھے سنایا تھا لیکوف خاموشی سے سنتا رہا اور پھر کہنے لگا:

"بہت سے لوگ عورت کے ہاتھوں تباہ ہو گئے"

میں زیادہ تر وہی کہانیاں سناتا جو کتابوں میں پڑھی تھیں۔ وہ ایک معجون مرکب کی طرح میرے دماغ کے پردوں میں گڈمڈ ہو کر رہ گئی تھیں ان کا مخلوط اثر میرے خیالات کی دنیا پر حاوی تھا۔ اور اس طرح ایک طویل

کہانی ذہنی صفحات پر مرتسم ہوگئی تھی۔ جس کا خلاصہ اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ زندگی کا حسن بے چینی اور اضطراب کے عالم میں جذبات کے شعلوں سے جل کر بھسم ہوا جارہا ہے۔ ان کہانیوں میں کیا تھا۔ بہادری کے کارنامے آپس کی لڑائی جھگڑے، زندگی اور موت کے ہنگامے، شریفوں کی بے غیرتیاں، امیروں کے ظلم و ستم، غریبوں کا صبر و سکون، اور اسی قسم کے دوسرے موضوع۔ ان کہانیوں کی تعداد بہت تھی مگر میں کہیں کا قصہ کہیں ملاکر حسب ضرورت اپنی ایک نئی چیز مرتب کر لیتا تھا۔ ایک کہانی کے واقعات میں ردو بدل کرنے کے علاوہ میں نئے لوگوں کے کردار کو بھی کسی قدر بدل ڈالا۔ یہاں تک کہ خود میری زندگی کا عکس اس میں جھلکنے لگا۔ اس کے مطابق میں نانا کے خدا کی طرح بالکل آزاد تھا۔ اپنی مرضی کا مالک اور اپنے افعال کا مختار۔ ان کتابی کہانیوں کے مطالعے سے مجھے سب سے بڑا نقصان یہ پہنچا کہ اصل زندگی کی حقیقتیں میری نگاہوں سے اوجھل ہو کر رہ گئیں۔ زندگی کے اس مہلک زہر کو جو سماج میں تیار ہو کر متعدی امراض کی طرح پھیل رہا تھا۔ میں سمجھنے سے قاصر رہا۔ کتابوں نے بہت سے نقائص کو میری نگاہوں میں بے نقص ٹھہرادیا۔ یہ جان لینے کے بعد کہ لوگ محبت کر کے کس طرح مصیبتیں جھیلتے ہیں میں نے گوارا نہ کیا کہ کسی بدنام گھر کی چار دیواری میں قدم رکھوں۔ لوگوں کو ذلیل اور ابتر حالت میں دیکھ کر ایک قسم کا تنفر ہونے لگتا یا ان کی حالت پر ذرا سا ترس آجاتا۔ ایک کہانی نے مجھے سکھایا کہ انسان سختی سے مذہب کا پابند رہے اور واقعات کے ماتحت کبھی نہ بدلے۔ ایک قصے کے ہیرو نے میرے دل میں امنگ پیدا کی کہ میں خود بھی دنیا میں بڑے کام کروں۔ شاہ ہنری

چہارم کا کردار مجھے سب سے زیادہ پسند تھا اور میرا خیال ہے کہ یہ شاندار گیت شاعر نے صرف اسی کی شان میں لکھا تھا۔

ناولوں میں ہنری چہارم کو ایک ایسے رحم دل انسان کی حیثیت سے پیش کیا ہے جسے نوع انسان سے دلی لگاؤ ہو۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ فرانس میں جو حسین ترین ملک سمجھا جاتا ہے اور سورماؤں اور بہادروں کی دنیا ہے ہر اعتبار سے عظیم الشان ہوگا۔ وہاں امیر و غریب میں کچھ زیادہ تخصیص نہ ہوگی۔ جب میں نے ایک ناول میں پڑھا کہ ہنری کو قتل کر دیا گیا تھا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اور مصنف پر غصہ آنے لگا۔ میں نے لیکوف سے بھی کہا کہ ہنری کی شخصیت ناول نویسوں کے لیے ہمیشہ موضوعِ رومان رہی ہے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ خود اسے بھی فرانس سے بہت دلچسپی تھی۔

جب میں کوئی کہانی سناتا تو وہ کہیں بیچ میں نہ بولتا اور نہ کسی قسم کا سوال کرتا۔ بلکہ خاموشی کے ساتھ سنے جاتا، سر جھکائے، بے حس و حرکت ایک سنگین مورت کی طرح، جس پر جگہ جگہ کائی لگ گئی ہو۔ اگر کسی وجہ سے میں خود بیان کرتے کرتے رک جاتا تو وہ بے تاب ہو کر پوچھتا:۔

"کیا یہی انجام ہے"

"ابھی نہیں"

"تو پھر کیوں رک گئے سنائے جاؤ"

فرانسیسی قوم کا ذکر چھڑ گیا تو اس نے ٹھنڈا سانس لے کر کہا:

"وہ لوگ ایک اچھے دور سے گزر چکے ہیں"

"اس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

"سوچو تو مجھے اور تمھیں آگ کے سامنے جلنا پڑتا ہے۔ وہ خوب مزے اُڑاتے ہیں اور ہمیں محنت کرنی پڑتی ہے گانے اور سیر کرنے کے سوا انھیں کوئی کام نہیں۔ زندگی کس قدر سکون کے ساتھ بسر ہوتی ہے۔"

"لیکن کام تو انھیں بھی کرنا پڑتا تھا۔"

"تمھاری کہانیوں سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی۔" لیکوف نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔ اور میں نے فوراً محسوس کیا کہ بے شک میں نے جتنی کتابیں پڑھیں ان کی کسی ایک کہانی میں بھی ایسا کردار پیش نہیں کیا گیا جس کو محنت و مشقت یا جانفشانی سے کام کرنا پڑا ہو۔

"اچھا اب کچھ دیر کے لیے میں سو جانا چاہتا ہوں۔" لیکوف نے کہا۔ اور جہاں بیٹھا تھا وہیں لیٹ گیا۔ ذرا سی دیر میں وہ پورے اطمینان سے خرّاٹے لے رہا تھا۔

موسم خزاں میں جب درختوں کے پتے زرد پڑ گئے۔ دریا کے دونوں طرف پھیلے ہوے میدانوں پر ارغوانی رنگ چھا گیا اور سورج کی شعاعیں بھی کسی قدر پیلی پڑ گئیں تو لیکوف نے غیر متوقع طور پر جہاز کی ملازمت چھوڑ دی اس نے ایک دن پہلے ہی مجھ سے کہا:

"پرسوں میں اور تم "پرم" میں ہوں گے۔ ہم دونوں حمام میں جائیں گے اور دل بھر کر گرم بھاپ سے غسل کریں گے۔ اس سے فارغ ہو کر تماشے میں جائیں گے۔ وہ گیت اور نغمے کی دنیا ہے۔ بڑی دلچسپی رہتی ہے۔ جب وہ ساز چھیڑتے ہیں تو مجھے بہت لطف آتا ہے۔

سراپولیا کے قریب ایک ہٹا کٹا آدمی جہاز پر چڑھ آیا۔ اس کے گدرائے ہوئے چہرے سے زنانہ پن جھلکتا تھا۔ نہ اس کی ڈاڑھی تھی نہ

مونچھیں ۔ بالکل صفاچٹ میدان تھا ۔ اس کا لمبا گرم جبہ اور لومڑی کے سمور کا کنٹوپ دیکھ کر زیادہ شبہہ ہونے لگتا تھا کہ ہو نہ ہو یہ عورت ہے ۔ زیادہ گرمائی کی خاطر اس نے ایک میز باورچی خانے کے عین قریب بچھوالی ۔ اور چائے لانے کے لیے حکم دیا ۔ چائے سخت گرم تھی اور چونکہ اس نے نہ تو کوٹ کے بٹن کھولے تھے اور نہ ٹوپی اتاری تھی بُری طرح پسینے میں شرابور ہو گیا ۔

اس وقت ہلکی ہلکی بارش بھی ہو رہی تھی اور جب اس شخص نے جیبی رومال نکال کر چہرے کا پسینہ پونچھا تو میں نے محسوس کیا کہ بارش کی رفتار ہلکی پڑ گئی ہے ۔ اور اسی طرح جب دوبارہ اس کو تیزی کے ساتھ پسینہ آنے لگا تو بارش کی رفتار بھی زیادہ تیز ہو گئی ۔

کچھ دیر میں لیکوف بھی اس جگہ آ پہنچا اور وہ دونوں مل کر ایک نقشے کو بڑے غور سے دیکھنے لگے ۔ مسافر نے کچھ اشارہ کرتے ہوئے نقشے پر اپنی انگلی پھیری ۔ لیکن لیکوف نے کہا :-

" پھر کیا ہوا ۔ معمولی بات ہے ۔ میں پروا نہیں کرتا ۔"

" بہت خوب ! مسافر نے کہا ۔ اور ساتھ ہی اس نقشے کو لپیٹ لپاٹ چمڑے کے ایک تھیلے میں ڈال لیا ۔ اس کے بعد بھی وہ کچھ دیر چپکے چپکے باتیں کرتے رہے اور چائے کا دور جاری رہا ۔

جب لیکوف پہرے پر جانے کے لیے تیار ہوا تو میں نے اسے روک کر اس نووارد کی بابت سوال کیا ۔ اس نے ہنس کر جواب دیا ۔

" دیکھنے میں کتنا خوب صورت معلوم ہوتا ہے ، جیسے قمری کا بچہ ۔ لیکن زنخا ہے ۔ اس کا وطن بہت دور سائبیریا میں ہے لیکن کاروبار ایک نئی بستی میں پھیلا رکھا ہے ۔ میں نے اس کے کارخانے میں ملازمت کا فیصلہ

کر لیا ہی۔ لہذا "پرم" پہنچنے کے بعد میں جہاز کی نوکری چھوڑ دوں گا اور اس وقت تم مجھ سے جدا ہو جاؤ گے۔ پہلے ریل میں، پھر کشتی میں اور اس کے بعد گھوڑے کی پیٹھ پر ہمیں سفر کرنا ہوگا۔ مسلسل پانچ ہفتے تک سفر کرتے رہنے کے بعد ہم اس جگہ پہنچ جائیں گے جہاں اس کے کارخانے قائم ہیں۔"

میں اس کے فوری فیصلے پر سخت متعجب تھا۔ اس لیے میں نے دریافت کیا "کیا تم اس شخص کو پہلے سے جانتے تھے؟"

"بالکل نہیں۔ میل ملاقات تو بڑی چیز ہی۔ میں نے اس کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ میں اسے کیا جانوں؟"

علی الصباح لیکوف نے ایک میلا کچیلا کوٹ گلے میں ڈالا۔ ننگے پانو میں چپل پہنی اور ایک ٹوٹی ہوئی ہیٹ جس کا چھجا بھی اسے خیرباد کہہ چکا تھا سر پر منڈھ لی اور پھر اپنے قوی آہنی ہاتھوں سے میرے بازو پکڑ کر کہنے لگا۔

"تم میرے ساتھ کیوں نہیں چلتے۔ وہ تمھیں بھی کسی کام پر لگا دے گا صرف اس کے سامنے اپنی رضامندی ظاہر کر دو۔ بولو۔ کیا خیال ہی۔ اگر کہو تو میں خود ذکر کر دوں۔ وہ تم سے کوئی چیز لے لیں گے جس کی تمھیں ضرورت نہیں ہوگی اور اس کے عوض کافی رقم ملے گی۔ جب وہ کسی شخص کو خصتی کرتے ہیں تو بڑا جشن مناتے ہیں اور معقول انعام دیتے ہیں۔"

زنجا جہاز پر کٹہرے کے قریب کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سفید بنڈل تھا اور وہ گھور گھور کر لیکوف کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے پپوٹے بھاری اور سوجے ہوئے معلوم ہو رہے تھے جیسے شرابیوں کے نشے کی حالت میں ہو جاتے ہیں۔ میں نے زیر لب اس کو برا بھلا کہنا

شروع کیا۔ لیکوف نے دوبارہ میرا بازو تھام لیا اور چپکے سے کہا:۔
"رہنے بھی دو۔ اس میں کیا ہرج ہے۔ کوئی بری بات نہیں ہے۔ زنخا ہو جانا بھی ایک قسم کی عبادت ہے۔ ہر شخص اپنے عقیدے کے مطابق عمل کرتا ہے۔ ہمیں کیا واسطہ جو ہم دخل دیں یا اعتراض کریں۔ اچھا خدا حافظ۔ خوش رہو"
اور یہ کہنے کے بعد لیکوف گیند کی طرح لڑھکتا ہوا چلا گیا۔ میرے دل میں ایک ناقابل بیان بے چینی اور استعجاب کی مخلوط کیفیات پیدا ہو گئیں اس کے جدا ہو جانے کا مجھے بہت افسوس تھا۔ لیکن اس کے آخری فیصلے پر غصہ بھی آ رہا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ یہ کس قسم کا انسان ہے کہ اپنے مستقل کام کو چھوڑ کر ایسی جگہ چلا گیا جہاں کا اسے کچھ بھی علم نہیں۔"

باب (۱۲)

موسم خزاں کا چل چلاؤ تھا۔ بحری سفروں کے دن ختم ہو گئے۔ میں نے ایک بت ساز کے کارخانے میں کام سیکھنے کی غرض سے شاگردی اختیار کر لی کارخانے کی مالکہ ایک نیک دل بوڑھی عورت تھی۔ دو ایک دن بعد ہی مجھ سے کہنے لگی:۔

"آج کل دن چھوٹے ہوتے ہیں اور راتیں بڑی۔ بہتر یہ ہی کہ صبح کے وقت تم دکان کے کام کاج میں ہاتھ بٹایا کرو۔ سیکھنے سکھانے کا کام شام کے بعد بھی ہو سکتا ہی"۔

اس نے مجھے ایک نوجوان پستہ قد دکاندار کے سپرد کر دیا جو مصنوعی رنگ و روغن سے اپنے چہرے کو خوبصورت بنائے رکھتا تھا۔ روز صبح کو سورج نکلنے سے بہت پہلے میں ٹھنڈی ہوا کھاتا، اس کے ہمراہ شہر کے پرلے سرے پر پہنچ جاتا۔ جہاں لین دین کا بازار دن بھر گرم رہتا تھا۔ ہماری دکان ایک بڑی عمارت کی دوسری منزل میں تھی۔ وضع قطع سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ یہ دکان کسی زمانے میں کارخانہ تھی۔ ایک آہنی دروازہ اور چھت کے قریب بنی ہوئی چھوٹی سی کھڑکی روشنی کے لیے ناکافی تھی اس لیے عموماً اندھیرا سا رہتا تھا۔ ساری دکان چھوٹی بڑی مورتوں اور ان کے ڈبوں سے بھری پڑی تھی۔ ان کے علاوہ قدیم رسم الخط میں چھپی ہوئی مذہبی کتابیں تھیں جن کی خوب صورت زرد چمڑے کی جلدیں کچھ کم قابل تعریف نہیں تھیں برابر والی دکان میں بھی مورتیں اور کتابیں فروخت ہوتی تھیں۔ سیاہ

ڈاڑھی والا دُکاندار اپنے تقدس کی بنا پر دور و نزدیک کافی مشہور تھا، اور عزّت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ کام کاج میں ہاتھ بٹانے کے لیے اس کا لڑکا بھی دکان پر رہتا۔ اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ جوانی ہی میں بوڑھا ہوگیا ہے۔ نیز اس کی آنکھیں ہر وقت بے قرار سی رہتی تھیں۔

میں صبح کو دُکان کھولتے ہی قریب کے شراب خانے سے کھولتا ہُوا پانی لانے کے لیے دوڑ جاتا اور ناشتے وغیرہ سے فارغ ہوکر دُکان کی جھاڑ پونچھ میں مشغول ہوجاتا۔ اس کے بعد میرا کام یہ تھا کہ آنے جانے والے گاہکوں پر باقاعدہ نظر رکھوں اور کوشش کروں کہ وہ برابر کی دُکان پر جانے نہ پائیں۔

دُکان دار بڑے زور دار لہجے میں کہتا تھا، "خریدار بڑے احمق ہوتے ہیں۔ وہ چیزوں کے بجائے صرف چیزوں کی قیمت کو دیکھتے ہیں۔ سستے داموں جہاں سے ملیں خرید لیتے ہیں۔ لیکن صحیح قیمت کا اندازہ اُنھیں کبھی نہیں ہوتا۔"

مورت کی چوبی سطح کو آہستہ آہستہ تھپ تھپاتے ہوئے وہ تجارت کے داؤ پیچ مجھے ایک عجیب انداز میں سمجھانے لگتا۔ ایک روز کہنے لگا:

"اس مورت کو دیکھو۔ صنعت گری کا اچھا نمونہ ہے لیکن قیمت کچھ زیادہ نہیں ہے۔ پانچ سات انچ لمبی لیکن اپنے سہارے کھڑی رہتی ہے اور اسے دیکھو۔ یہ دس بارہ انچ لمبی ہے اور یہ بھی اپنے سہارے کھڑی رہتی ہے۔ کیا تمھیں بزرگانِ دین کے حالات معلوم ہیں ان کی خصوصیات سے واقف ہو۔ اِدھر دیکھو یہ شیخ صاحب انسان کو شراب سے بچنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ اور یہ بہت بڑے شہید ہیں۔ انسان کو ہر قسم کی آفاتِ ناگہانی

سے محفوظ رکھتے ہیں۔ یہ مقدس ہستی بخاروں اور اسی قسم کی معمولی بیماریوں سے بچائے رکھتی ہے۔ اور معصوم مریم کے متعلق تم کیا جانتے ہو؟ ۔ سنو۔ ان کی مورتیں مختلف روپ میں نظر آئیں گی۔ یہ غم کی صورت ہے اور وہ مسرت کی تصویر۔ ان کی برکت سے مصیبتیں دور ہوکر خوشیاں نصیب ہوسکتی ہیں۔ ان میں سے بعض خاص خاص شہروں کے ساتھ منسوب ہیں اور انھیں کے نام پر مشہور ہیں۔"

مورتوں کی قیمتیں مختلف قد و قامت، وضع قطع اور ظاہری ٹیپ ٹاپ کے اعتبار سے مقرر تھیں اور وہ بہت جلد میرے ذہن میں بیٹھ گئیں میں نے معصوم مریم کی مختلف مورتوں میں امتیاز کرنا بھی آسانی سے سیکھ لیا لیکن یہ یاد رکھنا کہ فلاں بزرگ کی کیا خصوصیت ہے ایک امر محال تھا۔ بعض دفعہ گاہکوں کے انتظار میں دکان کے دروازے پر میں بے خیالی میں کھڑا ہوتا کہ اچانک دکاندار میری قابلیت کا امتحان لینے کے لیے آدھمکتا۔

"اچھا بتاؤ۔ عورت کی زچگی کے وقت دردِ زہ سے نجات دینے والا کون ہے؟"

اگر میرا جواب غلط ہوتا تو وہ ناک بھوں چڑھا کر بری طرح ملامت کرتا:

"کوڑ مغز! تمھارے دماغ میں گوبر بھرا ہوا ہے۔ آخر اس کھوپڑی سے کیا فائدہ ہے؟"

میرے لیے اس سے بھی زیادہ سخت کام گاہکوں کو پٹانا تھا۔ وہ مکروہ شکل کی رنگ برنگی مورتیں خود مجھے بھی بھلی معلوم نہ ہوتی تھیں اور اس لیے میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ ان کو فروخت کروں۔ میں نے نانی کی زبان سے سنا تھا اور وہ کہانیاں مجھے اس وقت تک یاد تھیں کہ

معصوم مریم، جوان خوب صورت اور نیک دل تھیں۔ اور مختلف رسالوں میں شائع ہونے والی تصویریں بھی نانی کے قول کا بیّن ثبوت تھیں لیکن اس کے بالکل برعکس بت سازوں نے ان کو ضعیف اور ڈراؤنی عورت کی شکل میں پیش کیا تھا۔ لمبی سی ناک، موٹے موٹے ہونٹ اور تھپواں اُپلے کی طرح گدرائے ہوئے کلّے دیکھ کر نفرت سی پیدا ہونے لگتی تھی۔

بدھ اور جمعہ کے دن بکری خوب ہوتی۔ کسان، بوڑھی عورتیں اور بعض دفعہ پورا خاندان دُکان کے اندر گھس آتا۔ یہ سب توہم پرست اور پُرانے خیال کے لوگ ہوتے تھے۔ میں ہر بُدھ کو دیکھتا کہ ڈھیلی ڈھالی سمور یا گھر کی بنی ہوئی چادر میں لپٹا لپٹایا ایک اوٹ پٹانگ سا انسان کچھ ڈرا کچھ سہما دبکتا دبکاتا چلا آ رہا ہے۔ ایسے گاہک کو اپنی طرف رجوع کرنا بڑا ناگوار گزرتا اور مجھے شرم سی آنے لگتی۔ پھر بڑی مشکل سے اپنے دل پر جبر کر کے میں اسے مخاطب کرتا:

"فرمایئے جناب! کیا چیز خریدنی ہے۔ آیئے۔ ملاحظہ کیجیے۔ مناجات کی بے نظیر کتابیں جن پر معقول لوگوں نے شرح لکھی ہے۔ دینی اور مذہبی کتابیں ہیں۔ آسمانی صحیفے ہیں جس چیز کی تلاش ہو یہاں مل جائے گی۔ ذرا اندر تک تکلیف گوارا کیجیے۔ بڑی نفیس مورتیں ہیں۔ سستے داموں مل جائیں گی۔ بہترین نمونہ، پائدار رنگ اگر مرضی کے مطابق چیز نہ ملے تو تیار کرا دی جائے گی۔ حکم کی تعمیل میں دیر نہیں لگتی۔ تشریف لایئے۔ آپ کے گھر کی آرائش، دوستوں کے لیے اعلیٰ تحفے۔ یہ روس بھر میں بہترین کارخانہ ہے۔ اس سے بہتر چیز کہیں نہیں مل سکتی۔" اور اسی قسم کی صدہا باتیں چرب زبانی کے ساتھ ایک سانس میں کہہ جاتا۔

گاہک جسے الفاظ سے مرعوب کر کے پٹا لینا قطعی غیر ممکن تھا کچھ دیر خاموش کھڑا مجھے گھورتا رہتا اور پھر یکایک مجھ کو اپنے مضبوط آہنی بازوؤں سے دھکیلتا ہوا آگے بڑھ جاتا۔ اس کو قریب کی دُکان میں گھستا ہوا دیکھ کر دکاندار دوڑا دوڑا میرے پاس آتا اور ہاتھ مل کر دانت کچکچا کر غصّے میں کہتا۔

"بڑے بے وقوف ہو۔ تم نے اسے جانے دیا۔ اس طرح کیا خاک دُکانداری کروگے۔"

فوراً برابر کی دکان میں ایک نازک سی باریک آواز سُنائی دی۔ ایسی آواز جس کا لوچ نشہ بن کر رگ رگ میں سرایت کرجاتا ہے۔ کوئی کہہ رہا تھا۔

"بندہ نواز! ہماری دُکان پر سمور کے لباس یا جوتوں کی بجائے آسمانی برکتیں فروخت کی جاتی ہیں۔ دنیوی چیزوں کے مقابلے میں ان کی قدروقیمت سونے چاندی اور جواہرات سے کہیں زیادہ ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ بالکل انمول ہیں۔"

ہمارا دُکان دار حسد کی آگ سے جل اُٹھتا اور غصّے سے بے تاب ہوکر بڑبڑانے لگتا:

"شیطان کہیں کا۔ اس کم بخت کی آنکھوں پر خدا کی لعنت ہے۔ تم اس سے بات کرنے کا ڈھنگ سیکھو۔ سمجھے۔"

میں بڑی ایمانداری سے اِن چرتروں کو سیکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ کیونکہ یہ میرا ایمان تھا کہ آدمی جو کچھ کرے دل لگا کر کرے لیکن میں مجبور تھا۔ گاہکوں کو اپنی چکنی چپڑی باتوں سے پٹا لینا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ میری زبان میں وہ جادو نہیں تھا وہ روکھے پھیکے اکھڑ آدمی جنھیں بات تک

کرنے کا شعور نہیں تھا وہ بوڑھی عورتیں جو بلیوں کی طرح مسکین اور بے زبان نظر آتی تھیں میرے جذبات میں ایک طوفان پیدا کر دینے کا باعث بن گئیں مجھے ان کی زدہ حالت پر ترس آنے لگتا۔ میرا جی چاہتا کہ چپکے سے ان کے کان میں مورتوں کی اصل قیمت کہ دوں۔ اور وہ زائد رقم جو عموماً لی جاتی ہے اُن سے وصول نہ کروں۔

مجھے یہ معلوم کرکے حیرت ہوتی کہ وہ کتابوں کی حقیقت جانتے ہیں اور انھیں مورتوں پر بھرے ہوئے رنگ و روغن کی قیمت کا بھی اندازہ ہے۔ ایک روز ایک بوڑھا آدمی جس کو میں گھیر گھار کر دکان کے اندر ہکا لایا تھا کچھ دیر بعد کہنے لگا۔

"میاں صاحبزادے یہ بات غلط ہے کہ تمھارا کارخانہ روس بھر میں بہترین ہے۔ یقین مانو کہ روگوشین والا کارخانہ ماسکو میں ہی بہترین سمجھا جاتا ہے"

میں گھبرا کر راستہ چھوڑ کے ایک طرف کھڑا ہو گیا تاکہ وہ جلد از جلد دُکان سے چلا جائے۔ وہ کچھ فاصلے پر ایک دوسری دُکان میں چلا گیا۔ اس نے برابر کے دروازے میں گھسنے کی تکلیف گوارا نہیں کی۔

"کیوں؟ روکا نہ گیا اسے؟" دُکان دار نے طعنہ دیتے ہوئے ترش روئی سے پوچھا۔

"آپ نے کیوں نہیں بتایا کہ روگوشین نے بھی کوئی کارخانہ قایم کر رکھا ہے؟"

وہ بُرا بھلا کہنے لگا۔

"وہ کس قدر مسکین بن کر یہاں آتے ہیں اور جو کچھ پوچھنا ہوتا ہے پوچھ پاچھ کر چل دیتے ہیں۔ ان پر خدا کی مار ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ

اس کاروبار کو خود بھی خوب سمجھتے ہیں۔ دوزخ کے چیونٹے!"

وہ خوب صورت تھا۔ پیٹ بھر کر کھانے کو مل جاتا تھا۔ اور خود غرض بھی تھا۔ اس لیے قدرتی طور پر اسے کسانوں سے نفرت تھی۔ جب کبھی وہ خوش مذاقی کی جوُن میں ہوتا تو مجھ سے شکایت کے طور پر کہتا:

"میں بھی کافی باوضع آدمی ہوں۔ صفائی ستھرائی کو پسند کرتا ہوں ہر وقت عطریات اور مختلف خوشبوؤں میں بسا رہتا ہوں۔ ساری تنخواہ اپنے ہی اوپر خرچ کر ڈالتا ہوں، لیکن اس کے باوجود تم دیکھتے ہو کہ مجھے کیسے کیسے دیہاتیوں کے سامنے خوشامدانہ طور پر جھکنے کے لیے مجبور ہوجانا پڑتا ہے محض اس لیے کہ دُکان کی مالکہ کے لیے چار پیسے نفع کے حاصل کروں۔ بتاؤ۔ یہ کوئی معقول بات ہے۔ ایک دیہاتی کی ہستی ہی کیا۔ گندے چیتھڑوں کی پوٹ برساتی کیڑے۔ اور پھر بھی ——"

اور وہ ایک دم سانپ طرح بل کھاتا ہوا خاموش ہوگیا۔

مجھے دیہاتی بہت پسند تھے کیونکہ ان کی وضع قطع، چال ڈھال اور بول چال سے میرے دل میں لیکوف کی یاد تازہ ہوجاتی تھی۔

کبھی کبھار کوئی غم کا مارا مصیبت زدہ پھٹے پرانے لبادے میں لپٹا دُکان کے اندر آگھستا۔ وہ اپنی جھبری ٹوپی اتار کر اُنگلیوں کے اشارے سے سینے پر صلیب کا نشان بناتا اور منہ پھیر کر نظریں جھکا کر ایک کونے کی طرف کھڑا ہوجاتا اس خیال سے کہ کہیں منحوس مورتوں پر نگاہ نہ پڑجائے۔ پھر بچ بچا کر کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے بڑی مشکل سے بولنے کی کوشش کرتا۔

"مجھے مناجات کی ایسی کتاب دے دو جس پر اچھی شرح لکھی ہوئی ہو۔"

وہ لبادے کی ڈھیلی ڈھالی آستینیں اوپر چڑھا کر ایک آدھ صفحہ پڑھتا

جاہتا اور زیرلب کچھ بڑبڑاتا رہتا۔

"کیوں جی۔ اس سے زیادہ پُرانا نسخہ کوئی نہیں ہی"

"تم جانتے ہو۔ بعض چیزیں پُرانی ہوکر مہنگی ہوجاتی ہیں۔ اس سے زیادہ قدیم نسخہ ہزار رُپے سے کم نہیں ملے گا"

"ہاں جانتا ہوں"

دیہاتی اپنی انگلی پر لب لگاکر ورق پلٹنا چاہتا اور اس کے میلے کچیلے ہاتھوں کا بدنما داغ کاغذ کی پیشانی پر کلنک کے ٹیکے کی طرح لگا رہ جاتا۔ دکاندار اس کی پیٹھ کے پیچھے کھڑا اس حرکت کو دیکھتا اور خون کا سا گھونٹ پی کر رہ جاتا۔

"تمام آسمانی صحیفے ایک ہی عہد کی یادگار ہیں۔ خدا کے الفاظ کبھی بدلتے نہیں"

"میں جانتا ہوں۔ میں نے لوگوں کو یہی کہتے سُنا ہی۔ خدا نے کوئی تبدیلی نہیں کی لیکن اس کے بندوں نے تو کردی ہی"

کتاب کو بند کرکے وہ خاموشی کے ساتھ باہر نکل گیا۔

بعض دفعہ یہ جنگلی لوگ دُکاندار سے بحث شروع کردیتے۔ اور یہ بات مجھ سے چھپی ہوئی نہیں تھی کہ اس کے مقابلے میں وہ لوگ مقدس نوشتوں کی حقیقت کو زیادہ سمجھتے تھے۔

"کافر کے بچے، شیطان کے چیلے" دُکان دار غصّے میں بھنبھنا کر کہتا۔

مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا کہ دیہاتی نئی کتابوں کو پسند نہ کرنے کے باوجود ان کا بڑا احترام کرتے۔ وہ اس قدر احتیاط سے اس کو پکڑتے

ورق پلٹتے گویا وہ کوئی پرندہ ہے کہ گرفت ڈھیلی ہوتے ہی کہیں پھر سے اُڑ نہ جائے۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوتی کیونکہ میں ہر کتاب کو ایک معجزۂ قدرت سمجھتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ کتاب کے اندر مصنف کی روح بند ہوتی ہے اور جب میں اسے کھولتا تو ایسا معلوم ہوتا گویا میں نے اس روح کو آزاد کر دیا۔ اور وہ میرے سامنے زندگی کے راز فاش کرنے کی اہل ہو گئی ہے۔

اکثر بوڑھے مرد اور عورتیں قدیم رسم الخط میں چھپی ہوئی کتابیں بیچنے کے لیے لایا کرتے۔ یا راہبوں کے ہاتھ سے لکھے ہوئے قلمی نسخے۔ مڑ تڑ کر بند ہو جانے والے بُت جن پر قدیم تحریریں منقوش ہوتیں خوبصورت صلیبیں یا اسی قسم کے اور تبرکات یا پھر ایسی نادر چیزیں جن کو بادشاہوں کے نام کی مناسبت سے تاریخی اہمیت حاصل ہوتی۔

میرا دُکان دار اور قریب کا پڑوسی دونوں اسی قسم کے بیچنے والوں کی تلاش میں رہتے اور کوشش کرتے کہ کوئی اچھی چیز ہو تو دوسرے کو خبر ہونے سے پہلے خود جھپٹ لیں۔ اس طرح نایاب چیز خرید کر ایک پیسے کے دس پیسے بنا لینا ان کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں تھا۔ وہ مجھے سمجھاتا رہتا:

”دیکھو ان بھکاریوں پر نظر رکھا کرو جن کی گدڑیوں میں لعل ہوتے ہیں۔ جہاں کہیں نظر پڑیں جھپٹ کر لے آؤ۔ ان سے اونے پونے چیز خرید کر لاکھوں کا فائدہ ہو سکتا ہے۔“

جب ایسا کوئی پھیری والا آتا تو دُکان دار فوراً مجھ سے کہتا کہ جاؤ پیٹر کو بلا لاؤ، کیونکہ اس کو پُرانی کتابوں، بتوں اور ہر قسم کی نایاب چیزوں کے پرکھنے اور قیمت کا اندازہ لگانے کا بڑا سلیقہ تھا۔ وہ ایک لمبا تڑنگا

بڈھا تھا۔ اس کی گھنی ڈاڑھی، بشاش چہرہ اور عقل و دانش سے چمکتی ہوئی آنکھیں مجھے اب تک یاد ہیں۔ اس کے پانْو کی ایک نس خراب ہوگئی تھی جس کے باعث لکڑی کے سہارے لنگڑا کر چلتا تھا۔ گرمی جاڑے وہ ایک ہی قسم کا ہلکا لباس پہنتا تھا۔ اور اس کے سر پر مخمل کی عجیب و غریب ٹوپی ایسی معلوم ہوتی گویا کسی نے تسلہ اوندھا کر رکھ دیا ہی۔ یوں تو وہ سینہ تان کر اکڑتا ہوا چلتا لیکن دُکان میں داخل ہوتے ہی اس کے کندھے ڈھیلے پڑجاتے، سر جھکتا اور کمر بھی دوہری ہوجاتی۔ ٹھنڈے ٹھنڈے سانس لے کر وہ جلدی جلدی صلیب کا نشان بناتا اور کچھ دعائیں اور مناجاتیں چپکے چپکے پڑھ کر اپنے اوپر دم کرلیتا۔ اس کی بزرگی اور اس کے نقوش کو دیکھ کر بیچنے والے پر ایک قسم کا رعب چھا جاتا اور وہ سمجھ لیتا کہ یہ جو رقم لگائے گا وہ بالکل مناسب ہوگی بوڑھا دریافت کرتا:

"آخر کیا بات ہی۔ کوئی مصیبت نازل ہوگئی ہی۔"

"ذرا دیکھیے۔ یہ شخص ایک مورت بیچنے کے لیے لایا ہی کہتا ہی کہ آج سے ایک ہزار سال پہلے کی ہی۔"

"جی کیا کہا۔"

"ایک ہزار سال پہلے کی۔"

"اب سمجھا۔ بات یہ ہی کہ میں ذرا اونچا سُننے لگا ہوں۔ خدا نے میری قوت سماعت میں کمی کردی ہی تاکہ بے دینوں کے کلمے کو نہ سن سکوں۔"

پھر اپنی ٹوپی اُتار کر وہ بت کو نظر کے سامنے اُٹھا لیتا۔ چاروں طرف دیکھ لینے کے بعد اس پر لکھی ہوئی عبارت کو پڑھتا۔ کبھی اِدھر سے کبھی اُدھر سے لکڑی کی گرہوں کو جانچتا اور پھر ناک بھوں چڑھا کر بڑبڑاتا۔

"بے دین کافروں نے بدمعاشی پر کمر کس لی ہے۔ بعض کو یہ معلوم ہے کہ ہم لوگ قدیم حسن کاریوں کی قدر کرتے ہیں اور بعض کو شیطان نے ورغلا رکھا ہے۔ لہٰذا آج یہ ان کا پیشہ ہو گیا ہے کہ مقدس مورتیں تیار کریں اور انھیں کسی قدیم زمانے سے منسوب کر دیں۔ پہلی نظر میں ممکن ہے یہ ایک ہزار سال کی پرانی معلوم ہو یا دو ہزار سال کی یا اس سے بھی زیادہ قدیم لیکن جب غور سے دیکھو تو فوراً پتہ چل جاتا ہے کہ محض قریب زمانے کی ہے۔"

جب وہ لفظ "قریب" استعمال کرتا تو اس کا مطلب ہوتا کہ چیز نایاب اور بیش بہا ہے۔

اسی قسم کی بہت سی علامتیں پہلے سے مقرر کر رکھی تھیں تاکہ دکان دار صاف لفظوں میں پوچھے بغیر سمجھ جائے کہ مورت یا کتاب کی قیمت کس حد تک دی جا سکتی ہے۔ کچھ کچھ میں بھی سمجھنے لگا تھا۔ مثلاً اس کی گفتگو میں اگر لفظ "افسردہ" استعمال ہو جاتا تو اس کے یہ معنے ہوتے کہ مورت دس روپے تک میں بری نہیں ہے۔ مجھے شرم آنے لگتی کہ یہ دونوں کس طرح مل کر ایک سادہ لوح غریب کو لوٹ رہے ہیں لیکن اس سے قطع نظر ان کی یہ عیاری میرے لیے بڑی پرلطف ہوتی تھی

"وہ شیطان اور شیطان کے بچے سب کچھ کر سکتے ہیں۔ کیونکہ گمراہی ان پر مسلط ہو چکی ہے۔ ذرا غور کرو۔ یہ دستخط بھی اصل معلوم ہوتے ہیں۔ حالانکہ بالکل جعلی ہیں۔ پھر رنگ و روغن کو دیکھو۔ یکسانیت نام کو نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے آدمیوں نے مل کر بنایا ہے۔ حالانکہ اوشاکوف جیسے قدیم استاد نے بے دین ہونے کے باوجود سارا بت اپنے ہی ہاتھ سے مکمل کیا تھا اس نے خود لکڑی کو تراشا، نقوش پیدا کیے۔ رنگ بھرا

حتیٰ کہ چھیلا چھالی بھی خود ہی کی اور پھر عبارت لکھی۔ لیکن اس زمانے کی گنہگار ہستیاں ذرا بھی تکلیف گوارا نہیں کرتیں۔ قدیم زمانے میں یہ فن بڑا مقدس سمجھا جاتا تھا لیکن آج کل نقالی کے سوا کچھ باقی نہیں رہا۔"

یہ کہہ کر اس نے مورت کو بڑی احتیاط سے میز پر رکھ دیا اور ٹوپی اوڑھتے ہوئے کہا:۔

"ایسا کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔"

اس بات کا مطلب ہوتا کہ مورت ضرور خرید لی جائے۔

بوڑھے کی اس لچھے دار گفتگو اور چرب زبانی سے بیچنے والا بالکل ہکّا بکّا رہ جاتا اور کسی قدر مرعوب ہو کر پوچھتا۔

"جی قبلہ! بالکل ٹھیک فرمایا۔ لیکن مورت کے متعلق بھی تو اپنی رائے ظاہر کیجیے۔"

"یہ مورت کافروں کی ہاتھ کی بنی ہوئی ہے۔"

"یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ خود میرے دادا دادی نے اس بت کو سامنے رکھ کر پوجا کی ہے۔"

"کافر لوگ تمہارے دادا کے زمانے سے بھی بہت پہلے دنیا میں موجود تھے۔"

یہ کہہ کر بوڑھا اس بت کو بیچنے والے کے سامنے اس طرح اٹھالیتا گویا آنکھوں کے اندر گھسیڑ دے گا اور کسی قدر ترش لہجے میں کہتا:

"اچھا اب دیکھو اس کے چہرے سے کس درجہ شادمانی ٹپک رہی ہے۔ کیا تم اسے مذہبی مورت کہہ سکتے ہو؟۔ یہ تو ایک معمولی پتلا ہے کاٹھ کا پتلا۔ محض خرافات اس میں الوہیت نام کو نہیں۔ کیا تم مجھے

جھوٹ کہلوانا چاہتے ہو؟ نا بابا۔ مجھے بہت جلد خدا کے حضور میں جانا ہے بھلا اس طرح ایمان نگل کر بات کرنے سے مجھے کس رکعت کا ثواب ملے گا۔"

وہ کمزور بڈھوں کی طرح ڈگمگاتا ہوا دُکان سے نکل کر برآمدے میں چلا جاتا اور چہرے سے ظاہر کرتا گویا ناراض ہو گیا ہے کیونکہ لوگوں نے اس کی جانچ پڑتال کو صحیح تسلیم نہیں کیا۔ دُکان دار مورت کے بدلے چند سکے پیش کرتا جنھیں بیچنے والا بغیر کسی اعتراض کے فوراً قبول کر لیتا۔ اور جاتے وقت پیٹر کے سامنے اس طرح جھک جاتا گویا اس کی بزرگی اور قابلیت کا لوہا مان لیا ہے۔ اس کے بعد وہ مجھے قہوہ خانے میں بھیج دیتا تاکہ چائے کے لیے گرم پانی لے آؤں۔ واپس آکر میں دیکھتا کہ پیٹر دھوکا بازی سے خریدی ہوئی چیزوں کو دیکھ دیکھ کر خوب خوش ہو رہا ہے۔ اور دکان دار کو ہدایت کر رہا ہے:

"دیکھو جی یہ بُت فن لطیف کا بہترین نمونہ ہے۔ خصوصاً اس کی رنگائی نہایت شاندار ہے۔ کسی نے خدا کے خوف سے اور بالکل مذہبی جذبے کے ماتحت اسے بنایا ہے۔ دنیوی خواہشات کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ ذرا ہوشیاری سے بیچنا۔"

"اور یہ ہے کس کی کاریگری؟" دُکان دار جوشِ مسرت سے اُچھل کر دریافت کرتا۔

"رہنے بھی دو۔ یہ بات ابھی تمھاری سمجھ میں نہیں آسکتی۔"

"اچھا تو یہ بتا دو کہ اگر کوئی قدر دان آ نکلے تو کس قیمت پر بیچ ڈالوں"

"بھلا میں کیا بتا سکتا ہوں، البتہ تم چاہو تو یہ میرے سپرد کردو دو ایک واقف کاروں کو میں ہی دکھا دوں گا۔ اور اس طرح اگر میرے

وسیلے سے بک جائے تو پورے پچاس تمھارے۔ اس سے زیادہ جو کچھ ملیں وہ میرے اور میرے باپ دادا کے۔"

دکان دار خوشی سے ناچ اُٹھا۔ دونوں اطمینان سے چائے کی لمبی لمبی چسکیاں لینے لگے۔ مجھے ان کے اس شرمناک طریقۂ کاروبار پر غصہ آرہا تھا۔ لیکن زبان سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ ان دونوں کے چہروں سے سخت قسم کی مکاری ٹپک رہی تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی گہری سازش کی تیاری ہے۔ دکان دار خود بھی چالاک ہونے کے باوجود بڈھے کی اُنگلیوں کے اشارے پر چلتا تھا۔ اس کے چلے جانے کے بعد وہ مجھ سے کہا کرتا۔

"اجی حضرت! اب یہ غضب نہ کرنا کہ کہیں مالکہ سے جاکر سارا راز فاش کردو۔ وہ میری جان کو آجائے گی۔"

جب بت کی خرید و فروخت پر خوب خوب حاشیہ آرائی ہوچکتی تو دکان دار لگے ہاتھوں دریافت کرتا:-

"اور سناؤ۔ شہر کی کوئی تازہ خیر خبر؟"

بڈھا بالکل مولویانہ انداز میں ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوداگروں کے جھوٹے سچے قصے سنانے لگتا۔ ان کی کاروباری زندگی، شادی اور بیاہ، بیماری اور موت، کھیل تماشے اور آپس کے جھگڑے ٹنٹے۔ بس یہی موضوع تھے جن پر قصے گھڑ کر اور خوب نمک مرچ لگاکر اس طرح پیش کرتا کہ اس معجون ظرافت سے سننے والوں کو مزا آجاتا۔ اس قسم کی گفتگو سے عموماً میرے دکان دار کے سینے میں حسد کی آگ بھڑک اُٹھتی۔ اس کے طباق سے چہرے پر تاؤ آجاتا۔ نتھنے غصے سے پھولنے لگتے اور شکایت کے طور پر کہتا:-

"دوسرے لوگ کیسی مزے کی زندگی گزارتے ہیں ۔ ایک ہم ہیں کہ کولھو کے بیل کی طرح مرمر کر جینا پڑتا ہے۔"

"اپنی اپنی قسمت ہے بھائی! تقدیر کے لکھے کو کون پلٹ سکتا ہے۔ کسی پر فرشتوں کے نرم ونازک پروں کا سایہ رہتا ہے اور کوئی شیطان کے چنگل میں پھنس کر اپنی زندگی خراب کر لیتا ہے۔"

اس ہٹے کٹے لحیم شحیم بڈھے کو ہر بات کا پتا رہتا تھا۔ شہری اور دیہاتی امیر اور غریب، سوداگر اور خریدار، غرض کسی کے راز اس سے پوشیدہ نہیں رہ سکتے تھے۔ وہ سب کو جانتا اور پہچانتا تھا۔ وہ عقاب سے زیادہ تیز نظر اور لومڑی سے زیادہ مکار تھا۔ میں ہمیشہ کوشش کرتا کہ کس طرح اسے برہم کردوں۔ لیکن اس میں زبردست سمائی تھی۔ وہ اپنے آپ کو عام سطح سے بلند رکھتے ہوئے بات چیت کرتا اور ایسا معلوم ہوتا گویا وہ غیر محدود فضا میں ہے۔ جہاں بیرونی اثرات اپنا رنگ نہیں جما سکتے۔ کوئی اسے سمجھنے کی کوشش کرتا تو ہر قدم پر ٹھوکر کھانے کے باوجود کچھ نہ جان سکتا۔ بس اس اعتبار سے اس میں اور لیکوف میں کچھ مشابہت تھی۔

دکان دار اگرچہ اس کی قابلیت کا لوہا مانتا تھا، منہ پر بھی اور پیٹھ پیچھے بھی۔ تاہم وہ چاہتا تھا کہ کوئی اس بڈھے کو ذرا چھیڑ کر برہم کر دے۔

"تم بڑے دھوکے باز ہو۔ لوگوں کو فریب دیتے ہو" وہ ذرا تیوری بدل کر ترش روئی سے کہتا۔ اور بڈھا لاپروائی سے مسکرا کر جواب دیتا:-

"بے عیب صرف خدا کی ذات ہے۔ اور دھوکا دینا اسی کو زیب نہیں دیتا۔ تم جانتے ہو ہمیں بے وقوفوں سے پالا پڑا ہے۔ پھر کس طرح

ممکن ہو کہ ان سے میل جول رکھتے ہوئے انھیں اُلّو نہ بنایا جائے۔ آخر ان کی حماقت کا اور اقتضا کیا ہو؟"

دُکان دار آپے سے باہر ہو جاتا۔

"سب دیہاتی احمق نہیں ہوتے کیونکہ اس جماعت میں تو ہم جیسے تاجروں کا بھی شمار ہو۔"

"لیکن تاجروں کی بابت میں نے اشارتاً بھی کچھ نہیں کہا۔ بے وقوف اور بدمعاش میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہو۔ بے وقوف بزرگانِ دین کی طرح قابلِ تعظیم ہستی ہو۔ کیونکہ اس کی عقل بھی کام نہیں کرتی۔"

بڈھا اسی طرح طنزیہ پیرائے میں چبا چبا کر گفتگو کرتا اور خود برہم ہونے کی بجائے دوسرے کو بھڑکا دیتا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ پانی کی سطح پر کھلا ہوا کنول کا پھول ہو جسے دریا کی موجیں پامال نہیں کرسکتیں۔ دو میں سے ایک بات لازمی تھی۔ یا تو اسے غصہ ہی نہیں آتا تھا یا وہ اسے بڑی صفائی سے پی جانے کا عادی تھا۔ اس میں شک نہیں کہ مجھ سے بحث کرنے میں عموماً وہ خود پہل کرتا۔ مثلاً بڑی سنجیدگی سے میرے بالکل قریب آکر قدرے تبسم کے ساتھ مجھ سے پوچھتا:۔

"بھلا بتاؤ تو اس فرانسیسی مصنف کا نام؟ — غالباً "پونوس" تھا۔"

میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ حروف کا اُلٹ پھیر کوئی اچھا مذاق نہیں ہو۔ تاہم بہت ضبط سے کام لے کر میں بھی اُسی انداز میں جواب دیتا۔

"جی نہیں "پوسون" حروف میں تبدیلی کرکے اپنی بدمذاقی کا ثبوت نہ دیجیے۔ آپ دودھ پیتے بچے نہیں ہیں۔"

"بالکل ٹھیک - واقعی میں دودھ پیتا بچہ نہیں ہوں لیکن یہ تو بتاؤ کہ پڑھ کیا رہے ہو؟"

"ایک فرانسیسی ناول"

"بہت خوب — کیوں جی - تم اپنے ادیبوں کو چھوڑ کر باہر والوں کی تحریر کیوں پسند کرتے ہو؟"

میں کوئی جواب نہ دیتا۔

"اچھا اتنا بتا دو کہ وہ لوگ عموماً زندگی کے کس پہلو پر افسانے لکھتے ہیں؟"

"ہر پہلو پر - کیونکہ وہ زندگی کا مطالعہ بہت گہری نظر سے کرتے ہیں"

"یعنی کتّے پالنے اور گھوڑے دوڑانے پر - کیونکہ یہی دو شغل ایسے ہیں جن کا انسانی زندگی سے بہت گہرا تعلق ہے"

دکان دار بے تحاشا ہنس پڑتا - میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی اور میں محسوس کرتا کہ اب وہاں کا ماحول اجیرن اور ناقابل برداشت ہو چلا ہے - لیکن اگر میں ٹل کر اس جگہ سے چلے جانے کی کوشش کرتا تو دکان دار فوراً راستہ روک لیتا -

"بھلا بچ کر کہاں جاؤگے؟"

اور بڈھا گھاگ فوراً موضوع بدل کر میرا امتحان لینے لگتا -

"اچھا میاں عقلمندوں کے سردار ذرا ایک معما تو حل کردو - دیکھیں تمھیں کتنی سوجھ بوجھ ہے - فرض کرو ایک جگہ ایک ہزار مادر زاد برہنہ مرد کھڑے کر دیے جائیں اور ایک ہزار ننگی جم عورتیں اور تم سے کہا جائے

کہ اس عُریاں جمِ غفیر میں آدم و حوّا بھی شامل ہیں۔ ذرا ڈھونڈھ کر بتاؤ کہ وہ کون سے ہیں۔ تو بھلا تم ان دونوں کو کس طرح پہچان سکو گے؟"

اس نے بار بار یہ سوال دُہرایا۔ اور جب کوئی جواب نہ ملا تو خود ہی بڑے فخر کے ساتھ اس کا حل پیش کرنے لگا۔

"نرے گاؤدی ہو۔ اتنی معمولی بات بھی نہیں بتا سکتے۔ تمھیں معلوم ہے کہ آدم و حوا کسی ماں کے پیٹ سے پیدا نہیں ہوئے تھے۔ بلکہ خدا نے ان کو از خود خلق کیا تھا اس لیے آنول ناول کے نشان ناف کی شکل میں ان کے پیٹ پر نہیں ہو سکتے اور بس یہی ان کی پہچان ہے۔"

بُڈھا اس قسم کی بے شمار پہیلیاں جانتا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ مجھے ہر دفعہ مات ہو جاتی تھی۔ میں نے شروع شروع میں اپنی پڑھی ہوئی کتابوں کے بعض حصے دُکان دار کو سُنائے تھے۔ کچھ عرصے بعد وہی کہانیاں بالکل مسخ کر کے میرے سامنے پیش کی گئیں۔ ہوا اس طرح کہ دُکان دار نے ان کو بہت کچھ کاٹ چھانٹ کر اور فحش اضافوں کے ساتھ بیرٹ کو سُنایا۔ بھلا وہ کب باز رہتے۔ اُنھوں نے اور بھی دو ہاتھ آگے بڑھ کر زیادہ شرمناک طریقے پر طبع آزمائی کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اصل چیز بگڑ کر کچھ سے کچھ ہو گئی۔

میں جانتا کہ ان کی وہ حرکت مجھ کو برہم کرنے کی غرض سے نہیں تھی بلکہ وہ اپنی گندی ذہنیت سے مجبور تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ کچھ نہ کچھ کیا جائے۔ یہ دوسری بات تھی کہ وہ فطرتاً سنوارنے کی بجائے بگاڑنے کی طرف مائل ہو جاتے تھے لیکن میرے لیے اس مذموم عمل جراحی کو برداشت کر لینا دشوار تھا۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ وہ اسی پر بس نہیں کرتے تھے بلکہ اس گندگی میں ڈھیلے پھینک کر چھینٹیں اُڑاتے اور خوب خوش ہوتے۔ گویا کسی اچھی

بھلی چیز کو بگاڑ دینا بجائے خود کوئی دلچسپ چیز ہو سکتی ہے۔

انھیں پر کیا موقوف۔ بدقسمتی سے اس بازار کے سبھی رہنے والے عجیب و غریب انسان تھے۔ پرلے درجے کے بے وقوف، چھچھورے اور فتنہ پرداز اگر کوئی بے چارہ دیہاتی اُن سے پوچھتا کہ شہر جانے کے لیے سیدھا اور قریب کا راستہ کون سا ہے تو وہ ہمیشہ غلط سمت بتا کر اسے اُلٹا پریشان کرتے۔ کیونکہ دوسروں کی تکلیف سے اُنھیں خوشی ہوتی تھی۔ جلدی ہی وہ اس مذاق کو فرسودہ اور غیر دلچسپ سمجھنے لگتے اور اس فکر میں رہتے کہ آئندہ کوئی نئی چال چلی جائے۔ وہ دو چوہوں کو پکڑتے، اُن کی دُمیں ملا کر سُتلی سے باندھتے اور بیچ سڑک میں چھوڑ دیتے۔ غریب چوہے گھبرا کر یا تو مخالف سمت میں دوڑنے کی کوشش کرتے یا پلٹ کر ایک دوسرے کو چاٹنا چاہتے جب وہ تھک تھکا کر ادھ موئے ہو جاتے تو مٹی کا تیل چھڑک کر اُنھیں آگ لگا دیتے اگر کوئی چوہا ہاتھ نہ لگتا تو بے چارے کتے کی شامت آجاتی۔ اس کی دم میں کوئی پُرانی بالٹی یا ٹوٹا پھوٹا کنستر باندھ دیتے۔ وہ ڈر کر بے تحاشا بھاگتا۔ اور یہ خوش ہو ہو کر تالیاں بجاتے۔ گویا بڑا دلچسپ کھیل ہے۔

اسی قسم کی بہت سی حماقتوں سے وہ اپنے دل بہلاتے تھے۔ یہ بات اتنی مشہور ہو گئی تھی کہ بعض دفعہ دور دور کے لوگ محض اُس مسخرے پن کو دیکھنے کے لیے اس بازار میں جمع ہوتے تھے۔ آپس کے میل جول میں بھی وہ اسی کوشش میں رہتے کہ ایک دوسرے کا مذاق اُڑایا جائے۔ ان کو تکلیف پہنچائی جائے۔ حتیٰ کہ ان کے لیے جینا دشوار کر دیا جائے۔ میں حیران ہوتا تھا کہ آخر ان باتوں کا ذکر کتابوں میں کیوں نہیں کیا جاتا۔ کم سے کم میں نے جتنی کتابیں پڑھیں ان میں کہیں اشارتاً بھی ان کا حال درج

نہیں تھا۔

خیر ان لغویات کو بھی معمولی کہا جا سکتا ہے کیونکہ ایک خاص واقعہ ان سب پر سبقت لے گیا۔ ہماری دکان کی نچلی منزل میں اونی چیزوں کا ایک تاجر رہتا تھا۔ اس کے ملازم نے اپنے پیٹو پنے سے آس پاس کے بلکہ تمام شہر کے رہنے والوں کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ تاجر اپنے ملازم کی اس غیر معمولی خصوصیت پر بہت فخر کرتا اور سب کے سامنے اسی انداز سے بیان کرتا جیسے کوئی شکاری اپنے کتّے کی تعریف کرتا ہے۔ وہ اکثر پڑوس کے دکان داروں کو شرط لگانے کی دعوت دیتا تھا۔

"کیوں بھئی۔ کوئی ہے دس روپے کی بازی لگانے والا جی دار۔ میں شرط لگاتا ہوں کہ بشکا دو گھنٹے کے اندر اندر دس پونڈ گوشت ہڑپ کر جائے گا۔"

"نہیں صاحب! ہم زیادہ سے زیادہ یہ کر سکیں گے کہ گوشت خرید لے آئیں۔ اور صرف اس کے کھانے کا تماشہ دیکھیں۔"

"چلو یہ بات بھی مانی۔ لیکن گوشت ہی گوشت ہو ہڈیاں الگ کر دی جائیں۔"

ایک روز اسی قسم کی گفتگو کے بعد اس کو بلا لیا گیا۔ جب وہ دکان سے باہر آیا تو سخت کام کرنے کے باعث اس کا سانس چڑھا ہوا تھا۔ آدمی کیا اچھا خاصا ہڈیوں کا ڈھانچ تھا۔ اس کے سوتی کوٹ پر ایک سرخ پیٹی کسی ہوئی تھی اور موٹے کمبل میں لپٹ لپٹا کر وہ اونی کپڑوں کی ایک بڑی سی گٹھری معلوم ہوتا تھا۔ اس نے آتے ہی نہایت ادب کے ساتھ اپنے گھٹے ہوئے سر سے ٹوپی اتاری اور مجمع پر ایک سرسری نظر ڈال کر خاموش کھڑا ہو گیا۔ اس کی دھنسی ہوئی آنکھوں سے ایک عجیب مایوسی ٹپک رہی

تھی۔ اس کے برخلاف اس کے مالک کے کلے کچوری کی طرح پھولے ہوئے اور خون کی زیادتی سے سُرخ تھے۔ مالک نے حسب معمول اپنی گرجتی ہوئی آواز میں پوچھا:-

"کیوں بے سؤر کی پوری ایک ران کھا سکتا ہی؟"

"کتنی دیر میں؟" ہِنکا نے پنپنائی ہوئی آواز میں دریافت کیا۔

"بس یہی دو گھنٹے میں"

"یہ تو ذرا مشکل ہی"

"ارے! مشکل کس چڑیا کا نام ہی"

"اچھا ایک بات ہی۔ شراب کے چند گھونٹ دے دینا"

مالک نے یہ شرط منظور کرلی اور لوگوں سے بڑے فخر کے ساتھ کہا۔

"آپ یہ نہ سمجھیں کہ یہ صبح سے نہار منہ ہی۔ تقریباً ایک سیر روٹی کے ٹکڑے ناشتے کے وقت کھائے تھے اور دوپہر کا کھانا الگ ہضم کر چکا ہی سمجھے!"

گوشت کی ایک بڑی سی ران منگالی گئی اور سب تماش بین اپنی اپنی جگہ سنبھل کر بیٹھ گئے۔ تمام سوداگر موٹے موٹے اونی کوٹوں میں لپٹے ہوئے ایسے نظر آتے تھے گویا کسی نے ریت کے اونچے اونچے ٹیلے برابر برابر لگا دیے ہیں۔ ان کے پیٹ غیر معمولی طور پر بڑے تھے اور مٹاپے کے باعث دُھندھی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس وقت انھیں مسرت کی بجائے کسی قدر کوفت ہو رہی تھی۔ سردی کے باعث اُنھوں نے اپنے ہاتھ آستینوں میں گھسیڑ رکھے تھے۔ وہ اس کھاؤ پیر کے گرد چھوٹا سا دائرہ بنا کر بیٹھ گئے۔ ہِنکا نے بالکل مذہبی انداز میں صلیب کا مقدس نشان بنایا اور پھر اون کے ایک بورے پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گیا۔

گوشت کی سینی اس کے پاس رکھ دی گئی اور وہ اپنی تیز نظروں سے اس کے جحم اور وزن کا جائزہ لینے لگا۔

ایک لمحے بعد ہی اس نے گوشت کا ایک پتلا پارچہ کاٹا اور دو توسوں کے درمیان رکھ کر منہ کے اندر ٹھونس لیا۔ اس کے ہونٹ کپکپا اُٹھے جب ان کو تر کرنے کے لیے اس نے لمبی زبان نکالی۔ جب اس کے تیز دانت نظر آئے اور جب اس نے اپنی تھوتھنی جھکا کر گوشت کی خوشبو لی تو بالکل ایسا محسوس ہُوا کہ وہ انسان نہیں کُتا یا بھیڑیا ہے۔

" دیکھو۔ دیکھو اس نے بھورنا شروع کر دیا "

" ذرا گھڑی پر نظر ڈال کر وقت بھی دیکھ لو "

ان کی نظریں اس پیٹو پر اس طرح جمی ہوئی تھیں جیسے کوئی جواری گھڑ دوڑ کے میدان میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کھڑا ہوتا ہے۔ وہ اس کے جبڑوں کی مسلسل حرکت، گالوں کی نکیلی ہڈیوں کے اتار چڑھاؤ اور ٹھوڑی کی باقاعدہ اونچ نیچ کو بڑے غور سے گھور رہے تھے۔ ان میں سے ایک اپنی محویت کو توڑ کر بولا:۔

" کھاتا خوب چبا چبا کر ہے۔ بالکل ریچھ کی طرح "

" کیا تم نے ریچھ کو کبھی کھاتے ہوئے دیکھا ہے "

" پاگل نہ بنو۔ میں جنگلوں میں نہیں رہتا۔ میں نے صرف مثال دی ہے عام طور پر یہی کہا جاتا ہے۔ کہ فلاں شخص ریچھ کی طرح چبا چبا کر کھاتا ہے "

" ریچھ نہیں سؤر کی طرح۔ یہ کہاوت زیادہ مشہور ہے "

" ہوا کرے لیکن یہاں عائد نہیں ہو سکتی کیونکہ سؤر اپنے ہم جنس کا گوشت نہیں کھا سکتا "

ایک زبردست قہقہہ بلند ہوا اور ان میں سے ایک نے غالباً اپنے تجربات کی بنا پر کہا:

"اجی واہ - سؤر تو اپنے نام کا سؤر ہے - اس سے کونسی چیز بچ سکتی ہے - اس کا جب بس چلتا ہے اپنے بھائی بہن تک کو ہڑپ کر جاتا ہے۔"

چوبے جی کے چہرے کا رنگ بتدریج بدلتا گیا - کانوں کی لوئیں نیلی پیلی پڑ گئیں - آنکھوں کے ڈھیلے سوج کر باہر نکلنے لگے - سانس لینا مشکل ہو گیا لیکن مُنہ تھا کہ لوہار کی دھونکنی کی طرح برابر کھلتا بند ہوتا رہا۔

"پروا نہ کرو مِشکا! ابھی بہت وقت باقی ہے۔" لوگوں نے اس کی ہمت بندھائی -

اس نے آنکھیں پھاڑ کر بے تابی کے ساتھ گوشت کے باقی حصے کا جائزہ لیا کہ اب کتنا رہ گیا ہے - تھوڑی شراب پی اور پھر چکّی چلانی شروع کر دی -

اب تماش بین ذرا زندہ دل ہو گئے - وہ مِشکا کے مالک سے گھڑی لے کر بار بار سوئیوں کو دیکھتے اور ایک دوسرے سے چپکے چپکے کہتے -

"کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ اس خبیث نے گھڑی پیچھے کر دی ہو - اس کے ہاتھ سے لینی چاہیے - ذرا مِشکا پر بھی نظر رکھو - وہ گوشت کا کوئی ٹکڑا آستین میں نہ چھپا لے - اس سے کچھ بعید نہیں - کیونکہ وہ مقررہ وقت سے پہلے اس ڈھیر کو ختم نہیں کر سکتا۔"

مِشکا کا مالک تڑپ کر چلّا اُٹھا:

"ارے مِشکا ہمت نہ ہاریو - تجھے انعام دوں گا - چار پیسے انعام - کھائے جا - میرے پٹھے - کھائے جا۔"

لوگوں نے اس سے بحث شروع کر دی لیکن شرط لگانے کے لیے

کوئی تیار نہیں ہوا۔

اور مِشکا برابر کھاتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ خود اس کا چہرا گوشت کی ران معلوم ہونے لگا۔ ہیجانِ تنفس سے اس کے پھٹے ہوئے نتھنے دردناک سُروں میں سیٹی بجانے لگے۔ اس کی حالت دیکھ کر ڈر معلوم ہوتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ بس اب وہ تکلیف کی شدت سے چیخ اُٹھے گا اور رو رو کر لوگوں سے کہے گا۔

"خدا کے لیے میری حالت پر ترس کھاؤ۔ اب میرا پیٹ پھٹنے لگا ہے"

لیکن طوعاً و کرہاً اس نے سارا لوتھڑا ختم کر ہی ڈالا اور اپنی مخمور آنکھوں کو کھولتے ہوئے بجھی ہوئی مضمحل آواز میں کہا۔

"مجھ سے بیٹھا نہیں جاتا۔ مجھے سو جانے دو"

مالک نے گھڑی پر نظر ڈالی اور غصّے سے چلا کر کہا:

"ارے گدھے! تو نے چار منٹ زیادہ لگا دیے"

باقی لوگ اسے چھیڑنے لگے۔ "غنیمت سمجھو کہ ہم نے شرط نہیں لگائی ورنہ تمھارا دیوالہ نکل جاتا"

"کچھ بھی ہو۔ یہ خبیث نستعلیق قسم کا جانور ہی بلکہ جانوروں سے بازی لے گیا"

"بے شک۔ نمائش میں رکھنے کے قابل ہی"

"ذرا سوچنے کی بات ہی کہ خدا نے انسانوں میں بھی کیسے کیسے راکھشس پیدا کیے ہیں"

"اچھا بھئی! اب چلنا چاہیے۔ کافی دیر ہوگئی۔ چائے کا وقت قریب آگیا"

اور وہ بکریوں کے ریوڑ کی طرح اکٹھے ہو کر قہوہ خانے میں جا گھسے۔

میں جاننا چاہتا تھا کہ وہ کون سا مکروہ جذبہ ان بدطینت اور سنگ دل لوگوں کے سینے میں چھپا ہوا ہی جو ان کو اس قدر انسانیت سوز منسخرے پن کے لیے مجبور کر دیتا ہی۔ انھیں ایک غریب کو پیٹ پھٹ جانے کی حد تک ٹھونس ٹھونس کر کھلانے میں کیا مزا آتا ہی۔

وہ تنگ و تاریک دُکان ہر وقت اُون کی گٹھریوں، بھیڑ کی کھالوں سن کے کپڑوں، جوتوں اور گھوڑے کے ساز و سامان وغیرہ سے چھت تک اَٹی رہتی تھی۔ دُکان کے دروازے پر چھت کو سہارنے والے ستون موسم کی تباہ کاریوں سے شکستہ ہونے کے علاوہ اُس غلاظت اور کیچڑ مٹی سے لپے رہتے تھے جو سڑک سے اُچٹ اچٹ کر آ پڑتی تھی۔ اس جگہ کا سارا نقشہ مجھے اچھی طرح یاد ہی۔ وہ رنگ و روغن سے محروم دیواریں، وہ شکستہ حال اینٹیں، وہ چونا نکل جانے سے اینٹوں کے درمیان پیدا ہو جانے والی شکنیں اور سوراخ، وہ مکڑی کے جالے اور ان جالوں میں پھنسے ہوئے بے ضرر کیڑے۔ غرض ہر چیز میرے دل کی تختی پر نقش ہی۔ اور جب کبھی تصوّر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں تو آئینہ ہو کر سامنے آجاتی ہی۔ مجھے یقین ہی کہ زمانہ چاہے کتنا ہی گزر جائے میں ان باتوں کو بھلا نہیں سکتا۔

پیدل چلنے والے اس فرش پر کھسّر کھسّر کرتے دھیرے دھیرے چلے جاتے۔ کرایے کی گاڑیاں اور کھڑکھڑیاں، سامان سے لدی لدائی کنکریلی سڑک پر گڑگڑاتی تیزی سے گزر جاتیں اور ان کا شور وہاں رہنے والوں کے کانوں میں دیر تک گونجتا رہتا۔ سڑک سے دور ہٹ کر ایک وسیع چوک کے اندر سرخ اینٹوں کی ایک دو منزلہ عمارت میں منڈی لگتی تھی بلکہ یہاں کی خالی پیٹیاں، نازک چیزوں کی حفاظت کرنے والا بھوسہ، کیچڑ میں سنے

ہوئے دلے مسلے کاغذ اور اسی قسم کا خس و خاشاک اس جگہ کا تبرک تھا۔
بے جان چیزوں کا تو خیر ذکر ہی کیا۔ انسان اور حیوان تک چلتے پھرتے رہنے کے باوجود بے حس و حرکت معلوم ہوتے تھے۔ گویا ان پر فالج گر پڑا تھا۔ زندگی کی لہر ان کے اندر سے غائب ہو چکی تھی۔ وہ قدم اٹھاتے تو اس قدر بے دلی کے ساتھ گویا کسی کا غیر مرئی ہاتھ انھیں مجبور کرتا رہتا تھا۔ ایک دم ایسا گمان ہوتا تھا کہ شاید زندگی کی حرکت کے ساتھ ساتھ ان کی آواز بھی کہیں گم ہو گئی ہے۔ اتنی مدھم آواز کہ اس کے مقابلے میں جنگل بیابان کے سناٹے کو شور و غل کہا جا سکتا تھا۔ کھڑکھڑکی چرخ چوں، دروازوں کے کھلنے بند ہونے کی کھڑبڑ، اور پھیری والوں کی صدائیں، ان سب میں ایک قسم کی بے دلی، گراوٹ، اور پھیکا پن پایا جاتا تھا۔ جس طرح نمک کی کان میں پہنچ کر ہر چیز نمک بن جاتی ہے۔ اسی طرح ان کے ساتھ اُٹھ بیٹھ کر ہر شخص بہت جلد بے حس ہو جاتا تھا۔
گرجا کی گھنٹیاں کسی نہ کسی کے ماتم کا پتا دیتی رہتیں۔ ان کی دل سوز آواز سے میرے کان ہمیشہ گونج اُٹھتے۔ مجھے گمان ہوتا کہ شاید وہ صبح سے شام تک بغیر تھمے بغیر رُکے منڈی کی ساری فضا پر چھائی رہتی ہے۔ وہ میرے خیالات اور احساسات کے ساتھ پوری طرح گھل مل گئی تھی۔ اس نے چاندی کے خول کی طرح میرے دل کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔
چھتوں سے کھُرچی ہوئی برف پر، برف سے ڈھکی ہوئی زمین پر غرض کائنات کے ہر ذرے پر سوگواری اور سرد مہری طاری رہتی۔ کارخانے کی چمنیوں سے اور انسان کے سینے سے بھی سوگواری دھنواں بن کر نکلتی اور فضا میں تحلیل ہو کر آسمان کے خلا میں کہیں چھپ جاتی۔

ان لوگوں کا رنگ ڈھنگ ہی عجیب تھا۔ ان کے پسینے کی طبیعت کو کند کر دینے والی بدبو، چربی اور تیل سے چکٹا ہوا لباس، چولھے اور چراغ سے نکل کر ہر چیز پر جم جانے والے دھوئیں کی کالک، یہ سب ان کی زندگی میں اس طرح رس بس گئی تھیں کہ خود زندگی کا ایک مستقل جزو معلوم ہوتی تھیں۔ اس فضا کی گھناؤنی بو دماغ پر اس طرح مسلط ہو جاتی تھی جیسے جاڑے کا اونی کنٹوپ سارے سر پر منڈھ لیا جائے۔ اس کے اثر سے ایک قسم کی غنودگی ایک خود فراموش محویت طاری ہو جاتی۔ جی چاہتا کہ آنکھیں بند کر کے چپ چاپ لیٹ جاؤ۔ یا بے تحاشا چیخ چیخ کر اپنا گلا پھاڑ لو۔ اس ساری نگری کو چھوڑ کر کہیں بھاگ جاؤ اور اگر اس طرح بھی تسکین نہ ہو تو کسی کا سر دیوار سے ٹکرا کر خود بھی مر جاؤ۔

میں سوداگروں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گھورتا۔ ان کی وہ آنکھیں جن میں ہر وقت نیند سی چھائی رہتی تھی۔ وہ مُنہ پھاڑ پھاڑ کر جمائیاں لیتے کمر میں بل ڈال ڈال کر انگڑائیاں لیتے، لیکن ان کی سستی کسی عنوان دور نہ ہو سکتی۔

جاڑا آتے ہی تجارت کا بازار کافی سرد پڑ جاتا۔ اور لوٹ کھسوٹ کی وہ امنگ جو گرمیوں میں کچھ عرصے کے لیے ان کو خوش طبع اور زندہ دل بنا دیتی تھی۔ اس موقع پر بالکل فنا ہو کر رہ جاتی۔ گدھے کی جھول کی مانند بھاری بھاری سموری کوٹ ان کی رفتار کو بہت سست کر دیتے اور انھیں خواہ مخواہ اس بوجھ سے زمین کی طرف جھک جانا پڑتا یوں تو وہ ضرورت سے زیادہ منمنا کر باتیں کرتے لیکن جب کسی بات پر جوش آجاتا تو آندھی اور بارش کے طوفان بھی ان کے غصے کا مقابلہ

نہ کر سکتے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ کبھی کبھی وہ ایسی حرکتیں محض اس لیے کرتے کہ لوگ جان لیں کہ ان کی رگوں کا خون گردش میں ہے۔ وہ مرے نہیں اسی دلیل سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ان کی طبیعت میں حد درجہ ہلاکت پسندی اور بے معنی کھلنڈرا پن کیوں تھا۔ واقعات اور ماحول کی سوگواری ان کی روح پر اس درجہ حاوی تھی اور ان کو کچل رہی تھی کہ اس کی بے پناہ قوتوں کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرنا ممکن نہیں تھا۔ البتہ یہ ان کے امکان میں تھا کہ دوسروں کو ستا کر ہی اپنے آپ کو خوش کر لیں۔

پیٹر کو مجھ سے کچھ للّٰہی نفرت تھی اور اسی لیے موقعے تلاش کر کے فقرے کستا رہتا تھا۔ لیکن جہاں تک کتابوں کے مطالعے اور ان سے واقفیت کا تعلق ہے وہ میری قدر کرتا تھا۔ اگر کبھی کسی معقول موضوع پر بحث چھڑ جاتی تو بڑی سنجیدگی سے گفتگو کرتا اور مفید مشورے دیا کرتا تھا۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ اس نازک مسئلے پر جس نے میرے دل میں ایک نامعلوم خلش پیدا کر دی تھی تبادلۂ خیالات کروں۔ اور ایک روز موقعہ پاکر میں نے سلسلہ شروع کر دیا۔

"یہ سوداگر لوگ جس قسم کی زندگی بسر کرتے ہیں مجھے بالکل ناپسند ہے"

اس نے اپنی ڈاڑھی کی ایک لٹ کو مروڑی دیتے ہوئے جواب دیا۔

"بھلا تم کیا جانو کہ وہ کس قسم کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ کیا تم نے کبھی ان کے گھر کی چار دیواری میں جا کر ان کے رنگ ڈھنگ دیکھے ہیں؟ میاں صاحبزادے! بازار صرف کاروبار کے لیے ہے۔ زندگی گزارنے کے لیے نہیں ہے۔ یہ سوداگر لوگ صبح سے شام تک خرید و فروخت

کرتے ہیں اور جس قدر جلد ممکن ہو سکے اس سے چھٹکارا پاکر گھر چلے جاتے ہیں ۔ بازار میں چلنے پھرنے والے سر سے پانو تک کپڑوں میں لپٹے رہتے ہیں اور کوئی نہیں جانتا کہ ان پردوں کی اوٹ میں کون کس طبیعت کا ہے ۔ انسان کی اصلی قلعی گھر جانے کے بعد کھلتی ہے ۔ گھر کی چار دیواری میں وہ کس طرح رہتا ہے ؟ گھر والوں سے کس طرح برتاو کرتا ہے ؟ اور اس سلسلے میں تم کچھ بھی نہیں جانتے ۔"

"یہ میں تسلیم کرتا ہوں لیکن وہ گھر کے اندر ہوں یا گھر کے باہر ان کی طبیعت کے اصلی جوہر اپنا رنگ ضرور دکھاتے ہیں ۔ ماحول بدلنے کے ساتھ معمولی فرق پڑ جانا ممکن ہے ۔ لیکن بالکل مختلف ہو جانا قرین قیاس نہیں ۔"

"تم تو خیر بہت دور ہو ۔ کوئی شخص ٹھیک طور پر یہ بھی نہیں جانتا کہ اس کی بابت اس کے پڑوسیوں کی کیا رائے ہے ۔ انسان کے خیالات تعداد میں ستاروں سے زیادہ ہوتے ہیں ۔ جن کا شمار نہیں ہو سکتا ۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ ایک شخص اپنے گھر پہنچ کر گھٹنوں کے بل گر پڑے اور گڑگڑا کر خدا سے التجا کرے "میرے مالک! مجھے معاف کر دے ۔ میں نے آج کا سارا دن بیہودگی اور لغویت میں خراب کر دیا ۔" اس طرح اس کے گھر کی چار دیواری اس کے لیے سب سے بڑی عبادت گاہ ہے ۔ جہاں رہتے ہوئے وہ بالکل تنہا خدا کی بارگاہ میں پہنچ جاتا ہے ۔ مثل مشہور ہے کہ کتا اپنے گھر میں شیر ہوتا ہے ۔ پھر اگر تم اس کی اصلیت کو اس دکان پر جا کر سمجھنا چاہو جہاں وہ جھوٹے ٹکڑوں اور چوسی ہوئی ہڈیوں کے لالچ میں کھڑا دم ہلاتا رہتا ہے تو یہ زبردست غلطی ہوگی ۔"

سنجیدہ گفتگو کرتے وقت اس کی آواز مدھم ہوتے ہوتے سرگوشی کی حد تک پہنچ جاتی تھی اور ایسا معلوم ہونے لگتا تھا گویا وہ کوئی بہت بڑا راز بے نقاب کر رہا ہی۔

"تم یہاں رہ کر لوگوں کو سمجھنا چاہتے ہو۔ اور خصوصاً اس عمر میں زندگی کے اس دور میں صرف آنکھ کھول کر مشاہدہ کرنا چاہیے۔ دماغ کھپانے کی ضرورت نہیں۔ جو کچھ تم دیکھو اسے اچھی طرح یاد رکھو، لیکن زبان سے کچھ نہ کہو۔ دماغ کاروبار کی گتھیاں سلجھانے کے لیے ہی اور دل روح کی حقیقت سمجھنے کے لیے۔ اس عمر میں تمھارے لیے یہی مناسب ہی کہ بس کتابیں پڑھے جاؤ۔ لیکن ہر معاملے میں اعتدال ہونا چاہیے۔ دنیا میں ایسی مثالیں بھی ہیں کہ لوگ ضرورت سے زیادہ پڑھ کر پاگل ہوگئے یا خدا کے منکر۔"

میں اس کو غیر فانی سمجھنے لگا۔ میرے لیے یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ وہ زیادہ بڈھا ہوکر بدل جائے گا۔ وہ ایسے سوداگروں اور ساہوکاروں کے قصے بڑی دلچسپی سے سناتا جو شہر بھر میں مشہور ہو چکے تھے۔ میں ایسی کہانیاں نانا جان سے بھی سُن چکا تھا۔ موضوع کے اعتبار سے ان میں کوئی فرق نہیں تھا۔ یعنی یہی کہ دولت بُری چیز ہی۔ انسان اس کے پھندے میں پھنس کر خدا سے منحرف ہوجاتا ہی اور گناہ کے جال میں پھنس جاتا ہی لیکن اس سے قطع نظر نانا جان کا انداز بیان بہت پیارا ہوتا تھا۔ پیٹر کو نوعِ انسانی سے کسی قسم کی ہمدردی نہیں تھی۔ لیکن خدا کا ذکر کرتے وقت بڑی گرم جوشی کا اظہار کرتا اور محویت کے عالم میں اس طرح آنکھیں بند کرلیتا گویا دل کی آنکھوں سے خدا کا دیدار کر رہا ہی۔"

"اور تو اور یہ مردود خدا تک کو دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں ہمارا آسمانی باپ ان کے ہتھکنڈوں کو خوب سمجھتا ہی اور اس لیے رو رو کر کہتا ہی۔" میرے بچو! آہ۔ میرے ناشاد بچو! دوزخ کی آگ تمھارے لیے روشن کی جا رہی ہی —"

ایک روز میں نے صرف مذاق کی غرض سے اسے یاد دلایا۔

"لیکن تم خود بھی تو غریب دیہاتیوں کو دھوکا دیتے ہو"

وہ یہ بات سن کر بالکل برہم نہ ہوا۔ معمولی طور پر کہنے لگا:۔

"میں ذاتی طور پر اسے کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ اگر میں ان سے چار پانچ رُپی اینٹھ بھی لوں تو اس سے ہوتا کیا ہی۔ اتنی حقیر رقم سے نہ ان کا دیوالہ نکل سکتا ہی نہ میں لکھ پتی بن سکتا ہوں"

وہ میرے ہاتھ سے کتاب چھین لیتا اور اس وقت تک میں جو کچھ پڑھ چکا ہوتا اس پر جرح کرتا۔ وہ چاہتا تھا کہ میری غلطیاں پکڑے۔ وہ حیرت اور تعجب کا اظہار کرتے ہوئے دُکان دار کو مخاطب کر کے کہتا:۔

"ذرا اس ٹانگ برابر کے چھوکرے کو تو دیکھو۔ اسے گھمنڈ ہی کہ یہ کتابوں کو خوب سمجھ بوجھ کر پڑھتا ہی"

اور اس کے بعد وہ ایک بصیرت افروز تقریر شروع کر دیتا۔ ایک ایسی تقریر جو یاد رکھنے کے لائق ہوتی تھی۔

جو کچھ میں کہوں، اسے کان کھول کر سنو۔ یہ باتیں تمھاری زندگی میں کام آئیں گی۔ بہت عرصہ ہُوا دو لاٹ پادری گزرے ہیں۔ ایک اسکندریہ میں رہتا تھا اور دوسرا یروشلم میں۔ اسکندریہ والے نے نسٹوریس نامی دہریے کے خلاف زبردست جہاد کیا۔ اس دہریے کے اقوال

بڑے گمراہ کن ہوتے تھے۔ وہ کہتا تھا کہ مریم کے خمیر میں روزِ اول سے گناہ کا جزو شامل تھا اور اس لیے غیر ممکن تھا کہ وہ کسی خدا کو جن سکتیں۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُنھوں نے ایک برگزیدہ ہستی پیدا کی جسے بعض خصوصیات کی بنا پر "مسیحا" یا دنیا کو نجات دلانے والا کہا جا سکتا ہے۔ وہ صرف عیسٰی کی ماں تھیں اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ سمجھے برخوردار! اسی کا نام دہریت ہے۔ اور یروشلم والے پادری نے آریائی نسل کے دہریوں کو خوب منہ توڑ جواب دیے۔"

مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی تھی کہ اس نے مذہبی تاریخ کا خوب مطالعہ کیا ہے۔ وہ بالکل مولویانہ انداز میں ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑے فخر سے کہتا:۔

"گزرے ہوئے زمانے کی یاد میرے دم سے قائم ہے۔ میں تاریخ کا زبردست ماہر ہوں۔ ایک دفعہ ماسکو کے دورانِ قیام کا ذکر ہے خود مجھے کافروں کے خلاف ایک مذہبی مناظرے میں حصہ لینا پڑا۔ وہاں بڑے بڑے دین دار اور دنیا دار سبھی قسم کے لوگ موجود تھے۔ تم یقین نہیں کرو گے میں نے اپنی تقریر سے مشہور عالموں اور فاضلوں کو محوِ حیرت کر دیا۔ ایک پادری کو ایسے آڑے ہاتھوں لیا کہ اس غریب کو بھاگتے ہی بنی۔ اور اس کے دماغ پر ایسا اثر ہوا کہ نکسیر پھوٹ گئی۔ خون بڑی مشکل سے بند ہو سکا۔

اس کا چہرا تمتما اٹھا اور آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔

اس نظریے کی داد نہیں دی جا سکتی کہ مخالف کی نکسیر کا پھوٹ جانا کامیابی کی سب سے بڑی علامت ہے۔ ایک ایسا افتخار جسے سونے کے حروف سے لکھوا کے چوکٹے میں جڑوا لیا جائے۔ قصے کا باقی حصہ اس نے خوب

نمک مرچ لگاکر بیان کیا۔

"وہ پادری بہت خوب صورت اور مردِ معقول تھا۔ وہ صدر مجلس کے پاس چبوترے پر کھڑا تھا اور اس کی ناک شریف سے خون کی پیاری پیاری بوندیں ٹپ ٹپ گر رہی تھیں۔ اسے چاہیے تھا کہ کہیں جاکر شرم سے ڈوب مرتا۔ لیکن نہیں۔ وہ بپھرے ہوئے شیر کی طرح وہیں کھڑا غراتا رہا۔ اس کی آواز بانگ دُہل سے زیادہ کرخت تھی۔ میں نے اپنی زبان کو قابو میں رکھا۔ بالکل تیزی نہ آنے دی اور نتیجہ یہ کہ میرے الفاظ تیر کی طرح اس کے سینے میں پیوست ہوتے چلے گئے۔ اس کے تن بدن میں آگ لگ رہی تھی اور بس یہی اس کے کیے کی سزا تھی۔"

کبھی کبھی چیزوں کی قیمت پرکھنے کے لیے دوسرے لوگوں کو بھی بلایا جاتا۔ ان میں سے بعض قابل ذکر ہیں۔ پاخومی کی موٹی تازی توند، چکٹے ہوئے کپڑے، بھینگی آنکھیں اور جھریایا ہوا چہرا ابھی تک یاد ہے۔ جو قیان بڈھا ہونے کے باوجود صاف ستھرا اور نرم دل تھا لیکن اس کا ساتھی ایک گاڑی بان کی طرح بالکل اول جلول تھا۔ خوب صورت ہونے کے باوجود اسے دیکھ کراہت پیدا ہوتی تھی۔ اس کے چہرے کی افسردگی اس بات کا پتا دیتی تھی کہ وہ زندگی ہی میں مرچکا ہے۔ کبھی اس کی آنکھوں میں چمک یا ہونٹوں پر تبسم نظر نہیں آیا۔ ہمیشہ یہ لوگ بیچنے کے لیے کچھ نہ کچھ اپنے ساتھ لاتے تھے۔ قدیم کتابیں، مورتیں، اگردان یا عہد عتیق کا کوئی تاریخی پیالہ۔ اگر خود ان کے پاس کوئی چیز نہ ہوتی تو وہ کسی اور بیچنے والے کو ساتھ لے آتے۔ اور آپ دلال بن کر بھاؤ تاؤ کرانے لگتے۔ جب یہ دُکان داری ختم ہوجاتی تو وہ میز پر چڑھ بیٹھتے اور پیاسے کوّوں کی

طرح چائے کے گھونٹ جلدی جلدی حلق سے اتارنے لگتے۔ وہ ایک دوسرے سے کہتے کہ کافروں نے بڑا ظلم ڈھا رکھا ہے ان سے کس طرح چھٹکارا پایا جائے۔

وہ کہتے کہ دیکھو فلاں شخص کے مکان پر چھاپا مارا اور مقدس کتابیں ضبط کر کے لے گئے۔ پولیس نے فلاں عبادت گاہ پر زبردستی تالا جڑ دیا اور اب اس کے متولی پر دفعہ ۱۰۲ کے ماتحت مقدمہ چلانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ان کی اکثر بحثوں میں دفعہ ۱۰۲ تکیۂ کلام بن جاتی تھی۔ ایسی گفتگو کے وقت وہ بہت آہستہ بولتے۔ شاید انھیں دیوار کے کانوں سے بھی ڈر لگتا تھا۔ انھیں اندیشہ رہتا کہ کہیں سردی کے پالے کی طرح کوئی نئی مصیبت اچانک نازل نہ ہوجائے۔ اس ساری گفتگو کا خلاصہ صرف چند لفظ ہوتے تھے۔ پولیس، تلاش، جیل، عدالت، انصاف، جلاوطنی، سائبیریا اور دفعہ ۱۰۲۔ یہ الفاظ بہت دیر بعد تک میرے کانوں میں گونجتے رہتے تھے۔ مجھے غصہ آتا کہ آخر مذہبی عقائد کے سلسلے میں اتنا ظلم وستم کیوں روا رکھا جاتا ہے۔ میرے سینے میں آگ بھڑک اٹھتی لیکن ان لکیر کے فقیر پرانے عقائد کو ماننے والوں کے ساتھ محض اظہار ہمدردی کے سوا اور کیا ہوسکتا تھا۔ کتابوں کے مطالعے نے میرے دل میں ان لوگوں کی عظمت پیدا کردی تھی جو اپنی مرادیں برلانے کے لیے پورے استقلال سے کام لیتے ہیں۔ اسے اپنا ایمان سمجھتے ہوئے پابجائے رکھتے ہیں۔

زندگی کے رموز سمجھانے والے اُستادوں کی بُرائیاں میرے حافظے کی لوح سے مٹ چکی ہیں۔ البتہ ان کی کاوش ہٹ دھرمی کے

پس منظر میں ان کی مذہبی تعلیمات اور کبھی نہ ڈگمگانے والے عقائد کی روشنی اپنی جھلک دکھاتی رہتی ہے۔ وہ کس طرح ان کی خاطر بڑی سے بڑی مصیبت جھیلنے کے لیے تیار ہوجاتے تھے۔

یہ ہٹ دھرم اور پُرانے عقیدوں کے محافظ ہماشما ہی میں نہیں بلکہ خاص خاص عقل مندوں میں بھی موجود تھے۔ اب ان کا تصور کرکے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ ہٹ دھرمی ان اہل مشرق کی مجہولیت کا عکس تھی۔ جو ”زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد“ کے مصداق جس بات پر جم جاتے آخر وقت تک جمے رہتے تھے۔ اُنھوں نے اپنے گھسے گھسائے خیالات کو جن مضبوط بندھنوں سے جکڑ رکھا تھا۔ ان کی گرہ عقل کے ناخن سے بھی نہیں کھل سکتی تھی۔ تاثرات کے جس بھنور میں ڈوب چکے تھے اس میں گہرائی کے سوا اُبھار کا نام نہیں تھا۔ ان کے ارادوں کا چکر ایک خاص منزل تک پہنچ کر ٹھیر گیا تھا۔ اور اس لیے انھیں مستقبل کی کبھی فکر نہیں ہوتی تھی البتہ جب کوئی بیرونی قوت انھیں خوب جھنجھوڑ کر اس جگہ سے ڈھکیل دیتی تو پھر ان کے لیے کہیں رُک پڑنا مشکل ہوجاتا۔ وہ اس طرح کہیں سے کہیں پہنچ جاتے جیسے پہاڑ کی چوٹی سے لڑھکتا ہوا پتھر صرف دامن میں پہنچ کر سانس لیتا ہے۔ وہ گزرے ہوئے زمانے کی یاد تازہ رکھنے اور دم توڑنے والی صداقتوں کو دوبارہ جنم دیتے رہنے کی غرض سے ویران قبرستانوں میں جاکر چلہ کشی کرتے، برت رکھتے اور ہر قسم کی مصیبت جھیلنے کے لیے تیار ہوجاتے۔ اگر ان سے کہا جاتا کہ یہ مقصد تکلیفیں برداشت کیے بغیر بھی حاصل ہوسکتا ہے تو کبھی تسلیم نہ کرتے بلکہ مخالفت کے لیے آمادہ ہوجاتے۔

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ عقائد جن کی روشنی میں وہ پورے اطمینان اور دل جمعی کے ساتھ سارے دُکھ سہ لیتے تھے ۔ بلا شبہ بڑے مضبوط اور راسخ عقائد تھے ۔ تاہم ان کی مثال ان پھٹے پُرانے چیتھڑوں سے زیادہ نہیں تھی جن پر خاک دھول کی کئی کئی تہیں جم چکی ہوں اور اس لیے زمانے کی تباہ کاریوں سے ان کا پامال ہوتے رہنا لازمی تھا خیالات اور احساسات تعصب اور کورانہ تقلید کی تنگ و تاریک فضا میں رہتے رہتے اس کے عادی ہو جاتے ہیں اور بے دست و پا اور مجبور محض ہونے کے باعث قائم رہتے ہیں ۔

وہ عقیدہ جس کو محض عادتاً یا رسماً اختیار کر لیا ہو ہماری زندگی کے لیے سب سے زیادہ خطرناک اور تکلیف دہ ہے ۔ ایسے عقائد کی محدود دنیا میں چاروں طرف گھرے رہ کر کوئی نئی چیز بہت دیر میں پیدا ہوتی ہے اور پھر جلدی ہی اپنی صورت بگاڑ کر فنا ہونی شروع ہو جاتی ہے ۔ اس اندھی تقلید میں دلی محبت کی چمک بہت کم ہوتی ہے اور بغض و عناد، رشک و حسد اور جرم و خطا کا دُھنواں اُٹھتا ہے جس کا لازمی نتیجہ نفرت و حقارت کے سوا کچھ نہیں نکلتا ۔ ایسی عقیدت کے شعلے دراصل فاسفورس کی اُن شعاعوں کے مانند ہیں جو مُردوں کی گلی سڑی ہڈیوں سے نکلتے رہتے ہیں ۔

لیکن اس سے قبل کہ میں ان حقیقتوں کو سمجھ سکوں مجھے زندگی کی بہت سی دردناک منزلیں طے کرنی پڑیں ۔ اپنے من کے مندر میں بہت سے بت بنا بنا کر مسمار کر ڈالے ۔ اور پھر حرفِ غلط کی طرح اپنے حافظے کی لوح سے ان کو مٹا کر رکھ دیا ۔ اول اول جب مجھے زندگی کے رموز

سمجھانے والے ان استادوں سے سابقہ پڑا، طبیعت کو اکتا دینے والی درد ناک فضا میں ۔ تو میں نے خیال کیا کہ روحانی قوتوں کے اعتبار سے وہ بہت بڑی ہستیاں ہیں اور غالباً دنیا میں ان کی نظیر کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتی لیکن ان میں سے تقریباً ہر ایک سزا یافتہ تھا ، وہ جیل کی تیرہ و تاریک کوٹھریوں میں رہ چکے تھے ۔ قیدیوں کی گاڑیوں میں ٹھونس کر ان کو وطن عزیز سے کوسوں دور کئی کئی بار جلا وطن بھی کیا جا چکا تھا ۔ وہ بالکل عام مجرموں کی طرح تھے ۔ ان کی زندگی کس درجہ پوشیدہ اور مذہبی نقاب کی آڑ میں چھپی ہوئی تھی ۔

پاخَومی تلخ شراب کے لمبے لمبے گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے اپنی دین داری کا ڈھول پیٹتا اور بڑے فخر کے ساتھ اپنے حافظے کی تعریف کرنے لگتا ۔ جس طرح مسلمان حافظ قرآن ہوتے ہیں ، بہت سی کتابیں اس کی بھی نوکِ زبان پر تھیں ۔ وہ کوئی صفحہ کھول کر ایک سطر پر انگلی رکھتا اور ٹھیک اسی جگہ سے صفحے کے آخر تک ساری عبارت بآسانی سُنا ڈالتا ۔ اس کی خاموش جھکی ہوئی نظریں ہمیشہ فرش کا جائزہ لیتی رہتی تھیں ۔ گویا کسی کھوئی ہوئی قیمتی چیز کی تلاش میں ہیں ۔

عموماً ایک ہی کتاب اس کی جیب میں ہوتی اور اگر اسے بھی کسی خاص ترکیب سے وہ اس طرح کھولتا کہ ایک ہی صفحہ نظر کے سامنے آجاتا جسے غالباً اس نے بڑی محنت سے رٹ رکھا تھا ۔ پیٹر ایسے موقعے کی تلاش میں رہتا اور کوئی نہ کوئی غلطی پکڑ کر خواہ مخواہ لفظی بحث شروع کر دیتا تھا ۔

"تم تو محض الفاظ سے کھیلتے ہو ۔" پاخَومی بگڑ کر کہتا ۔

"اور تم بھی مجھے طفلِ مکتب سمجھنا چھوڑ دو ۔" پیٹر اسی لہجے میں

جواب دیتا۔

دیکھتے ہی دیکھتے دونوں کے گلوں کی رگیں پھول جاتیں، چہرے غصّے سے تمتما اُٹھتے۔ وہ ایک دوسرے کو آنکھیں نکال کر گھورتے ہوئے ملامت کرنے لگتے:-

"او صداقت کے چہرے پر بدنما داغ لگانے والے! تجھے شرم آنی چاہیے"

پاخومی اس طرح جواب دیتا گویا کوئی بھولی ہوئی بات اسے ایک دم یاد آگئی ہے۔

"ارے تم خود بھی تو اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو۔ تم کس قدر آوارہ اور بد ذات ہو۔ ہمیشہ معصوم عورتوں پر ڈورے ڈالتے پھرتے ہو"

دکان دار اپنی آستینوں میں ہاتھ گھسیڑے مکارانہ طور پر مسکراتا رہتا، اور مذہب کے ان دونوں علم برداروں کو اس طرح شہ دیتا کہ وہ لڑائی سے باز نہ رہ سکتے۔

ایک دن جب کہ وہ دونوں بڈھے خوب تیزی سے جھگڑ رہے تھے، پیٹر نے بالکل غیر متوقع طور پر اپنے ساتھی کے منہ پر زور سے ایک تھپڑ رسید کر دیا۔ وہ گھبرا کر بھاگ نکلا اور یہ بھی پکڑنے کے لیے اس کے پیچھے دوڑ پڑا۔

"دیکھنا دیکھنا۔ جانے نہ پائے۔ اس حرام زادے نے گالیاں بکوا کر خواہ مخواہ میری زبان ناپاک کرا دی۔ میرے گناہوں کا بوجھ اسی کی گردن پر رہے گا۔ مردود کو شرم بھی تو نہیں آتی"

وہ اپنے ساتھیوں کو خصوصاً یہی کہہ کر ملامت کرتا کہ تم میں جوش

ایمان کی کمی ہے اور پیشین گوئی کے طور پر ڈراتا کہ ایک نہ ایک دن تم ضرور "غیر مقلد" ہو جاؤ گے"۔

"سمجھے بھائی الیکساشہ! یہ بات نہ ہو تو دنیا میں تمھیں کوئی تکلیف نہ پہنچے"۔

غیر مقلدوں سے اسے نفرت تھی اور بظاہر ان سے ڈرتا بھی تھا۔ لیکن جب اس سے پوچھا جاتا کہ "اس فرقے کے اصول کیا ہیں؟" تو اس کا جواب کچھ زیادہ فاضلانہ نہیں ہوتا تھا۔ وہ کہتا:

"اس فرقے کے لوگ اول درجے کے بدعتی ہوتے ہیں۔ وہ ہر بات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں اور خدا کو نہیں مانتے۔ وہ اس انجیل کے سوا کچھ نہیں پڑھتے جسے جرمنی کے ایک باشندے "لوتھر" نے مرتب کیا تھا۔ ذرا سوچو تو کہ "لوتھر" جس مصدر سے بنا ہے اس کے معنی: "غضبناک" ہیں۔ خدا ہم کو مغرب کے گمراہوں اور ان کی بدعتوں سے محفوظ رکھے"۔

پھر اپنا پانو زمین پر پٹکتے ہوئے زوردار لہجے میں کہتا۔

"تم دیکھ لینا۔ ان کو اس زمانے کے نئے دین دار فنا کر کے چھوڑیں گے۔ صرف اس بات کی ضرورت ہے کہ ان کی باقاعدہ نگہداشت کی جائے اور جب ہاتھ لگیں سب کو جلا ڈالا جائے۔ تاہم یہ ہمارا کام نہیں ہے کیونکہ ہم ٹھہرے اصل مذہب کے ماننے والے۔ وہ مذہب جو ہر اعتبار سے خالص مشرقی اور بالکل مکمل ہے۔ ہم سب مشرقی ہیں لیکن اب بعض افراد پر مغربی رنگ چڑھ چلا ہے۔ وہ مذہب کو بھی عقل کے ذریعے سمجھنا چاہتے ہیں۔ اہل جرمن کا تو خیر ذکر ہی کیا۔ فرانسیسیوں نے کون سے

نیک کام کیے ہیں۔ اُنھوں نے ۱۲ء میں ۔"

اپنے جذبات کی رو میں بہ کر وہ بھول گیا کہ ایک کمسن لڑکا اس کے سامنے کھڑا ہے۔ اس نے میری بیٹی اپنے قوی ہاتھوں سے پکڑ لی۔ کبھی مجھ کو اپنی طرف کھینچا اور کبھی اور دھکیل دیا، کیونکہ انتہائی جوش کے عالم میں وہ آپے سے باہر ہُوا جا رہا تھا۔ پھر نہایت خوب صورت انداز میں کہنے لگا:۔

"انسان کا دماغ ایک وسیع جنگل ہے جس میں اس کے خیالات ہمیشہ بھٹکتے پھرتے ہیں۔ روح انسان کے لیے سب سے بڑا عطیہ ہے۔ لیکن بھٹکا ہُوا دماغ اسے طاق نسیاں پر رکھ کر شیطان کا چیلا بن بیٹھتا ہے۔ نجانے شیطان کی ذریات کو کس بات کا گھمنڈ ہے۔ غیر مقلّدوں کے سب سے بڑے پیشوا کا قول ہے کہ شیطان خدا کا بیٹا اور یسوع ناصری کا بڑا بھائی ہے۔ تعجب ہے کہ اس قدر دماغ سوزی کے بعد وہ پہنچے بھی تو کیسے بچر نتیجے پر۔ وہ لوگوں کو یہ بھی نصیحت کرتے ہیں کہ اپنے بزرگوں کا کہا مت مانو، کام کاج پر لات مارو۔ بیوی بچوں کو چھوڑ کر دور بھاگ جاؤ۔ یہ سب زندگی کا جنجال ہے۔ گھر بار کو خیر باد کہ کر جو من میں آئے کرو۔ شیطان تمھاری مدد کرے گا۔ سنا گیا ہے کہ وہ الیکسانشہ اب یہاں بھی آ دھمکا ہے۔"

عین اس وقت دُکان دار نے مجھے کسی ضروری کام میں لگا دیا۔ اور مجھے بڈھے کو تنہا چھوڑ کر دُکان کے اندر گھس جانا پڑا۔ تاہم وہ وضع کا پابند پھر بھی خاموش نہ ہوا۔ کوئی اور نہیں تو دیوار ہی سے گفتگو کرتا رہا:۔ "اے بے دست و پا روح! اے آنکھوں کی اندھی! بتا تجھ

سے بچنے کے لیے میں کدھر بھاگوں ؟"

اور پھر کرسی کے سہارے اپنا سر پیچھے کی طرف جھکا لیا۔ خاموشی طاری ہوگئی اور وہ بے حس و حرکت ہوکر آسمان کی لا نہایت وسعتوں میں کسی چیز کو گہری نظر سے ڈھونڈھنے لگا۔

اِسے میرا زیادہ خیال رہنے لگا۔ اس کے برتاؤ میں بھی کسی قدر نرمی پیدا ہوگئی۔ جب کبھی مجھے مطالعے میں مشغول دیکھتا تو قریب آکر سرسری نظر ڈالتے ہوئے کہتا

" پڑھو۔ صاحبزادے! پڑھے جاؤ۔ یہ تمھاری آیندہ زندگی میں کام آئے گا۔ مانا کہ تم بہت ہوشیار ہو لیکن افسوس ہی کہ تم اپنے سے بڑے کا ذرا بھی لحاظ نہیں کرتے۔ تمھارا خیال ہی کہ تم ہر کسی کا مقابلہ کرسکتے ہو لیکن تمھاری یہ گستاخیاں کبھی نہ کبھی رنگ لائیں گی۔ یہ بھی جانتے ہو؟ سنو صاحبزادے! تم جیل جانے کا راستہ اپنے لیے صاف کر رہے ہو۔ جو چاہو پڑھو۔ لیکن یاد رکھو کہ یہ صرف کتابیں ہیں۔ تمھیں اپنی عقل سے کام لینا ہوگا۔ ایک اچھے معقول آدمی نے بہت سی نئی پرانی کتابیں پڑھ کر یہ فیصلہ کیا کہ انھیں دنیا میں رہنا نہیں چاہیے اور اس لیے ان کو ایک بوری میں بند کرکے دریا میں ڈبو دیا۔ اس میں شک نہیں کہ اس نے زبردست حماقت کی۔ لیکن ــــ اور اب وہ کتے کا پلاّ الیکسا شہ ہمیں آکر ستائے گا"

یہ خوف اس کے دل و دماغ پر بُری طرح مسلط ہوگیا تھا۔ چنانچہ ایک روز عجیب کھوئی ہوئی حالت میں آیا اور دُکان دار سے کہنے لگا۔ ابھی سنکر آیا ہوں کہ الیکسا شہ ہمارے شہر میں آگیا ہی میں بہت

عرصے سے اس کی تلاش میں تھا۔ لیکن وہ آتے ہی کہیں روپوش ہو گیا۔
دُکان دار نے بالکل بے پروائی سے جواب دیا۔
"مجھے کچھ خبر نہیں کہ وہ کون ہے اور کیوں آیا ہے"۔
بڈھے نے مایوسی سے سر جھکا کر کہا۔
"اچھا تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ تمھاری دنیا میں صرف سوداگر ہیں اور خریدار۔ ان کے علاوہ کوئی نہیں ۔ خیر چائے پلواؤ"۔

جب میں چائے دانی لے کر آیا تو دُکان میں کچھ ملنے والے موجود تھے ۔ بڈھا لوقیان ایک طرف کھڑا مسکرا رہا تھا اور دروازے کے پیچھے تاریک گوشے میں ایک اجنبی شخص بیٹھا تھا اس نے ایک بد وضع ٹوپی اپنے سر پر بُری طرح منڈھ رکھی تھی ۔ اس کا چہرا بالکل صاف نظر نہیں آ رہا تھا تاہم یہ اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ بہت خاموش طبع اور کم سخن ہے۔ اس کی ظاہری حالت ایسے دُکان دار سے ملتی جلتی تھی جو اچانک دیوالہ نکل جانے کے باعث حد درجہ افسردہ اور غمگین ہے۔

پیٹر نے اس کی طرف نظر اٹھا کر تو نہیں دیکھا تاہم ذرا سخت اور زور دار لہجے میں کوئی بات ضرور کہی۔ وہ بار بار ٹوپی کو ضرورت سے زیادہ جھکا کر منہ چھپانے کی کوشش کرتا رہا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے داہنے ہاتھ میں ایک قسم کی تھرتھری پیدا ہو چلی ہے۔ اس کے بعد سے اس کی ٹوپی کو قرار نہ ملا ۔ کبھی ماتھے کی حد تک آگے کھسک آتی اور کبھی پیچھے ہٹ کر آدھی چندیا کو بھی ننگا کر دیتی ۔ اس کی اضطراری کیفیت نے میرے دل میں پگلے فقیر کی یاد تازہ کر دی ۔ ہم بچپن میں اِگوشا کو چھیڑتے تھے کہ تیری جھولی میں موت رہتی ہے۔

پیٹر نے طعن آمیز لہجے میں کہا: "دریا کو بہت سے مکروہ جانور ہر وقت گھنگولتے رہتے ہیں اور اس طرح پانی کبھی پاک صاف نہیں رہ سکتا۔"

نووارد جو اپنی ظاہری وضع قطع سے بالکل دُکان دار جچتا تھا یہ سُنتے ہی تلملا اُٹھا لیکن بڑی سنجیدگی سے پوچھا:-

"کیا جناب کا روئے سخن میری طرف ہے؟"

"معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔"

اب نووارد نے کھری کھری سُنانی شروع کی۔ "بہت خوب! لیکن اے شخص تو خود کیا ہے۔ کیا تیرا شمار ان مکروہ جانوروں میں نہیں ہے؟"

"میں جیسا بھی ہوں، میرا خدا جانتا ہے۔ تمھیں ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں۔"

"سروکار کیوں نہیں۔" اس نے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا: "اے شخص! سچائی کی طرف سے منہ مت موڑ اور جان بوجھ کر اندھا نہ بن۔ یہ مذہبی اور اخلاقی دونوں اعتبار سے زبردست گناہ ہے۔"

مجھے یہ بات بھلی معلوم ہوئی کہ نووارد نے پیٹر کو "اے شخص" کہہ کر مخاطب کیا اور غصہ ہونے کے باوجود اپنے لہجے میں ترشی نہ آنے دی وہ اس طرح گفتگو کر رہا تھا جیسے کوئی عبادت کے وقت خدا سے ہم کلام ہوتا ہے۔ وہ کرسی پر سے اُٹھ کھڑا ہوا اور دونوں ہاتھ دعا مانگنے کے انداز میں پھیلا کر کہنے لگا۔

"میرے متعلق کوئی غلط رائے قایم مت کرو۔ میں نے تم سے زیادہ سنگین گناہوں کا ارتکاب نہیں کیا ہے۔"

سماوار میں پانی اُبلنے سے کچھ سنسناہٹ پیدا ہو رہی تھی۔ اور اس

کے ساتھ ساتھ پیٹر کا لب و لہجہ زیادہ حقارت آمیز ہوتا جاتا تھا۔ دوسرا ان باتوں سے مرعوب نہ ہوا۔ اس کی زبان بھی کترنی کی طرح برابر چلتی رہی۔

"خدا بہتر جانتا ہے کہ روح القدس کی شان میں کس شخص نے زیادہ گستاخی کی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تم مجسم گناہ ہو۔ میں نے تمہاری طرح زیادہ کتابوں کا مطالعہ نہیں کیا اور نہ تم سے زیادہ ذوق ادب رکھتا ہوں لیکن میری زندگی بالکل سادہ اور بے عیب گزری ہے۔"

"جی ہاں۔ کیا کہنے تمہاری سادگی کے۔ ع "بس چپ رہو، ہمارے بھی منہ میں زبان ہے۔" ہم تمہاری بابت بہت کچھ سُن چکے ہیں۔ اور اب اس سے زیادہ سُننے کی ضرورت نہیں۔"

"تمہاری تحریروں سے بہت سے لوگ گمراہ ہو گئے۔ ان کے پیچھے ایمان میں فرق آگیا۔ کہاں تک بیان کروں۔ بس اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"تم کافر ہو۔ کافر۔" پیٹر اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔

نو وارد نے دونوں ہاتھ اس طرح منہ کے سامنے پھیلا رکھے تھے گویا ان پر لکھی ہوئی عبارت پڑھ رہا ہے۔ کچھ دیر بعد ذرا جھک کر بولا۔ "کیا تم سمجھتے ہو کہ لوگوں کو ایک گڑھے سے نکال کر دوسرے گڑھے میں دھکیل دینا کوئی اچھی بات ہے؟ میں کبھی نہیں مان سکتا۔ اے شخص! کیوں نہ ہم آزاد ہو جائیں۔ یہ گھر بار، یہ سازو سامان، یہ بیوی بچے سب اس دنیا کے بکھیڑے ہیں۔ خدا کی نظر میں ان کی کوئی وقعت نہیں۔ اپنے آپ کو ان بندھنوں سے آزاد کر دو جن کی خاطر آپس میں جھگڑا پڑتا ہے ہم ایک دوسرے کو نوچتے کھسوٹتے ہیں۔ سونے چاندی کی چیزیں اور

یہ قیمتی اشیا ان سے کیا ہوتا ہے۔ بدمعاشی، ریاکاری اور ہر قسم کا گناہ ان سے بچنا چاہیے۔ روح کو سچی شانتی روئے زمین پر کہیں نہیں مل سکتی صرف جنت کی فضا اس کے لیے موزوں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ دنیا کی آلائشوں سے آزاد ہو جاؤ۔ ان زنجیروں کو اتار پھینکو۔ بندھنوں کو توڑ دو آسمانی باپ کے دشمنوں نے مکر و فریب کا جال بن کر سارے جہان پر پھیلا رکھا ہے۔ کسی نہ کسی طرح اس سے بچ نکلو۔ میں سیدھی راہ چل رہا ہوں۔ میری روح بھٹک نہیں سکتی۔ میں اس تاریک دنیا سے بہت بلند ہوں۔"

"اور میرا خیال ہے تم کھانے پینے اور پہننے کی چیزوں سے بہت بلند ہو۔ ان کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ یہ سب اسی دنیا کی آلائشیں ہیں۔"

لیکن ان الفاظ کا ایکاشہ پر مطلق اثر نہیں ہوا۔ وہ زیادہ جوش و خروش کے ساتھ بولتا رہا۔ اس کی آواز مدھم ہونے کے باوجود صدائے ناقوس کی طرح گونج رہی تھی۔

"اے شخص! بتا تجھے کون سی شے سب سے زیادہ عزیز ہے؟ تو خدا کے سوا اور کس کو ترجیح دے سکتا ہے۔ میں ہر عیب سے پاک و صاف ہو کر اس کے سامنے کھڑا ہوں۔ تو بھی اپنے من سے دنیا کی چاہت کو نکال دے اور خدا کی طرف دیکھ۔ اس طرح کہ صرف تو ہو اور وہ ذات پاک۔ پھر تو خدا کی طرف کھنچتا چلا جائے گا۔ اس تک پہنچنے کی صرف یہی ترکیب ہے۔ اسی طرح روح کو نجات مل سکتی ہے۔ ماں باپ کو چھوڑ۔ بیوی بچوں کو خیرباد کہہ اور اگر تیری آنکھیں ترغیب معصیت دیتی ہیں تو انھیں بھی نکال کر پھینک دے۔ خدا کو خوش کرنے کے لیے اپنے جسم کو

فنا کر دے مگر روح کو بچائے۔ من کے مندر کو پاک صاف کر کے روح کو مسکن بنا۔ اور اس کو دیر تک اسی میں رہنے دے۔"

"بہت خوب!" پیٹر نے کھڑے ہوتے ہوئے جواب دیا:۔

"تمہاری مثال ایسی ہے جیسے کوئی تھوک کر چاٹ لے۔ میں سمجھتا تھا کہ تمھیں ایک سال کے عرصے میں کچھ نہ کچھ عقل آگئی ہوگی لیکن تم اور بھی زیادہ بدھو ہوگئے ہو۔ زیادہ گاؤدی اور کوڑھ مغز۔"

بڈھا یہ حکم لگاکر دکان سے کٹہرے کی طرف بھاگ نکلا اور ایلکساشہ حیران و پریشان اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ اس نے فوراً متعجب ہوکر پوچھا

"کیا یہ چل دیا۔ اب نہیں آئے گا؟ آخر اس طرح بھاگنے کی ضرورت کیا تھی؟"

لوقیان نے آنکھ کے اشارے سے تسلی دیتے ہوئے کہا:۔

"بس بس۔ اسی میں تمہاری جیت ہے۔"

یہ سنتے ہی ایلکساشہ اس پر پل پڑا۔"

"اور تم۔ تم بھی کیا ہو۔ اوّل درجے کے زمانہ ساز۔ تمہاری بیہودہ بکواس کا سر پیر نہیں ہوتا۔ خیر۔ تم پر خدا کی رحمت ہو۔"

لوقیان یہ سن کر مسکرایا اور خود بھی کٹہرے کی طرف چلا گیا۔ اب ایلکساشہ کو دکان دار کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ بڑے فخر کے ساتھ کہنے لگا۔

"میرے مقابلے میں یہ لوگ ٹھہر نہیں سکتے۔ میں دعوے سے کہتا ہوں جس طرح کالے کے سامنے چراغ جلنا مشکل ہے۔ یہ بھی میرے حملوں کی تاب نہیں لا سکتے۔"

دکان دار نے ایک اچٹتی ہوئی نظر اس پر ڈالی اور بڑے

روکھے پن سے کہا:

"میں اس قسم کے معاملات میں حصہ نہیں لیتا"

"ہیں! کیا تمھارا یہ مطلب ہے کہ تم اس طرف توجہ نہیں کرتے؟ یہ زندگی کے وہ مسائل ہیں جن پر غور کرنا ضروری ہوتا ہے"

وہ سر جھکائے دو ایک لمحے تک خاموش بیٹھا رہا۔ پھر بڈھے نے اسے آواز دی اور وہ تینوں وہاں سے چل دیے۔

شام کے وقت مناسب موقع دیکھ کر میں نے بڑے کاریگر کو سب حال کہ سنایا۔ ایوان لاریونوچ چپ چاپ میری تمام گفتگو سنتا رہا۔ اور جب میں کہ چکا تو اس نے حاشیہ آرائی شروع کی۔

"تم نہیں جانتے وہ خارجی فرقے[1] سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ لوگ کسی کے زیر اثر رہنا پسند نہیں کرتے"

"وہ کس قسم کی زندگی بسر کرتے ہیں؟"

"بالکل خانہ بدوش لوگوں کی طرح وہ دربدر مارے پھرتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس فرقے کو خارجی کہا جاتا ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ زمین یا جائداد پر کسی ایک شخص کا قبضہ نہیں ہونا چاہیے۔ پولیس ایسے لوگوں کو خطرۂ امن سمجھ کر ان کی تلاش میں رہتی ہے۔ اور جب ہاتھ لگیں گرفتار کر لیتی ہے"

میں یہ سمجھنے سے بالکل قاصر تھا کہ لوگ جان بوجھ کر اپنے آپ کو لطف و نشاط سے کس طرح محروم کر لیتے ہیں۔ خود میری زندگی کافی تلخ

---

(۱) BEY GOUN روسی عیسائیوں کا وہ فرقہ جو عیسائیت کے قدیم اصولوں کا پیرو تھا۔

گزر رہی تھی۔ لیکن اس جگہ کے ماحول اور اس زمانے کی فضا کے اعتبار سے اسی کو غنیمت خیال کرتا تھا۔ میں کبھی گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ اس تھوڑی بہت دلچسپی کو بھی اپنے لیے حرام سمجھنے لگوں اور اس میں کوئی حصہ نہ لوں۔ اسی لیے الیکسا شہ کی گفتگو کے تمام نقوش ایک ایک کر کے میرے دل سے محو ہوتے چلے گئے۔

لیکن اس کے باوجود خاموشی و تنہائی کے عالم میں ایسے لمحات بھی آتے جب اس کا خیالی پیکر میری نگاہ کے سامنے آ کھڑا ہوتا۔ میں محسوس کرتا کہ وہ سامنے کے میدان سے چل کر میرے پاس آیا ہے مجھے دکھائی دیتا کہ اس نے اپنے گورے ہاتھ کی ایک اضطراری جنبش سے ٹوپی اتار کر الگ پھینک دی ہے۔ اور پھر مجھے سُنائی دیتا۔

"میں بالکل سیدھی راہ چل رہا ہوں۔ اب میرے لیے اس دُنیا میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں نے زندگی کے تمام بندھنوں کو توڑ ڈالا ہے۔"

عین اس وقت اپنے والد کا نقشہ میری نگاہوں کے سامنے پھر جاتا وہ نقشہ جو نانی نے ایک بار خواب میں دیکھ کر مجھے سنایا تھا۔ اُنھوں نے دیکھا کہ والد کے ہاتھ میں اخروٹ کی نازک سی چھڑی ہے اور ایک چتکبرا کتا ہانپتا کانپتا لمبی سی زبان لٹکائے ان کے پیچھے پیچھے بھاگ رہا ہے۔

باب (۱۳)

بُت سازی کا کارخانہ ایک وسیع سنگین عمارت کے صرف دو کمروں میں قایم تھا۔ ان کمروں میں چند کھڑکیاں تھیں جن میں سے بعض صحن کی طرف اور بعض باغ کی طرف کھلتی تھیں۔ صرف ایک کا رُخ سڑک کی جانب تھا۔ یہ کھڑکیاں چھوٹی اور مربع شکل کی تھیں۔ شیشوں پر خاک دھول اور دھوئیں وغیرہ کے جم جانے سے ایسی پھول پتی ہوگئی تھی کہ سرما کی پیلی مدھم شعاعوں کو اندر گھسنے کا مشکل سے موقع ملتا تھا۔ دونوں کمروں کی میزوں پر تل دھرنے کو جگہ نہیں ملتی تھی۔ میزوں کے چاروں طرف کاریگر سر جوڑے اپنے اپنے کام میں مصروف نظر آتے تھے چھت میں پانی سے بھری ہوئی بلوری گیندیں اس غرض سے لٹکا رکھی تھیں کہ جب چراغ کی روشنی ان پر منعکس ہوکر سفید سفید باریک شعاعوں کی شکل میں لوٹے تو بتوں کی غیر ہموار سطح پر اچھا اثر پیدا ہو۔

کارخانے کی چاروں طرف سے گھری ہوئی گرم فضا میں دم گھٹنے لگتا تھا۔ اس جگہ مختلف شہروں سے آئے ہوئے تقریبًا بیس کاریگر ہر وقت مصروف رہتے تھے۔ ان کا لباس بہت مختصر ہوتا تھا۔ گلے میں کھلے کالر کا بنیان، ٹانگوں میں دوسوتی کا جانگیہ۔ ننگے پانو۔ یا زیادہ سے زیادہ چپل۔ نیلگوں بادلوں کی طرح سستی بیڑیوں کا بل کھاتا ہوا دھواں ہر وقت ان کے سروں پر چھائے رہتا تھا۔ سریش، وارنش اور سڑے انڈوں کی وجہ سے ہوا میں بدبو پھیلی رہتی تھی۔ کبھی کبھی مغموم سروں

میں اس گیت کی تان سنائی دے جاتی تھی۔

ارے من! پاپی یہ سنسار ارے من پاپی یہ سنسار

لڑکا لڑکی کو لے ڈوبا۔ کوئی نہ پوچھے حال! ۔ ارے من پاپی ...

یوں تو انھیں بہت سے دردناک گیت یاد تھے مگر یہ خاص طور پر پسند کیا جاتا۔ کیونکہ اس کے لمبے سروں سے کام میں کوئی خلل پیدا نہیں ہوتا تھا بلکہ بزرگانِ دین کے خدوخال میں رنج وغم کے تاثرات پیدا کرنے میں مدد ملتی تھی۔ جب وہ مؤقلم کو رنگ میں ڈبو کر مورت کے چہرے پر پھیرتے تو حسب منشا نقوش بننے شروع ہو جاتے کیونکہ گیت کے پُرکیف اثر سے ان کی انگلیوں میں وہ لوچ پیدا ہو جاتا تھا جو ایک چتر کار کے لیے ضروری ہے۔ ایک کھڑکی کے قریب گونو افیم نشے میں دُھت بیٹھا نازک ہتھوڑی کی کھٹا کھٹ سے لکڑی میں نقوش کندہ کرتا رہتا۔ اس کی پکوڑا سی ناک کچھ نیلگوں معلوم ہوتی تھی۔ گیت کی اُداس لَے ہتھوڑی کی مسلسل تان کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر کیفیات میں اضافہ کر دیتی تھی۔ گیت ختم ہو جاتا تو وہ آواز تنہا ایسی معلوم ہوتی گویا کھٹ بڑھئی درخت پر ٹھونگیں مار مار کر کیڑے نکال رہا ہے۔ یہ کام بذات خود کچھ اتنا حسین یا دلچسپ نہیں تھا کہ کوئی شخص جی لگا کر پوری توجہ کے ساتھ صبح سے شام تک مصروف رہ سکے۔ البتہ نغمے کی فراوانی نے اس میں رعنائی پیدا کر دی تھی۔ ایک دوسرا شخص مورت کے مختلف ٹکڑوں کو سریش لگا لگا کر قاعدے کے مطابق جوڑتا رہتا اور اگر کہیں کور کسر باقی رہ جاتی تو رندا پھیر کر برابر کر دیتا۔ وہ لونڈا جس کو دق ہو چلی تھی رنگ ملانے اور گھونٹنے پر متقرر تھا ان میں سے

ایک شخص مخصوص عبارت کا خاکہ پنسل سے بنا دیتا۔ مورت کے رنگین لباس اور شکل وصورت کی زیبائش ایک علیحدہ شخص کے ذمے تھی۔ جب مورت ایک حد تک تیار ہو چکتی تو آخری شخص جو ہر فن مولا سمجھا جاتا تھا اس پر گہری نظر ڈالتا تاکہ اگر کوئی خامی رہ گئی ہو تو پوری کر دی جائے۔ جب کوئی مورت دیوار کی طرف مُنہ کیے نظر آتی تو یہ سمجھا جاتا کہ وہ ہر لحاظ سے مکمل ہو چکی ہے۔

مورت کے دھڑ پر ہاتھ پاؤں اور گردن جوڑے جانے سے قبل جب نظر پڑتی تو اس کی بیکس حالت پر بے ساختہ ہنسی آجاتی اور تعجب ہوتا کہ یہی ناقص اور حقیر چیز معبد کے شہ نشین یا قربان گاہ کے دروازے پر پہنچ کر باعظمت اور لائق پرستش ہو جائے گی۔ یہ رنگ برنگ کی مورتیں موت کا مظہر سمجھی جاتی تھیں اور اگر کمی تھی تو صرف اس شخص کی جو ان میں روح پھونک دے لیکن کبھی کبھی ایسا بھی محسوس ہوتا کہ ان میں روح موجود تھی جو لوگوں کو محض اپنی کرامات دکھانے کے خیال سے اپنا بھاری ڈھانچ وہیں چھوڑ کر کسی پردے میں جا چھپی ہے۔

تقسیم عمل کے اصول پر کام کو مختلف نوعیتوں کے اعتبار سے بانٹ رکھا تھا۔ تاکہ ایک شخص ایک ہی کام کا ماہر ہو جائے اور اسے پوری خوبی کے ساتھ پیش کر سکے۔ ایوان لاریونوفچ ان سب کا افسر اعلیٰ اور اُستاد سمجھا جاتا تھا۔ اس کا رنگ گندمی تھا۔ ڈاڑھی کے بال ریشم سے زیادہ ملایم تھے اور اس کی کرنجی آنکھوں میں حسرت و یاس کا گہرا سمندر لہریں مارتا نظر آتا تھا۔ اس کا تبسم دل فریب تھا لیکن اس سے مل کر دوسروں کو بجائے خوشی کے اُلٹی کوفت ہونے لگتی تھی وہ شمعون کے مجسمے کی طرح بالکل کمزور اور دُبلا پتلا تھا لیکن اس کی آنکھیں ایک عجیب محویت کے عالم

میں بہت دور خلا میں کسی نامعلوم چیز کو ڈھونڈھتی نظر آتی تھیں۔

مجھے کارخانے میں آئے ابھی چند دن ہوئے تھے کہ ایک بگڑا دل کاریگر جو خوبصورت اور قوی ہیکل تھا اور جھنڈیاں تیار کرتا تھا نشے کی حالت میں اپنے کام پر آگیا۔ وہ اپنے آپے میں نہیں تھا۔ اس نے گھونسے مار مار کر ہر چیز کو توڑنا پھوڑنا شروع کر دیا۔ اس کی زبان کو حرکت نہ ہوئی۔ صرف فولادی ہاتھ اپنا کام کر رہے تھے۔ دیکھتے دیکھتے کمرے کے اندر ایک طوفانِ بدتمیزی امنڈ آیا۔ ہر چیز اپنی جگہ سے بے جگہ ہو گئی۔ یہ حالت دیکھ کر دوسروں کے رہے سہے ہوش اڑ گئے۔ انھیں اس کے سوا اپنے بچاؤ کا کوئی پہلو نظر نہ آیا کہ اِدھر اُدھر جہاں جگہ ملے جا چھپے۔ وہ ایک دوسرے کی پیٹھ ٹھونک کر کہتے کہ جاؤ اور اس خبیث کو اٹھا کر پٹک دو۔

ستانوف جو مورت کے چہرے پر روغن پھیرتا تھا بڑی مشکل سے اس شرابی پر قابو پا سکا۔ اس نے موقع پا کر لکڑی کا اسٹول اس کے سر پر دے مارا۔ کاریگر کا نشہ فوراً ہی ہرن ہو گیا اور وہ چکرا کر فرش پر لمبا لیٹ گیا۔ پھر کیا تھا۔ ان سب کی بن آئی۔ رسّی لے کر اس کے ہاتھ پاؤں کس دیے۔ جب اُسے کسی قدر ہوش آیا تو اس نے رسّی کو اپنے تیز تیز دانتوں سے چبا ڈالنے کی کوشش کی۔ اس جرأت پر ستانوف کو غصہ آگیا وہ اُچھل کر میز کے اوپر جا پہنچا تاکہ ذرا اونچائی سے اس خبط الحواس پر کود پڑے۔ قد و قامت اور قوتِ بازو میں وہ بھی کچھ گیا گزرا نہیں تھا۔ اس لیے ظاہر تھا کہ وہ ایک ہی رگڑے میں اس کی ہڈیاں پیس کر رکھ دے گا لیکن عین اس وقت ایوان خاص موقعۂ واردات پر آ دھمکا۔ اس نے محض انگلی کے اشارے سے ستانوف کو حکم دیا کہ میز سے اتر کر اپنی جگہ

پر جا بیٹھا اور باقی لوگوں کو سنجیدگی سے ہدایت کی۔

"دیکھو اس کو اٹھا کر برآمدے میں لے جاؤ اور وہیں پڑا رہنے دو جب اس کی طبیعت ٹھیک ہو جائے تو کام پر بلا لینا۔"

وہ اس کو گھسیٹ کر کارخانے کے باہر لے گئے اور پھر کرسیوں اور میزوں کو ترتیب وار درست کر کے اپنے اپنے کام پر حسب معمول جُٹ گئے۔ وہ اپنے اس ساتھی کو برابر بُرا بھلا کہتے رہے۔ اُنھوں نے پورے وثوق کے ساتھ حکم لگایا کہ اگر صورتِ حال یہی رہی تو وہ کسی نہ کسی دن لڑائی جھگڑے میں مارا جائے گا۔

"اس کو مار ڈالنا معمولی بات نہیں ہے۔" ستانوف نے کچھ ایسے انداز سے کہا گویا بڑے تجربے کی بات بیان کر رہا ہے۔

میں نے حیرت و استعجاب سے دیوان کی طرف دیکھا اور یہ سمجھنے کی کوشش کی کہ آخر کیوں وہ طاقتور اور گھونسے باز لوگ اس کمزور و نحیف شخص سے دب جاتے ہیں۔ وہ ایک ایک کے پاس جا کر سمجھاتا کہ کام کس طرح کرنا چاہیے۔ بڑے سے بڑے کاریگر تک اس کی ہدایتوں کو بے چون و چرا تسلیم کر لیتا تھا۔ وہ کام سکھاتے وقت سب سے زیادہ توجہ اسی شرابی پر صرف کرتا تھا:۔

"اے بندۂ خدا، آخر تیری چترکاری کس مرض کی دوا ہے جب تو اطالوی قلم سے زندگی کی تصویر نہ بنا سکا۔ کیا تو نہیں جانتا کہ روغنی تصویروں کے لیے تیز رنگوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن تو نے تو وہ سفیدی پوتی کہ مریم کی آنکھوں سے گویا برف ٹپکنے لگی۔ اور گالوں کو لال گلال کر دیا۔ تضاد کی وجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پتھر کی آنکھیں جا پڑیں

کی ہوئی ہیں - اور پھر ان میں کوئی مناسبت بھی نہیں - ایک آنکھ ناک کی طرف جھکی ہوئی ہے تو دوسری کنپٹی کی طرف اٹھی ہوئی ہے - چنانچہ شبیہ مبارک سے الوہیت کیا ظاہر ہوتی، مکاری صاف عیاں ہے - بھلے مانس دل لگاکر کام کیا کرو۔"

قزاق نے یہ سن کر منہ بنایا اور اپنی مخمور آنکھوں کو مٹکا کر متوالی آواز میں بولا :- "ارے بابا — یہ میرا پیشہ نہیں خدا نے مجھے گویا بننے کے لیے پیدا کیا تھا لیکن کمبختوں نے مجھے سادھو سنت بنا کر چھوڑ دیا۔"

"میاں، محنت سے آدمی ہر پیشے میں کمال حاصل کر سکتا ہے۔"

"کیا بکتے ہو جی۔ مجھے کیا سمجھا ہے تم نے؟ تمہارا بس چلتا تو مجھے کوچوان بنا دیتے، کیوں؟"

اُس نے کڑک دار آواز میں یہ الاپ چھیڑا :-

رات اندھیری ٹھنڈی ٹھنڈی، جیا میرا کلپائے۔
لادو بگھی رنگ برنگی، گھوڑا پنچ کلیانی،
سجنی پاس میں اُڑتا جاؤں — جیا میرا کلپائے۔

اب تو ایوان لارینووچ، ناک پر چشمہ بٹھا کر کھسک گیا لیکن ساری منڈلی نے سُر میں سُر ملایا اور کارخانے میں کورس کا وہ غلغلہ اٹھا کہ در و دیوار کانپ گئے۔ رہ رہ کر ہوا ٹیپ کے اس بند پر رقص کرنے لگتی تھی :-

سجنی کی کٹیا کو چل رے گھوڑے پنچ کلیانی!

اتائی پاشکا جو انتہائی انہماک سے انڈوں کی زردی کو پھینٹ رہا تھا، کام کاج چھوڑ کر دو انڈوں کے چھلکے دونوں ہاتھوں میں لیے بڑی

اُستادی سے کورس میں سب کی رہنمائی کرنے لگا۔ جوش کے عالم میں وہ سب گردوپیش کو بھول گئے اور آوازوں کے ہجوم میں یوں کھو گئے گویا سب کے سینوں میں صرف ایک راگنی موجزن ہے۔ اور ان سب کی توجہ کا مرکز وہ قزاق تھا۔ جب وہ کوئی نیا بند شروع کرتا تو سب یوں مبہوت ہو جاتے گویا وہ اُن کا اُستاد ہے اور ٹکٹکی باندھ کر اس کے ہاتھوں کی گت کو دیکھنے لگتے۔ اس کے ہاتھ یوں جنبش کرنے لگتے گویا ابھی ہوا میں اُڑ جائیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ اس وقت اگر وہ گانا بند کر کے حکم دیتا کہ آؤ سب کچھ برباد کر ڈالیں تو مزدور آن کی آن میں اس کارخانے کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتے۔

یوں وہ گاتا تو کم تھا لیکن اس کے ہنگامہ خیز نغموں میں ایسی قوت تھی کہ سب بندھنوں کو توڑ دے اور فضا پر چھا جائے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے ساتھیوں کا خمیر خس و خاشاک سے تیار ہوا تھا اور وہ ان کے کالبد میں آگ لگا سکتا تھا۔ اس کی شاندار آواز کے سامنے جو بھی شے آتی ادب سے سر بہ نیاز ہو جاتی۔

میں جب کبھی ان جادو اثر گیتوں کو سنتا تو اُس نغمہ گر کے تئیں میرا دل آتشِ رشک سے بھڑک اُٹھتا کہ وہ سننے والوں پر کس طرح موہنی کر سکتا تھا۔ میرا دل درد سے بھر آتا اور یہ درد باہر اچھل آنے کو بیتاب ہو جاتا۔ جی چاہتا کہ رونے لگوں اور گانے والوں سے پکار کر کہوں کہ "میں بھی تمہارا رفیق ہوں!"

ڈیوڈوف، جو تپ دق کے مارے زرد و نزار ہو گیا تھا اپنے بکھرے ہوئے بالوں کو ہلا کر ایسے عجیب طریقے سے منہ کھولتا گویا کوئی پہاڑی کوّا ابھی ابھی انڈے سے نکل آیا ہے۔

یہ پُرشور کورس صرف اس وقت گائے جاتے جب قزاق ان کی ابتدا کرتا۔ ان میں سے ایک گیت جو غم میں ڈوبا ہُوا تھا، پاپی سنسار، کے متعلق تھا، دوسرا جنگلوں کا نظارہ پیش کرتا تھا اور تیسرا زار الکزنڈر کے قتل کا بیان کرتا تھا۔ کبھی کبھی ہمارے بہترین روپ ساز "جنچریف" کے کہنے سے کلیسا کے بھجن بھی گائے گئے لیکن یہ کسی کو نہ بھائے اس مردِ خدا کے ذہن میں موسیقی کا تخیل اتنا محدود تھا کہ ذرا اِدھر اُدھر ہوئے اور وہ بپھر پڑا۔

جنچریف کی عمر ۴۵ سال ہوگی۔ اس گنجے چوب خشک کے بچے کھچے بال کالے گھونگھردار تھے اور بھنویں اتنی گھنی تھیں کہ اُن پر مونچھوں کا دھوکا ہو سکتا تھا۔ اس کی نوک دار ڈاڑھی بھرے ہوئے کٹیلے چہرے پر بہت پھبتی تھی۔ لیکن لمبی لمبی مونچھیں چہرے پر خواہ مخواہ مستزاد تھیں۔ کیونکہ گھنی بھنوؤں کی موجودگی میں ان کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ اس کی نیلی آنکھوں میں باہم کھینچا تانی تھی، ایک چھوٹی تو دوسری بڑی تھی۔

میرے ساتھی پاشکا کو پکار کر وہ بولا:۔ "ہاں بھئی، شروع کرو: حمد ہی

لوگو، شور نہ مچاؤ"

ایپرن (پیش بند) میں ہاتھ پونچھ کر پاشکا چلایا:۔

حمد ہی۔۔ اے۔۔ اے"

کئی لوگوں نے آواز ملائی: "یہ اس خدائے پاک کی، لیکن جنچریف نے جھلا کر کہا: "رینگو مت یارو! آواز تو روح کی گہرائیوں سے نکلنی چاہیے"

ستینوف پھٹے ہوئے ڈھول کی طرح چلایا:۔

"ہم غلاموں کی صدا"

"توبہ کرو توبہ کرو! اس کڑی کو یوں گانا چاہیے کہ زمین کانپ جائے اور در دریچے خود بخود کھل جائیں"

ینچریف کی ہڑبڑاہٹ کی حد نہ تھی۔ اُس کی بھنویں برابر پھڑک رہی تھیں، آواز بھرّا گئی تھی اور اُنگلیاں ان دیکھے چھتارے پر رقص کر رہی تھیں۔

وہ اکڑ کر بولا: "خدائے پاک کے غلام —— اس کا مطلب بھی سمجھے۔ اس کا مطلب جب تیر کی طرح تمہاری رُوح میں پیوست ہو جائے تب تو کوئی بات ہی۔ یہ حقیقت تم پر روشن کیوں نہیں ہوتی —— میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں"

ستونوف نے ہار مان کر جواب دیا: "یہ بھجن ہم سے نہیں چلنے کا"

"تو پھر اپنا بے سرا الاپ بند کرو"

برہم ہو کر ینچریف اپنے کام میں جٹ گیا۔ وہ کارخانے کا سب سے اچھا کاریگر تھا قدیم بیزنطینی یا جدید اطالوی قلم۔ دونوں پر اُسے قابو حاصل تھا۔ بتوں کی نقاشی کے ہر پہلو کا اُسے علم تھا اور وہ اُن کے نادر سے نادر نمونوں کو پرکھ چکا تھا۔ لیکن اگر کسی نے جدّت کی کوشش کی تو وہ آگ ببولا ہو جاتا۔

اس کمال کے باوجود اس میں نام کو تکبّر نہ تھا اور وہ مجھ جیسے شاگردوں سے بھی مہربانی سے پیش آتا تھا۔ دوسرے تو خیر ہماری کوئی پروا نہ کرتے تھے لیکن وہ ہمیں بھی کام سکھلانے کے لیے دردِ سری کرتا تھا۔

اُس سے پار پانا دشوار امر تھا۔ ہفتوں وہ زبان نہ کھولتا، گونگے کی طرح چپ چاپ کام کیے جاتا۔ اس کیفیت میں وہ سب سے اجنبیوں کا سا برتاؤ کرتا گویا اُن سے پہلی مرتبہ دوچار ہوا ہے۔ اور گو اُسے گانے کا بڑا شوق تھا، لیکن ایسے موقعوں پر گانا تو دور رہا وہ کان پڑے گیتوں کو بھی سنا انسنا کر دیتا۔ دوسرے کاریگر اس کی خاموشی پر زیرِ لب چہ میگوئیاں کیا کرتے۔ مورت کو چبوترے پر لٹا کر نہایت انہماک سے وہ رنگ بھیرنے لگتا اور بیچ بیچ میں زور سے کچھ نکتہ چینی بھی کرنے لگتا۔

سب لوگ یہ تماشا دیکھ کر چپ چپ ہنسنے لگے۔ اور کونے سے کسی نے آواز لگائی:

"کھال پنھا کر اور پر لگا کر اس پر کوئی وارنش کر دے۔"

میں نے پوچھا: "آپ کس سے بات چیت کر رہے ہیں؟"

جیجریف کچھ نہ بولا۔ یا تو اس نے میرا سوال ہی نہ سنا اور یا جواب دینے کی زحمت گوارا نہ کی۔ تھوڑی دیر بعد وہ دوبارہ اپنے آپ سے بولا: "ہمیں اولیاے کرام کی زندگی کے حالات پڑھنا چاہییں ہم بھی کتنے لاعلم ہیں۔ ہماری زندگی بے روح ہے۔ ہر طرف مورتیں ہی مورتیں ہیں لیکن روح کا کہیں پتا نہیں۔"

اس خود کلامی پر سب تو سب سیتنوف تک حقارت سے قہقہہ لگا بیٹھا تھا اور کوئی نہ کوئی ضرور دھیرے سے کہہ اُٹھتا:

"اب کے سنیچر کو یہ شراب خانے کی سیر کر کے رہے گا۔"

اونچا پورا اور ہٹا کٹا سیتنوف جو ابھی بائیس سال کا بچھڑا تھا۔

اپنا گول مٹول غمگین چہرا لیے کونے میں بیٹھا رہتا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ جب مریم کے ایک مشہور بت کا چربہ بنا چکنے کے بعد جنجریف جوش سے بولا:

ختم ہو گیا! خدا کی ماں، تو وہ دریا ہے جس میں ساری دنیا کے آنسو آکر جمع ہوتے ہیں"

کاندھے پر کوٹ ڈال کر اس نے اُسی دم بھٹی کی راہ پکڑی۔ نوجوان تالیاں اور سیٹیاں بجانے لگے لیکن بڑوں نے اس پر رشک کی نگاہیں ڈالیں سیتنوف نے مورت کو غور سے دیکھ کر کہا:۔

"شراب پی کر مست نہ ہو تو کیا ہو، اپنا کمال کوڑیوں کے مول بیچتے ہوئے اس کا دل کیسے نہ پھٹے۔ اس طرح کا غم ہر کسی کو نہیں ہوتا"

جنجریف کی مے نوشی کا سلسلہ سنیچر کو شروع ہوتا تھا لیکن اس کا انداز بھی نرالا تھا۔ ہفتے کی صبح وہ کسی شاگرد کے ہاتھ ایک پرچہ کہیں بھیجتا۔ اور دوپہر کے وقت لاریانووچ سے کہتا:

"میں آج حمام جاؤں گا۔"

"واپسی کب تک ہوگی؟"

"یہی کوئی—"

"براہِ کرم دو چار کے لیے نہ ٹرخ جانا"

سر ہلا کر جنجریف باہر چلا جاتا۔ حمام سے لوٹ کر وہ لباس کی طرف متوجہ ہوتا۔ صاف صاف کپڑے پہن کر چاندی کا زنجیرہ سدری میں آویزاں کرتا اور مجھ سے اور میرے اُستاد بھائی پاشکا سے یہ کہہ کر کہیں غائب ہو جاتا کہ: "شام تک کارخانے کی صفائی ہو جائے۔

بڑی میز کو دھو کر لک جھک کر دینا۔"

اب تو گویا ہر کارخندار پر جشن کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ سب کے سب نہا دھو کر تیار ہو جاتے۔ دن چڑھے جنچر لیف صاحب اس طرح نمودار ہوتے کہ شراب و کباب کا بقچہ ایک طرف اور ایک ہتنی سی عورت دوسری طرف۔ یہ دیوزاد ساڑھے چھ فیٹ سے کم اونچی نہ تھی۔ اس کے قد و قامت کے آگے کارخانے کی ہر شے کھلونا معلوم ہوتی تھی۔ اونچا پورا ستینوف بھی اس توپ خانم کے آگے پودنا معلوم ہوتا تھا۔ یوں قد کے لحاظ سے اس کا جسم مناسب تھا، البتہ سینہ پہاڑ کی طرح اُبھر کر ٹھڈّی سے جا ملا تھا۔ اور اس کی چال عجب لٹ پٹی تھی یوں اس کی عمر چالیس سے کم نہ ہوگی۔ لیکن چہرا اب بھی چکنا چپڑا تھا۔ البتہ دہانہ نسبتاً اتنا چھوٹا تھا گویا تین پیسے کی گڑیا پر رنگ پھر دیا ہو۔ گھوڑی کی طرح دانت نپور کر وہ سب سے ہاتھ ملاتی اور بے سر پیر کی باتیں ملانے لگتی:

"خیریت تو ہے؟ آج کیسا پالا گر رہا ہے۔ اوئی، یہاں کیسی بدبو بسی ہوئی ہے۔ ہو نہ ہو، رنگ کی بو ہے۔ مزاج تو اچھے ہیں؟"

یہ معلوم ہوتا کہ کسی ندی میں جوار آگیا ہے۔ اس کے ڈیل ڈول کو تو کوئی پھر بھی گوارا کرلے لیکن اس کی بات چیت اتنی لچر اور بے معنی ہوتی کہ الجھن ہونے لگتی۔ کچھ بولنے سے پہلے وہ گالوں میں ہوا بھر لیتی اور محسوس ہوتا کہ یہ کپّی اب پھٹی اور تب پھٹی۔ ہم سب بہ مشکل ہنسی ضبط کرکے آپس میں کہتے:

"انجن ہے انجن!"

"سانڈنی ہے، ہتنی ہے!"

اپنی مٹکی نما چھاتیوں پر ہاتھ باندھ کر اور ٹھوتھنی بند کر کے وہ سماوار کے پاس کرسی پر بیٹھ جاتی اور ہم سب پر باری باری سے عنایت کی نگاہ ڈالتی۔

تاہم سب لوگ کمال احترام سے اس سے پیش آتے۔ اور اس کے سامنے لڑکوں کے تو اوسان خطا ہوتے تھے۔ پہلے تو وہ حیرانی سے اُس کے پہاڑ سے جسم کا جائزہ لیتے لیکن اس کی آنکھوں سے آنکھیں چار ہوتے ہی گھبرا کر سٹی بھول جاتے۔ جھچریف بھی اس مہمان سے ادب سے پیش آتا اور اُسے آپ کہہ کر مخاطب کرتا۔ ہر وقت وہ اس کی آؤبھگت میں لگا رہتا اور ہر بات پر اس کا شکریہ ادا کرتا۔

اور وہ گھوڑی بڑے نخرے سے ہنہنا کر کہتی :۔ ”بھئی، زیادہ تکلف کی ضرورت نہیں۔ میری وجہ سے خواہ مخواہ اپنے کو ہلکان کر رہے ہو۔“

زبان کے قیود سے وہ قطعاً آزاد تھی۔ اس کی کہنی جس جگہ ٹک گئی ٹک گئی اور ہاتھ بھی کسی اشد ضرورت سے ہی حرکت کرتے تھے۔ اس کے جسم سے تندور کی گرم گرم روٹی کی سی مہک آتی تھی۔ ایک بوڑھے کاریگر نے اس کے حُسن کی تعریف میں ایسی لنترانی ہانکی کہ اس کا چہرا خوشی سے دمک اٹھا۔ جب مدّاح نے اپنی بھٹی ختم کر دی تو وہ لقمہ دینے کے لیے بولی :۔

”خدا لگتی تو یہ کہ جوانی میں میری صورت شکل اچھی نہ تھی۔ یہ تو لیے دیے رہنے کا کرشمہ ہے۔ جب ہم نے تیس کی منزل میں قدم رکھا تو ہمارا حسن ایسا نکھرا کہ بڑے بڑے رئیس ہمارے عشق کا دم بھرنے لگے۔ ایک کپتان نے تو دو گھوڑوں کی بگھی لا کر چوکھٹ پر کھڑی کر دی۔“

اس دوران میں قزاق پر نشے کا پورا اثر ہو گیا تھا۔ چنانچہ مہمان کو جلے بھنے تیوروں سے گھور کر اس نے پوچھا:

"یہ تو کہیے کہ یہ گھی کس غرض سے حاضر کی گئی!"

"ہماری محبت کی خاطر۔"

"محبت! کس قسم کی محبت؟"

عورت نے سادگی سے جواب دیا: "تم جیسے بانکے چھیلے کو اتنا بھی نہیں معلوم؟"

اس پر ایک فرمائشی قہقہہ بلند ہوا۔ ستینوف نے قزاق سے کہا:

"پرلے درجے کی احمق ہے یہ عورت! محبت کے جذبے کو یوں نیلام پر چڑھا رہی ہے۔"

شراب اس پر بھی چڑھ گئی تھی۔ کنپٹی پر آنسو موتی کی طرح دمک رہے تھے اور آنکھوں سے ذہانت کی بجائے وحشت چمک رہی تھی۔

ایک بوڑھے مزدور نے اپنی پھلوری سی ناک کو پھلا کر اور مچچائی ہوئی آنکھ کو پونچھ کر پوچھا:-

"آپ کے کتنے بچے ہیں؟"

"صرف ایک"

کمرے میں دو لیمپ روشن تھے۔ لیکن ان کی روشنی ناکافی تھی کارخانے کے کونوں میں اندھیرا تھا جس میں سے ہیبت ناک مورتیں جھانک رہی تھیں کیونکہ ابھی ان کے ہاتھ یا سر مکمل نہیں ہوئے تھے اور ان کی جگہ جو خول چڑھے ہوئے تھے وہ ڈراؤنے معلوم ہوتے تھے۔ شبہہ ہوتا کہ اولیا کے کالبدِ نوری اپنے پیرہن سے نکل بھاگے

ہیں - فانوس دھنویں کے بادلوں میں چھپ گئے تھے -

جنجریف گھوم گھوم کر ہر ایک سے کھانے پینے کا اصرار کر رہا تھا، اس کی گھنجی کھوپڑی کبھی ایک طرف اور کبھی دوسری طرف ڈھلک پڑتی۔ وہ غضب کا نحیف تھا اور اس وجہ سے اس کی توتے کی سی ناک اور بھی بڑی معلوم ہوتی تھی، جب اس کے چہرے پر روشنی کی آڑی کرن پڑتی تو ناک کا سایہ گال پر پھیل جاتا۔ اپنی گونج دار آواز میں وہ للکارا: "بھائیو، کھاؤ پیو اور مست رہو"

"بھائی تم فکر نہ کرو۔ قدرت نے سب کو ہاتھ دیے ہیں اور جسے جتنی بھوک ہو اتنا ہی کھائے گا"

جنجریف نے دوبارہ آواز لگائی: بھائیو، اب آرام کا وقت ہے۔ ہم سب خدا کے بندے ہیں، اس لیے آؤ ایک بار یہ بھجن ہو جائے "حمد ہے یہ اس خدائے پاک کی"

کسی کو یہ بھجن نہ بھایا۔ شراب و کباب کی بہتات سے سب اکھڑ گئے تھے۔ قزاق کے ہاتھ میں ایک ہارمونکا تھی۔ اور نوجوان 'سلوتن' جو کوّے کی طرح کالا اور سنجیدہ تھا۔ ایک ڈھولک ٹھیک کر رہا تھا طنبورے الگ تنتنا رہے تھے۔

جنجریف نے فرمائش کی: "ناچ کی دھن! بیگم، کیا میں آپ کے ساتھ ناچنے کی عزت حاصل کر سکتا ہوں؟"

کمرے کے بیچوں بیچ وہ پینترا بدل کر سنتری کی طرح کھڑی ہو گئی۔ ہارمونکا نے شکوہ کا راگ چھیڑا، طنبورے نے سُر میں سُر ملایا اور ڈھولک نے گہری سانسوں کا ایک طویل سلسلہ

چھیڑ دیا۔ موسیقی پر ڈھولک کا اثر چنداں خوشگوار نہ تھا۔ محسوس ہوتا تھا کہ کوئی پاگل آہیں بھرتا، شور مچاتا دیواروں سے سر ٹکرا رہا ہو۔
جنجریف کو ناچ آتا ہی نہ تھا۔ بس وہ اِدھر اُدھر تھرک کر پانو جوڑ کر بکرے کی طرح اُچھلنے کودنے لگا اور تال سُر کی مطلق پروا نہ کی، معلوم ہوتا تھا کہ یہ ٹانگیں مانگے کی ہیں اور جسم تھا کہ خواہ مخواہ پیچ و تاب کھا رہا تھا گویا کوئی بھنگا مکڑی کے جالے میں پھنسا تڑپ رہا ہو۔ یا مچھلی جال میں پھڑک رہی ہو۔ نہایت کریہہ منظر تھا۔ لیکن اس کے حال و قال سے سبھی مرعوب ہو گئے اور صف باندھ کر خاموشی سے یہ نظارہ دیکھنے لگے۔ اس کے چہرے کا اُتار چڑھاؤ حیرت ناک تھا کبھی وہ مہربان معلوم ہوتا کبھی پشیمان۔ اور پھر یک بیک اس کے چہرے سے غرور و تمکنت کے آثار ہویدا ہوتے۔ دفعتًا وہ چونک کر ایک آہِ سرد بھرتا اور آنکھیں بند کر لیتا۔ جب وہ کھلتیں تو اُن میں اُداسی تیرتی ہوئی۔ مٹھی باندھ کر اور پانو دبا کر وہ عورت کے پاس جاتا اور اس کے آگے گھٹنے ٹیک کر بیٹھ جاتا۔ اپنے ہاتھ پھیلا کر اور بھنویں چڑھا کر وہ معنی خیز انداز میں مُسکرانے لگتا۔ وہ ہونٹوں ہونٹوں میں جواب دیتی:۔

”مہربان اب اُٹھ کھڑے ہو“

عورت بھی آنکھیں بند کرنے کی کوشش کرتی لیکن اس کے دیدے اتنے بڑے تھے کہ پپوٹے انھیں کسی طرح نہ ڈھک سکتے۔ اور اس کھینچا تانی میں اُس کی شکل اور بھی بگڑ جاتی۔ اسے بھی ناچ نہ آتا تھا۔ اور وہ اپنے بھاری بھرکم جسم کو آہستہ آہستہ یوں حرکت دیتی

گویا آٹے کی بوری کو کوئی ایک جگہ سے اٹھاکر دوسری جگہ رکھ رہا ہو۔ اس کے بائیں ہاتھ میں رومال تھا جسے وہ مشکل تمام ہلاتی جاتی اور اس کا داہنا ہاتھ کولھے پر دھرا ہوا تھا۔

اور جنجریف اس دیونی کے ارد گرد اتنی مختلف شکلیں بدل کر مٹک رہا تھا گویا وہ بھی کوئی دس سر والا راون ہے اگر ایک شکل پر انکسار ہوتا تو دوسری پر وحشت، اور تیسری پر ایسا خوف گویا وہ اس کالی دیوی کے چنگل سے نکل بھاگنے کو بیتاب ہے۔ سب سے آخر میں جو شکل نظر آتی اُس میں اس کے دانت گھایل کُتّے کی طرح نکلے ہوئے ہوتے۔ یہ غیر دلچسپ ناچ مجھے سپاہیوں، اردلیوں اور دھوبنوں کی بدکاریوں کی یاد دلاتا تھا۔

کسی موقعے پر ستینوف نے بھی کیسے مزے کی بات کہی تھی:-

"ایسے معاملوں میں سب جھوٹ بولتے ہیں — اس کھیل کا یہی قاعدہ ہے کوئی کسی سے محبت نہیں کرتا۔ یہ سب دل بہلانے کے بہانے ہیں"

لیکن یہ باور کرنا ناممکن تھا کہ محبت کے نام پر سب جھوٹ بولتے ہیں۔ کیا ملکۂ حسن بھی ایسا کر سکتی تھی؟ اور اس وقت جنجریف بھلا کسے دھوکا دے رہا تھا۔ اصل قصہ یہ ہے کہ ستینوف کے عشق کا ٹٹو کسی طوائف کی طرف جا رہا تھا اور اسی بدبخت نے اُسے جل دیا تھا۔ لیکن ستینوف نے دوستوں کی رائے کو رد کر کے اس کی گوشمالی نہیں کی بلکہ اس سے مہربانی سے پیش آیا۔

وہ توپ خانم مٹکتی تھرکتی رومال ہلاتی رہی۔ جنجریف کی

اُچھل کود بھی جاری رہی۔ اور میں یہ سوچنے سے اپنے آپ کو باز نہ رکھ سکا کہ: "وہ حوّا جس نے اللہ میاں تک کو چکمہ دے دیا، کیا اس دیونی سے ملتی جلتی تھی؟" دم بھر کے لیے میں عورت ذات سے متنفر ہوگیا۔

ہیبت ناک بُت تاریک کونوں سے جھانکتے رہے اور تاریکیٔ شب در و دالان پر چھاگئی۔ موم بتیوں کی روشنی دھندلی پڑنے لگی۔ اگر کوئی کان لگاکر سنتا تو اس شور و شر کے پس منظر میں نل کا پانی ٹپاٹپ ٹب میں گر رہا تھا۔

کتابوں کی زندگی سے یہ سب کس قدر مختلف تھا۔ اور یہ تفریق حد درجہ مایوس کن تھی۔ کچھ دیر بعد سب لوگ اس بیہودہ سوانگ سے تھک گئے اور قزاق نے ہارمونکا بجانا شروع کیا۔ اور لوگوں نے بھی اس کا ساتھ دیا اور فضا میں یک بیک نئی زندگی کی لہر دوڑ گئی ناچ رنگ اور ہاؤ ہو کرتے ہوئے سب کو یاد تھا کہ خوشی کی یہ گھڑی غنیمت ہی۔

متوالے ستینوف نے کسی سے پوچھا: "کیا یہ ممکن ہی کہ کوئی شخص کسی عورت سے اس صدق دل سے محبت کرے؟" اور یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

جواب ملا: "میاں — عورت کو عورت سمجھو اور زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ محبت کا ہی گڑ ہی"

اس کے بعد وہ عاشق و معشوق جانے کہاں غائب ہوگئے۔ چیچرلف دو تین روز بعد نمودار ہوا اور پھر کام میں جٹ گیا۔ دو ہفتے تک

وہ ایک کونے میں انتھک کام کرتا رہا اور ہرگز کسی سے ہم کلام نہ ہوا۔

ان کے غائب ہونے کے بعد ستینوف نے اِدھر اُدھر دیکھ کر پوچھا: ۔" کیا وہ چل دیے؟ اس کے چہرے پر قبل از وقت بڑھاپے کے آثار پیدا ہوگئے تھے لیکن اس کی آنکھیں سادہ اور حسین تھیں۔ ستینوف سے میرے تعلقات دوستانہ تھے اور اس کی وجہ وہ نوٹ بک تھی جس میں میں نظمیں نقل کیا کرتا تھا۔ وہ خدا سے بزار تھا اور سچ تو یہ ہے کہ لاریئووچ کے علاوہ سب کی یہی کیفیت تھی۔ خدا اور عورت کا ذکر وہ ایک ہی انداز میں کرتے۔ لیکن کھاتے وقت وہ صلیب کا نشان بنانا اور سوتے وقت دعا مانگنا نہ بھولتے اور اتوار کو کلیسا کی حاضری بھی ان کے فرض منصبی میں داخل تھی۔

ستینوف کو یہ دکھاوے ناپسند تھے۔ اس لیے سب اُسے دہریہ کہتے تھے۔ " خدا کہیں نہیں ہے" وہ علی الاعلان کہا کرتا۔ میں نے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے دعوے کو ثابت کرے۔ جواب ملا:

" خدا مجسم نیکی ہے اور انسان مجسم بدی ہے، اور انجیل میں لکھا ہے کہ انسان خدا کا عکس ہے۔ پھر اس تضاد کی وجہ کیا ہے؟

اس دلیل کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ میرے آس پاس بہت سے ایسے لوگ تھے جن کی رگ رگ میں بدی سرایت کر گئی تھی ان سے خدا کو دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔

ستینوف نے فتویٰ صادر کیا: " آدمی سُور سے بھی بدتر ہے" پھر مجھے تسکین دینے کے لیے وہ بولا: " آزردہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ دنیا میں اچھے آدمی بھی تو موجود ہیں"

وہ مزاج کا بڑا سیدھا تھا۔ کوئی بات معلوم نہ ہو تو صفائی سے اقرار کر لیتا اور خواہ مخواہ ڈینگ نہ ہانکتا۔ اس کی اس خصوصیت نے مجھے بہت متاثر کیا۔ کیونکہ اب تک میں جن لوگوں سے ملتا آیا تھا وہ سب ہمہ دان اور عقل کل تھے۔ اُس کی بیاض میں عمدہ نظموں کے ساتھ فحش شعر بھی نقل تھے اور میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ بیک وقت دونوں سے کیسے لطف اندوز ہو سکتا تھا۔ اجی نشکن تو مسخرہ تھا اس کی شاعری میں کیا رکھا ہے۔ لیکن ایک دوسرے شاعر نے کیا خوب کہا ہے:-

دخترِ درزن کا سینہ دیکھ کر
جی میں آتا ہے کہ مل مل دیجیے!

خدا جانے کس وجہ سے اُسے یہ بے معنی تک بندی بہت پسند تھی:-

یار کے دل تک جانے کا ہے ایک راستہ پتلا سا
کون وہاں تک جائے گا اور دل کی کُنڈی ہلائے گا!

باب (۱۴)

کارخانے میں میرے ذمّے زیادہ کام کاج نہ تھا۔ صبح جب سب لوگ سوتے ہوتے میں چائے کی تیاری میں لگا رہتا۔ اور جب چائے نوشی کا دور شروع ہوتا تو "پال" کے ساتھ صفائی دھلائی میں لگ جاتا۔ اس کے بعد دُکان کی راہ لیتا۔ تیسرے پہر مجھے رنگ تیار کرنے ہوتے اور کاریگروں کے پاس بیٹھنا ہوتا۔ پہلے تو میری دلچسپی کا تار بندھا رہا لیکن رفتہ رفتہ یہ احساس ہونے لگا کہ ہر اُستادِ فن بھی اس کام سے بیزار ہے اور بادلِ ناخواستہ لیپا پوتی کرتا ہے۔

شام کو جب چھٹی ہوتی تو میں کاریگروں کو اپنے اور پرائے قصے سُنایا کرتا اور جانے کیسے تھوڑے ہی عرصے میں میں کارخانے کا داستان گو اور محرر بن بیٹھا۔

یہ معلوم کرنے میں دیر نہ لگی کہ یہ سب مجھ سے کم پڑھے لکھے ہیں۔ بیچارے بچپن سے ہی پیٹ کے دھندوں میں پھنسے ہوئے تھے۔ ان میں اکیلا ژنچریف ایسا تھا جس نے ماسکو تک کا سفر کیا تھا اور اس شہر کا ذکر آتے ہی وہ معنی خیز پیرائے میں کہتا:-

"ماسکو کو رنج و غم سے کیا واسطہ۔ وہاں تو ہر آدمی غرض کا بندہ ہے"۔ باقی سب کنوئیں کے مینڈک تھے۔ یہاں تک کہ "کزان" کے بارے میں وہ مجھ سے پوچھا کرتے کہ کیا وہاں بھی روسی بستے

ہیں۔

جغرافیے سے وہ قطعاً ناواقف تھے اور انھیں یہ باور کرانا مشکل تھا کہ سائبیریا، یورال کے پہاڑ کے پرے ہے۔ ان کی منطق یہ تھی کہ چونکہ فلاں مچھلی کاسپین کے سمندر میں ملتی ہے لیکن یورال سے منسوب ہے لہٰذا یہ پہاڑ اس سمندر کے کنارے ہے۔

اگر میں یہ کہتا کہ انگلستان ایک جزیرہ ہے تو وہ ہنس پڑتے اور ہرگز نہ مانتے کہ نپولین ایک معمولی گھرانے کا فرد تھا۔ جب میں آپ بیتی سناتا تب بھی انھیں یقین نہ ہوتا لیکن سنسنی خیز تاریخی واقعات کو وہ بڑے شوق سے سنتے تھے۔ بڑے بوڑھے بھی تخیل کو حقیقت پر ترجیح دیتے تھے جو کہانی جتنی زیادہ انہونی اور عجیب ہوتی اتنے ہی انہماک سے وہ اُسے سنتے۔ یوں سمجھیے کہ آج کی تلخی اور مایوسی پر غور کرنا انھیں ہرگز گوارا نہ تھا، البتہ کل کے لیے ہوائی قلعے کھڑے کرنے میں انھیں خاص لطف آتا تھا۔

یہ رویہ میرے لیے ناقابل فہم تھا کیونکہ روزمرہ کی زندگی اور کتابی زندگی میں میں نے بڑا فرق پایا۔ کتابوں میں سموری خانساماں، جنجزلیف بت ساز یا ناتالیا دھوبن کے سے چلتے پھرتے جیتے جاگتے کردار کہاں تھے۔

جب میں کتابیں پڑھ کر سناتا تو وہ لوگ بہت خوش ہوتے کیونکہ لارینووچ کا قول تھا:۔

”جہاں کتاب پڑھی جا رہی ہو وہاں شور و شر کی پہنچ بھی نہیں“

میں ہمیشہ کتابوں کی تلاش میں سرگرداں رہتا اور تقریباً ہر شام کو ہماری مجلس لگتی۔ میری زندگی میں یہ وقت یادگار ہے۔ کارخانے میں کامل خاموشی ہوتی اور شمعدان ستاروں کی طرح روشن ہوتے۔ میز کے ارد گرد جسے دیکھیے غور و فکر کے عالم میں کتاب سُن رہا ہے اور گاہے گاہے مصنف یا ہیرو کی تعریف میں مرحبا کہہ اُٹھتا ہے۔ اس موقعے پر ان کی کایا پلٹ سی ہوجاتی اور وہ اتنے بدل جاتے کہ مجھے بھلے لگنے لگتے۔ مجھے محسوس ہوتا کہ میں اسی ماحول کے لیے پیدا ہوا ہوں۔

ایک دن ستینوف نے کہا: "کتاب پڑھتے وقت محسوس ہوتا ہے کہ بہار آگئی ہے اور ہم نے اپنے دریچے اُس کے استقبال کے لیے کھول دیے ہیں"

لیکن کتابوں کا ملنا آسان نہ تھا۔ گرہ میں اتنے دام کہاں کہ کتب خانے کے رکن بن جائیں۔ تاہم کوئی نہ کوئی خدا کا بندہ رحم کھاکر کتابیں دے ہی دیتا تھا۔ ایک مرتبہ کسی فوجی افسر نے مجھے مشہور شاعر "لرمنتوف" کی نظموں کا مجموعہ دیا اور اسے پڑھتے وقت پہلی بار مجھے اندازہ ہوا کہ شاعری کی طاقت کتنی عظیم الشان ہے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جیسے ہی میں نے اس کی نظم "شیطان" کو پڑھنا شروع کیا، ستینوف نے اپنی کوچی ایک طرف کو رکھ دی اور مسکراتے ہوئے جھومنے لگا۔

"بھائیو شور نہ مچاؤ"۔ یہ کہہ کر لارینووچ نے بھی اپنا کام تہ کرکے ایک طرف رکھ دیا اور ہماری میز پر بیٹھ کر ہمہ تن گوش ہوکر نظم سُننے لگا۔ مجھ پر رقت کا عالم طاری تھا، آواز بھرّا گئی

تھی اور آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے لیکن اس سے زیادہ اثر مجھ پر یہ دیکھ کر ہوا کہ مزدور مسحور سے ہو گئے تھے۔ سب لوگ گویا مقناطیس کے اثر سے کھنچ کر میرے آس پاس جمع ہو گئے تھے۔ جب میں نظم کا پہلا حصہ ختم کر چکا تو محفل حرکت میں آئی اور اب تک جو لوگ سانس روکے شاعر کی جادو بیانی پر حیرت کر رہے تھے۔ آفریں و مرحبا کے نعرے لگاتے ہوئے خوشی کے مارے ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ جنجرلیف نے میرے سر کو کتاب سے ٹکرا کر کہا: "آگے پڑھو"

جب میں نظم ختم کر چکا تو میرے ہاتھ سے کتاب لے کر اس نے سر ورق کو دیکھا اور بولا :۔

"اسے دوبارہ پڑھنا چاہیے! کل پھر دور چلے میں اس جادو کی پڑیا کو چھپا کر رکھ دوں"

چنانچہ اس نے لرمنتوف کے دیوان کو اپنی میز کے خانے میں مقفل کر دیا اور پھر اپنے کام میں جٹ گیا۔ کارخانے میں خاموشی سی چھا گئی۔ لوگ چپکے چپکے اپنے کام میں لگ گئے۔ سیتنوف کھڑکی کے شیشے سے منہ لگا کر یوں ساکت و جامد بیٹھا ہوا تھا گویا اُسے سانپ سونگھ گیا ہو جنجرلیف نے سر اُٹھا کر نکتہ سرائی کی :۔

"خدا کے بندو — زندگی ایسی ہی ہے"

سر ہلا کر وہ کہنے لگا :

"شیطان کی تصویر تو میں بھی بنا سکتا ہوں۔ سیاہ فام، آتش پر — لیکن ہاتھ پیر ہلکے نیلے رنگ کے جیسے چاندنی رات میں برف کا رنگ"

دیر تک وہ بیقراری کی حالت میں شیطان، حوّا، جنت، اولیا کے گناہ اور اسی قسم کے مضامین پر بے تکی باتیں کرتا رہا۔ اس ساری گفتگو کا ماحصل یہ نکلا: "اگر پیغمبر بدکار عورتوں سے بدچلنی کریں تو شیطان نیک روحوں کو کیوں نہ خراب کرے۔"

سب لوگ چپ چاپ اس کی باتیں سنتے رہے۔ سچ تو یہ ہے کہ کسی کو بولنے کی خواہش نہ تھی۔ جوں توں کر کے سب کام کرتے رہے اور بار بار گھڑی کو دیکھتے رہے۔ جیسے ہی دس کا گجر بجا سب نے کام سے ہاتھ کھینچ لیا۔

میں ستینوف اور جنجریف کے ساتھ صحن میں نکل آیا۔ ستاروں کو دیکھ کر سینوف نے کہا:۔

بھٹکا ہوا قافلہ۔ کیا ڈھونڈتا ہے عرش سہمے ہوئے ہیں رواں۔ قدرت کے یہ نور نظر۔

"تو گویا آپ شعر بھی فرمانے لگے!"

سردی کے مارے تھرتھراتے ہوئے جنجریف نے کہا۔ "میاں یادداشت پر ایسی جھاڑو پھری ہے کہ کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ لیکن — بھئی آفریں ہے اس کی وسیع القلبی پر کہ شیطان تک ترس کھاتا ہے! کمال ہے کہ ہمیں شیطان پر رحم آنے لگا۔ کیوں؟"

ستینوف نے بھی ہامی بھری۔

جنجریف نے جوش میں آکر کہا: "انسان تو یہی ہے۔" چلتے چلتے اس نے تاکید کی: "دیکھو جی۔ دکان پر کسی سے اس کتاب کا ذکر نہ کرنا کیونکہ ہو نہ ہو یہ ضبطی میں آچکی ہے۔"

یہ سُن کر میں فرطِ شوق سے اُچھل پڑا کیونکہ یہی وہ جنس ممنوعہ تھی جس کا ذکر پادری نے کیا تھا۔

کھانے کے وقت معمول کے مطابق شور وغوغا نہ تھا اور سب یوں آہستہ آہستہ نوالے زہر مار کر رہے تھے گویا کوئی اہم واقعہ ہوگیا ہو اور سب اسی کے خیال میں محو ہوں۔ جب لیٹنے کا وقت ہوا تو جنجریف نے کتاب نکال کر مجھ سے فرمائش کی:۔

"آؤ، ایک بار اور وہ نظم سناؤ"

یہ سُن کر کئی آدمی میرے آس پاس آ بیٹھے اور تن من کی سُدھ بھُلا کر جادو کے وہ بول سُننے لگے اور جب میں نے پڑھنا ختم کیا تو جنجریف میز پر طبلہ بجاتے ہوئے بول اُٹھا:

"کیسی زندہ جاوید تصویر ہے ۔ ارے ابلیس ۔۔ بھائیو دیکھ لیا اس کا رنگ روپ!"

ستینوف میرے کاندھے پر جھک کر نظم کا کوئی بند پڑھتے پڑھتے ہنس پڑا اور بولا:۔

"اسے میں اپنی بیاض میں نقل کروں گا"

کتاب اٹھا کر جنجریف نے جھنجھلائی ہوئی آواز میں کہا:

"ہماری مثال ان کتوں کی سی ہے جن کی آنکھیں چھن گئی ہوں۔ نہ خدا کو ہماری ضرورت ہے اور نہ شیطان کو اور ہم خدا کے بندے کیسے ہوئے۔ اپنے بندوں کو وہ دور نہیں رکھتا۔ موسیٰ کو ہی دیکھ لو کہ انھیں کیا ملا۔ ہم بھلا کس کھیت کی مولی ہیں"

کتاب دراز میں رکھ کر کپڑے پہنتے ہوئے اس نے ستینوف

سے پوچھا:-

"چلتے ہو شراب خانے؟"

"چلوں گا تو سہی لیکن میں اپنے شراب خانے جاؤں گا۔"

ان دونوں کے چلے جانے کے بعد، میں فرش پر پال کے ساتھ پڑا رہا۔ دیر تک اِدھر اُدھر کروٹیں بدلنے کے بعد اس نے یک بیک رونا شروع کر دیا:

"ارے بابا کچھ کہو تو سہی کیا بات ہے؟" جواب میں وہ بولا:

"ان سب کی حالت زار دیکھ کر میرا دل بیٹھا جاتا ہے۔ ان کے ساتھ رہتے مجھے چار سال ہو گئے اور ان کا رتی رتی حال مجھے معلوم ہے۔"

مجھے بھی ان بدنصیبوں پر بڑا ترس آتا تھا۔ دیر تک ہمیں نیند نہ آئی اور ہم آہستہ آہستہ فرداً فرداً ان سب کا ذکر کرتے رہے اور ہر ایک میں ہمیں کوئی نہ کوئی خوبی ضرور نظر آئی۔

پال میرا گہرا دوست تھا۔ آخر میں وہ بڑا اچھا کاریگر بن گیا لیکن زیادہ عرصے کام نہ کر سکا۔ تین سال کے اندر وہ دیوانہ وار شراب پینے لگا اور بعد ازاں میں نے اُسے ماسکو کے ایک بازار میں خستہ حال پایا۔ چند سال بعد ہی وہ مر گیا۔ یہ سوچ کر دل خون ہوتا ہے کہ زندگی میں کیسے اچھے اچھے لوگوں کو میں نے اپنے ہاتھ سے اپنی زندگی تباہ کرتے دیکھا ہے۔ یوں تو ہر قوم میں تھوڑے بہت لوگ اپنی جان کے درپے ہوتے ہیں اور ان کی فطرت کا یہی تقاضا بھی ہے۔ لیکن روس میں جس ہولناک طریقے سے اور

جس وسیع پیمانے پر خودکشی کا یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ وہ عبرت انگیز ہے۔

اس زمانے میں پال نہایت زندہ دل اور ذہین تھا۔ مجھ سے عمر میں بس دو سال بڑا تھا۔ جانوروں اور پرندوں کی تصویریں بنانے میں اسے کمال حاصل تھا اور کارٹون کا تو وہ استاد تھا۔ مزدوروں کے کارٹون بنانے میں اُسے خاص ملکہ حاصل تھا۔ سِتینوف کارٹون میں لکڑ بڑھئی بنایا گیا تھا جو ایک ٹانگ پر بیٹھا اُداسی سے کچھ سوچ رہا ہے۔ چنچریف ایک بوڑھا مرغ ہے جس کے بال و پر جھڑ گئے ہیں لیکن سب سے اچھا کارٹون بوڑھے "گولوف" کا تھا جو چمگادڑ کی شکل میں پیش کیا گیا تھا۔

مزدوروں کو اپنے کارٹون تو بُرے نہیں لگے لیکن گولوویف کی نقل سے سب کے کان کھڑے ہوئے اور انھوں نے پال کو ڈانٹ کر کہا:

"خیریت چاہتے ہو تو اسے پھاڑ ڈالو ورنہ بڑے میاں نے دیکھ لیا تو زندہ نہ چھوڑیں گے!"

یہ بُڈّھا جو گندگی میں لاثانی اور مے نوشی میں بے ہمتا تھا۔ دن رات دین داری کا وہ پاکھنڈ رچتا تھا کہ الامان اور دوسروں کی برائی میں وہ مصروف رہتا تھا کہ توبہ۔ سب کارخنداروں کی چغلی وہ دوکان کے مددگار سے کیا کرتا جس کی شادی مالکہ کی بھانجی سے ہونے والی تھی اور اس نسبت سے وہ ابھی سے اپنے کو سب کا آقا سمجھنے لگا تھا۔ کارخندار اس سے نفرت کرتے تھے لیکن اُس سے خوف بھی کھاتے تھے اور اسی وجہ سے گولوویف سے بھی ڈرتے تھے۔

اس چغلخور کو سزا دینے کا کام پال نے اپنے ذمّے لیا تھا اور اس کا واحد مقصد یہ تھا کہ اس کمینے بڈھے کو لمحہ بھر کا اطمینان نصیب نہ ہو۔ میں بھی جوش و خروش سے اُس کا ہاتھ بٹاتا اور کارخانہ ہماری چھیڑ چھاڑ کی داد دیتا۔ لیکن ہمارے کان میں یہ بات بھی ڈال دی گئی کہ دکان کا مددگار ہماری ٹوہ میں ہے۔

اس ڈراوے کا ہم پر کوئی اثر نہ ہوا۔ ایک بار تو ہم نے سوتے میں اُس کے چہرے پر سیاہی پوت دی۔ دوسری مرتبہ اس کی ناک پر ایسی سُنہری پالش کی کہ تین دن تک نتھنوں سے سونے کا پانی نہ اُترا۔ لیکن ہماری چھیڑ چھاڑ سے جب بھی اس بڈھے پر غصّے کا بھوت سوار رہا میرے دل میں جہاز اور اس پر کام کرنے والے سپاہی کی یاد تازہ ہوگئی اور میں اپنی روح کو تڑپتا ہُوا محسوس کرنے لگا گو لوفیف میں کافی بڈھا ہو جانے کے باوجود بڑا دم خم تھا۔ ہم اس کے ہتھّے چڑھ جاتے تو وہ آسانی سے مار بھگاتا اور لطف یہ کہ پھر مالکہ سے شکایت بھی کر دیتا تھا۔

مالکہ ہر وقت نشے میں دھت رہتی اور اسی لیے بظاہر بڑی ہنس مُکھ اور رحم دل معلوم ہوتی تھی۔ لیکن جب وہ گھونسا تان کر ہماری طرف بڑھتی تو بس روح فنا ہو جاتی۔ وہ دانت پیس کر کہا کرتی:

"ارے جنگلی کتّو! تم اپنی شرارت سے باز نہیں آؤ گے۔ وہ بڈھا ہے۔ تمھارے باپ کے برابر۔ اور تم اس کی عزت نہیں کرتے۔ اچھا سچ سچ بتاؤ اس کے گلاس میں شراب کی بجائے سرکہ کس نے اُنڈیلا تھا؟"

"ہم سب نے"۔ اور یہ جواب سن کر مالکہ حیران رہ جاتی۔

"پناہ بخدا! کیسی سینہ زوری ہے۔ جرم کرتے ہو اور جرم کا اقرار بھی۔ تم پر خدا کی لعنت ہو۔ تمھیں اس بڈھے کا احترام کرنا چاہیے"۔

وہ ہمیں مار بھگاتی اور جب شام کو دُکاندار آتا تو ساری رام کہانی اُس کو سنا ڈالتی۔ وہ بگڑ کر مجھ سے کہتا:

"آخر کیوں پڑھتے ہو تم کتابیں۔ آسمانی نوشتوں کا مطالعہ کرنے کے بعد بھی تم اپنی خباثت سے باز نہیں آتے۔ اس در دسری سے کیا حاصل پر وقت آئے گا کہ تم اپنے کیے پر پچھتاؤ گے"۔

مالکہ تنہا رہنے کی عادی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی رُوح رنج و غم میں ڈوبی رہتی ہے۔ وہ شراب کے میٹھے میٹھے گھونٹ حلق سے اُتارتے وقت کھڑکی میں بیٹھ جاتی اور بڑی دل سوز لَے میں یہ گیت الاپتی:۔

نہ غم خوار کوئی نہ دم ساز ہے
مرے رنج و غم پر ترس کھائے کون
کسے دردِ پنہاں کا احساس ہو
میں اب حالِ دل کس سے جا کر کہوں

ایک روز میں نے دیکھا۔ وہ گرم دودھ کا جگ ہاتھ میں لیے زینے پر سے اتر رہی تھی کہ یکایک اس کی ٹانگیں لڑکھڑانے لگیں۔ وہ بیٹھ کر بچّوں کی طرح ایک سیڑھی اُترنے کے لیے مجبور ہوگئی۔ اس کشمکش میں اُس کے ہاتھ بھی بے قابو ہوگئے۔ اور تمام دودھ چھلک کر لباس پر گر پڑا۔ وہ جگ کو کڑی نظروں سے دیکھ کر غصّے میں کہنے لگی۔

"ارے کمبخت۔ بگڑے دل! بتا تو سہی تیرے من میں کیا ہے؟"۔

ضرورت سے زیادہ کھاتے پیتے رہنے کی وجہ سے اس کا جسم پھول کر

کُتّا بن گیا تھا۔ وہ ایسی بوڑھی شیرنی معلوم ہوتی تھی جس میں شکار پکڑنے کی سکت باقی نہ رہی ہو۔ اُسے سوائے غرّانے کے اور کچھ نہیں آتا تھا۔ وہ مسرت و شادمانی میں گزارے ہوئے لمحے یاد کر کر کے زندگی کے باقی دن پورے کر رہی تھی۔

ستیالوف سب سے زیادہ پُرانا ملازم تھا۔ اُس نے وہ دن دیکھے تھے جب کارخانے کی تجارت اپنے عروج پر تھی۔ اور بڑے بڑے کاریگر اپنا خون پسینہ ایک کر کے وہاں کام کرتے تھے۔ مگر اب وہ بات نہیں تھی۔ نئے نئے لوگوں کا دور دورہ تھا۔ شہرت دنیک نامی حرف غلط کی طرح مٹتی چلی جا رہی تھی۔ اور اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ کفِ افسوس ملکر خاموشی اختیار کی جائے۔

سیتالوف کی طرح پال نے بھی اس انقلاب کو خوب محسوس کیا تھا۔ اور اس کا سبب جانتا تھا وہ سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگا کر فلسفیانہ انداز میں صرف تین چیزوں کا ذکر کرتا — خدا۔ شراب اور عورت — بس اس کے سوا کوئی چوتھی چیز اُس کے دل و دماغ پر حاوی نہیں ہوسکتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ بعض لوگ جان بوجھ کر بنے بنائے کام کو بگاڑ دیتے ہیں اور بعض اپنی ناواقفیت کے باعث اس کو سنوار نہیں سکتے۔

ایسے خیالات کا اظہار کرتے وقت اس کا چہرہ غصّے سے تمتما اُٹھتا تھا۔ وہ مراقبے کی حالت میں اپنے بستر پر بیٹھ جاتا اور چوکور کھڑکی کے باہر اس طرح نظریں جما لیتا کہ پھر اُسے دنیا و مافیہا کی خبر نہ رہتی۔ البتہ کچھ دیر بعد اس کی نظریں بھٹکتی بھٹکاتی سائبان کی اُن چادروں کا جایزہ لینے لگتیں جو برف کے بوجھ سے ہر وقت دبی رہتی تھیں۔

کارخندار رات بھر خراٹے لیتے یا نیند میں براتے رہتے تھے۔ ان میں سے ایک شخص سوتے میں بہت زیادہ بے تکی باتیں بکنے کا عادی تھا اور دو یدوف کا تو ذکر ہی کیا۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ کھانس کھانس کر اپنی زندگی کے باقی دنوں کو بلغم کی شکل میں تھوکتا رہے گا۔ یہ سب کے سب خدا کے بندے پہلو سے پہلو ملائے چادروں میں لپٹے پڑے رہتے اور دیواروں کے قریب رکھی ہوئی ناتمام مورتیں جن میں سے اکثر ہاتھ پانو سے محروم ہوتیں ان کی زدہ حالت پر ہنسا کرتی تھیں۔ وہاں کی فضا غلاظت اور سڑے ہوئے انڈوں کی بدبو سے اس قدر متعفن ہوتی کہ سانس لینے کو جی نہیں چاہتا۔

"مجھے ان کی بے کسی پر ترس آتا ہے"۔ پال زیرِ لب کہتا۔ "خدایا ان پر رحم کر"۔

اس طرح جب وہ مجھ سے اظہار ہمدردی کرنے لگتا تو مجھے بہت کوفت ہوتی۔ میری نگاہ میں وہاں کے سب لوگ بھلے مانس تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کی زندگی بڑی دردناک، ناخوشگوار اور خود ان کے لیے اجیرن تھی۔ موسم سرما میں باد و باران کے طوفان کے ساتھ برف بھی پڑنے لگتی تو مکانوں اور مکانوں کی چھتوں سے لے کر درختوں اور درختوں کے پتوں تک دُنیا کی ہر چیز پر مُردنی چھا جاتی۔ معلوم ہوتا کہ کائنات کا ہر ذرہ آہ و زاری کرنے اور آنسو بہانے میں مصروف ہے۔ حتیٰ کہ قریب کے گرجا میں بجنے والی گھنٹیوں کی آواز میں بھی سوز پیدا ہو جاتا تھا۔ اس افسردگی کی لہر بہتے ہوئے بوجھل سیسے کی طرح کارخانے تک بھی پہنچتی اور ہر جاندار شے کو بے جان کر دیتی۔ پھر اس خیال سے کہ وہ مردنی کہیں واقعی موت

نہ بن جائے، ان لوگوں کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہوتا کہ وہ چکلوں میں جا کر شاہدانِ بازاری کے دامن میں پناہ لے لیں۔ عورت کا قرب اُن کے لیے بے چھنی شراب سے زیادہ نشہ آور اور مدہوش کن ثابت ہوتا اور وہ اس کیفیت میں سرشار ہو کر عارضی طور پر اپنے آپ کو بھول جاتے تھے۔

ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ کتابیں پڑھ کر سُنانا بالکل بیکار تھا۔ لہٰذا میں اور پال ان کو اور طریقوں سے ہنسانے کی کوشش کرتے۔ مثلاً کبھی رنگ و روغن مل کر عجیب و غریب شکلیں بنا لیں اور کبھی کوئی لباس پہن کر بھیس بدل ڈالا۔ ہم دونوں مِل جُل کر مزاحیہ نقلیں تیار کر لیتے اور مضحکہ خیز حرکتوں سے ان کو پیش کرتے تو کارخانے کی مغموم فضا میں کچھ دیر کے لیے زندہ دلی پیدا ہو جاتی۔ ہمارے مکالمے عموماً بہادری کے قصّوں سے ماخوذ ہوتے تھے جو بزدل سامعین کے لیے یقیناً دلچسپی کا باعث ہو جاتے تھے۔

شیطان سے متعلق ایک چینی قصہ خاص طور پر پسند کیا جاتا تھا۔ پاشکا بڑی خوبی سے شیطان کا پارٹ کرتا۔ اور باقی تمام افراد کی اداکاری میرے ذمّے تھی۔ میں ایک ہی وقت میں کئی کئی لوگوں کی نقل اُتار سکتا تھا۔ کبھی غریب کسان بنتا، اور کبھی مال دار زمین دار۔ کبھی رئیس بنتا اور کبھی اُس کے در کا بھکاری۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ مجھی کو پتھر کی وہ چٹان بھی بن جانا پڑتا جس پر شیطان تھک تھکا کر کچھ دیر سُستانے اور یہ سوچنے کو آ بیٹھتا کہ اب کن نئی نئی ترکیبوں سے وہ بھولے بھالے لوگوں کو اپنے جال میں پھنسائے۔

مجھے سخت تعجب ہوتا جب سامعین معمولی سے معمولی مذاق پر بھی کِھلکِھلا کر ہنس پڑتے۔ میں سوچتا کہ دیکھو ان لوگوں کا ذوق کتنا پست ہے۔ اپنے قہقہوں کی مطلق قدر نہیں کرتے۔

"بھئی بہت ہی مسخرا ہی" وہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو کر کہتے "شیطان کا چیلا ہی"

لیکن جب میں نے ان کی ذہنیت کا گہرا مطالعہ کیا تو مجھے اس احساس سے تکلیف ہونے لگی کہ دراصل وہ مسرت و انبساط کی بجائے رنج وغم کے زیادہ دلدادہ تھے۔ طرب و نشاط کو ان کی زندگی سے دُور کا واسطہ بھی نہ تھا۔ اور اس لیے ان کی نگاہ میں اس کی کوئی وقعت نہیں تھی۔ اُن کے قہقہے آنسوؤں میں ڈوب کر بلند ہوتے تھے۔ اور یہ ان کی زندگی کا وہ تضاد تھا جس کو جلد سمجھ لینا کوئی آسان بات نہیں تھی۔ چنانچہ اکثر دیکھا گیا کہ رنگ رلیوں کے درمیان میں جب بھی ان کو اپنی دردناک زندگی کا احساس ہوا، ان کی حالت بدل گئی، اگر وہ خوشی میں آ کر ناچنے لگتے تو میں سمجھتا کہ ان کی حرکاتِ رقصیہ کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ اپنے اعضا کی غیر معمولی جنبشوں سے ان بندھنوں کو توڑ دیں جن سے ان کے ہاتھ پانو جکڑے ہوئے ہیں۔ ایسی رنگ رلیوں اور چہلوں کے دَوران میں جب کوئی خوفناک وحشیانہ جذبہ ان کے اندر بیدار ہو جاتا تو وہ بالکل بے بنیاد غصّے کا اظہار کرتے ہوئے آپس میں دست و گریبان ہو جاتے اور چاہتے کہ ایک دوسرے کو چبا ڈالیں بلکہ صفحۂ ہستی سے مٹا کر رکھ دیں۔

ان کی وہ نمائشی مسرت میرے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ بلکہ مجھے اس ہنسی مذاق سے الجھن سی ہونے لگی اور اسی لیے میں نے ایسی اوٹ پٹانگ تمثیلیں پیش کرنی شروع کر دیں۔ جن میں واقعات کی ترتیب کا مطلق لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ میں چاہتا تھا کہ کسی طرح ان کی خود فراموشی کو دُور کر کے ان میں صحیح احساسِ مسرت پیدا کر دوں اور اس میں شک نہیں کہ مجھے تھوڑی

بہت کامیابی ہوئی اور انھوں نے بھی میری کوششوں کو سراہا لیکن اس کا کیا علاج کہ ذرا سی ڈھیل ملتے ہی وہ مایوسی جس کے اثر کو میں بڑی مشکل سے زایل کرتا تھا، دوبارہ ان پر طاری ہو جاتی۔ اور اس قدر تیزی کے ساتھ کہ اس سے چھٹکارا پانا قریب قریب محال ہو جاتا۔

بھورے میاں ہمدردی جتاتے ہوئے کہتے۔

"بھئی کیا کہنے! بہت ہی دل چسپ انسان ہو، خدا نظرِ بد سے بچائے۔"

"اجی واقعی! اس کا دم بھی غنیمت ہے۔" جیخاریف تائید کرکے مجھ سے مخاطب ہوتا! "بھئی میکسم! میرا خیال ہے تم سرکس میں نوکری کر لو۔ ورنہ تھیئٹر بھی تمھارے لیے بہترین جگہ ہے۔ مسخرے کا پارٹ تم سے بہتر کوئی نہیں کر سکتا۔"

تمام کارخانے میں صرف دو ہستیوں کو تھیئٹر جانے کا شوق تھا اور وہ بھی خاص خاص موقعوں پر۔ باقی دقیانوسی خیال کے لوگ اسے لہو ولعب سے تعبیر کرتے ہوئے گناہِ کبیرہ سمجھتے تھے، جس سے بچے بغیر نجات غیر ممکن تھی۔ لیکن ستیانوف پُرزور لہجے میں مجھ سے کہتا:۔

"ارے میاں! یہ سب جھنجھٹ چھوڑو اور فوراً ایکٹر بن جاؤ۔ بس اسی طرح کچھ کما کھاؤ گے۔"

وہ مشہور اداکاروں کے قصّے سُنا سُنا کر مجھے اُکساتا اور ہر ممکن طریقے سے ترغیب دیتا کہ میں اُس کی رائے مان لوں۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ منڈی میں تین آگ بُجھانے والے سپاہی ایک غریب کسان کو بُری طرح مار پیٹ رہے تھے۔ یہ تماشہ دیکھنے کے لیے تقریباً چالیس آدمیوں کا جمگھٹ لگ گیا تھا۔ وہ سب کے سب خوش ہو ہو کر

سپاہیوں کو اُبھار رہے تھے۔ یہ منظر دیکھتے ہی ستیانوف کا خون کھولنے لگا۔ اُس نے فوراً آستینیں چڑھائیں اور سپاہیوں پر پل پڑا۔ ایسے مکّے مارے کہ اُن کے اوسان خطا ہو گئے۔ اور غریب کسان کو صاف بچا لیا۔ اس نے تماش بینوں کو خوب لعنت ملامت کی کہ وہ کیوں کھڑے سیر دیکھتے رہے۔

مجھے اس کی جرأت پر بڑا تعجب ہوا۔ اول تین کے مقابلے میں تنِ تنہا لڑنا بذاتِ خود کافی بہادری کا کام تھا۔ اور پھر وہ جگہ ایسی تھی کہ اگر سپاہی چاہتے تو باقی آگ بجھانے والوں کو اپنی مدد کے لیے بلا سکتے تھے کیونکہ وہ احاطہ جہاں آگ بجھانے کا انجن کھڑا رہتا تھا مشکل سے دس قدم کے فاصلے پر تھا ایسی صورت میں ستیانوف کی ہڈی پسلی ایک ہو جاتی۔ مگر اللہ نے خیر کی۔ وہ تینوں بُزدل اس قدر خوف زدہ ہو کر بھاگے کہ پیچھے مُڑ کر بھی نہیں دیکھا۔

اتوار کے اتوار تمام نوجوان گھونسے بازی کا مقابلہ دیکھنے جاتے جو گرجا کے بالکل پیچھے کھُلے میدان میں ہوتا تھا۔ وہاں ہمارے کارخانداروں سے لڑنے کے لیے گانو کے زمیندار اور کوچوان جمع ہوتے تھے۔ گھونسے بازوں میں بڑی بڑی آنکھوں والا ایک قوی ہیکل مردوانی خاص طور پر مشہور تھا۔ یوں تو وضع قطع کے اعتبار سے وہ بڑا اُول جلول معلوم ہوتا لیکن تھا بڑا جیدار بڑے بڑے جیوٹ اُس کے مقابلے میں آتے ہوئے کتراتے تھے۔ خدا جانے ہمارے کارخانے کے رنگساز کو کیا سوجھتی کہ میرا شیر ڈٹ کر کھڑا ہو جاتا۔ اور ہمیشہ مُنہ کی کھاتا۔ بس دو ہی ہاتھوں میں چت ہو کر زمین ناپنے لگتا۔ وہ ہانپتا کانپتا پسینے میں شرابور اکھاڑے سے باہر نکلتا اور قسم کھا کر کہتا کہ بس اس مردوانی کو آیندہ وار میں جان سے مار ڈالوں گا۔ ورنہ خود ہلاک ہو جاؤں گا۔ لیکن یہ قسم کبھی پوری نہ ہوتی۔

تاہم اس حریف کو شکست دینا اُس نے اپنی زندگی کا واحد مقصد بنا لیا تھا۔ اور اس خیال سے شراب پینی چھوڑ دی تھی۔ وہ اپنے تمام جسم پر سونے سے پہلے خوب برف رگڑواتا اور صبح کو تیل کی مالش کرتا۔ گوشت زیادہ کھانے لگا تاکہ پٹھے خوب تگڑے ہو جائیں۔ لیکن جب اس طرح بھی کوئی فایدہ نہ ہوا۔ تو اُس نے دستانوں کے اندر سیسے کی ٹکلیاں ٹنکوا لیں اور یقین کر لیا کہ اب اپنے حریف کا منہ آسانی سے توڑ سکوں گا۔ لیکن ستیانوف نے اس کارروائی کو پسند نہیں کیا۔ اور رنگساز کو سختی سے ڈانٹ کر کہا کہ یہ سیسہ فوراً نکلوا دو۔ ورنہ مقابلے سے پہلے ساری پول کھول کر رکھ دوں گا۔ رنگ ساز نے سوچا کہ یہ یوں ہی دھمکی دے رہا ہے۔ اور اس لیے کچھ پروا نہ کی۔ لیکن عین موقعے پر ستیانوف نے اُسے علیحدہ بلا کر آخری بار سمجھایا۔ اس کا چہرہ غصّے سے سُرخ ہو گیا لیکن کر کیا سکتا تھا مجبوراً اپنا سا منہ لے کر اکھاڑے کے باہر چلا گیا۔ اور دستانے اُتار کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ لوگ جو حقیقت حال سے ناواقف تھے ستیانوف پر برس پڑے کہ آخر نجی معاملات پر گفتگو کیوں کی گئی جس سے ایک پہلوان ہمت ہار کر میدان سے چلا گیا۔ ستیانوف پہلے تو خاموش رہا مگر جب ہر طرف سے لے دے ہوئی اور یہاں تک کہ اس اکھاڑے کا منتظم بھی لال پیلا ہونے لگا تو اس سے نہ رہا گیا اور اس نے سب راز فاش کر دیا۔ منتظم کے ہاتھوں کے توتے اُڑ گئے اور وہ اظہارِ تشکّر کے طور پر جھک گیا۔ اس نے کہا اس کے یہ معنی ہوئے کہ ہم مقابلے سے پہلے ایسے لوگوں کے دستانے دیکھ لیا کریں ورنہ کسی نہ کسی دن یہاں خون خرابہ ہو جائے گا اور مفت میں ہم دھر لیے جائیں گے۔ اس وقت اللہ نے بڑی خیر کی۔ مردوانی مرتے مرتے بچ گیا۔

سارے مجمع میں ایک ابتری سی پھیل گئی۔ اور ہر چند لوگ رنگ ساز کو برُا بھلا کہہ رہے تھے تاہم وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ مقابلے کا بازار سرد رہے۔ ان کی بلا سے زید لڑے یا بکر مگر دو دو ہاتھ ضرور ہوں۔ ایسی صورت میں ستیانوف کے لیے اس کے سوائے کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ وہ خود خم ٹھونک کر آگے بڑھ جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوُا۔

لوگوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ کر بڑا سا گھیرا بنا لیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے سب کے سامنے جوڑ چھوٹ گئی۔ دونوں گھونسے بازوں نے بائیں ہاتھ سینوں پر رکھ کر دائیں ہاتھ آگے بڑھائے اور مقابلہ شروع ہو گیا۔ جاننے والوں نے جلدی ہی اندازہ لگا لیا کہ نتیجہ کیا رہے گا۔ ستیانوف کے بازو ذرا لمبے تھے۔ اور اس لیے ان کی مار پوری قوت سے پڑ سکتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ تھا بھی چالاک۔ دائیں ہاتھ سے جھجکی دے کر بائیں ہاتھ سے ایسا حملہ کرتا کہ مردوانی دیکھتا کا دیکھتا رہ جاتا۔ اور ابھی اس کے ہوش وحواس سنبھلنے بھی نہ پاتے کہ دھن سے ایک مکّہ اور آن پڑتا۔ تمام کارخندار برابر شہ دیتے رہے اور صرف ہمیں لوگ نہیں بلکہ دوسرے اجنبی بھی غل مچانے میں برابر کے شریک ہو گئے۔ مردوانی قدآور نہ سہی لیکن تھا بڑا ہٹّا کٹّا اس لیے دو چار وار میں اگر ایک مُکّا بھی جچا تُلا پڑ جاتا تو ستیانوف کے مزاج درست ہو جاتے تھے۔ آخر کار لڑتے لڑتے جب دونوں تنگ ہو گئے تو لوگوں نے بیچ میں پڑ کر جوڑ برابر چھڑوا دی۔ مردوانی نے مزاحیہ لہجے میں کہا۔

"بھئی مانتے ہیں۔ میاں رنگ ساز طاقت نہ سہی لیکن ہیں بڑے چالاک۔ اور چستی بھی ان میں بَلا کی ہے۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ اگر وہ

برابر ریاض کرتے رہیں تو دُنیا کے بہترین گھونسہ باز بن سکتے ہیں"۔

ان استادوں کے بعد شاگردوں میں گھونسہ بازی ہونے لگی۔ اور میں ستیا نوف کو اس شخص کے پاس لے گیا جو پٹھوں پر مالش کرنے اور اُتری ہوئی ہڈیوں کو دُرست کرنے کا ماہر سمجھا جاتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ان حضرت کی چولیں ضرور ڈھیلی ہوگئی ہوں گی۔ میں اس کی عزت کرتا تھا اور اس واقعے کے بعد اس کی اہمیت میری نگاہ میں اور بھی زیادہ ہوگئی۔

وہ کہتا تھا کہ میں نے راز فاش کرکے اپنا فرض ادا کیا ہے۔ اگر خاموش رہتا تو ناحق ایک شخص کی جان جاتی۔ لیکن رنگساز کو اُس سے بغض للّہی ہوگیا۔ وہ دوسروں میں اسے بدنام کرتا پھرتا اور سامنے بھی خوب جلی کٹی سُناتا۔ ستیا نوف نے اس کی فقرے بازی پر کبھی توجہ نہ کی۔ وہ یا تو کارخانے میں پوری ایمان داری کے ساتھ کام کرتا یا کسی شاعر کی نظمیں اپنی بیاض میں نقل کرتا رہتا۔ اس طرح نقل کرنے کا مشغلہ اُسے بہت مرغوب تھا۔ اور جب ایک بار میں نے پوچھا کہ

"اماں! تمھارے پاس رُپے کی کمی نہیں ہے، پھر نقل کیوں کرتے ہو؟ اصل کتاب کیوں نہیں خرید لیتے؟" تو اُس نے جواب دیا

"بھئی تم سمجھے نہیں۔ مجھے اپنے خط میں لکھی ہوئی ہر تحریر بھلی معلوم ہوتی ہے"۔

اُس کا خط پاکیزہ اور آواز سُریلی تھی۔ جب کوئی صفحہ ختم ہوجاتا تو وہ سیاہی سوکھنے کے انتظار میں نقل کیے ہوئے آخری مصرعے بلند آواز سے الاپنے لگتا۔ اس کا انتخاب بُرا نہیں ہوتا تھا مثلاً

کوئی ایسی دُنیا میں دل کیوں لگائے

خوشی دل کی جس جا میسر نہ آئے
ہی اک قولِ برحق یہ کہنا ہمارا
نہیں جا وواں حسن یکتا تمھارا

اور اس حصّے کو ختم کرنے کے بعد وہ کسی قدر محو ہو کر کہنے لگا۔
"واہ کیا خوب کہا ہی۔ اور اس میں شک نہیں کہ ایک شاعر ہی ان حقیقتوں کو سمجھ سکتا ہی"۔

ستیا نوف اور رنگ ساز میں کچھ عجیب قسم کا میل جول تھا۔ جب وہ مل بیٹھ کر شراب پیتے تو ان میں ضرور نوک جھونک شروع ہو جاتی۔ ستیانوف کچھ دیر ٹال مٹول کرتا رہتا۔ اور جب دیکھتا کہ رنگ ساز نشے میں دُھت ہو گیا ہی تو ایسی پٹائی کرتا کہ خدا کی پناہ۔ مجبوراً باقی کارخنداروں کو ان دوستوں کے درمیان بیچ بچاؤ کرانے کے لیے اپنی ٹانگ پھنسانی پڑتی۔ لیکن جب ستیا نوف سنجیدہ حالت میں ہوتا تو رنگ ساز جان بوجھ کر لگاتار چھیڑ خانی کیے جاتا تاکہ وہ کھسیانہ ہو کر بے قابو ہو جائے۔ کبھی اس کی شاعرانہ ذہنیت کا مذاق اُڑاتا۔ کبھی اس کی رومان پسند طبیعت کا۔ اور اس چھیڑ چھاڑ میں وہ ایسی بیہودگیاں تک کر گزرتا جو ناقابلِ برداشت ہوتیں لیکن ستیا نوف خاموشی سے سب کچھ پی جاتا۔ اور مطلق برہمی کا اظہار نہ کرتا۔ بلکہ اس کے ساتھ مل کر خود ہی اپنی حالت پر ہنسنے لگتا۔

رات کو وہ دونوں قریب قریب سوتے۔ کافی دیر تک انھیں نیند نہ آتی اور ان کا وقت باتوں میں گزرتا رہتا۔ میں اس گفتگو کی نوعیت معلوم کرنی چاہتا۔ یہ اندازہ لگانے کے لیے کہ آخر وہ کون سا موضوع ہی جو ان کی طبیعتوں میں اس قدر تضاد ہونے کے باوجود رات کے وقت انھیں ایک

مرکز پر لے آتا ہے۔ میں چوری چھپے سُننے کی کوشش کرتا مگر گفتگو اس قدر آہستہ ہوتی کہ کچھ بھی میرے پلّے نہ پڑتا۔ مجھے اپنے قریب کھسکتا ہوا دیکھ کر رنگ ساز ڈپٹ کر پوچھتا۔

"کیوں جی! کیا مطلب ہے؟"

اور ایسا معلوم ہوتا گویا ستیانوف نے دیکھا ہی نہیں۔ وہ مجھے کچھ نہ کہتا۔ تاہم ایک روز انھوں نے بلالیا اور رنگ ساز نے مجھ سے پوچھا۔

"کیوں بھئی میکسیم! اگر تمھیں بہت سی دولت مل جائے تو اسے کس طرح خرچ کرو؟"

"بس میں تو کتابیں خرید لوں"

"اور ان کے علاوہ؟"

"اس پر کبھی غور نہیں کیا"

ستیانوف نے تائید کی۔ بے شک پہلے سے کوئی بھی نہیں جانتا کہ ہاتھ میں آیا ہوا روپیہ کس طرح خرچ کیا جائے گا۔ ان کا مقصد کیا تھا؟ یا ان کے خیال کے مطابق روپے کا بہترین مصرف کیا ہو سکتا تھا؟ —— یہ معلوم کرنے کی میں نے کوشش نہیں کی۔ تاہم اس طرح قرب حاصل ہو جانے پر میں بعد میں ان کی گفتگو سُن سکا۔ لے دے کے وہی فرسودہ موضوع تھے جو دن کے وقت بھی معرض بحث میں رہا کرتے تھے۔ مثلاً خدا اور خدا کی نوازشات یا اس کے برعکس عورت اور عورت کی ریاکاریاں۔ امیروں کا ظلم وستم، غریبوں کی بے کسی یا پھر زندگی کی الجھنیں اور اس کے ناقابل فہم اسرار و رموز۔

میں ان کی گفتگو بڑے شوق سے سنتا اور یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوتی کہ نتیجے کے خیال سے وہ سب ایک دوسرے کے ہم خیال ہیں۔

یعنی سب ہی کہتے کہ زندگی ایک وبال ہے۔ لیکن ان کی یہ آرزو صرف الفاظ تک محدود رہتی اور کبھی عملی صورت اختیار نہ کرتی۔ ان کے باہمی تعلقات کچھ اس قسم کے تھے کہ ان میں تبدیلی پیدا ہونے کا کوئی امکان نہیں ہو سکتا تھا۔ میں ان کی گفتگو اور ان کی زندگی کی روشنی میں خود اپنی زندگی کا مطالعہ کرتا۔ اور مجھے محسوس ہوتا کہ اس میں ایک سوگوار قسم کا خلا موجود ہے۔ جس کی فضا میں ہوا کے دوش پر اُڑنے والے خاک کے ذرّوں کی طرح وہ لوگ۔ تیرتے پھر رہے ہیں۔ جن سے مجھے روزمرہ سابقہ پڑتا رہتا تھا۔ وہ لوگ جو دوسروں کے متعلق رائے زنی کرتے رہتے ان کے خلاف زہر اُگلنے، ان پر سخت سے سخت حملے کرنے، اور معمولی معمولی باتوں پر جھگڑ پڑنے کے عادی تھے۔ وہ جان بوجھ کر ایک دوسرے کو ستاتے کیونکہ انھیں آپس کی چھیڑ خانی سے بڑی دلچسپی تھی۔ وہ اس موضوع پر بڑی گرما گرم بحث کرتے کہ مرنے کے بعد ان کا حشر کیا ہوگا۔ لیکن یہ جاننے کی کبھی کوشش نہ کرتے کہ کارخانے کی فضا میں بدبو کیوں پھیلی رہتی ہے۔ دروازے کے قریب نل کے نیچے ہاتھ دھونے کا پیپا رکھا ہوا تھا جس کے پیندے میں لکڑی گل جانے کے باعث چھید ہو گئے تھے اور ان کے اندر سے رِس رِس کر پانی قریب ہی جمع ہو جاتا اور مسلسل سڑتا رہتا۔ اس سے نہ صرف بدبُو بلکہ تمام کارخانے میں سیل پھیلی رہتی تھی۔ میں نے اور پال نے کئی بار پھٹی پرانی دھجیاں ٹھونس کر سوراخ بند کرنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ لکڑی اس قدر گل گئی تھی کہ پانی کے زور سے سوراخ بڑھتے ہی چلے گئے سارا پیندا چھلنی ہو گیا۔ اس لیے میں نے کہا کہ سارا تختہ بدل ڈالنا چاہیے دراصل اسی کی نمی سے بہت سے لوگوں کو نزلے زکام کی شکایت

ہو گئی تھی۔

وہ نہا دھو کر آتے اور میلے کچیلے بستر پر دراز ہو جاتے۔ اُنھیں اس کی غلاظت یا بدبُو سے کبھی گھن نہ آتی۔ ایسی ہی روزمرّہ کی سینکڑوں باتیں تھیں جن سے ہماری زندگی ناقابلِ برداشت ہو گئی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ ان کا تدارک آسانی سے ہو سکتا تھا۔ لیکن ہاتھ پاؤں ہلانے کی تکلیف کسی کو گوارا نہیں تھی۔

وہ عموماً کہا کرتے

"خدا کا تو ذکر ہی کیا۔ خود ہمیں اپنی حالت پر ترس نہیں آتا۔"

ایک روز میں نے اور پال نے مل کر دویدوف کو نہلا دُھلا کر صاف کیا۔ کیونکہ اس کی بیماری کا سب سے بڑا سبب اس کا گھنی پن تھا۔ یہ دیکھ کر سب لوگ ہم پر ہنسنے لگے اور قمیصیں اُتار اُتار کر کہنے لگے کہ آؤ ذرا ہماری جوئیں بھی دیکھ لو۔ اُنھوں نے خوب فقرے کسے اور طرح طرح سے ہمارا مذاق اُڑایا۔ دویدوف کو خطرناک قسم کی کھانسی لاحق تھی۔ وہ ہر وقت کھانستا رہتا۔ جس کے باعث رات کے وقت لوگوں کی نیند تک حرام ہو گئی تھی۔ اس کے بلغم میں خون آتا تھا۔ جو اور بھی زیادہ خطرناک تھا۔

صبح اُٹھ کر سب ایک زبان ہو کے کہتے کہ اسے اسپتال میں داخل کر دیا جائے۔ کم بخت کی کھانسی ہمیں چین سے سونے نہیں دیتی۔ پھر ان میں سے کوئی نہ کوئی بول اُٹھتا کہ چلو دو چار دن اور رہنے دو۔ اس کی زندگی کا پیمانہ چھلک جانے کے قریب ہے۔ عنقریب خود ہی ختم ہو جائے گا اور وہ بھی ہاں میں ہاں ملا کر کہتا کہ بے شک بندے نے کوچ کی تیاری

کرلی ہے۔

وہ سنجیدہ مذاق کا عادی تھا۔ اس کے چٹکلوں سے کبھی کبھی کارخانے کی مغموم فضا میں ہنسی کی لہر دوڑ جاتی تھی۔ گانا وانا اسے خاک نہ آتا تھا لیکن اس کے بغیر رہ نہیں سکتا تھا۔

"سنو میرے بھائیو!" وہ بمشکل کھانسی پر قابو پا کر کہتا۔ "اس گانے والے پرندے کی آواز سُنو جو عنقریب جنت میں آشیانہ بنانے والا ہے —

میں عرش بریں کا رہنے والا
صبح سویرے اٹھتا ہوں
سوتا رہوں یا شب بھر جاگوں
کیڑوں کی غذا میں بنتا ہوں"

سُننے والے ہنس کر کہتے "بھئی بڑا زندہ دل ہے۔ بیماری بھی اسے غمگین نہ کر سکی"۔

وہ میرے اور پال کے سوا سب کا مذاق اُڑاتا تھا۔ جب کبھی ہم گفتگو کے لیے اس کے پاس جا بیٹھتے وہ بڑی خاطر مدارات کرتا۔ اور اس وقت اس کی باتیں بھی سنجیدہ ہوتیں۔ اس کا خیال تھا کہ موت کا سایہ اس پر کبھی نہیں پڑ سکتا۔ اور اس طرح اپنی سخت جان کو اپنے لیے ایک وبال سمجھتا تھا۔ جب وہ بالکل بے دھڑک ہو کر اپنی موت کا ذکر کرنے لگتا تو پال پر ایک قسم کی ہیبت سی طاری ہونے لگتی۔ اور ان باتوں کا خیال کر کے وہ بعد میں بھی ڈرتا رہتا۔ مجھے سوتے سے جگا کر وہ چپکے سے کہتا۔

"میکسیم! میکسیم! شاید وہ مر رہا ہے۔ بھلا ایسی حالت میں جب کہ ہم سب اس کے قریب پڑے ہیں وہ آدھی رات کو مر گیا تو کیا ہوگا۔ خدا

بُری گھڑی سے بچائے۔ مجھے مرنے والوں سے بڑا ڈر لگتا ہے۔"

کچھ دیر خاموش رہ کر کہتا۔

"ذرا سوچنے کی بات ہے۔ وہ اس دُنیا میں پیدا ہی کیوں ہوا؟ ابھی بہار کے چوبیس موسم بھی نہیں دیکھے اور موت کے آغوش میں پہنچ رہا ہے۔"

ایک رات چاندنی چھٹکی ہوئی تھی کہ اچانک اُس کی آنکھ کھُل گئی اُس نے جھنجھوڑ کر مجھے بیدار کر دیا۔ اور بہت خوفزدہ ہو کر کہنے لگا۔ "سنتے ہو۔" میں نے کان لگا کر سُنا تو دویدوف مچان پر لیٹا خراٹے لے رہا تھا اور نیند میں بڑبڑا بھی رہا تھا۔

"خدا کی قسم! وہ جانکنی کی حالت میں ہے۔" پال نے مضطرب ہو کر کہا۔ "وہ آج ضرور مر جائے گا۔"

مجھے تمام دن صحن میں گری ہوئی برف سمیٹ کر باہر میدان میں لے جانی پڑی تھی۔ اس لیے تھک کر چوُر ہو گیا تھا اور نیند بھی بُری طرح چھا رہی تھی۔ لیکن پال نے طرح طرح کی قسمیں دے دے کر مجھے سونے نہ دیا۔ کچھ دیر بعد وہ چونک کر اُٹھ بیٹھا اور چلّا کر کہنے لگا۔

"ارے بھئی اٹھو۔ سب اُٹھ بیٹھو۔ دویدوف مر گیا۔"

یہ سنتے ہی بعض لوگ واقعی اُٹھ بیٹھے۔ بعض کی آنکھیں کمبلوں کے نیچے چمکنے لگیں۔ اور بعض نے بگڑ کر مختلف سوالوں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ رنگساز فوراً جھپٹ کر مچان پر چڑھ گیا اور تعجب سے بولا۔

"بھلا یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے۔ اس کا جسم تو ابھی تک گرم ہے۔ یقیناً جان باقی ہے۔"

کچھ دیر بعد سب خاموش ہو گئے۔ جینجاریف نے صلیب کا نشان

بناتے ہوئے کروٹ لی اور کمبل اپنے چاروں طرف لپٹتے ہوئے کہا۔
"کچھ بھی ہو۔ وہ اس دُنیا کو خیرباد کہہ چکا ہے۔"

ایک نے یہ رائے پیش کی کہ اسے مچان پر سے اُتار کر برآمدے میں ڈال دینا چاہیے۔ لیکن رنگساز نے مچان پر سے نیچے اُتر کر کھڑکی کے باہر نظر ڈالی اور آخری فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔

"جہاں پڑا ہے صبح تک وہیں پڑا رہنے دو۔ اس نے اپنی زندگی میں کسی کو تکلیف نہیں پہنچائی بھلا ہم اس کی مٹی کیوں خراب کریں۔

پاول تکیے کے نیچے مُنہ چھپا کر چپکے چپکے سسکیاں لینے لگا۔

لیکن ستیانوف صبح تک بیدار نہ ہوا۔

پندرھواں باب

میدانوں میں گری ہوئی برف پگھلنی شروع ہو گئی تھی۔ کبھی کبھار بارش کا کوئی چھینٹا پڑ جاتا۔ ورنہ آسمان سے بادلوں کا طوفان چھٹ چکا تھا۔ سورج بھی اپنا روزانہ سفر طے کرنے میں کافی سُست قدم ہو گیا تھا۔ ہوا میں گرمی بڑھ چلی تھی۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہار کا موسم آن پہنچا ہے۔ اس کی کرشمہ سازیاں نئے نئے گُل کھلا رہی تھیں۔ سرسبز ڈالیوں پر پھُدکنے والے پرندوں کے چہچہوں نے جوان زندگی کی لہر دوڑا دی تھی۔ اور وہ والہانہ مسرت جو اس وقت چڑیوں پر طاری تھی خود انسان پر بھی چھائی جا رہی تھی۔ چشموں کی مسلسل روانی سے بجنے والا قدرتی ساز گرجا کی گھنٹیوں سے ہم آہنگ ہو کر ایک کیف نشاط پیدا کر رہا تھا۔ لیکن وہ دل جو ازل سے حرماں نصیب تھے ان نغموں میں لطف کی بجائے سوز محسوس کر رہے تھے۔

میری سال گرہ کے موقعے پر کارخنداروں نے ایک مختصر سی دعوت کی۔ کچھ تحفے پیش کیے۔ اور جیخاریف نے پُرزور لمبی تقریر کی جو مجھے آج تک یاد ہے۔

"صاحبزادے! تم کیا اور تمھاری حقیقت کیا"۔ اس نے بھویں مٹکا کر مزاحیہ طریقے پر کہا۔ "تم ابھی نادان ہو۔ اور پھر یتیم۔ تمھاری عمر مشکل سے تیرہ سال ہو گی اور میں تم سے تقریباً چار گُنا بڑا ہوں۔ اس بزرگی کے باوجود میں تمھاری تعریف اور قدر کرتا ہوں۔ کیونکہ لوگوں کے ساتھ میل جول

رکھنے میں تمھارا ظاہر و باطن یکساں ہی۔ لیکن اس خصلت کو کبھی نہ چھوڑنا۔ اسی میں فایدہ ہی۔

اس کا خیال تھا کہ انسان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک خدا کے بندے اور دوسرے کارخانوں کے مزدور۔ لیکن دونوں میں کیا فرق ہوتا ہی۔ یہ اس کی باتوں سے پتا نہ چل سکا اور مجھے یقین ہی کہ وہ خود بھی نہیں سمجھتا تھا۔ اس کی تقریر بڑی دل چسپ اور لچھے دار تھی۔ ہنستے ہنستے سب کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ میں ان تحفوں کو ہاتھ میں لیے حیران کھڑا رہا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ اس کی تقریر کے جواب میں کیا کہوں۔ یہ دیکھ کر کہ میری بہت تعریف ہو رہی ہی، رنگساز صاحب سے برداشت نہ ہو سکا۔ یکایک جھنّا کر بولے۔

"ارے میاں! چھوڑو بھی۔ آخر کب تک اس کے گُن گاتے رہوگے اپنی تعریف سُنتے سنتے خود اس کے کان پک گئے ہوں گے۔"

پھر میری پیٹھ ٹھونک کر وہ خود میرے اوصاف بیان کرنے لگا۔

"تم میں سب سے بڑی خوبی یہ ہی کہ تم سب کے ساتھ یکساں میل جول رکھتے ہو۔ اور یہی وجہ ہی کہ جب تم سے کوئی خطا ہو جائے تو تمھارے ساتھ جوتی پیزار کرنے کو جی نہیں چاہتا۔"

وہ سب مجھے پیار کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے میری بوکھلاہٹ کا اندازہ لگا لیا ہی۔ میرے دل میں عجیب قسم کی گھبراہٹ سی پیدا ہو رہی تھی۔ میں حیران تھا کہ آخر وہ لوگ میری تعریف میں اس قدر رطب اللسان کیوں ہیں۔ حالانکہ دوکاندار روانہ صبح کو پیٹر سے کہا کرتا تھا کہ یہ لونڈا بڑا نکما ہی۔ اسے زیادہ عرصے نہیں رکھنا چاہیے۔

جب اس روز حسب معمول میں دُکان پہنچا تو دُکاندار نے بلا کر کہا۔
"دیکھو۔ آج تمھارے ذمّے یہ کام ہے کہ کارخانے کی چھت پر جمی ہوئی برف کھرچ کھرچ کر نیچے پھینک دو۔ اور گودام کو بھی اچھی طرح صاف کر دینا۔"

اسے کیا خبر تھی کہ وہ میرا جنم دن تھا۔ اور میرا خیال ہے کہ اس وقت تک کوئی بھی اس حقیقت سے واقف نہیں تھا۔ چنانچہ جب کارخانے میں مبارک سلامت کا سلسلہ ختم ہو گیا تو میں لباس بدل کر سائبان کی چھت پر چڑھ گیا۔ اور بلور کی طرح چمکتی ہوئی برف کو جو تہ بہ تہ جمی ہوئی تھی سمیٹ کر اوپر سے نیچے پھینکنے لگا۔ لیکن ستم یہ ہوا کہ میں گھبراہٹ میں گودام کا دروازہ بند کرنا بھول گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اوپر سے پھینکی ہوئی ساری برف اُس کے اندر جا پڑی جب میں کود کر نیچے اُترا تو اس وقت اپنی غلطی محسوس کی۔ اور پھر از سرِ نو اس وبال کو گودام سے نکالنا پڑا۔ نیچے گر کر وہ کافی سخت ہو چکی تھی اس لیے پھاوڑا چلانے میں بہت دقّت ہوئی۔ پھاوڑا لکڑی کی بجائے لوہے کا تھا۔ اتفاق دیکھیے کہ عین اُس وقت جب دکان دار اندر آیا۔ اس کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ چنانچہ یہ مثل کہ ہر خوشی میں غم چھپا ہوتا ہے۔ بالکل ٹھیک نکلی۔ دکان دار آنکھیں نکال کر مجھے سخت سست کہنے لگا۔ وہ اسی وقت سزا دینی بھی چاہتا تھا مگر کسی خیال سے رُک گیا۔ اور میں یہ کہہ کر وہاں سے چلتا بنا کہ میں نے مزدوروں کی طرح کام کرنے کے لیے ملازمت نہیں کی ہے۔ اس نے پھاوڑے کا ڈنڈا میرے پاؤں پر دے مارا۔ میں بھی کیوں چوکتا۔ میں نے بھی برف کا ڈلا اس زور سے مارا کہ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ میں سب کام چھوڑ چھاڑ کارخانے میں بھاگ گیا اور اس انتظار میں رہا کہ دیکھیں کیا

نتیجہ برآمد ہوتا ہی۔ چند ہی لمحے گزرے ہوں گے کہ اس کی محبوبہ دوڑتی ہوئی آئی۔ اس کا چہرہ جو چیچک کے داغوں سے نقشین پیالہ بنا ہوا تھا۔ غصّے سے تمتما رہا تھا۔ آتے ہی وہ مجھ سے۔ کہنے لگی کہ چل تجھے اوپر بلایا ہی۔

میں نے وہاں جانے سے صاف انکار کر دیا۔ لاریونچ نے حیران ہوکر وجہ پوچھی تو میں نے سب ماجرا بیان کر دیا۔ اس کی تیوری پر بل آگئے اور میری بجائے وہ خود معاملہ رفع دفع کرنے کے خیال سے اوپر چلا گیا۔ سب کا خیال تھا کہ اب مجھے کارخانے سے نکالا مل جائے گا۔ مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ میں وہاں کے ذلیل کام سے اُکتا چکا تھا اور خدا سے چاہتا تھا کہ وہاں سے کسی طرح علیحدگی ہو جائے۔

یہ میں جانتا تھا کہ دُکاندار مجھ سے کھنچا کھنچا رہتا ہی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس کو مجھ سے نفرت ہو گئی تھی۔ اسی لیے مجھے بھی اس کی شکل دیکھنا گوارا نہ تھی۔ اس نے مختلف طریقوں سے مجھے بدنام کرنے کی کوشش کی۔ مثلاً جب میں جھاڑو دینے جاتا تو وہ اُس سے پہلے دوکان کے فرش پر چند سکّے گرا دیتا۔ میری نظر پڑتی تو میں انھیں اُٹھا کر اس پیالے میں ڈال دیتا جس میں فقیروں کے لیے کچھ رقم پڑی رہتی تھی۔ دو ایک دن میں اس بھید کو نہ سمجھ سکا مگر بعد میں تاڑ گیا۔ پھر تو میں نے اسے خوب آڑے ہاتھوں لیا۔

"کیوں جی۔ آخر تم نے سمجھا کیا ہی۔ تم جان بوجھ کر پیسے پھینک دیتے ہو تاکہ مجھ پر چوری کا الزام لگا سکو۔"

وہ مجھے کتابیں پڑھتے دیکھتا تو منع کرتا۔ اس کا خیال تھا کہ ان کے مطالعے سے میرا دماغ خراب ہو جائے گا۔ وہ مجھے کوڑھ مغز کہا کرتا تھا۔

اگرچہ میں نے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ میں اس کے پیسے پھینکنے

کا مطلب سمجھ چکا ہوں، پھر بھی اس کی یہ عادت نہ گئی۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ اگر کسی دن کوئی سکّہ لڑھک کر تختوں کی جھری میں جا پڑا تو الزام میرے سر تھپ جائے گا۔ لہٰذا مناسب یہی تھا کہ اس کا تدارک کر دیا جاتا۔

میں اس معاملے پر ابھی غور کر ہی رہا تھا کہ ایک روز جب قہوہ خانے سے گرم پانی لے کر لوٹا تو میں نے دیکھا کہ دُکان دار پڑوس کی دکان کے ایک نئے ملازم کو میرے خلاف پٹی پڑھا رہا ہے۔ وہ اس سے کہہ رہا تھا کہ اس چھوکرے کو کسی طرح ورغلا کر دو ایک کتابیں چروا دو تاکہ مطلب بن جائے اچانک جیسے ہی میں کمرے میں داخل ہوا تو ان دونوں کے ہوش اُڑ گئے اس طرح ظاہر ہے کہ ان کی یہ سازش ناکامیاب رہ گئی۔

یہ نیا ملازم شراب پینے کا بہت دھتی تھا اور اسی لیے اکثر دکانوں سے نکالا جا چکا تھا۔ مگر دکان پر کھڑے ہو کر گاہک لانے کی وجہ سے وہ بہت مقبول تھا۔ اس کے دانت صاف سُتھرے رہتے تھے۔ پھر بھی منہ کی بدبُو سے قریب کھڑے ہونے والے کا دماغ سڑ جاتا تھا۔

ایک روز تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی وہ مسکراتا ہوا میرے پاس آیا۔ اور غیر متوقع طور پر میری ٹوپی اُتار کر میرے سر کے بال پکڑ لیے۔ ہم دونوں میں گتھم گتھا ہونے لگی۔ وہ کھینچ کر مجھے دکان کی گیلری کی طرف لے گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ مجھے دھکیل کر ان مورتوں پر گرا دے جو فرش پر قرینے سے رکھی ہوئی تھیں۔ اگر وہ کامیاب ہو جاتا تو ظاہر ہے کہ بہت سے شیشے ٹوٹ جاتے، پھول پتی کا کام بگڑ جاتا یا کم سے کم بعض مورتوں پر کھرونچیں ضرور آجاتیں۔ ایسی صورت میں اپنا پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا۔ لیکن وہ بہت کمزور تھا اور میں جلدی ہی اس پر غالب آگیا۔ میں نے اس بڑی

طرح اس کو رگڑا کہ ساری ناک چھل گئی اور گھنی ڈاڑھی پر خون بہنے لگا۔

دوسرے روز صبح کے وقت مالک کسی کام سے باہر چلا گیا تھا۔ اور لوگ بھی غیر حاضر تھے۔ ہماری اور برابر کی دکان میں صرف ہمیں دونوں تھے وہ اپنی ناک پر مرہم تھوپتے ہوئے مجھ سے دوستانہ طور پر کہنے لگا۔

"کیا تمھارا خیال ہو کہ میں خود اپنی مرضی سے تمھارے ساتھ جھگڑ پڑا تھا۔ نہیں میرے دوست! میں اتنا بیوقوف نہیں ہوں۔ میں خوب جانتا تھا کہ اس ہاتھا پائی میں تمھیں مجھ پر بھاری رہو گے۔ کیونکہ مجھ میں دم درود بالکل نہیں ہو۔ لیکن پھر بھی مجھے ایسا کرنا پڑا کیونکہ تمھارے مالک کی خوشنودی مجھے منظور تھی۔ میں نے اس کے اشارے پر تم سے لڑائی مول لی۔ وہ چاہتا تھا کہ میرے دھکیلنے پر تمھارے ہاتھوں دُکان کا کچھ نقصان ہو جائے تاکہ تمھارے خلاف شکایت کی جاسکے۔ ورنہ میرا تمھارا مقابلہ ہی کیا۔ تم نے ایک ہی رگڑے میں میری ناک کو ایسی زینت بخشی ہو کہ مرتے دم تک نشان باقی رہے گا۔"

میں نے اس کی باتوں پر یقین کر لیا۔ اور پھر مجھے اس کی حالت پر ترس آنے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ ایک حرّافہ عورت کے جال میں پھنسا ہوا ہو اور اس لیے روپیہ کمانے کی خاطر وہ ہر ذلیل سے ذلیل کام کر سکتا ہو۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اگر ہمارا مالک تم سے کہے کہ جاؤ فلاں شخص کو زہر دے دو۔ تو کیا تم ایسا کر گزرو گے۔ اُس نے جواب دیا کہ ہاں اُس سے کچھ بعید نہیں ہو۔ وہ اگر چاہے تو مجھ سے ہر قسم کا کام لے سکتا ہو۔"

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ مجھ سے کہنے لگا۔

"سنو یار! اس وقت میری گرہ میں ایک دمڑی بھی نہیں ہے آج گھر میں چولھا توا اوندھا رہے گا اور میری جورو مجھے کھا جائے گی۔ کیا دوست تم اتنا نہیں کر سکتے کہ ایک مورت چرا کر میرے حوالے کر دو۔ میں اُسے بیچ کر اپنا کام چلا لوں گا۔"

مجھے کچھ پُرانی باتیں یاد آگئیں۔ جا و بے جا ہمدردی جتانے کا نتیجہ عموماً اپنے حق میں بُرا رہتا ہے۔ لیکن اس کی زدہ حالت کا اندازہ لگاتے ہوئے انکار بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ لہذا میں آمادہ ہو گیا۔ لیکن یہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی قیمتی مورت چراؤں۔ اس پر وہ کہنے لگا کہ اپنے اعمال کو ریاضی کے اصول پر جانچنا غلطی ہے۔ جب چوری کرنی ٹھیری تو سستی مہنگی چیز کا سوال ہی کیا۔ آخر مجبور ہو کر میں نے ایک اچھی سی مورت اُسے تھما دی۔ جسے لے کر وہ چلتا بنا۔

کئی روز تک میرا ضمیر مجھے لعنت ملامت کرتا رہا۔

چند دن بعد وہ دوبارہ میرے پاس آیا اور بڑی لجاجت سے کہنے لگا کہ اگر ہو سکے تو مناجات کی کوئی کتاب مجھے دے دو۔ اس وقت ایک معقول گاہک موجود ہے۔

میں نے اس سے پوچھا

"کیا تم نے مالک سے کہہ دیا کہ میں نے مورت چرائی تھی؟"

"ہاں، کہہ دینا ہی پڑا" اس نے غمگین لہجے میں جواب دیا۔ "بھیا بات یہ ہے کہ میرے پیٹ میں کوئی بات پچ نہیں سکتی"۔

یہ سُنتے ہی میرے ہوش اُڑ گئے۔ اور ایسا معلوم ہوا جیسے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ میری حالت دیکھ کر وہ بھی گھبرا سا گیا۔ اور اظہارِ تأسف

کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"ہُوا یوں کہ ہمارا مالک تاڑ گیا۔ یا بصورتِ دیگر میرے مالک کو خبر لگی اور اس نے تمھارے مالک کے کان بھر دیے۔"

میں سمجھ گیا کہ اب بچنا مشکل ہے۔ وہ لوگ پہلے ہی میرے خلاف سازشیں کر رہے تھے۔ یہ بھرم کھُلنے سے تو گویا ان کی مراد بر آئی ہو گی۔ بھلا اب وہ کیوں بخشنے لگے۔ جیل کی ہوا کھلا کر رہیں گے۔ اگر قسمت میں یہی لکھا ہے تو ضرور ہو کر رہے گا۔ گھبرانے اور فکر کرنے سے کیا حاصل؟ پھر خیال آیا کہ جب ڈوبنا ہی ٹھیرا تو اتنی گہری جگہ ڈوبا جائے کہ ابھرنے کی کوئی صورت ممکن نہ ہو سکے۔ چنانچہ میں نے مناجات کی ایک کتاب اس کے ہاتھ میں پکڑا دی اور وہ اسے اپنے ڈھیلے ڈھالے کوٹ کی آستینوں میں چھپا کر چمپت ہو گیا۔ لیکن زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ اُلٹے پانو لوٹ آیا۔ اور کتاب میرے سامنے پھینک، یہ کہہ کر چلتا بنا۔

"میں گوارا نہیں کرتا کہ اسے لے جاؤں۔ خواہ مخواہ سارا چھپّر تمھارے سر پر ٹوٹ پڑے گا۔"

میں ان الفاظ کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ آخر چھپّر میرے سر پر کس طرح ٹوٹ پڑے گا؟ لیکن کتاب کے واپس مل جانے پر مجھے خوشی ضرور ہوئی۔ اس واقعے کے بعد سے میرے دُکان دار کے دل میں زیادہ شبہات پیدا ہو گئے اور میری مخالفت میں اس نے زیادہ زہر اُگلنا شروع کر دیا۔

جب لارئیونچ اُوپر کی منزل میں گیا تو یہ سب باتیں میرے ذہن میں تھیں۔ وہ زیادہ دیر نہیں ٹھیرا۔ اور جب واپس آیا تو میں نے دیکھا کہ وہ معمول سے زیادہ غمگین اور چپ چپ ہے۔ کھانا کھانے سے قبل اس نے

حقیقتِ حال سے مجھے آگاہ کیا۔

"میں اس داؤ میں تھا کہ تم دوکان کے جھمیلوں سے رہائی پاکر صرف کارخانے میں لگ جاؤ۔ مگر بات بنی نہیں۔ کوزما نے اس تجویز کی مخالفت کی۔ وہ بُری طرح تمھاری کاٹ میں لگا ہوُا ہی۔

دُکان تو دکان گھر کی چار دیواری میں بھی کسی کو مجھ سے دشمنی تھی۔ یہ ذاتِ شریف دکان دار کی منظورِ نظر محبوبہ تھی۔ بڑی ہی اُچھال چھکا کھیلی کھائی عورت۔ کارخانے کے سبھی نوجوان اس سے دل لگی کرتے تھے۔ ان کی عادت تھی کہ چھپ چھپا کر ڈیوڑھی میں انتظار کرتے اور جوں ہی وہ اُدھر سے گزرتی اس کے سینے سے لپٹ جاتے۔ اس کی تیوری پر بل بھی نہ پڑتا۔ وہ محض 'اوئی' کرکے رہ جاتی۔ اس کا منہ صبح سے شام تک جگالی کرتا رہتا تھا۔ اس کی جیبیں ہر وقت بسکٹوں اور مٹھائی کی ڈلیوں سے بھری رہتیں اور جبڑے چکّی کے پاٹوں کی طرح مسلسل گردش میں رہتے۔ اس کے بے کیف چہرے پر ٹکتی ہوئی کرنجی آنکھیں۔ دیکھ کر میرے دل میں عجیب اُلجھن سی پیدا ہونے لگتی تھی۔ وہ مجھ سے اور پال سے ایسی پہیلیاں پوچھتی جن کی بوجھ ہمیشہ لغو اور فحش ہوتی تھی۔ وہ ایسے الفاظ کو برابر دُہراتی جن کی جلدی جلدی مسلسل تکرار ذو معنی ہو کر ذم کا پہلو پیدا کر دیتے۔ ایک روز ایک بڑی عمر کے کاری گر نے اُس سے کہا۔

"اری چھوکری! تو تو بڑی بے شرم ہی۔"

اور وہ بالکل برجستہ یہ بیہودہ بول گنگناتی ہوئی چلی گئی :۔

جس نے کی شرم اُس کے پھوٹے کرم،
جس نے کی بے حیائی اُس نے کھائی دودھ ملائی

مجھے اپنی زندگی میں اس قسم کی لڑکی سے پہلی بار سابقہ پڑا تھا۔ اس کی ضرورت سے زیادہ بے شرمی سے مجھے نفرت بھی اور ڈر بھی معلوم ہوتا تھا۔ جب اس نے محسوس کیا کہ مجھے اس کے عشوے اور غمزے ایک آن نہیں بھاتے تو مجھے پھانسنے کے لیے اُس نے تریا چرتروں سے کام لینا شروع کیا۔

ایک روز تہ خانے کے اندر میں اور پال اس کے ساتھ مل کر شراب کے پیپوں کو بھاپ دے رہے تھے کہ وہ اچانک کہنے لگی۔

"ارے چھوکرو! بوسے میں بڑی لذت ہوتی ہے۔ آؤ، تمھیں اُس کا صحیح طریقہ سکھا دوں۔"

"میں جانتا ہوں اور تم سے زیادہ اچھی طرح جانتا ہوں۔" پال نے بگڑ کر جواب دیا۔ اور میں نے صلاح دی کہ جاؤ اور اپنے ہونے والے شوہر کے بوسے لو۔ میرے الفاظ میں بھی کافی تلخی تھی۔

وہ ایسا منہ توڑ جواب سُن کر بگڑ گئی۔

ارے! تم کیسے اُجڈ بدتمیز ہو۔ ایک نوجوان لڑکی تمھیں پیار کرنا چاہتی ہے اور تم اس سے منہ موڑ کر دُور بھاگ رہے ہو۔ خدا کی قسم! ایسے مرد نہ دنیا میں دیکھے نہ سُنے۔" اور خاص طور پر میری طرف گھونسا تان کر سختی سے کہنے لگی۔

"ذرا دیکھتا رہ۔ تجھے تو وہ مزا چکھاؤں گی کہ ہمیشہ یاد رکھے گا۔"

لیکن میری طرف سے جواب دیتے ہوئے پال نے کہا

"اور اگر تیرے چہیتے کو معلوم ہو جائے کہ تو کیسی چھنال ہے تو وہ بھی تجھے ایسا مزا چکھائے گا جسے تو کبھی نہ بھول سکے گی۔"

پیچ و تاب کھانے کے باعث اس کے چہرے کی کھال سُکڑ سُکڑ کر

پھیلنے لگی - اور وہ ناک بھوں چڑھا کر حقارت سے یہ کہتی ہوئی چلی گئی -

"مجھے اس کی پروا نہیں - اسے جوتی کی نوک پر مارتی ہوں - رُپے پیسے کی بھی کمی نہیں ہی - اس جیسے پانچ دکان داروں کو سرِ بازار خرید سکتی ہوں - سمجھے - لڑکی کو چاہیے کہ جب تک وہ کنواری ہی خوب مزے کر لے - شادی کے بعد وہ ماں بن جاتی ہی اور اس کی دل چسپیوں کا بازار سرد پڑ جاتا ہی"

اس دن کے بعد سے وہ پال کے ساتھ زیادہ چھیڑ خانی کرنے لگی - اور ساتھ ہی میں نے محسوس کیا کہ وہ بدلا لینے کی غرض سے ہر وقت پیچ تاب کھاتی رہتی ہی -

اس دُکان میں زندگی گزارنا میرے لیے زیادہ دشوار ہوتا گیا - میں ہر وقت مذہبی کتابیں پڑھتا رہتا - کیونکہ وہاں آنے جانے والوں کی گفتگو میں اب کوئی دل چسپی نہیں رہی تھی - وہی پُرانے پامال موضوع اور وہی دقیانوسی اندازِ بیان - اس سے الگ ہٹ کر وہ بات کرنا ہی نہیں جانتے تھے - پیٹر کی گفتگو پھر بھی دل چسپ ہوتی تھی - کیونکہ حیاتِ انسانی کے تاریک پہلوؤں کا اس نے گہرا مطالعہ کیا تھا اور ان پر اپنی رائے کا اظہار کرتے وقت وہ ندرتِ خیال، جوشِ بیان اور سُننے والوں کی دل بستگی کا خاص طور پر خیال رکھتا تھا - کبھی کبھی مجھے شبہہ ہونے لگتا کہ ہو نہ ہو وہ ضرور الیاس نبی ہی - لیکن جب کبھی میں نے اس بڈھے کے سامنے عام لوگوں پر بے لاگ تنقید کی یا اپنے خیالات کا اظہار کیا تو وہ عموماً وہی پُرانی باتیں دُہرانے لگتا جو کبھی کسی موقعے پر خود میں نے دُکان دار سے کہی تھیں - دکان دار اس قسم کی گفتگو سے چڑ کر یا تو میرا مذاق اڑاتا یا ناراض ہو کر بُرا بھلا کہنے لگتا -

ایک روز میں نے بڈھے سے کہا کہ میں نے تمھارے بہت سے اقوال

اپنی اس بیاض میں لکھ لیے ہیں جس کے اندر کتابوں سے نقل کر کر کے بعض دل پسند نظمیں جمع کر رکھی ہیں۔ وہ یہ سُنتے ہی چونک پڑا۔ اور اس طرح لنگڑاتا ہُوا گویا اس کی ٹانگوں میں کوئی نقص ہو۔ تیزی سے میری طرف جھپٹا قریب آکر پُر اشتیاق لہجے میں کہنے لگا۔

"بھلا میرے اقوال کو لکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ آخر معلوم تو ہو کہ کیوں لکھے ہیں؟ میاں صاحبزادے وہ تمھارے لیے بالکل بے کار ہیں ان سے تمھیں کوئی فایدہ نہیں پہنچ سکتا۔ انھیں بھول جاؤ۔ بھول کر بھی انھیں یاد نہ رکھو۔ ہاں ہاں۔ میں کہتا ہوں کہ ان پر لعنت بھیجو۔ لاؤ کہاں ہیں وہ بس میرے حوالے کردو۔ انھیں اپنے پاس بھی نہ رکھو سمجھے!

وہ بہت دیر تک مجھے بہلاتا پھُسلاتا رہا اس نے خوب کوشش کی کہ کسی طرح میں اپنی بیاض اُس کے حوالے کردوں یا بصورتِ دیگر جلا کر راکھ کر دوں۔ جب میں کسی عنوان اس کی بات ماننے کو تیار نہ ہُوا تو اس نے ناراض ہو کر سب حال دکان دار کو سُنا دیا۔ دکان دار نے گھر لَوٹتے وقت مجھ سے پوچھا۔

"کیوں جی۔ تم لوگوں کے قول بھی لکھنے لگے ہو۔ آخر کس لیے؟۔ اچھا۔ کان کھول کر سن لو۔ آیندہ یہ حرکت نہ ہونے پائے۔ یہ کام صرف جاسوسوں کا ہے۔ شریف آدمی ایسا نہیں کرتے۔"

"اور تم ستیانوف کا کیا بگاڑ لوگے؟" میں بغیر سوچے سمجھے پوچھ بیٹھا۔

"وہ بھی تو اسی طرح لکھتا ہے۔"

"اچھا! وہ "طویل احمق"۔ وہ بھی اس مرض میں گرفتار ہے۔"

کچھ دیر وہ بالکل خاموش رہا۔ اور پھر غیر معمولی طور پر اس کے لہجے

میں نرمی پیدا ہو گئی۔

"اچھا سنو۔ اگر تم اپنی بیاض مجھے دکھا دو اور ستیانوف کی بھی لے آؤ۔ تو تم کو مٹھائی کھانے کے لیے ایک اٹھنّی انعام ملے گی۔ لیکن شرط یہ ہے کہ بالکل چپ چاپ ستیانوف کے فرشتوں کو بھی اس بات کا علم نہ ہونے پائے۔"

خدا جانے اس بے وقوف کو یہ گمان کیوں ہو گیا کہ میں اس کی یہ خواہش پوری کر دوں گا۔ تاہم زیادہ گفتگو نہیں کی۔ اور لمبے لمبے قدم مارتا ہوا مجھ سے آگے بڑھ گیا۔

میں نے گھر پہنچتے ہی سب رام کہانی ستیانوف کو سنا دی اور یہ بھی کہہ دیا کہ دکاندار تمھاری بیاض اڑانے کے لیے کہہ رہا تھا۔ اس کی تیوری پر بل آ گئے۔

"تم بھی عجیب آدمی ہو۔ خواہ مخواہ بکواس کرتے رہتے ہو۔ آخر کہنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اب وہ ضرور کسی نہ کسی کو لالچ دے کر ہم دونوں کی بیاضیں چروا لے گا۔ اب بہتر یہی ہے کہ تم اپنی بیاض بھی مجھے دے دو۔ میں دونوں کو کسی محفوظ جگہ چھپا دوں گا۔ اور یہ بھی یاد رکھو کہ وہ آج کل میں تمھیں بھی جواب دے دے گا۔"

مجھے اس بات کا پورا یقین تھا۔ اور فیصلہ کر چکا تھا کہ نانی کے واپس آتے ہی ملازمت چھوڑ دوں گا۔ نانی کو جاڑا شروع ہوتے ہی ایک جگہ کام مل گیا تھا۔ وہ چند لڑکیوں کو لیس بنانا سکھاتی تھیں۔ نانا نے دوبارہ کنون کے بازار میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ لیکن میں ان سے ملاقات کے لیے کبھی نہیں گیا۔ اور جب کبھی وہ شہر آئے تو انھوں نے بھی مجھ سے ملنے

کی تکلیف گوارا نہیں کی۔ ایک روز بازار میں ہم دونوں کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ وہ بڑی آن بان کے ساتھ آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ میں نے روک کر پوچھا۔ "فرمائیے! کیسے مزاج ہیں"۔ انھوں نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ کا چھجا بناتے ہوئے گھور کر میری طرف دیکھا اور کچھ دیر سوچ بچار کے بعد کہا۔

"اچھا۔ تم ہو۔ سُنا ہے تم نے مورتوں پر رنگ کرنے کا کام سیکھ لیا ہے۔ خوب۔ خوب۔ بہت معقول کام ہے۔ زندگی جس طرح بھی گزرے گزارتے رہو"۔

مجھے سامنے سے ایک طرف دھکیلتے ہوئے انھوں نے اسی آن بان کے ساتھ اپنی راہ لی۔ اور مجھ سے کچھ سنے بغیر چل دئے۔

میں کبھی کبھار نانی سے مل لیتا تھا۔ نانا کا پیٹ بھرنے کے لیے ان بیچاری کو بہت محنت کرنی پڑتی تھی۔ نانا بڑھاپے کے باعث بیکار ہو چکے تھے۔ کیونکہ وہ اس بیماری میں مبتلا ہو گئے تھے جو زیادہ عمر میں ہر شخص کو لاحق ہو جاتی ہے۔ یعنی "ضعفِ پیری"۔ ان کے علاوہ نانی نے میرے چچا کی اولاد کا بوجھ بھی اپنے کاندھوں پر ڈال لیا تھا۔

انھیں سب سے زیادہ تکلیف ساشا کے ہاتھوں پہنچتی تھی۔ لڑکا خوبصورت خوابوں کی دُنیا میں رہنے والا اور کتابوں کا کیڑا تھا۔ لیکن کام کاج کے معاملے میں بڑا نکٹھو تھا۔ کہیں جم کر ملازمت نہیں کی۔ آج اس مالک سے لڑ پڑا تو کل اُس سے۔ سب دھندا چھوڑ چھاڑ چلا آیا اور نانی پر دھنی دے دی۔ وہ غریب اُسے کھلاتیں پلاتیں اور ساتھ ہی نئی ملازمت بھی ڈھونڈھتی پھرتیں۔ ساشا کی بہن نے بھی انھیں پر تھیا دے رکھی تھی۔ اس نے ایک شرابی سے شادی کر کے اپنی قسمت پھوڑ لی تھی۔ وہ روزانہ بیوی کو مارتا پیٹتا رہتا۔

حتیٰ کہ ایک روز گھر سے نکال باہر کیا۔

جب کبھی میں نانی سے ملتا ان کی جادو اثر شخصیت مجھ پر اپنا رنگ جمانے لگتی۔ حالانکہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ ان کی حسین روح کو اوہامِ خیالی نے اندھا کر دیا ہے۔ وہ اس لایق نہیں رہی تھیں کہ گہرائیوں میں پہنچ کر زندگی کی حقیقتوں کو ان کے اصلی رنگ میں اور اس کی اصلیت کی تلخیوں کو پورے طور پر سمجھ سکتیں۔ اور میری کبھی خاموش نہ رہنے والی ذہنیت، بے قرار طبیعت نانی کو عجیب چکر میں ڈال دیتی تھی۔ وہ مجھے سمجھاتیں۔

"اولیشا! صبر و استقلال سے کام لینا سیکھو"۔

اس میں شک نہیں کہ وہ میری کہانیاں سن کر اس کے علاوہ کوئی دوسرا جواب دے ہی نہیں سکتی تھیں۔ خود میں بھی ان پر غور کر کر کے حیران رہ جاتا تھا۔ ان کہانیوں میں دکھتی ہوئی رگوں کی فریاد چھپی ہوتی تھی حسرت نصیب دل کی آرزوئیں دم توڑتی نظر آتی تھیں اور انسانیت کا خون انسانیت کے ہاتھوں بہتا دکھائی دیتا تھا۔ وہ کہانیاں نہیں بلکہ دہکتی ہوئی انگیٹھیاں تھیں جن کے اندر میں اپنی رُوح کو جلتا ہوا محسوس کرتا تھا۔

فطری طور پر صبر کا مادہ مجھ میں نہیں تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ صلاحیت یا خوبی صرف جانوروں، درختوں اور پتھروں کے لیے مخصوص ہے۔ اگر میں تھوڑے بہت صبر سے کام لیتا بھی تو محض اپنے اوپر قابو پانے، اپنی پوشیدہ قوت کا جایزہ لینے اور یہ معلوم کرنے کے لیے کہ واقعی میرا وجود اس دنیا میں ہے بھی یا نہیں۔ بہت سے منچلے جوانی کی حماقتوں میں پھنس کر اپنے آپ کو تباہ کر لیتے ہیں۔ وہ اپنی ہمت سے زیادہ بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا لیتے ہیں جس کے بارے ان کے اعصاب، ان کی ہڈیاں تک چکنا چور

ہوجاتی ہیں - پھر بھی وہ بڑے فخر کے ساتھ کہتے ہیں کہ انھوں نے اپنے سے زیادہ عمر والوں کو مات دے دی - ایسا نہ ہو تو وہ ہمیشہ ان کی قوتِ بازو پر رشک کرتے ہیں -

خود میں نے بھی اس پر عمل کیا، جسمانی اور روحانی دونوں طریقوں سے اور یہ محض حُسنِ اتفاق تھا کہ میں خطرے کی حد سے آگے بڑھنے نہ پایا - اور نہ میں نے اپنے دامن پر وہ داغ لگنے دیا جو مرتے دم تک بدستور قایم رہتا ہو - اس کے علاوہ یہ بھی حقیقت ہو کہ صبر سے زیادہ کوئی دوسری چیز انسان کے لیے تباہ کن نہیں ہوتی - صبر کیا ہو؟ - مجبوری کا دوسرا نام - جب انسان اپنی قوتوں کو قضا و قدر کے رحم و کرم پر چھوڑ دے -

ایک نہ ایک دن مجھے مر کر اپنی صورت کو بگاڑ کر خاک کے دامن میں ابدی نیند سونا ہو مگر میں فخر کے ساتھ کہتا ہوں اور مرتے دم تک کہتا رہوں گا کہ پورے چالیس سال تک بہت سے لوگ میرے دامن کو گناہ آلود کرنے اور میری روح کو معصیت کے غار میں دھکیلنے کی انتہائی کوشش کرتے رہے اور پھر بھی وہ اپنی کوشش میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکے -

روز بروز یہ بے تکی سی خواہش میرے دل و دماغ پر زیادہ حاوی ہوتی چلی گئی کہ میں جی بھر کر مسخرہ پن کروں - لوگوں سے اس طرح دل لگی کی جائے کہ وہ خوشی سے ناچ ناچ اُٹھیں - یہاں تک کہ ان کی زندگی ایک مستقل قہقہہ بن جائے - میں اس خواہش کی تکمیل میں کامیاب رہا - میں اس منڈی میں کاروبار کرنے والے تاجروں کی زندگی کو فرضی افسانوں

کی شکل میں پیش کر سکتا تھا۔ پوری مہارت کے ساتھ ان کی نقل اُتار سکتا تھا۔ ذرا سا بھیس بدل کر ان کا ہم شکل بن جاتا تھا۔ میں دکھاتا کہ کس طرح سادہ لوح دیہاتی شہر میں آکر موروں کو خریدتے اور بیچتے ہیں، کس طرح دکان دار عیاری اور مکاری سے کام لے کر انھیں اُلّو بناتا ہے۔ اور کس طرح قیمت جانچنے والے دلّال آپس میں جھک جھک کرتے اور ایک دوسرے پر کیچڑ اُچھالتے ہیں۔

تمام کارخانہ بلند قہقہوں سے گونج اُٹھتا۔ سب کاریگر اپنا اپنا کام چھوڑ کر میری اس نقل و حرکت سے لطف اُٹھانے لگتے۔ لیکن ہمیشہ ایسے موقعوں پر لاریونچ یہ کہہ کر مزہ کرکرا کر دیتا۔

"تم کھانے سے فارغ ہو کر اس قسم کی اکاری کیا کرو تو زیادہ مناسب ہے۔ تمھارے اس مسخرہ پن سے سارا کام پٹ ہو جاتا ہے۔"

جب میرا یہ سوانگ ختم ہو چکتا تو طبیعت ہلکی ہو جاتی۔ مجھے محسوس ہوتا کہ دل پر سے بہت بڑا بوجھ اُتر گیا ہے۔ ایک آدھ گھنٹے کے لیے دماغ کو کامل سکون اور پوری فرحت نصیب ہو جاتی۔ لیکن مسرت کے لمحے سریع الزوال ہوتے ہیں۔ بہت جلد مجھے دوبارہ محسوس ہونے لگتا کہ میرا دماغ خاردار جھاڑیوں میں پھنس رہا ہے۔ اور ایک ایسی فضا میں گھر گیا ہے جو گرم ہونے کے ساتھ ساتھ متعفن ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ میرے چاروں طرف غلاظتیں اُبل رہی ہیں اور میں خود بھی ان غلاظتوں میں ڈوبتا چلا جا رہا ہوں۔

میں حیران ہو کر سوچنے لگتا۔ کیا سچ مچ زندگی اسی کا نام ہے؟ اور کیا میں بھی ان ہی لوگوں کی طرح زندگی بسر کرتا رہوں گا؟ ایک ایسی بے کیف زندگی جس میں نہ کبھی اُبھار ہو گا اور نہ کسی قسم کی بلند خیالی ہے۔

لوگ گھور گھور کر میری طرف دیکھتے اور حیران ہو کر پوچھتے "کیا بات ہی میکسم! تم ہم سب سے کھنچے رہتے ہو"

اسی طرح ستیانوف اکثر دریافت کرتا "آخر معاملہ کیا ہی۔ یہ تبدیلی کیوں ہو رہی ہی؟"

اور میں سوائے خاموش رہنے کے کوئی جواب نہ دے سکتا۔

زندگی کی ان صبر آزمائیوں اور بے کیفیوں نے روح کے لطیف ترین نقوش میرے دل سے دھو ڈالے اور ان کی بجائے مدھم سی بے معنی خراشیں پیدا کر دیں۔ میں خون کے سے گھونٹ پی پی کر اس بغاوت کو برداشت کرتا رہا۔ ہم سب ایک حمام میں ننگے تھے۔ فرق اتنا تھا کہ پانی کی خنکی میرے حق میں بڑھی ہوئی تھی اور اس لیے مدرسوں کے مقابلے میں مجھ کو زیادہ تکلیف پہنچ رہی تھی۔ بارہا مجھے محسوس ہوتا کہ میں ایسی گہرائیوں میں ڈوبتا چلا جا رہا ہوں جن کی تہ کا ملنا محال ہی۔

میرے ساتھ لوگوں کا برتاؤ بہت اچھا تھا۔ وہ دوسروں کی طرح نہ مجھ پر چیختے چلاتے نہ مجھے تنگ کرتے۔ بلکہ اس کے برعکس وہ نام لینے کی بجائے مجھے آبائی لقب سے یاد کرتے تاکہ یہ ظاہر ہو کہ ان کے دلوں میں میری بہت عزت و وقعت ہی۔ میں اسی کو غنیمت سمجھتا۔ لیکن یہ احساس میرے لیے حد درجہ تکلیف دہ تھا کہ وہ سب کے سب کس بُری طرح شراب پینے کے عادی ہیں اور آوارہ عورتوں سے تعلقات پیدا کر کے اپنی زندگی کو اپنے ہاتھوں تباہ کر رہے ہیں حالانکہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ شراب اور عورت، یہی دو چیزیں ان کی تھکی ہوئی زندگی کو سہارا دئے رکھتی تھیں۔

جب کبھی میں حافظے پر زور ڈالتا تو اس خیال سے تکلیف ہونے لگتی

کہ نطالیہ جیسی ہوش مند اور دل گردے والی عورت کا شمار بھی شاہد ان بازاری میں ہوتا ہے۔ اور خود میری نانی کس زمرے میں تھیں؟ ۔ اور میری ملکۂ حسن؟

میں اپنی ملکہ کو یاد کر کے ایک نہ معلوم خوف سے کانپ اُٹھتا تھا۔ وہ باقی عورتوں سے بالکل مختلف تھی۔ مجھے محسوس ہوتا کہ میں نے اسے کبھی خواب کی دُنیا میں دیکھا ہے۔

عورت ذات کا خیال میرے دل میں ضرورت سے زیادہ جاگزیں رہنے لگا۔ بارہا میں نے اپنے من سے پوچھا کہ کیا تو بھی اگلی چھٹی کے دن اُس جگہ جانا چاہتا ہے جہاں جا کر سب لوگ اپنا دل بہلاتے ہیں ؟۔ یہ کسی نفسانی خواہش کے ماتحت نہیں تھا۔ میں بالکل تندرست اور طاقت ور تھا۔ لیکن کبھی کبھی یہ آرزو مجھے دیوانہ بنا دیتی کہ میں کسی ایسی ہستی کے سینے سے لپٹ جاؤں جو ماں کی طرح نرم و نازک، رحم دل، دُکھ سُکھ کو سمجھنے والی اور اور پرخلوص ہو تا کہ میں اس سے کہہ سکوں کہ میری روح ہر وقت بہت مضطرب اور بے چین رہتی ہے۔

ایک روز پال نے مجھے بتایا کہ وہ سامنے والے مکان کی خادمہ کے ساتھ خوب مزے اُڑاتا ہے تو میرے سینے میں حسد کی آگ بھڑک اٹھی۔

"ارے بھئی! بڑا دلچسپ واقعہ ہے۔ آج سے ایک مہینے پہلے مجھے اس سے نفرت تھی وہ کہیں نظر آجاتی تو میں اُس پر ڈھیلوں کی بوچھاڑ شروع کر دیتا لیکن آج وہی ہستی مجھے جان سے زیادہ عزیز ہے۔ چوری چھپے جب بھی ملاقات ہوتی ہے ہم دونوں ایک دوسرے سے لپٹ کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔"

"تم کس قسم کی باتیں کرتے ہو؟"

"ہر قسم کی ۔ میں اسے آپ بیتی سناتا ہوں اور وہ مجھے آپ بیتی سناتی ہے ۔ اور پھر ہم جی کھول کر ایک دوسرے کو پیار کرتے ہیں ۔ لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں ۔ یوں وہ بڑی پاک دامن ہے ۔ تم یقین نہیں کروگے وہ اتنی نیک ہے کہ اس کی بے چارگی پر افسوس ہوتا ہے ۔ ارے یہ کیا ۔ تم بالکل چرسیوں کی طرح سگریٹ پیتے ہو"

واقعی میں تمباکو نوشی کا بُری طرح عادی تھا اس کے نشے سے میرے پریشان خیالات اور مضطرب جذبات میں سکون پیدا ہو جاتا تھا ۔ رہی شراب ۔ سو اسے پی کر مجھے بڑی کوفت ہوتی تھی ۔ کیونکہ اس کی بَدبُو سے میرے ذوقِ لطیف کو صدمہ پہنچتا تھا ۔ لیکن پال غٹاغٹ جام پر جام چڑھائے جاتا اور بس نہ کرتا اور پھر نشے میں وحشت ہو کر اناپ شناپ بکنے لگتا ۔ وہ چیخ چیخ کر کہتا ۔

"مجھے جانے دو ۔ مجھے گھر جانے دو ۔ میں اس جگہ رہنا نہیں چاہتا ۔ میں اس زندگی سے اُکتا گیا ہوں"

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے وہ یتیم اور لاوارث تھا ۔ اس کے والدین عرصہ ہُوا مر چکے تھے ۔ بھائی بہن میں سے بھی کوئی نہیں تھا ۔ اس نے زندگی کے آٹھ سال بالکل اجنبی لوگوں میں بسر کیے تھے ۔

یہ بے چینی اور بے اطمینانی کی حالت ہی کیا کم تھی کہ موسمِ بہار نے شروع ہو کر رہا سہا سکون بالکل ختم کر دیا ۔ میں نے فیصلہ کیا کہ دوبارہ جہاز پر ملازمت کر لوں اور استرخان پہنچتے ہی ایران کی طرف بھاگ نکلوں ۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ میری نظرِ انتخاب صرف ایران ہی کی طرف کیوں اٹھی ۔ شاید اس لیے کہ بازار میں ایرانی سوداگروں کو دیکھ کر میرے دل میں

نئی نئی امنگیں پیدا ہونے لگتی تھیں۔ وہ سنگین بتوں کے مانند چپ چاپ بیٹھے، دھوپ میں رنگین ڈاڑھیاں پھیلائے، حقّے گڑگڑاتے بہت بھلے معلوم ہوتے تھے۔ ان کی تیز نظر سُرمگیں آنکھیں کتنی دل کش ہوتی تھیں۔

انھی خیالات کے ماتحت ایک نہ ایک روز میں کسی طرف بھاگ نکلتا لیکن ایک واقعے نے تبدیلی پیدا کر دی۔ نوروز کے دن تھے۔ کارخانے کے بہت سے ملازم چھٹّی لے کر اپنے گھر جا چکے تھے۔ باقی شراب پینے اور پلانے میں مشغول تھے۔ میں تنِ تنہا دریا کے کنارے ٹہل رہا تھا۔ اور اتفاقاً نانا کے نقشہ نویس بھانجے سے ملاقات ہوگئی جس کے یہاں پہلے میں ملازم رہ چکا تھا۔ وہ بھورا کوٹ ڈانٹے، اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، آہستہ آہستہ ٹہل رہا تھا اُس کے منہ میں سگریٹ تھا اور ٹوپی گدّی کی طرف جھکی ہوئی تھی۔ اُس نے مُسکرا کر مُربّیانہ انداز میں مجھ پر نظر ڈالی۔ اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بالکل آزاد طبع ہی اور دُنیا میں اُسے کسی بات کا غم نہیں ہی۔ اس وقت وہاں ہم دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ اس نے کہا

"پیشکوف! تم پر آسمانی باپ کی برکتیں ہوں۔"

نوروز کی خوشی میں ہم نے ایک دوسرے کا بوسہ لیا۔ اور پھر اس نے میرا حال پوچھا میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں کارخانے کے کام کاج سے، وہاں کی بے رنگ زندگی سے اور سب سے زیادہ اس شہر کے گندے ماحول سے اُکتا گیا ہوں اور اس تاک میں ہوں کہ کسی طرح ایران پہنچ جاؤں۔

"ارے چھوڑو اس خیال کو۔" اُس نے بہت سنجیدگی سے کہا "بھلا ایران میں کیا رکھا ہی؟ وہاں جا کر کیا لوگے؟ میں جانتا ہوں کہ یہ فیصلہ تم نے کس جذبے کے ماتحت کیا ہی۔ جب میں تمھاری طرح جوان تھا تو آوارہ گردی

کا بھوت میرے سر پر بھی سوار رہتا تھا۔"

میں خوش ہُوا کہ اس نے پتے کی بات کہہ دی۔ اس میں شک نہیں کہ اُس کا ظاہر و باطن موسم بہار کی طرح بالکل صاف تھا۔ اور اس اعتبار سے وہ سب سے الگ تھلگ تھا۔

"لو سگریٹ پیو۔" اس نے چاندی کا کیس میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا جس کے اندر موٹے موٹے سگریٹ بھرے ہوئے تھے۔

بس ان باتوں سے اُس نے میرا دل موہ لیا۔

"اب بہتر یہی ہے پیشکوف! کہ تم دوبارہ میرے پاس چلے آؤ۔ تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں نے اس سال نئی مارکٹ کے چند ٹھیکے لے لیے ہیں مجھے اس کام میں تم سے بہت مدد ملے گی، تم ایک نگراں کے فرایض اچھی طرح انجام دے سکتے ہو۔ ہر قسم کا سامان تمھاری تحویل میں رہا کرے گا تم اس کو مناسب جگہ رکھنے رکھانے کے ذمّے دار ہوگے اور اس امر کی دیکھ بھال بھی رکھوگے کہ اس میں سے کوئی چیز چوری نہ ہو جائے۔ بولو کیا خیال ہے؟۔ تمھیں پانچ رُپے بطور جیب خرچ اور دونوں وقت خوراک کے لیے پانچ آنے ملا کریں گے۔ عورتوں سے کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں۔ صرف اتنا بتا دینا کہ ہم دونوں کی اتفاق سے ملاقات ہو گئی تھی۔ اور اگر چاہو تو اتوار کے دن ہم لوگوں سے آکر مل لو۔ یہ تبدیلی تمھارے لیے مفید رہے گی۔"

ہم اس طرح جدا ہوئے گویا بہت گہرے دوست تھے۔ اس نے رخصت ہوتے وقت میرے ہاتھ کو بڑی گرم جوشی سے دبایا اور جاتے جاتے کئی بار پلٹ کر اپنی ٹوپی ہوا میں لہراتا رہا۔

جب میں نے کارخانے میں پہنچ کر لوگوں کو بتایا کہ میں عنقریب اس

جگہ کو خیرباد کہہ دوں گا تو بہت سے کاریگر دُنیا دکھاوے کو اظہار افسوس کرنے لگے البتہ پال کو واقعی رنج ہوا اور وہ مجھ کو بُرا بھلا کہنے لگا۔

"ذرا سوچنے کی بات ہی۔ اتنے عرصے ہمارا تمھارا ساتھ رہا۔ اب انجان لوگوں میں جاکر تم کس طرح زندگی بسر کرسکو گے۔ ان میں بڑھئی، لوہار، معمار رنگ ساز اور ہر قسم کے لوگ شامل ہوں گے۔ وہاں جانا تو بالکل ایسا ہوگا جیسے کوئی چولھے میں سے نکل کر بھاڑ میں جا پڑے۔"

جیخاریف نے غرّاتے ہوئے کہا۔

"ارے میاں! عنقا کو دیکھو کتنا بلند آشیانہ بناتا ہی اور ایک تم ہو کہ اچھی خاصی جگہ سے بھی نیچے گرجانا چاہتے ہو۔"

جب کارخانے سے ان لوگوں نے مجھ کو رخصت کیا تو وہ منظر بہت حسرت ناک تھا۔

"اس میں شک نہیں کہ انسان کو اپنی بہتری کے لیے ہر وقت ہاتھ پانو مارتے رہنا چاہیے۔" یہ جیخاریف کی نصیحت تھی جو شراب خواری کے مضر اثرات سے محض ہڈیوں کا ڈھانچہ معلوم ہوتا تھا۔ "تاہم یہ ضرور کہوں گا کہ کسی کام میں بُری پھنسنے سے پہلے مناسب ہی کہ ہر قسم کی اونچ نیچ پر غور کرلیا جائے۔"

"ورنہ زندگی کے آخری لمحات تک پچھتانا پڑتا ہی۔" لاریونچ نے گویا تائید کرتے ہوئے کہا۔

لیکن میں نے محسوس کیا کہ ان کی باتوں میں تصنّع اور بناوٹ پائی جاتی ہی۔ وہ اس قسم کی گفتگو سے گویا اپنا فرض ادا کررہے تھے۔ کچھ بھی ہو وہ بندھن جس نے ان سب کو میرے ساتھ جکڑ رکھا تھا، بوسیدہ ہوکر ٹوٹ

چکا تھا۔

گولونیف شراب کے نشے میں دُھت مچان پر پڑا لڑھکنیاں کھا رہا تھا۔ وہیں لیٹے لیٹے وہ بڑبڑانے لگا۔

"خدا کرے کہ یہ سب کے سب جیل کی تاریک کوٹھریوں میں ٹھونس دیے جائیں، مجھے ان کے دلوں کا حال معلوم ہے۔ کسی ایک کو بھی خدا پر اعتقاد نہیں ہے۔ بدبخت کہیں کے ——"

ہر روز کی طرح بے دست و پا نامکمّل مورتیں دیوار کی طرف منہ کیے قطار باندھے کھڑی تھیں۔ شیشے کے گولے چھت میں لٹک رہے تھے۔ چونکہ روشنی کا معقول انتظام ہوئے کافی دن گزر چکے تھے اس لیے یہ گولے بہت عرصے سے استعمال نہیں ہوئے تھے۔ دھوئیں اور گرد و غبار نے ان پر جم کر اپنا سکّہ اچھی طرح بٹھا دیا تھا۔ مجھے اس ماحول کی ساری کائنات پوری تفصیل کے ساتھ اس طرح یاد ہے کہ اگر میں آنکھیں بند کر کے بیٹھ جاؤں تو وہاں کی ہر چیز ایک پرچھائیں بن کر میری نگاہ کے سامنے سے گزرنے لگے وہ لمبی لمبی میزیں، کونوں کھدروں میں رکھے ہوئے رنگ و روغن کے مرتبان، چھوٹے بڑے برش، رنگ برنگ کی مورتیں، عجیب غریب چہرے، اور سب سے زیادہ گولونیف کی ننگی ٹانگیں جن پر مُردنی چھائی رہتی تھی ہیں ان میں سے کسی ایک چیز کو بھی نہیں بھُلا سکتا تھا۔

میں چاہتا تھا کہ جس طرح بھی ہو، اُن سے پیچھا چھُڑا کر جلدی سے بھاگ جاؤں۔ لیکن روس کی یہ رسم کس قدر تکلیف دہ ہے کہ لوگ رخصت کے وقت خواہ مخواہ زیادہ دیر لگاتے ہیں۔ اور پھر ان وداعی الفاظ! بالکل یہ معلوم ہوتا ہے کہ مجلسِ عزا منعقد ہے۔

آخیر میں جینخاریف نے اپنی بھووں کو تان کر کہا۔
"اور وہ کتاب! وہ مجموعۂ خرافات - میں تمھیں واپس نہیں کروں گا اگر تم چاہو تو اس کی قیمت لے سکتے ہو۔"

کتاب میری اپنی تھی - ایک واقف کار سے لی تھی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی اور کو دے دوں - اس لیے میں نے بگڑ کر قیمت لینے سے انکار کر دیا۔ اس پر جینخاریف نے کسی قسم کی حجت کیے بغیر وہ رقم اپنے بٹوے میں ڈال لی اور میرے سجھاؤ سے کہنے لگا۔

"اچھا تمھاری مرضی - نہیں لیتے نہ لو - لیکن میں کتاب واپس نہیں کروں گا - در اصل وہ تمھارے مطلب کی نہیں ہے - ایسی کتابوں کے مطالعے سے تم بہت جلد گمراہ ہو جاؤ گے۔"

"لیکن وہ تو بازار میں فروخت ہوتی ہے - میں نے اپنی آنکھوں سے کتاب والوں کے ہاں دیکھا ہے۔"

لیکن اُس نے میری بات کو اس طرح ٹال دیا گویا اس کا اصل مفہوم سمجھا ہی نہیں۔

"بکتی ہے تو بکنے دو - بازار میں تو زہر کی پڑیاں بھی فروخت ہوتی ہیں۔"

غرض یہ کہ اُس نے کتاب واپس نہیں کی۔

جب میں اپنی مالکہ سے رخصت ہونے کے لیے سیڑھیوں پر چڑھ رہا تھا تو مجھے خیال آیا کہ لاؤ لگے ہاتھوں اس کی بھتیجی سے بھی ملتے چلو۔

"کیا یہ بالکل سچ ہے کہ تم ملازمت چھوڑ چلے ہو۔"

"جی ہاں - بالکل سچ۔"

"چلو اسی میں خیر ہوئی - اگر تم اپنی مرضی سے نہ جاتے تو آج کل میں

تم کو خود ہی نکالا مل جاتا" اس نے یقین دلاتے ہوئے کہا۔ وہ اظہار ہمدردی کی بجائے صرف صاف گوئی سے کام لے رہی تھی۔

اور اس متوالی مالکہ نے ذرا اٹک کر کہا۔

"جاؤ۔ خدا حافظ! تم تین کوڑی کے چھوکرے ہو۔ بالکل ناکارہ ہو۔ ہر چند مجھے ذاتی طور پر تم سے کبھی واسطہ نہیں رہا تاہم تمھارے متعلق عام رائے یہی ہے کہ تم بہت گستاخ اور بدتمیز ہو" اور یکایک وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں جاری ہو گئیں۔

"افسوس! اگر وہ مرحوم — وہ میرا پیارا شوہر — وہ میری روح کا مالک — آج زندہ ہوتا تو تمھارا سب کس بل نکال کر رکھ دیتا۔ وہ اس بُری طرح تمھارے کان مروڑتا کہ تمھیں یہاں رہ جاتے ہی بن پڑتی۔ بخدا تم اس آسانی سے یہاں سے چلے جانے کی اجازت حاصل نہ کر سکتے۔ لیکن اب تو صورت ہی دوسری ہے۔ جاؤ۔ اگر تمھارا دل یہاں رہنے کو نہیں چاہتا تو زیادہ دیر ٹھیرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم جا سکتے ہو۔ لیکن ہاں رخصت ہونے سے پہلے یہ تو بتا دو کہ جاؤ گے کہاں، کیا کرو گے، کس جگہ رہو گے۔ اس پر غور کر لیا ہے۔ آخر در در کی ٹھوکریں کھانے سے کیا حاصل؟"

سولھواں باب

میں اپنے مالک کے ساتھ کشتی میں بیٹھا تھا۔ کشتی بازار کے بیچوں بیچ اُن دکانوں کے قریب سے گزر رہی تھی جن میں دوسری منزل تک تل دُھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ چپّو میرے ہاتھوں میں تھے۔ اور مالک سُکّان کو سنبھالے بیٹھا تھا۔ دود کش کا پہیا خراب ہو جانے کے باعث پتوار کا کام نہیں دے سکتا تھا۔ وہ جھک کر پانی میں لٹک گیا تھا۔ اس نقص کی وجہ سے کشتی کا توازن بگڑ گیا اور وہ ہچکولے کھانے لگی تھی۔ ٹھیرے ہوئے مٹیلے پانی پر اس کا ٹھمک ٹھمک کر چلنا آنکھوں کو بہت بُرا معلوم ہوتا تھا۔

"لاحول ولاقوۃ" مالک نے ناک بھوں چڑھا کر سگرٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔ "پانی پھر بڑھنے لگا ہے۔ کمبخت کسی عنوان کم ہونے میں نہیں آتا۔ کام میں خواہ مخواہ دیر ہو رہی ہے" اور اچانک وہ خوفزدہ ہو کر چلّایا۔ "آہستہ! آہستہ! دیکھو کشتی کھمبے سے نہ ٹکرا جائے" اس نے دو چار چپّو مار کر کشتی کو خطرے سے بچا لیا۔ اور مجھے خوب دُھمکایا۔

اس نے چلتے چلتے وہ جگہ دکھائی جہاں پانی اُتر جانے کے بعد تعمیری کام شروع کرنا تھا۔ اس کے صفاچٹ گلے، اس کی باریک کتری ہوئی مونچھیں، مُنہ میں دبا ہوا سگرٹ، اور باقی وضع قطع کو دیکھ کر کوئی مشکل ہی سے کہہ سکتا تھا کہ یہ شخص ٹھیکیدار ہے۔ چمڑے کی صدری

گھٹنوں تک کے جُوتے اور کندھے پر لٹکا ہوا شکاری تھیلا۔ بھلا یہ چیزیں کسی ٹھیکیدار کے پاس ہوتی ہیں۔ اِس کے پانْو کے پاس ہی ایک قیمتی دُنالی بندوق بھری رکھی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ کسمسا کر چمڑے کی ٹوپی ٹھیک کرنے لگتا۔ وہ چاہتا تھا کہ اُسے ضرورت سے زیادہ کھینچ کر اپنی آنکھوں کو ڈھک لے۔ کبھی غصّے میں ہونٹ چباتا اور کبھی سہم کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا۔ اور پھر فوراً ہی ٹوپی کو کھینچ کر گدّی کی طرف جُھکا دیتا۔ ہنسی اِس کے لبوں پر نمودار ہونے لگتی اور ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی لطیف واقعہ اِسے یاد آنے لگا ہی۔ اِسے دیکھکر کوئی شخص یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ اِس کے پاس بہُت کام ہی اور پانی اُترنے میں جوں جوں دیر ہو رہی ہی اُس کی پریشانی بڑھتی جا رہی ہی۔ کیونکہ بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کاروبار کی جھپلشوں سے بالکل خالی الذہن ہی۔

میں حیرت واستعجاب کی کیفیت میں گُم ہو جاتا۔ مجھے یہ محسوس کر کے اُلجھن ہونے لگتی کہ اِس شہر میں بھی زندگی کی چہل پہل نام کو نہیں ہی بلند عمارتوں کی لمبی لمبی قطاریں، بند کھڑکیاں اور قبرستان کی سی خاموشی شہر میں ہر طرف پانی ہی پانی نظر آتا تھا اور کشتی چلنے کے وقت ایسا معلوم ہوتا کہ سارا شہر ہمارے ساتھ بہتا چلا آرہا ہی۔ آسمان پر بادل چھائے رہتے تھے۔ سورج اِن اطلسی پردوں کے پیچھے مُنہ چھُپائے بیٹھا رہتا۔ اور کبھی کبھی ایک ہلکی سی نقرئی جھلک دکھا کر پھر غائب ہو جاتا۔

پانی بھی گدلا اور سرد تھا۔ اس کی رفتار بس برائے نام تھی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ وہ چل نہیں رہا۔ ٹھیر گیا ہی۔ بلکہ جم کر ایک جگہ قائم ہو گیا ہی۔ اِن دُکانوں کے قریب

بنے ہوئے خالی مکانوں کی طرح، جن کی دیواروں پر پھری ہوئی زرد کھریا پانی کے ملگجے پن کے ساتھ مل کر ہم رنگ ہو جاتی تھی۔ جب کبھی بادل کے کسی شگاف سے سورج کی کوئی پیلی کرن تڑپ کر باہر نکل آتی تو کائنات کا ہر ذرّہ چند لمحے کے لیے جگمگا اُٹھتا۔ آسمان کی نیلگوں چادر پانی پر منعکس ہوتی تو ہماری کشتی ایسی معلوم ہوتی گویا دو آسمانوں کے درمیان ہواہیں معلّق ہو گئی ہو۔ سنگین عمارتیں بھی پانی کی سطح سے اپنا سر اُبھارتیں اور کشتی کے ساتھ ساتھ والگا کی طرف بہنے لگتیں۔ کشتی کے چاروں طرف ٹوٹے پھوٹے ڈبے، ڈبّیاں، ٹوکریاں، لکڑی کی چھیلن، اَلَم غلّم خدا جانے کیا کچھ اکر جمع ہو جاتا، کبھی کبھار کوئی کھپچّی سطح پر سانپ کی طرح بل کھاتی تیرتی چلی جاتی۔

اِکّا دُکّا کھڑکیاں کھلی نظر آتیں۔ برآمدوں کی چھتوں پر کھلے ہوئے کپڑے سوکھتے ہوتے یا جوتوں کی سلائی ہوتی رہتی۔ ایک عورت کھڑکی سے مُنڈیا نکال کر ملگجے دریا پر نظر ڈالتی۔ ایک کشتی کچھُ فاصلے پر —— جہاز کے جسم سے سر ٹکراتی۔ اس کا سُرخ رنگ پانی میں جھلک مارتا تو ایسا معلوم ہوتا گویا گوشت کا بڑا سا لوتھڑا دریا میں تیر رہا ہو۔

زندگی کے انھی بے کیف و بے رنگ پہلوؤں پر رائے زنی کرتے ہوئے میرا مالک مجھ سے کہتا۔

"دیکھو سامنے والی کوٹھری میں اس بازار کا چوکیدار رہتا ہو۔ رات کے وقت وہ سب سے نیچے اُتر کر اپنی کشتی میں بیٹھ جاتا ہو اور اِدھر اُدھر چکّر لگاتا پھرتا ہو، یہ معلوم کرنے کے لیے کہ کوئی

چور، اُچکّا یا اُٹھائی گیرا کسی دُکان یا مکان کے کاوے تو نہیں کاٹ رہا۔ اگر اتفاق سے کوئی چور نظر نہ آئے تو پھر وہ خود چور بن جاتا ہے "

اس نے رُک رُک کر یہ گفتگو اس طرح کی گویا زبان خود بخود ہل رہی تھی۔ حالانکہ دماغ کہیں اور تھا۔ قرب و جوار کی ہر شے خواب میں نظر آنے والی چیزوں کی طرح، خاموش، ویران اور غیر حقیقی تھی۔ دریائے دولگا بہتے بہتے ایک بڑی جھیل میں ہل جاتا تھا۔ اس کے کنارے کنارے بہت دُور پہاڑ کے دامن میں ایک شہر آباد تھا جسے رنگین فضاؤں کے اعتبار سے قوسِ قزح کہا جا سکتا تھا۔ وہاں بہت سے شاداب باغات تھے جن میں ہر وقت بہار جھولتی رہتی تھی، کلیاں چٹکتیں، پھول مسکراتے اور سبز پتّوں سے ڈھکے ہوئے مکانات اور گرجا دیکھنے والوں پر رُعب طاری کر دیتے تھے نوروز کا نغمۂ بہار پانی کی سطح پر گونجتا ہوا دور تک سُنائی دیتا اور شہر کے ہنگامۂ نشاط کو فاصلے کی تھکن بھی نہ دبا سکتی۔ لیکن اس کے بالکل برعکس یہاں کا ماحول ایک ایسے قبرستان کے مانند حسرتناک تھا جسے خود مُردوں نے بھی فراموش کر دیا ہو۔

ہماری کشتی ساحلی درختوں کے بیچ میں سے ہوتی ہوئی گزر رہی تھی۔ مالک کے مُنہ میں دبے ہوئے سگار نے عجیب رنگ دکھایا۔ اُس کا کڑوا دھنواں اُس کی آنکھوں میں گھس گیا، ہاتھ بے قابو ہوئے اور کشتی کا اگلا سرا بے خیالی میں کنارے پر اُگے ہوئے درختوں کے اندر جا گھسا۔ وہ کچھ تو پریشان اور کچھ کبیدہ خاطر ہو کر چلّا پڑا۔

"لاحول ولاقوۃ! کیسی ناکارہ کشتی ہے"

"لیکن آپ نے ٹھیک اُس کی روک تھام بھی تو نہیں کی"

"میں اکیلا کر بھی کیا سکتا ہوں" اس نے بڑبڑاتے ہوئے جواب دیا۔ "جب کشتی میں دو آدمی ہوں تو قاعدہ ہے ایک چپّو چلاتا ہے اور دوسرا پتوار سنبھال کر اُس کی روک تھام کرتا ہے۔ لیکن خیر اِس طرف دیکھو۔ وہ چینیوں کی بستی ہے"

میں اس حصّے کے چپّے چپّے سے واقف تھا۔ میں جانتا تھا کہ اِس بستی کی عمارتیں کتنی مضحکہ خیز ہیں۔ خصوصاً چھتوں پر آلتی پالتی مار کر بیٹھنے والے چینی بالکل چینی مورتوں کے مانند معلوم ہوتے تھے۔ عرصہ ہوا کبھی میں اور میرے ساتھ کے کھیلنے والے اِن لوگوں پر پتھروں کی بوچھاڑ کرتے تھے۔ بارہا ایسا ہوا کہ میرے نشانے سے کسی غریب کا سَر پھوٹ گیا یا ہاتھ پاؤں زخمی ہو گئے۔ لیکن اب میرے لیے ایسی چھیڑ خانیوں میں کسی قسم کی دِل چسپی کا شائبہ تک باقی نہیں رہا تھا۔

"لغویت"۔ اِس بستی کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے میرے مالک نے کہا۔ "کاش! اِس کو تعمیر کرنے کی اِجازت مجھے دی جاتی"

لیکن میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ اگر اِس کو تمام شہر تعمیر کرنے کی اِجازت مِل جاتی تب بھی وہ اس کی شان و شوکت کو چار چاند نہ لگا سکتا۔ پھر بھی اِس کی فضا اتنی ہی خراب اور گھٹی ہوئی رہتی۔ کیونکہ وہ قطعۂ زمین دو دریاؤں کے درمیان کافی نشیب

میں واقع تھا۔ اور ہر سال طغیانی آنے کے باعث ساری جگہ مرطوب رہتی تھی۔ اور جب صورتِ حال یہ ہو تو ظاہر ہی کہ اس وقت بھی چینیوں کی یہ بستی بالکل اُسی طرح قائم رہتی۔

اُس نے سگار کا ٹکڑا ایک طرف پھینکتے ہوئے اِس پر تھوک دیا۔ گویا طبیعت کے چڑچڑے پن کی تمام بنا صرف وہی تھا۔ اور پھر بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"زندگی بے کیفیت ہو گئ ہی۔ پیشکوف۔ بالکل بے کیفیت تمام لوگ گنوار لٹھ کی طرح جاہل اور بد ذوق ہیں۔ ان سے بات کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ اگر کوئی شخص اپنی قابلیّت کا مظاہرہ بھی کرنا چاہے تو کس کے سامنے۔ اثر لینے والا کون ہی۔ یہ سارا شہر بڑھیّوں، راج مزدوروں، رنگسازوں اور کاشتکاروں سے بھرا پڑا ہی"

اِس کی نظریں سفید مسجد پر جم کر رہ گئیں جو پانی سے سر اُبھارے چھوٹی سی پہاڑی پر ایک دلکش منظر پیش کر رہی تھی اور پھر گفتگو کا سلسلہ ملاتے ہوئے اِس طرح بولا گویا عرصۂ دراز کی بھلائی ہوئی باتوں کو دوبارہ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں ایک جرمن کے ماتحت کام کرتا تھا۔ اِس وقت مُجھے شراب اور تمباکو نوشی کی لت ہو گئی! میرے دوست تجارت کے میدان میں کوئی قوم جرمنوں سے بازی نہیں لے جا سکتی۔ خرید و فروخت کے وقت وہ بالکل جانور بن جاتے ہیں۔ شراب نوشی یقیناً ایک دلچسپ شغل ہی۔ لیکن خدا کا شکر ہی کہ میں سگار پینے کا

بہت زیادہ عادی نہیں ہوا۔ اور سگار پینے والے کی اپنی بیوی سے ہمیشہ کھٹ پٹ رہتی ہی۔ جہاں اِس نے مُنہ سونگھا اور چلاّنے لگی۔" ارے مردود یہ تیرے مُنہ میں سے کس چیز کی بُو آرہی ہی؟ کیا بیل کا چمڑا چبا کر آرہا ہی؟"۔ ارے بھئی! بات یہ ہی کہ ہماری عُمر جتنی زیادہ ہو، ہم اُسی قدر زیادہ مکّار اور دغا باز ہوتے ہیں۔ ہاں ہاں، یہ اُصول بلا تخصیص ہر شخص پر عاید ہو سکتا ہی

اِس نے چپّو کو کشتی کے سہارے کھڑا کر کے اپنی بندوق سنبھال لی اور چھت پر بیٹھے ہوئے ایک چینی کو نشانہ بنا ڈالا۔ غنیمت ہی کہ نشانے نے خطا کی اور گولی چھت اور دیوار کے درمیان پیوست ہوتی چلی گئی۔ صرف ذرا سی خاک اُڑی اور وہ بھی فضا میں گم ہو گئی۔

"نشانہ چوک گیا"، اُس نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا مگر کسی قسم کا افسوس ظاہر کیے بغیر۔ اور اِس اثنا میں بندوق دوبارہ بھر لی۔

"اچھا یہ تو بتاؤ، حسین جادو گرنیوں سے کیسی گزرتی ہی کسی لڑکی سے کبھی دل لگایا ہی؟ کیا کہا۔ نہیں؟ آخر کیوں؟۔ اجی حضرت بندے نے تو تیرہ سال کی عمر میں عشق بازی شروع کر دی تھی۔

جیسے کوئی رات کا دیکھا ہوا خواب بیان کر رہا ہو، اُس نے اپنی اوّلینِ محبّت کی روئداد مجھے سُنائی۔ وہ ایک معمار کے ساتھ کام سیکھنے کے لیے اُمّیدوار ہو گیا تھا، بس اِس کی خادمہ سے آنکھ لڑا بیٹھے۔ دریا کا گدلا پانی مکانات کے پشتوں سے ٹکرا ٹکرا کر آہستہ آہستہ ہچکولے کھا رہا تھا۔ بڑے گرجا کے پرلے سرے پر

غلیظ پانی کا چوبچّہ دھوپ میں چمک رہا تھا۔ سڑے بُسے ڈنٹھل اُس میں سے سَر نکالے کھڑے تھے۔ مورتوں کے کارخانے میں لوگ یہ گیت عموماً الاپا کرتے تھے۔

وہ ساگر نیلا نیلا ہی طوفانوں کی دُنیا

مجھے یقین ہی کہ وہ نیلا سمندر بھی اتنا ہی پر سکون اور بے جان ہوگا
مجھے ساری ساری رات نیند نہ آتی" مالک نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ میں بستر سے نکل کر اُس کے دروازے پر جا کھڑا ہوتا۔ اور شدید سردی کے باعث کانپتا رہتا، وہ مکان بالکل برف خانہ بنا ہوا تھا۔ اُس لونڈیا سے مالک کی بھی اٹ سٹ تھی۔ اور وہ بھی رات کے وقت اس کے پاس آیا کرتا تھا۔ اس لیے اندیشہ رہتا کہ وہ مجھے دیکھ نہ لے۔ لیکن میں مطلق پروا نہ کرتا۔ بالکل نڈر ہو کر کام کیا کرتا
وہ ایک کھوئے ہوئے انداز میں اس طرح کہ رہا تھا جیسے ایک شخص اپنے پھٹے پُرانے کوٹ کو اس نظر سے دیکھتا ہو کہ آئندہ اسے پہنا جائے یا نہ پہنا جائے۔

وہ لڑکی مجھے دیکھ لیتی مجھ پر ترس کھا کر دروازے کے پٹ کھول دیتی اور اندر بُلاتے ہوئے کہتی۔ "آؤ میاں مجنوں! اندر آجاؤ"
میں نے اِس قسم کے بہت سے قصّے سُنے تھے اور میں ان سے اُکتا گیا تھا، حالانکہ ان میں دلچسپی کا ایک پہلو ضرور ہوتا تھا۔ اور وہ یہ کہ تقریباً ہر شخص اپنی "اوّلین محبّت" کی روئداد بغیر لفاظی کے بے حجابی کے ساتھ کچھ اس طرح سناتا کہ سُننے والے کو اُس سے ہمدردی ہونے لگتی اور یہی اندازہ لگتا کہ "اوّلین محبّت" کا قصہ حقیقتاً اُن کی زندگی

کا بہترین افسانہ ہی۔

میرے مالک نے مُسکراتے ہوئے اپنے سر کو جنبش دی اور معنی خیز لہجے میں کہا۔

"لیکن حضرت! یہ باتیں بیوی سے کہنے کی نہیں ہوتیں۔ سمجھے۔ کبھی نہیں۔ حالانکہ اِس میں کوئی ہرج نہیں ہوتا۔ پھر بھی کہنی نہیں چاہیئیں۔"

اس نے سارا قصّہ اُپنے ہی کانوں کو سُنایا تھا۔ مجھے نہیں۔ اگر وہ چُپ ہو جاتا تو میں بولنا شروع کر دیتا۔ اِس سنسان فضا میں اِس کے سِوا کوئی چارہ کار ہی نہیں تھا کہ ایک شخص مسلسل بولے جائے، گائے جائے یا کوئی ساز چھیڑ دے۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو اِس اُجاڑ شہر میں جو ہر وقت مٹلگجے سرد پانی میں ڈوبا نظر آتا تھا کسی جگہ ٹانگ پھیلا کر ابدی نیند سو جائے۔

"سب سے پہلا اُصول یہ ہی کہ شادی کے سِلسلے میں جلد بازی نہ کی جائے"۔ اُس نے مشورے کے طور پر کہا "میرے دوست شادی کا معاملہ بہُت زیادہ اہم ہوتا ہی، جب تک تم اکیلے ہو، جہاں چاہو رہو جو چاہو کرو۔ اپنی مرضی کے مالک ہو، ایران جاکر مسلمان بن جاؤ یا چین جاکر بُدھ، تم اپنی زندگی کو اپنے خیالات کے مُطابق توڑ مروڑ سکتے ہو، ہر چیز کا مزہ چکھ سکتے ہو۔ لیکن بھیّا! بیوی موسمی طوفانوں کی طرح آتی ہی۔ تمھیں اِس پر پورا اقتدار حاصِل نہیں ہو سکتا۔ اور نہ وہ تمھارے لباس کے مانند ہوتی ہی کہ آج پہنا اور کل اُتار دیا۔ تم اِس سے بآسانی چھٹکارا نہیں پا سکتے"۔

اِس کے چہرے کا رنگ بدل گیا، اس نے اپنی نظریں ملگجے پانی پر جمادیں، بھویں تان لیں اور پکوڑا سی ناک کو ہتھیلی سے مسلتے ہوئے بڑبڑانے لگا۔

"سمجھے بھائی! ہر کام خوب سوچ سمجھ کر کرنا چاہیئے۔ فرض کرو تم ہر قسم کے خطرے سے محفوظ ہو اور تمھاری طبیعت بھی لاابالی نہیں ہی۔ اس کے باوجود ہو سکتا ہی کہ تمھاری راہ میں کوئی جال بچھا دیا جائے اور تم اس میں پھنس جاؤ۔"

اب ہماری کشتی جھیل کے اُس حصّے سے گزر رہی تھی جس پر کائی نے اپنا رنگ جما رکھا تھا۔

"ذرا آہستہ چلاؤ۔" اُس نے زسلون کی طرف بندوق تان کر آہستہ سے کہا۔ اور دو چار مرغابیاں مار لینے کے بعد بولا۔

آؤ۔ کنون کے بازار چلیں۔ مجھے ایک ضروری کام ہی۔ شام تک وہیں مصروف رہوں گا۔ تم اس عرصے میں اپنے گھر ہو آنا اور کہدینا کہ ایک ٹھیکیدار کے ہاں ملازمت کرلی ہی۔"

وہ شہر کے بیرونی حصّے میں سڑک کے قریب اُتر کر چلا گیا۔ میں کشتی کو بازار کی طرف موڑ لایا اور لنگر ڈال دیا۔ یہ حصّہ بھی کافی گنجان آباد تھا۔ میں کشتی میں بیٹھا دونوں دریاؤں کے سنگم کو گھورتا رہا، میں نے شہر پر نظر ڈالی، جہازوں کا جائزہ لیا۔ اور پھر آسمان کی طرف دیکھا۔ آسمان ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بہت ہی بڑا پرندہ اپنے عظیم الشان بازو فضا میں پھیلائے بیٹھا ہی۔ اور ہر چیز کو ان سفید پروں میں سمیٹ لینا چاہتا ہی۔ کہیں بادلوں کے نیلے

شگافوں سے سورج کی سنہری کرنیں جھانک کر کائنات کے ہر ذرّے کو اُجال رہی تھی۔ میرے چاروں طرف اچھی خاصی چہل پہل تھی۔ دریا کے بہاؤ پر سینکڑوں تختے پڑے تیر رہے تھے۔ جن پر دیہاتی قدم جمائے کھڑے تھے۔ چپوؤں کے بجائے اُن کے ہاتھوں میں لمبے لمبے بانس تھے۔ وہ آپس میں چہلیں کرتے ایک دوسرے کو پکارتے جا رہے تھے۔ ایک چھوٹی سی دخانی کشتی ایک خالی ڈونگے کو چڑھاؤ پر گھسیٹ رہی تھی۔ دریا اس کو دھکیل دینے اور کچل کر غرق کر دینے پر تُلا ہوا تھا۔ اِن کا آپس میں اِس طرح دست و گریبان ہونا بہت دلچسپ تھا، کشتی چاہتی تھی کہ لہروں کا مُنہ توڑ کر آگے بڑھ جائے اور لہریں بیتاب تھیں کہ کسی طرح کشتی میں گھُس کر اُسے پاش پاش کر دیں۔ دونوں کی حالت تھکے ہوئے پہلوانوں سے کم نہیں تھیں لہریں ہانپ رہی تھیں اور کشتی کا سانس پھول چکا تھا۔ ایک دوسرے ڈونگے پر چار دیہاتی پانی میں ٹانگیں لٹکائے برابر بیٹھے تھے۔ اِن میں سے ایک جس نے سُرخ قمیص پہن رکھی تھی ایک گیت الاپ رہا تھا۔ الفاظ صاف طور پر سُنائی نہیں دے رہے تھے۔ لیکن اس کی طرز مجھے یاد تھی۔

میں نے محسوس کیا کہ میں اِس ماحول کی ہر چیز سے واقف ہوں، ہر چیز سے مجھے لگاؤ ہے۔ سب کو جانتا، پہچانتا، سمجھتا، بوجھتا ہوں۔ اور وہ شہر جسے پیچھے چھوڑ آیا تھا بلا شبہہ ڈراونے خوابوں کا مسکن تھا یا صرف میرے مالک کے خوابوں کی نگری جو خود اسی کی طرح پیچیدہ اور ناقابلِ فہم تھی۔

جب ہر چیز کو اچھی طرح دیکھتے دیکھتے میری طبیعت بھر گئی تو میں نے گھر جانے کے لیے کشتی کا رُخ پھیر دیا، میں محسوس کر رہا تھا کہ اب میں جوان ہو گیا ہوں اور ہر بڑے سے بڑا کام کرنے کا اہل ہوں۔ میں نے پہاڑی پر چڑھتے ہوئے مڑ کر دریا پر نظر ڈالی جو ایک ملاگیری چادر کی طرح پھیلا پڑا تھا۔ پہاڑی کی چوٹی سے میدان ایک بہت بڑے طباق کی مانند معلوم ہوتا تھا۔ ایک ایسا طباق جس میں دونوں جہان کی نعمتیں بھری ہوئی ہیں۔

میں نے گھر میں بہت سی کتابیں جمع کر رکھی تھیں۔ اُس مکان میں جو کبھی میری ملکہ کا عشرت کدہ تھا ایک بڑے خاندان نے رہایش اختیار کر لی تھی۔ پانچ نوجوان لڑکیاں تھیں، حسن و جمال اور رعنائی میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر۔ اور دو لڑکے جو مدرسے میں تعلیم پا رہے تھے، میں عام طور پر انھی لوگوں سے کتابیں لے لیتا تھا۔ میں نے ترجنیف کا بہت گہرا مطالعہ کیا۔ اور حیران رہ گیا کہ اس کا اندازِ بیان کس درجہ سادہ، معنی خیز اور موسمِ بہار کی طرح شگفتہ ہے۔ اِس کے کردار بالکل حقیقی اور اِسی دُنیا کے رہنے والے ہیں، جس موقعے پر اُس نے قلم اُٹھایا، اُس کے کسی پہلو کو رُوشن کیے بغیر نہ چھوڑا۔ دوٗسرے مصنفین کا بھی یہی حال تھا مثلاً ایک افسانے میں بالکل وہی زندگی پیش کی گئی تھی جس کا مشاہدہ میں نے مورتوں کے کارخانے میں کیا تھا۔ اسی لیے میں نے اِس سوگوار فضا سے بہت زیادہ اثر لیا۔ میں روٗسی کتابیں بہت زیادہ دلچسپی سے پڑھتا اور محسوس کرتا کہ گرجا کی ماتمی گھنٹیوں کی صدائے دلخراش اِن اوراق پر مُرتسم کر دی گئی ہے۔

اِن میں کس قدر درد اور سوز پنہاں ہوتا تھا۔

ایسی بہت سی کتابیں پڑھیں جن میں زندگی اور موت کے اسرار و رموز کو بے نقاب کرنے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اِن کے مطالعے سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ مُصنّف کے خیال کے مطابق موت ہماری زندگی پر بُری طرح چھا گئی ہے۔ اِن کتابوں کے نام تک ایک دوسرے سے مِلتے جُلتے تھے۔ مثلاً "مردہ روحیں" "تین مردے"۔ "مُردوں کے خطوط"۔ اِس تھکا دینے والے موضوع سے میری طبیعت کو سخت اُلجھن ہونے لگتی۔ اور میں گھبرا کر اِن کو پھینک دینا چاہتی۔ چارلس ڈکنس اور والٹر سکاٹ کا طرزِ تحریر بھی مجھے بہت پسند تھا اُن کی کتابوں سے میرے دماغ کو بہت آسُودگی نصیب ہوتی۔ کوئی اور کتاب نہ مِلتی تو میں اِنھی کو بار بار پڑھے جاتا۔ سکاٹ کے ناوِل شیطان کی آنت کی طرح طویل ہوتے تھے مگر بیحد دلچسپ۔ اُن کو پڑھ کر ایک بزمِ نشاط کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا۔ میرے دل میں سب سے زیادہ اِحترام ڈکنس کا ہے۔ نوعِ انسان سے بے لوث محبّت کرنے کے جذبے کو شاید اِس سے زیادہ کِسی اور شخص نے نہیں سمجھا اور نہ اپنی تحریروں میں پیش کیا۔ اس کا دِل اِس بلند احساس سے معمور تھا اور وہ تکمیلِ فن کے ساتھ اُس کو اپنی کتابوں میں پیش کر سکتا تھا۔

شام کے وقت سب سے اوپر کی چھت پر بہت سے لوگوں کا جمگھٹا لگتا۔ نوجوان لڑکے لڑکیاں سبھی جمع ہو جاتے، دیر تک چہل پہل رہتی۔ اُن کی گفتگو عموماً ادبی اور شاعرانہ ہوتی، اِس لیے

میرا بھی دل لگ جاتا اور اِس میں برابر کا حِصّہ لیا کرتا۔ مجھ اکیلے نے اِتنی کتابیں پڑھی تھیں کہ اِن سب نے مِل کر بھی نہ پڑھی ہوں گی۔ لیکن کبھی کبھی وہ مدرسے کی باتیں شروع کر دیتے اور اُستادوں کا ظلم وستم بیان کرنے لگتے۔ اس وقت میں سوچتا کہ میں نے ان سب سے زیادہ آزاد زندگی بسر کی ہے۔ اور مجھے حیرت ہوتی کہ وہ اس مارپیٹ کو کس طرح برداشت کر لیتے ہیں۔ پھر بھی میں اُن پر رشک کرتا۔ اور کچھ نہیں تو کم سے کم انھیں یہ موقع تو حاصل ہے کہ جس قدر چاہیں اپنے علم کو وسیع کرتے رہیں۔

میرے ساتھی عُمر میں مجھ سے بڑے تھے لیکن میں اُن پر اپنی فوقیت محسوس کرتا تھا۔ کیونکہ اِن سب سے زیادہ تجربہ کار اور بالغ نظر تھا۔ مجھے اِس احساس سے تکلیف ہوتی تھی، میں چاہتا تھا کہ اُن کے ساتھ شیر وشکر ہو کر رہوں، شام کے وقت میں دیر کر کے گھر پہنچتا، سر جھاڑ، مُنہ پھاڑ، میری حالت عجیب وغریب ہوتی، ظاہر ہے کہ میرے تاثرات اِن سب سے مختلف ہوا کرتے تھے۔ وہ حُسن وشباب کی نیرنگیوں پر بھی گفتگو کرتے۔ اُن میں سے ہر شخص کسی نہ کسی کی محبّت میں گرفتار تھا یا ہو جانا چاہتا تھا۔ عشق کا اظہار عموماً اشعار میں ہوتا ہے اور اس لیے وہ کوشش کرتے کہ شاعری میں بھی کچھ نہ کچھ دسترس حاصل ہو جائے۔ اِس ضمن میں اُنھیں خاص طور پر میری مدد درکار ہوتی، میں بسر وچشم اُن کی خدمت کے لیے تیّار ہو جاتا۔ کیونکہ معمولی تک بندی کر لینا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ لیکن خدا جانے کیوں میری نظموں میں ہمیشہ مزاحیہ رنگ غالب آجاتا۔ میں

اِن میں سے ہر ایک کی محبوبہ کو کسی نہ کسی پھل یا ترکاری سے تشبیہہ دیے بغیر نہ رَہ سکتا تھا۔

ایک روز سیما شکو مجھ سے کہنے لگا۔

"کیوں جی کیا اِس کا نام شاعری ہے؟ دہقانی لوگ اِس سے بہتر تک بندی کر سکتے ہیں۔"

مِس تطزین اِن سَب کی مشترکہ محبوبہ تھی۔ وہ سَب والہانہ طور پر اِس سے محبّت کرتے اور اپنا کلام عموماً اِسی کے نام منسوب کرتے تھے۔ میں نے سوچا کہ اِس ضمن میں اُن سے پیچھے نہ رہوں۔ اور اس لیے میں بھی اُس سے محبّت کرنے لگا۔ محبّت کی ابتدا کیونکر ہوئی یہ تو مجھے یاد نہیں۔ البتّہ یہ جانتا ہوں کہ اِس کا انجام بہت بُرا رہا۔ میری قیام گاہ سے کچھ دُور ایک تالاب تھا جس میں نیلگوں پانی ہر وقت سڑا کرتا تھا۔ ایک روز میں نے تطزین سے کہا کہ آؤ تمھیں کچھ سیر کرا لاؤں۔ وہ فوراً آمادہ ہو گئی۔ اُس کا لباس بہت شاندار تھا کپڑے پر فیتے اور لیس وغیرہ قسم کی چیزیں ٹکی ہوئی تھیں۔ میں ایک موٹا سا تختہ گھسیٹ کر کنارے کے قریب لے آیا۔ وہ صرف میرا وزن سہارنے کے لیے کافی تھا۔ لیکن جونہی اِس نوجوان حسینہ نے بصد نازو انداز اِس پر قدم رکھا اور میں نے چپوّ کی بجائے ایک ڈنڈا سنبھالا، وہ کمبخت پلٹ گیا اور اس طرح پلٹا کہ مس صاحبہ اپنے قیمتی لباس سمیت غڑپ پانی میں جا پڑیں۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ خود بھی نہایت مردانہ وار اس کے ساتھ ہی کود پڑا۔ اور جلدی ہی کنارے پر تیرا لایا، کچھ تو خوف و دہشت سے متاثر ہو کر

اور کچھ تالاب کی کیچڑ میں لت پت ہو کر اس کا سارا حسن عارضی طور پر تباہ ہو گیا۔ اِس نے خوب گھونسہ تان کر مجھے دھمکیاں دیں اور چلاّ کر کہا۔

میں جانتی ہوں تم نے مجھے جان بوجھ کر پانی میں گرا دیا"

میں نے بہت کوشش کی کہ وہ اس غلط فہمی کو دور کر دے۔ یقین دلانا چاہا کہ میری نیت خراب نہیں تھی۔ مگر اُس نے تسلیم نہیں کیا۔ اور اس کے بعد سے مجھے اپنا دشمن سمجھنے لگی۔

بحیثیتِ مجموعی اِس شہر کی زندگی میرے لیے کچھ زیادہ دلچسپ نہ تھی۔ بوڑھی مالکہ کو مجھ سے ازلی بیر ہو گیا تھا اور اس کی جوان لڑکی ہر شخص کو کاٹ کھانے کے لیے دوڑتی تھی۔ کسی کا قصور ہو یا نہ ہو ناراض ہونا اس کی فطرت میں داخل تھا۔

میرے مالک کو بہت سے نقشے تیار کرنے تھے۔ وہ اپنے بھائی کے ساتھ مل کر سب کام پورا نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا میرے سوتیلے باپ کو بھی اس نے ہاتھ بٹانے کی غرض سے ملازم رکھ لیا۔

ایک روز میں بازار کے کام سے فارغ ہو کر ذرا جلدی گھر لوٹ آیا۔ تقریباً پانچ بجے تھے۔ میں سیدھا کھانے کے کمرے میں گھس گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ میز کے قریب بیٹھا مالک سے باتیں کر رہا ہے۔ میں اس شخص کا خیال تک اپنے دل سے مٹا چکا تھا۔ اس نے بے تکلفی سے میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"کہو کیسے مزاج ہیں؟"

مجھے اس سوال کی بالکل توقع نہیں تھی۔ اس لیے ذرا جھجک

کر پیچھے ہٹ گیا۔ نفرت کی وہ آگ جو عرصۂ دراز سے سینے میں دبی ہوئی تھی یکبارگی بھڑک اُٹھی اور میرا تن بدن اُس کے شعلوں میں جلنے لگا۔ اِس کے مدقوق چہرے پر خوفناک ہنسی نمودار ہو گئی۔ اِس کی سیاہ آنکھیں اندر کو دھنس کر پہلے سے زیادہ بڑی ہو گئی تھیں۔ وہ بہت زیادہ تھکا ماندہ اور نڈھال معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ اُس کی پتلی اُنگلیاں گرم سلاخوں کی طرح جل رہی تھیں۔

"بہت خوب!" اُس نے کھانستے ہوئے کہا۔ "کتنے عرصے کے بعد ہماری مُلاقات ہوئی ہے۔"

میں وہاں سے ٹل کر چلا گیا۔ میری رُوح سخت مضمحل ہو رہی تھی۔

ہم ایک دُوسرے سے بہت چوکس اور کھنچے کھنچے رہنے لگے حالانکہ اِس کے برتاؤ میں بے تکلفی تھی۔ وہ مجھے میرے آبائی لقب سے یاد کرتا اور یہ ظاہر نہ ہونے دیتا کہ مجھ سے عمر اور رشتے میں بڑا ہے۔

"جب بازار جاؤ تو میرے لیے پاؤ بھر تمباکو کے سو پیکٹ سگریٹ اور ایک سیر اُبلا ہوا گوشت لیتے آنا۔"

وہ رُوپے پیسے دیتا تو سکّے ہاتھ کی تپش سے ہمیشہ گرم ہوتے اُنھیں چھو کر مجھے کراہت سی ہونے لگتی۔ سب جانتے تھے اِسے دق ہو گئی ہے اور اب زیادہ عرصے اِس دُنیا میں زندہ نہیں رہ سکے گا۔ یہ بات اِسے بھی معلوم تھی۔ وہ کبھی کبھی اپنی سیاہ ڈاڑھی

کو مڑوڑی دیتے ہوئے خاموش دلگیر لہجے میں کہتا۔

"اِس میں شک نہیں کہ میرا مرض لاعلاج ہو گیا ہے۔ تاہم اگر میں بہت زیادہ گوشت کھانے لگوں تو کچھ افاقہ ہو سکتا ہے۔"

اس کی خوراک اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ کوئی مشکل ہی سے یقین کر سکتا تھا۔ اِس کے ساتھ ہی ساتھ تمباکو نوشی کا بُری طرح دھتی تھا۔ صرف کھانے کے وقت سگریٹ اِس کے ہونٹوں سے جُدا ہوتا تھا، میں روزانہ اُس کے لیے اُبلا ہوا گوشت، پارچے اور مچھلیاں خرید کر لاتا۔ لیکن نانی کی بہن پُورے وثوق سے کہتیں اور نہ جانے کیوں اُن کی باتوں سے ظاہر ہوتا کہ وہ اِس کا بُرا چاہتی تھیں۔

"مُرغّن غذاؤں سے موت کا فرشتہ ٹل نہیں سکتا۔ تم لذیذ کھانے کھا کر اسے فریب نہیں دے سکتے۔"

گھر کی مالکہ اِس طرح ہمدردی جتاتی گویا میرے سوتیلے باپ کی بیماری کا اُسے بہت خیال تھا۔ وہ میرا بھید کہتے ہوئے اُس کو مشورہ دیتی کہ تم فلاں فلاں دوائیں استعمال کیوں نہیں کرتے لیکن پیٹھ پیچھے اُس کا خوب مذاق اُڑاتی۔

"عجیب مردِ معقول ہے! ـ کہتا ہے کہ روٹیوں کے بھورے کھانے کے کمرے میں پڑے رہنے نہیں چاہئیں۔ اِن پر مکھیاں بھنکتی ہیں، اِن کی نسل میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ انسان کے لیے تباہی کا باعث بن جاتی ہیں۔"

اِس کی لڑکی یہ فقرہ کستی اور وہ خود الفاظ کو دُہراتے ہوئے

پوچھتی۔

"کیا کہا — وہ مردِ معقول ہی؟ ذرا اس کا کوٹ تو دیکھو۔ کیسا پھٹا پُرانا اور خاک دُھول میں اٹا رہتا ہی۔ اِس کا سارا دن اس کے جھاڑنے پوچھنے میں گزر جاتا ہی۔ بڑا نفاست پسند ہی۔ چاہتا ہی کہ خاک کا ایک ذرّہ بھی اِس پر نہ پڑا رہے"

لیکن مالک اِن کو ذرا تھپک کر کہتا۔

"اری چمگادڑو! چپ بھی رہو۔ وہ اس دُنیا میں چند دن کا مہمان ہی"

مجھے حیرت ہوتی کہ وہ لوگ جو سماج میں خاصے شریف آدمی کہلاتے تھے، آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ بغضِ للّٰہی رکھتے تھے۔ مجھے اُن کی ظاہرداری پر غصّہ آتا۔ اور اِس کا نیتجہ یہ ہوا کہ مجھے اپنے سوتیلے باپ سے کچھ دلی لگاؤ ہو چلا۔ سُرخ شراب آنکھوں کو کتنی بھلی معلوم ہوتی ہی۔ لیکن صحت کو تباہ کر دیتی ہی۔ یہی حال اُن لوگوں کا تھا۔ اِس پراگندہ ماحول میں گھرے رہنا میرے باپ کے لیے بالکل ایسا تھا جیسے کوئی مچھلی محض اتفاقاً غلیظ پانی میں جا پڑے۔ یہ مثال کچھ زیادہ معقول نہیں ہی کیونکہ اِس فضا کے زیرِ اثر خود زندگی ہی ایک نامعقول چیز بن گئی تھی۔

میں نے اندازہ لگایا۔ اِس میں اور "دراصل صاحب" میں ایک گونہ مشابہت تھی "دراصل صاحب" کو میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ وہ اور میری ملکہ، دونوں میری نگاہ میں لائقِ وقعت تھے میں نے کتابوں کے مطالعے سے جو کچھ اثر لیا، اور میری روح کو

جو پاکیزگی حاصل ہوئی، وہ میں نے اُنھیں پر قربان کر دی۔
جب میں نے جان لیا کہ میرا سوتیلا باپ "دراصل صاحب" سے بہت مِلتا جُلتا ہی تو میری نگاہ میں اُس کی وقعت بھی پیدا ہو گئی۔ وہ گھر کے ہر چھوٹے بڑے سے یکساں طور پر پیش آتا، خلوص و محبّت کا اِظہار کرتا اور گفتگو کے وقت ہر کِسی کی بات کا جواب نہایت انکساری اور نرمی سے دیتا تھا۔ جب وہ میرے مالک کو گُر کی باتیں سکھاتا تو مجھے بہت خوشی ہوتی۔ میز کی سطح پر موٹے کاغذ کے بڑے بڑے نقشے پھیلے رہتے اور وہ ان کے قریب کھڑے ہو کر اُنگلی سے اِشارہ کرتے ہوئے کہتا۔
"دیکھو یہاں محراب میں ایک بڑے پتھر کی ڈاٹ لگانی ضروری ہی۔ اِس سے دباؤ کا زور آدھا رہ جائے گا۔ اس کے بغیر ستون قائم نہیں رہ سکیں گے اور دیوار پاش پاش ہو جائے گی۔"
"ارے بھئی سب ٹھیک ہی۔ کچھ نہیں بگڑتا بگڑاتا۔" مالک بڑبڑا کر جواب دیتا۔ اور جب میرا سوتیلا باپ کہیں چلا جاتا تو بڑھیا بھی ٹرّا کر کہتی۔
"مجھے حیرت تو اس بات کی ہی کہ تم ایسے لوگوں کو زبان چلانے کیوں دیتے ہو۔ وہ اِس طرح سمجھانے کی کوشش کرتا ہی گویا تم پہلے سے کچھ جانتے ہی نہیں ہو۔"
وہ کھانے سے فارغ ہو کر دانت مانجھتے ہوئے غرارے کرتا تو بُڑھیا جل بھُن کر کباب ہو جاتی۔ وہ کہتی کہ اِس موئے کا بھولا ہوا ٹینٹوا مجھے ایک آن نہیں بھاتا۔ وہ ترش رُو ہو کر کہتی

"میرا خیال ہے کہ سر پیچھے کی طرف جھکا کر غرارے کرنا تمھارے لیے بہت خطرناک ہے۔"

اور وہ مسکرا کر نرمی سے پوچھتا۔ "آخر کیوں؟"

"اس لیے کہ ـــ بس میں جو کہتی ہوں۔"

اس کے بعد وہ اپنے نیلے ناخن برش سے صاف کرنے لگتا۔

"ہائے غضب" بڑھیا چلّا کر کہتی۔ "وہ اپنے ناخن پھر صاف کر رہا ہے ارے میں کیونکر کہوں۔ وہ مرنے کے قریب ہے۔ اور ہمارے گھر میں ـــ مجھ سے یہ نہیں دیکھا جاتا۔

"اری جل ککڑی!" مالک دانت پیس کر کہتا "میں پوچھتا ہوں کہ تو اتنی احمق کیوں ہوگئی ہے؟"

"کیا کہا تم نے؟" بیوی آنکھیں پھاڑ کر حیرت سے پوچھتی۔ جب رات ہو جاتی تو مالکہ خدا کے حضور میں جھک کر گڑگڑاتی

"یہ بیماریوں کی پوٹ ہمارے سر پر آ گری ہے۔ تو ہی اس سے نجات دے۔"

ڈاکٹر نے میرے سوتیلے باپ کے رنگ ڈھنگ کا مذاق اڑانا شروع کر دیا ـــ وہ اس کی دھیمی چال، وہ اس کے اکڑے ہوئے بازوؤں کی جچی تلی جنبش، وہ اس کے کھانے پینے کا شائستہ انداز اور گلوبند لپیٹنے کی خاص وضع، غرض ہر چیز کا مذاق اڑانے لگا۔ ایک روز دوران گفتگو میں اس نے پوچھا۔

"میکسیموف! اچھا یہ بتاؤ "گھٹنے" کو فرانسیسی زبان میں کیا

کہتے ہیں ؟"

"آپ بھول رہے ہیں۔ میرا نام میکسیموف نہیں ہے"۔

"خیر کیا مضائقہ ہے۔ اچھا "سینے" کی فرانسیسی بتاؤ؟"

کھانے کے وقت وکٹر اپنی ماں کو فرانسیسی زبان کا کوئی غلط سلط جملہ سُناتا۔

"ارے او فرانسیسی!" بڑھیا جز بز ہو کر ڈانٹتی۔

میرا سوتیلا باپ گونگا اور بہرا بنا گُم سُم بیٹھا رہتا۔ اُس کی نظریں کھانے کی رکابی سے ہٹ کر کسی چیز پر نہ پڑتیں۔

ایک روز بڑا بھائی چھوٹے سے کہنے لگا۔

"وکٹر! اب تو تم فرانسیسی بھی سیکھ رہے ہو۔ پھر فرانسیسیوں کی طرح عشق بازی کیوں نہیں شروع کر دیتے!"

اس فقرے پر میں نے پہلی اور آخری بار اپنے سوتیلے باپ کو مُسکراتے ہوئے دیکھا۔

نوجوان مالکہ نے غصّے سے بھنّا کر چمچہ میز پر دے پٹکا۔ اور اپنے خاوند کو ڈپٹ کر بولی۔

تمھیں شرم نہیں آتی۔ میری موجودگی میں ایسی بیہودہ باتیں کر رہے ہو"

زینے کے نیچے ایک مختصر سی تاریک جگہ میری خواب گاہ تھی۔ وہیں کھڑکی کے قریب بیٹھکر میں فرصت میں کوئی کتاب بھی دیکھ لیتا تھا۔ کبھی کبھار میرا سوتیلا باپ غلام گردش میں سے گزرتے وقت میرے پاس چلا آتا اور کتاب میرے ہاتھ میں

دیکھکر پوچھتا۔

"اوہو۔ کیا پڑھ ڈالا؟" اور جب دھوئیں کا غبار ہوا میں چھوڑتے ہوئے وہ گفتگو کرتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ اس کے سینے میں سخت جھرجھراہٹ ہو رہی ہے۔ "یہ کونسی کتاب ہے؟"

میں کتاب اُس کے ہاتھ میں تھما دیتا۔

"اچھا یہ ہے" وہ سرورق پر سرسری نظر ڈال کر کہتا۔ غالباً میں اُسے پڑھ چکا ہوں۔ لو۔ سگریٹ پیئو۔

ہم دونوں سگریٹ پینے لگتے۔ اور ہماری نظریں کھڑکی کے باہر میلے کچیلے صحن کا جائزہ لیتیں۔ وہ کہتا۔

"سخت افسوس ہے کہ تمہاری تعلیم کا انتظام نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ میں سمجھتا ہوں کہ تم میں دماغی قابلیّت بہت کافی ہے"

"جی فرصت کے وقت میں خود ہی کچھ پڑھ بڑھا لیتا ہوں"

"یہ کافی نہیں ہے۔ تم کو مدرسے میں داخل ہو کر باقاعدہ تعلیم حاصل کرنی چاہیئے"

میرا جی چاہتا کہ اس سے پوچھ بیٹھوں۔

"اجی حضرت! آپ نے تو مدرسے میں داخل ہو کر باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی۔ ذرا بتایئے۔ آپ کو اس سے کیا فائدہ پہنچ رہا ہے؟"

لیکن ایسا معلوم ہوا کہ اُس نے میرے من کی بات بھانپ لی۔

"اگر تعلیم کا باقاعدہ اور معقول انتظام ہو تو اس میں شک نہیں کہ مدرسہ بہترین تربیت گاہ بن سکتا ہے۔ انسان جس قدر

زیادہ علم حاصل کرے، اُتنا ہی اُس کا نام روشن ہو۔"

لیکن ایک بار اُس نے نصیحت کرتے ہوئے کہا۔ "بہتر یہ ہے کہ تم کہیں اور چلے جاؤ یہاں بے کار پڑے رہنے سے کیا حاصل؟"

"حاصل کیوں نہیں! مجھے یہ کام پسند ہے۔"

"اوہو۔ کس اعتبار سے؟"

"میں اُن لوگوں کے ساتھ مِل جُل کر کام کرتا ہوں تو مجھے بہت مزا آتا ہے۔"

"ہاں یہ بات تو ٹھیک ہے۔"

لیکن اس کے بعد ایک دن کہنے لگا۔ "یہ ہمارے ٹھیکیدار کیسے ذلیل لوگ ہیں — حد درجہ ذلیل ہیں۔"

میں سوچنے لگا کہ میری ماں نے کب اور کس موقع پر یہ لفظ استعمال کیا تھا اور جب مجھے یاد آیا تو میں غیر ارادی طور پر اس سے الگ ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

"کیوں۔ کیا تم کو میری رائے سے اتفاق نہیں ہے؟"

"میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔"

"یقین مانو۔ میں نے جو کچھ کہا حرف بحرف ٹھیک ہے۔ میں ثابت کر سکتا ہوں۔"

"کچھ بھی ہو میں اُس مالک کو اچھا سمجھتا ہوں۔"

"یہ تو میں بھی مانتا ہوں کہ وہ بہت لایق انسان ہے۔ لیکن کبھی کبھی اُس کی حرکتیں بہت ہی عجیب و غریب ہوتی ہیں۔"

میں چاہتا تھا کہ اس سے کتابوں کے بارے میں کچھ گفتگو

کروں۔ لیکن بعد میں اندازہ لگایا کہ اُس کے دل میں اُن کی کوئی وقعت نہیں تھی۔ چُنانچہ ایک روز اُس نے مشورہ دیا۔

"دیکھو تم چکنی چپڑی باتوں سے بھٹک نہ جانا۔ کتابوں میں لکھی ہوئی باتیں بظاہر بنی سنوری اور حقیقت سے کوسوں دور ہوتی ہیں۔ بہت سے مصنف بھی ہمارے مالک کی طرح کمینے اور ذلیل ہوتے ہیں"

اُس نے لوگوں کی ذات پر جس بے باکی سے حملہ کیا، مجھے بہت ناگوار گزرا۔ اور کچھ دیر کے لیے دماغ میں شدید اُلجھن پیدا ہو گئی۔

اُسی روز کا ذکر ہے کہ دورانِ گفتگو میں اُس نے پوچھا۔

"کیا تم نے گونشیریف کی کوئی کتاب پڑھی ہے؟"

"ہاں۔ فریگیٹ پلاڈا"

"اوں ہوں۔ یہ بہت خشک کتاب ہے۔ میرے کہنے سے تم "اوبلوموف" پڑھ کر دیکھو۔ جس طرح گونشیریف رُوس کا بہترین مصنف سمجھا جاتا ہے اسی طرح یہ تصنیف اِس کا شاہکار ہے، بلاشبہ اُس نے یہ کتاب جس صداقت اور بے باکی سے لکھی ہے، تعریف نہیں کی جاسکتی رُوسی ادب میں اِس کا نام ابد تک قائم رہے گا"

ڈکنس کی بابت اِس نے رائے پیش کی۔

"میں یقین دلاتا ہوں۔ اس کی ہر کتاب مرقع خرافات ہے۔ البتہ "ترغیبات انتھونی" چاہو تو پڑھ کر دیکھ لو۔ چونکہ تمھاری طبیعت میں تھوڑا سا مذہبی رجحان ہے۔ اِس لیے میرا خیال ہے کہ

تُم اسے پسند کرو گے۔ اور شاید اِس کا مُطالعہ تمھارے لیے مفید بھی ثابت ہو۔"

وہ میرے لیے پُرانے رسالوں کا ایک پلندہ اُٹھا لایا جن میں کچھ کتابیں قسط وار چھپی ہوئی تھیں۔ میں نے فلابیر FLAUBERT کا مُطالعہ کیا۔ اُس کو پڑھنے سے بعض پُرانی باتوں کی یاد تازہ ہو گئی اور چند مقدّس ہستیوں کی زندگی کے کارنامے آنکھوں کے سامنے آگئے۔ لیکن بحیثیتِ مجموعی مجھ پر کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ اِن اوراق میں اور بھی کئی چیزیں پڑھنے سے تعلّق رکھتی تھیں۔

فلابیر کی بابت میری رائے سُن کر میرا سوتیلا باپ کہنے لگا "اِس کے یہ معنی ہوئے کہ تم میں ابھی لڑکپن باقی ہے۔ اور ایسی کتابوں کے سمجھنے کی صلاحیّت پیدا نہیں ہوئی ہے۔ خیر۔ اسے بھولنا مت۔ پھر کبھی پڑھ کر دیکھنا۔"

بعض دفعہ کئی کئی گھنٹے تک ہم دونوں میں کوئی گفتگو نہ ہوتی وہ خاموش بیٹھا کھانستا رہتا۔ یا سگریٹ کے لمبے لمبے کش لیے جاتا۔ اُس کی خوبصورت آنکھوں میں چھپا ہوا سوز اپنی جھلک دکھانے لگتا۔ میرا جی چاہتا کہ اُسے اُس کی نظر بچا کر برابر دیکھتا رہوں اُس وقت یہ بات میرے ذہن سے مٹ جاتی کہ یہ شخص رضائے الٰہی کے سامنے سر جھکا کر چُپ چاپ مر جانے کے لیے بالکل تیار بیٹھا ہے۔ اسے یہ تک گوارا نہیں ہے کہ حرفِ شکایت زبان پر لائے اُس وقت میں یہ بھی بھول جاتا کہ کبھی زمانے میں یہی شخص میری ماں سے ایک قریبی تعلّق رکھتا اور اس کی بدنامی کا باعث ہوا تھا

مجھے معلوم تھا کہ اب وہ کسی درزن کے ساتھ رہتا ہے اور اس کے خیال سے میرے دِل میں تجسّس اور حیرت کے جذبات پیدا ہوئے۔ اِس بھُس بھری کھال سے وہ کیسے ہم آغوش ہو سکتی تھی اِن سڑے ہوئے ہونٹوں کو کیسے بوسہ دے سکتی تھی۔

"در اصل صاحب" کی طرح میرا سوتیلا باپ بھی کبھی کبھی عجیب و غریب باتیں کیا کرتا تھا۔ مثلاً مجھے پیٹر گاڑی بان یاد آگیا جس نے خودکشی کر لی تھی۔ وہ بھی امیر لوگوں کے سِلسلے میں ایسی قسم کی گفتگو کرتا تھا۔ مجھے یہ محسوس کرکے بڑی کوفت ہوئی کہ اُن سب کے خیالات بھی اس بُڈھے سے ملتے جُلتے ہیں۔

اوُسپ نے اپنے ہاتھ سے میری ٹانگ کو چھوا اور برابر کہے گیا۔

"لوگوں کو چاہئے کہ کتابیں اور ہر قسم کی تحریریں سوچ سمجھ کر پڑھا کریں۔ اور یہ مانی ہوئی بات ہے کہ کوئی شخص کسی مقصد کے بغیر کچھ نہیں کرتا۔ کتابیں خواہ مخواہ نہیں لکھدی جاتیں۔ اِن میں سے بعض انسان کا دماغ پراگندہ کر دینے کے لیے ہوتی ہیں۔ ہر شخص کو قدرت کی طرف سے عقلِ سلیم عطا ہوئی ہے اور وہ اِس عقل کو استعمال کیے بغیر دُنیا کا کوئی معمولی سے معمولی کام بھی نہیں کر سکتا"

"وہ بہت دیر تک بولتا رہا اور پھر لیٹ گیا۔ اس کے بعد دوبارہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ تاریک خاموشی میں عجیب و غریب جملے اس کے مُنہ سے بڑی تیزی کے ساتھ نکلنے لگے۔

"لوگ کہتے ہیں کہ شہریوں کی نسل دیہاتیوں سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ لیکن یہ بات دُرست نہیں ہے۔ ہم ہر لحاظ سے شہریوں کی طرح ہیں۔ بس فرق اِتنا ہے کہ ہم ترازو کے ہلکے پلڑے میں ہیں۔ بے شک ایک شہری کتابیں پڑھ کر بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔ اور مجھے صرف اپنی کھوپڑی پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک شہری کا جسم بہت نرم و نازک ہوتا ہے۔ بس اس قسم کے بہت معمولی فرق ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ ایسی سب کتابوں کو چولھے میں جھونک دوں۔ ہر شخص کو چاہیے وہ اپنے آپ سے پوچھے کہ مَیں کیا ہوں؟ ایک انسان! ۔ اور وہ کیا ہے؟ ۔ وہ بھی ایک انسان ہے۔ اچھّا پھر؟ کیا خدا کو اس کی فالتو دولت کی ضرورت ہے۔ ہرگز نہیں خُدا کی بارگاہ میں ہم سب کا رُتبہ برابر ہے۔"

آخر کار جب صبح کے اُجالے نے نمودار ہو کر ستاروں کے چہرے کا نُور پھیکا کر دیا تو اوسپ نے مجھ سے کہا۔

"میں رات ایسی ایسی باتیں کہ گیا جن پر کبھی غور بھی نہیں کیا تھا۔ لیکن تم ان میں سے کسی پر یقین نہ کرنا۔ مَیں کسی سنجیدہ ارادے کے ماتحت اِس قدر زیادہ نہیں بولتا رہا بلکہ محض اِس لیے کہ میری نیند اُڑ گئی تھی۔ تم لیٹ جاؤ اور کسی ایسی چیز کا تصوّر کرو جو تمھیں خوش کر سکے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک کوّا میدانوں، پہاڑو اور دریاؤں کو طے کرتا برابر اُڑتا چلا گیا۔ دُنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک۔ اور اُس نے عمر بھی بہت زیادہ پائی۔ آخر کار خُدا نے اِسے سزا دی۔ کوّا مر گیا۔ اور سوکھ ساکھ کر بالکل کھڑنک

ہو گیا۔ اچھا بتاؤ۔ اِس کا کیا مطلب ہؤا؟ اس کا کوئی مطلب ہی نہیں ہے۔ بالکل نہیں۔ اچھا اب سو جاؤ۔ کچھ دیر کے بعد اُٹھنا پڑے گا۔"

مجھے شکاری کتّوں سے بڑی رغبت ہے۔ وہ بہت بھولے بھالے معلوم ہوتے تھے۔ اور ساتھ ہی ساتھ حد درجہ حسین بھی یہ دو باتیں اُن کو میری نگاہ میں لایقِ محبّت ٹھیراتی ہیں۔ بہُت سی حسین عورتوں کی طرح کہ وہ بھی بظاہر بھولی بھالی معلوم ہوتی ہیں۔"

میں نے خیال کیا۔ اور یہ خیال کرتے ہوئے میں فخر و انبساط سے پھولا نہ سمایا۔

"کاش وہ ملکۂ حُسن سے تھوڑا بہت واقف ہوتا۔"

"ایک ہی دُکان میں جب بہت سے لوگ اکٹھّے رہتے ہوں تو مسلسل ایک دؤسرے کو دیکھتے رہنے سے وہ بڑی حد تک آپس میں ہم شکل معلوم ہونے لگتے ہیں۔ یہ اس کا ایک ایسا قول تھا جسے میں اپنی یادداشت میں لکھے بغیر نہ رہ سکا۔

میں ایسے اقوال کو بڑی توجہ کے ساتھ سُنتا۔ گویا وہ نعمتِ غیر مترقبہ ہیں۔ بھلا سوچنے کی بات ہے ایک ایسی فضا میں جہاں ہر شخص بے کیف و بے رنگ گفتگو کرنے کا عادی ہو، ایک ایسی گفتگو جس کے نپے تُلے الفاظ سانچے میں ڈھلی ڈھلائی یکساں شکل و صؤرت کی چیزوں کی مانند ہوں وہاں کبھی کبھی ایسی غیر معمؤلی باتوں کا سُن لینا جو ادبی رنگ میں ڈؤبی ہوں کس درجہ

دل خوش کُن اور فرحت بخش ہو سکتا ہے۔ میرے سوتیلے باپ نے کبھی بھُول کر بھی میری ماں کا ذکر نہیں کیا۔ حتّٰی کہ اُس کا نام تک بھی زبان پر نہیں لایا۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرے دل میں اِس کے لیے کافی جگہ ہو گئی۔ میں اُس سے مِل کر خوش ہوتا اور اُس کی عزّت کرتا۔

ایک روز میں باتوں باتوں میں خدا کی بابت پُوچھ بیٹھا۔ یہ تو یاد نہیں کہ اُس وقت موضوعِ گفتگو کیا تھا۔ اور یہ سوال میرے دل میں کیوں پیدا ہوا۔ تاہم پُوچھا ضرُور تھا۔ اُس نے نظر اُٹھا کر میری طرف دیکھا اور بڑے خاموش لہجے میں کہا۔

"میرا اعتقاد نہیں ہے۔ مَیں خدا کو نہیں مانتا"

معاً مجھے ستانوف یاد آ گیا۔ اور مَیں نے اُس کا بھی ذکر چھیڑ دیا میری باتوں کو بہت غور سے سُننے کے بعد اُس نے اپنا خیال ظاہر کیا:—

"وہ شخص شک و شبہہ میں گرفتار تھا۔ اور مانی ہوئی بات ہے کہ شکی طبیعت کے لوگ کسی نہ کسی خیال کے معتقد ضرور ہوتے ہیں۔ رہا میرا سوال سو مَیں ایسی باتوں کو سرے سے مانتا ہی نہیں"

"مگر یہ ممکن کیونکر ہو سکتا ہے؟"

"ممکن نہ ہونے کی وجہ؟ تم خود معلوم کر سکتے ہو کہ مَیں ایسی باتوں کو نہیں مانتا"

مجھے اس کے سوا کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ مرنے کے بالکل قریب ہے۔ مَیں نے اُس کی حالت پر ترس کھانا بھی چھوڑ دیا

کیونکہ ہر مرنے والے کے متعلق میری دِلی آرزو یہی ہوتی ہے کہ بہت جلد اِس کا خاتمہ بالخیر ہو۔ وہ زندگی کی آخری کٹھن منزلوں کو بلا تاخیر طے کر کے موت کے آغوش میں جا پہنچے۔

وہ شخص میرے قریب بیٹھا تھا۔ پہلو بہ پہلو دل میں گرم جوشی اور احساسات کی دُنیا لیے ہوئے۔ وہ ہر شخص کے متعلق اِس انداز سے گفتگو کرتا گویا اِن پر رائے زنی کرنے کی اس میں اہلیت بھی اور وہ اِن کے معاملات کو سُلجھا بھی سکتا تھا۔ مجھے محسوس ہوتا کہ میری کوئی کھوئی ہوئی چیز اِس کے اندر جا چھپی ہے۔ یہ کبھی سمجھ میں نہ آنے والا گورکھ دھندا بحرِ تخئیل کا وہ زبردست گرداب تھا جس میں کوئی چیز ڈوب کر دوبارہ اُبھر نہیں سکتی۔ صرف یہی نہیں کہ ایک عجیب سے رشتے نے ہم دونوں کو ایک دوسرے سے قریب کر رکھا تھا۔ بلکہ میں محسوس کرتا کہ وہ میری ہستی کا ایک بڑا جزو ہے اور بظاہر مجھ سے الگ ہونے کے باوجود میرے اندر کہیں کسی گوشے میں چھپا رہتا ہے۔ میں اُٹھتے بیٹھتے ہر گھڑی ہر لمحے اِسی کی بابت سوچتا رہتا۔ یہاں تک کہ اُس کی رُوح کے ہمہ گیر سائے مجھ پر چھائے رہنے لگے۔ میں قیاس لگاتا کہ وہ آج کل میں سب لوگوں کی نظر سے ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو جائے گا اور اس کے ساتھ وہ خیالات اور احساسات جو اِس کے دل و دماغ میں چھپے رہتے تھے فنا ہو جائیں گے۔ جب وہ اِس جہان سے کوچ کر جائے گا تو ایک اور رشتۂ حیات جس نے میری زندگی کو مربوط کر رکھا تھا ٹوٹ کر سارے شیرازے کو منتشر کر دے گا۔ صرف اِس

کی یاد باقی رہ جائے گی۔ اور وہ یاد بھی میری ذات تک محدود اور میرے حافظے کی لوح سے کبھی نہ مٹنے والی ہوگی۔ کیونکہ صرف وہ چیز جس میں آثارِ حیات ہوں تبدیل ہوتی اور گھٹتی بڑھتی ہے۔ لیکن یادداشت اِن خیالات کا دوسرا نام ہے جن کو شرمندۂ احسان نہیں کیا جا سکتا۔ وہ احساسات اور جذبات کو بیدار کرتی اور اِن پر جلا کرتی ہے۔ اور کبھی کبھی زندگی کو جڑ بنیاد سے اُکھاڑ کر پھینک دیتی ہے۔ وہ ماضی کے نقوش کو حال کے آئینے میں دیکھتی اور اُن کی بابت ہر وقت سوال کرتی رہتی ہے۔

"مجھے یقین ہو چلا ہے کہ اب میں کسی مصرف کا نہیں رہا۔"
میرے سوتیلے باپ نے بڑی مایوسی کے ساتھ کہا۔ "ضعف و ناطاقتی کا خدا بھلا کرے۔ کسی کام کاج پر دِل نہیں لگتا۔"

دوسرے روز شام کی چائے کے وقت میں نے دیکھا کہ وہ دسترخوان اور کپڑوں کے اوپر گرے ہوئے روٹی کے بھورے بڑی احتیاط سے جھاڑ رہا ہے۔ اور ان کے ساتھ کسی ایسی غیرمرئی چیز کو بھی اپنی ذات سے الگ کر ڈالنا چاہتا ہے جو اس کے خیال کے مطابق اس سے چمٹی ہوئی تھی۔ بوڑھی مالکہ نے کنکھیوں سے اُس کی طرف دیکھا اور اپنی بہو سے آنکھ مارتے ہوئے بولی۔

"زرا دیکھو تو کس بُری طرح اپنے آپ کو نوچ کھسوٹ رہا ہے گویا جسم سے کوئی چیز کھرچ ڈالے گا۔"

اس کے بعد دو دن تک وہ کام پر نہیں آیا۔ تیسرے دن بڑھیا نے ایک بڑا سفید لفافہ میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔

"لو یہ تمہارے نام ہے۔ کل دوپہر کے بعد ایک عورت لے کر آئی تھی۔ میں فوراً ہی تمہیں دُنیا بھول گئی۔ وہ عورت خاصی گوری چٹی اور نوجوان تھی۔ اور کافی غور و خوض کے باوجود میں یہ اندازہ نہ لگا سکی کہ اس کا مقصد کیا ہے۔ وہ یہاں کس لیے آئی تھی"۔

لفافے کے اندر سے ایک چھوٹا سا پرچہ نکلا۔ جس پر ہسپتال کی مہر لگی ہوئی تھی اور جلی حروف میں لکھا تھا

"جب کبھی ایک آدھ گھنٹے کی فرصت ملے، مجھ سے ملنے کے لیے چلے آنا۔ میں ہسپتال میں داخل ہو گیا ہوں۔

راقم۔ ع۔ م

دوسرے روز سویرے اُٹھتے ہی میں نے اسپتال کی راہ لی اور سوتیلے باپ کے سرھانے جا بیٹھا۔ پلنگ کافی لمبا چوڑا تھا۔ پھر بھی اُس کے پانو جن پر پھٹی پُرانی جرابیں چڑھی تھیں کپڑے کے باہر نکل گئے تھے۔ اِس کی خوبصورت آنکھیں سخت بے قرار تھیں۔ پریشان نگاہیں سامنے کی دیوار سے بھٹکتی بھٹکاتی کبھی میرے چہرے پر جم جاتیں اور کبھی اس نوجوان لڑکی کے نازک ہاتھوں پر جو سرھانے کے قریب ایک تپائی پر بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ تکئے کے سرے پر تھے اور میرا سوتیلا باپ اپنے رُخسار بڑی طرح اُن پر مسل رہا تھا۔ اُس کا جسم خاصا گداز تھا اور وہ گہرے رنگ کی چمک دار فراک پہنے ہوئے تھی، گول مول چہرے پر کبھی نہ تھمنے والے آنسوؤں کا سلسلہ قائم تھا۔

اس کی غمناک کرنجی آنکھیں ایک لمحے کے لیے بھی میرے باپ کے چہرے سے نہ ہٹ سکیں۔ اس چہرے سے جس پر انتہائی کمزوری اور لاغری کے باعث مُردنی چھائی ہوئی تھی۔

"اب پادری کو بُلا لینا ضروری ہے" اُس نے رازدارانہ طور پر مجھ سے کہا۔ "لیکن مجھے منع کر دیا ہے۔ بہت کچھ سمجھایا۔ لیکن یہ کسی طرح نہیں مانتے" اور اپنے ہاتھ تکیے سے ہٹا کر سینے پر اس طرح رکھ لیے گویا رُوح کی خلوتوں میں پہنچ کر مغفرت کی دُعا کر رہی ہے۔

ذرا سی دیر بعد میرے باپ کو ہوش آگیا۔ اُس نے نظر اُٹھا کر چھت کی طرف دیکھا اور دماغ پر اس طرح زور دیا گویا کسی بھولی ہوئی بات کو یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ پھر اپنا دُبلا پتلا ہاتھ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہنے لگا۔

"تم آ گئے۔ تمہارا شکریہ۔ میری حالت دیکھی۔ اب تو ہوش و حواس بھی ٹھکانے نہیں رہے"

یہ کہتے کہتے اُسے غش سا آنے لگا۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ میں نے اُس کی سرد اُنگلیوں کو اپنے ہاتھوں سے دبا لیا۔ اُس کے ناخن نیلے پڑ چلے تھے۔ لڑکی نے آہستہ سے کہا۔

"اگر مناسب سمجھو تو ہم دونوں کا تعارف کرا دو"

"تم ضرور ایک دُوسرے سے واقف ہو" اُس نے نظر پھیر کر لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "یہ بہت معقول......"

اُس کی زبان بند ہو گئی۔ مُنہ کُھلا کا کُھلا رہ گیا۔ اور بھرّائی ہوئی آواز میں ایک چیخ ایسی نکلی جو جگر کو چیرتی ہوئی چلی گئی۔

لڑکی سے بھی ضبط نہ ہو سکا۔ بے تاب ہو کر وہ بھی چلائی۔ کمبل کو ایک طرف پھینکا۔ اور اپنی عُریاں باہیں گلے میں ڈال کر میرے باپ سے لپٹ گئی۔ اُس کے تکیے پر سر رکھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

جاں کنی کی حالت طاری ہوئے بغیر میرے باپ کا دم فوراً نکل گیا۔ جب وہ آخری ہچکی لے رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر پہلا سا نُور چھا گیا تھا۔ میں لڑکی کو اپنے بازو کا سہارا دیکر اسپتال سے باہر لے آیا۔ اُس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے، برسوں کے بیمار کی طرح، اور وہ رونے سے باز نہ آتی تھی۔ اُس کا رُومال آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ وہ اُسے مٹھی میں دبا دبا کر گہری نظر سے اس طرح دیکھتی گویا کسی کی یاد اس سے وابستہ ہی۔ اور اس لیے اُس کی نگاہ میں سب سے زیادہ قیمتی چیز ہی۔

یکایک اُس نے رونا پٹنا بند کر دیا اور میرے بالکل نزدیک آکر کہنے لگی۔

"میں جاڑے کا موسم شروع ہونے تک بھی زندہ نہیں رہ سکوں گی۔ اُف! میرے اللہ! یہ کیا ستم ہو گیا؟"

پھر اُس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا جو آنسوؤں سے بھیگ رہا تھا۔ اور کہنے لگی۔

"اچھا خدا حافظ۔ تمھارے والد تمھیں بہت یاد کرتے تھے۔ کل تجہیز و تکفین کا انتظام ہو گا۔" "کیوں نا میں تمھیں گھر تک پہنچا دوں۔"

"نہیں کیا ضرورت ہی۔ رات ہوتی تو دیکھا جاتا اس وقت دن

ہے"

ایک بغلی راستے کے نکڑ پر پہنچ کر میں دیر تک اُسے دیکھتا رہا وہ ہولے ہولے قدم اُٹھائے چلی جا رہی تھی ایک ایسے دُشمن کی طرح جسے دنیا میں جلدی کرنے کے لیے اب کوئی کام نہ رہا ہو۔
اگست کا مہینہ تھا۔ پت جھڑ کا موسم شروع ہوئے کافی دِن گزر چکے تھے، مجھے ذاتی کام کاج سے اتنی فرصت نہ مِلی کہ اپنے سوتیلے باپ کو دفن کرنے کے لیے قبرستان جا سکتا اور اُس دن کے بعد اُس لڑکی سے دوبارہ مُلاقات نہ ہو سکی۔

سترھواں باب

ہر روز صبح کے چھ بجتے ہی میں منڈی کی طرف روانہ ہو جاتا، جہاں مالک نے تعمیر کا کام ٹھیکے پر دے رکھا تھا۔ وہاں بہت دلچسپ لوگوں سے میل ملاقات رہتی۔ بھان متی کے کنبے کی طرح کاریگروں میں ایک سے ایک نرالا شخص موجود تھا۔ کوئی کبڑا تھا تو کوئی کانا۔ کسی کے بال بھورے تھے تو کسی کی آنکھیں کرنجی۔ بعض اپنی ظاہری وضع قطع کے اعتبار سے اس قدر سنجیدہ اور بزرگ معلوم ہوتے کہ بلا مبالغہ اُن پر پیرو مرشد ہونے کا گمان ہونے لگتا اور بعض اپنی فطری عیّاری اور مکّاری کے باعث چھٹے ہوئے بدمعاش نظر آتے تھے۔

مَیں زندگی کی دوسری منزل میں قدم رکھنے کے بعد نقشہ نویس کے مکان پر اُن لوگوں سے واقف ہو گیا تھا۔ وہ ہر اتوار کو باورچیخانے میں اس طرح نمودار ہوتے گویا بہت سنجیدہ و متین اور بلند مرتبہ ہیں ان کے دلچسپ فقرے گفتگو کی جان ہوتے۔ مجھے اُن کی باتوں میں ایک نیا لُطف محسوس ہوتا۔ میں نے خیال کیا کہ ان پتھر کی مانند کرخت اور بے ڈول گنواروں کی ذہنیت کا مطالعہ کر لینا بالکل بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ خصوصاً ان کمینہ خصلت بدمعاشوں اور شرابیوں کے مقابلے میں جو کنون کی بستی اور اس کے قرب و جوار

رہتے تھے۔

شتشلین نامی راج مجھے سب سے زیادہ پسند تھا۔یہاں تک کہ ایک روز میں اُس سے پوچھ بیٹھا کہ اگر میں تمھارے کاریگروں کی ٹکڑی میں شامل ہو جاؤں تو کیا ہرج ہے۔ وہ اپنی سنہری بھووں کو گوری گوری اُنگلیوں سے کھجاتے ہوئے کچھ سوچنے لگا اور پھر بہت نرم لہجے میں بولا۔

ابھی تمھاری عمر اس لائق نہیں ہے۔ کم سے کم ایک سال اور ٹھیرو۔ ہمارا کام آسان نہیں ہے۔ بہت سی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔"

پھر اپنے خوبصورت سر کو ذرا تان کر کہنے لگا۔

"کیا تم اپنے موجودہ طرز زندگی سے مطمئن نہیں ہو۔ خیر۔ پروا مت کرو۔ صبر سے کام کیے جاؤ۔ ساتھ ہی کوشش کرو کہ ہر قسم کی زندگی کو اپنا لینے کی صلاحیت تم میں پیدا ہو جائے۔ اس کے بعد تم اس لایق ہو جاؤ گے کہ بڑی سے بڑی مصیبت کو جھیل سکو۔"

ٹھیک طور پر نہیں بتا سکتا کہ مجھے اس نیک مشورے سے کتنا فایدہ پہنچا۔ لیکن مجھے یاد اب تک ہے۔ اور دل میں اس کا شکر گزار ہوں۔

یہ لوگ ہر اتوار کی صبح مالک کے مکان پر جمع ہوتے۔ کھانے کی میز کے ارد گرد تپائیوں پر بیٹھ جاتے اور جب تک مالک آئے ہر قسم کی گپ شپ میں گزار دیتے، مالک آکر بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ سب سے ملتا، گرم جوشی سے ہاتھ ہلاتا اور ایسی جگہ بیٹھ جاتا

جس سے تھوڑی بہت امتیازی شان پیدا ہو سکے۔ وہ پھٹی پرانی جلدوں کے بہی کھاتے اور نوٹوں کی گڈیاں نکال کر میز پر پھیلا دیتے اور ہفتے بھر کی حساب کی جانچ پرتال شروع ہو جاتی۔

اگر اُن کے حساب میں کوئی غلطی نکل آتی تو مالک مذاق کے طور پر فقرہ کسنے سے باز نہ آتا۔ لیکن جب اِس سے چوک ہو جاتی تو وہ بھی ترکی بہ ترکی جواب دیتے۔ کبھی کبھی خوفناک جھگڑے کی صوُرت پیدا ہو جاتی۔ لیکن ایسا بہت کم ہوتا۔ کیونکہ عموماً وہ سیدھے بھاؤ معاملہ طے کر لینے کے عادی تھے۔

"تم تھے تو پوُرے بدمعاش، لیکن خراب خاصے بھلے مانس ہو گئے ہو" کاریگر قہقہہ لگا کر مالک سے کہتے۔

اور وہ ذرا کھسیانی ہنسی ہنس کر جواب دیتا۔

"اور ابے اُلّو! تو خود کیا ہے۔ بدمعاشی میں ہم دونوں ایک دوُسرے کی ٹکّر ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ہم سب چھٹے ہوئے بدمعاش ہیں"

"سچ کہتے ہو بھائی۔ ہم لوگ اس کے سوا اور ہو بھی کیا سکتے ہیں" ایک نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ اور دوُسرا سنجیدگی سے بولا۔

"تم لوگ حرام کی کمائی پر بسر اوقات کرتے ہو اور قوّتِ بازوُ سے پیدا کیا ہوُا رُپیہ خدا کے نام پر خیرات یا شہنشاہ کو نذر کر دینے میں صرف کرتے ہو"

"اچھا اگر یہ بات ہے تو پیارے میں بڑی خوشی سے تم کو بھوُن کر دیوتا پر بھینٹ چڑھاؤں گا" مالک نے ہنس کر جواب

دیا۔"

وہ اِسی طرح اُس کے ساتھ ہنسی مذاق کرتے رہے۔

"تمھارا یہ مطلب ہے کہ ہم سب کو بھاڑ میں جھونک دو گے؟"

"کیا ہمیں دہکتی بھٹی میں جلا کر بھسم کر دو گے؟"

راج صاحب نے اپنی لمبی چوڑی ڈاڑھی کو بڑی آن بان کے ساتھ سینے پر پھیلا دیا۔ اور ذرا مترنم لہجے میں گنگنا کر گویا ہوئے

"بھائیو! میرا خیال ہے کہ ہم لوگ دوسروں کو دھوکا دیے بغیر اپنا کام کاج نیک نیتی سے انجام دیا کریں۔

اگر آئندہ ہم سب ایمانداری کی زندگی بسر کرنے لگیں تو یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ ہماری روحوں کو کس قدر شانتی نصیب ہو گی۔ کیوں پیارے دوستو! کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

اس کی کرنجی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ پیشانی پر پسینہ آگیا۔ اور مجھے یہ دیکھکر تعجب ہوا کہ وہ کافی خوبصورت تھا۔ اُس کے آخری سوال پر وہ سب کے سب کچھ بوکھلا سے گئے اور اسی لیے ایک ایک کر کے وہاں سے کھسک گئے۔

"دیہاتی لوگ کچھ زیادہ دھوکے باز نہیں ہوتے" ان میں سے ایک بڑبڑانے لگا۔ گویا اُس کی دیہاتیوں سے بہت ہمدردی تھی

سیاہ فام راج نے اپنی گداز کمر میز کے سہارے جھکاتے ہوئے بھر بھراتی آواز میں کہا۔

"گناہ دلدل کے ایک بڑے تالاب کی مانند ہے۔ جس قدر آگے قدم بڑھاؤ گے، اُتنے ہی زیادہ اُس میں دھنستے چلے جاؤ گے؟

اور مالک اِس انداز سے بولا گویا وہ تقریر کرنے کا ارادہ کر رہا تھا۔
"میرے متعلق تم یقین کر لو کہ میں جو کچھ کرتا ہوں کسی اور ہستی کے اشارے پر کرتا ہوں طوعاً و کرہاً۔ بالکل بادل نخواستہ۔"

جب مالک اِس صوفیانہ طریقے پر اپنی بریت کا پہلو ڈھونڈ نکالتا تو دوسرے اس کی پیروی کرنے لگتے اور "من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو" کے مصداق ایک دُوسرے کی اچھائیاں گنوانے لگتے۔ حساب کتاب سے فارغ ہو چکتے تو وہ اِس اہم کام سے تھک تھکا کر پسینے میں شرابور قہوہ خانے کی راہ لیتے اور مالک کو بھی ساتھ چلنے کے لیے کہتے کہ آؤ تمھیں چائے پلائیں۔

میرے ذِمّے یہ کام تھا کہ میں اِن لوگوں پر گہری نظر رکھوں تاکہ واپسی کے وقت وہ کیلیں، اینٹیں یا لکڑی کے تختے وغیرہ چُرا کر اپنے ساتھ نہ لے جائیں۔ ان میں سے تقریباً ہر شخص میرے مالک کے پاس کام کرنے کے علاوہ خود بھی کوئی چھوٹا موٹا ٹھیکہ لے لیا کرتا تھا۔ تاکہ خالی وقت میں کچھ مزید رقم پیدا کر سکے۔ اِس لیے اُنھیں ضرورت ہوتی کہ وہ میری آنکھوں میں خاک ڈال کر اپنے ہاتھ رنگ لیں۔ وہ مجھے پرچانے کے لیئے بڑی آؤ بھگت کرتے اور ایک روز تو شٹشلین کہنے لگا۔

"تمھیں یاد ہے۔ ایک بار میری ٹکڑی میں شامل ہونے کے لیے تُم نے کیسی خواہش ظاہر کی تھی۔ اور اب یہ حال ہے کہ ہر وقت میری چوکسی کرتے رہتے ہو۔"

"ہاں جی ہاں" راج نے مذاق اُڑاتے ہوئے کہا۔ "ہوا کے

جھونکوں کی رکھوالی کیے جاؤ وہ کہیں جانے نہ پائیں۔ اور بس خدا پر بھروسہ رکھو۔ تمھاری محنت بے کار نہیں جائے گی"۔

مستری بولا۔ اور اِس وقت اُس کے لہجے میں بغض و عداوت کا رنگ جھلک رہا تھا۔

"کیا خوب! چوٹے بلّی جلیبیوں کی رکھوالی"۔

بہت سخت کام میرے سپرد کیا گیا تھا اور مجھے ڈر تھا کہ اس آزمایش میں پورا نہ اُتر سکوں گا۔ میں اِن لوگوں کی موجودگی میں عجیب خفّت سی محسوس کرتا۔ میں اچھّی طرح جانتا تھا کہ وہ لوگ بڑے عیّار اور ہتھکنڈے باز ہیں۔ اور ایسے داؤ پیچ جانتے ہیں جو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتے۔ پھر بھی مجھے اُن کی دیکھ بھال کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ کچھ عرصے وہ ذمّہ داری میرے لیے وبالِ جان بنی رہی۔ لیکن جلد ہی راج نے تاڑ لیا کہ میں خود اُس سے اُکتا رہا ہوں۔ اِس لیے ایک روز علیحدگی میں لے جاکر مجھے سمجھانے لگا۔

"دیکھو میاں صاحب زادے۔ اِس طرح کھنچے رہنے سے کوئی فایدہ نہیں۔ خود تمھیں کو نقصان پہنچے گا اچھّی طرح سوچ سمجھ لو"۔

اس میں شک نہیں کہ میں اِس حقیقت سے ناواقف تھا۔ لیکن یہ جانتا تھا کہ وہ میری اس بیچارگی کو اچھّی طرح محسوس کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد ہم دونوں میں باہمی سمجھوتے کی صورت پیدا ہو گئی۔ وہ سب کی نظروں سے بچ بچا کر مجھے علیحدگی میں لے گیا۔ اور رازدارانہ طور پر کہنے لگا۔

"اگر تم ٹھیک معلوم کرنا چاہتے ہو تو میں بتائے دیتا ہوں کہ وہ شخص جو اینٹیں اُٹھا اُٹھا کر راج کو دیتا ہے ہم لوگوں میں سب سے زیادہ بد معاش ہے۔ اس کا کنبہ بہت بڑا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ وہ لالچی بھی ہے۔ کیلوں کی پوڑیا سے لے کر سیمنٹ کی بوری تک جو کچھ بھی اُس کے ہاتھ لگے اُڑا کرلے جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آدمی معقول ہے، خدا سے ڈرتا ہے، خیالات بُرے نہیں اور کچھ تعلیم یافتہ بھی ہے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ چوری کا لپکا ہے۔ اس حرکت سے کسی طرح باز نہیں رہتا۔ سنگ تراش صاحب کی طبیعت میں نسائیت پائی جاتی ہے۔ وہ ضرورت سے زیادہ امن پسند ہے۔ اور جہاں تک تمھاری ذمّے داری کا تعلق ہے اُس کی ذات سے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن ہے وہ بھی بہت چالاک کانڑے کی طرح کبڑے میں بھی ایک رگ زیادہ ہوتی ہے۔ رہا ششلین وہ نہ تو کسی کی چیز ہتھیاتا ہے۔ اور نہ اپنی چیز قبضے سے جانے دیتا ہے۔ وہ لالچی بھی نہیں ہے۔ دوسرے اُسے بے وقوف بنا سکتے ہیں لیکن وہ خود کسی کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ کیونکہ وہ اپنی عقل سے کام لینا نہیں جانتا۔"

"اس کے یہ معنی ہوئے کہ وہ بہت نیک آدمی ہے۔"

اوسپ نے نظر اُٹھا کر میری طرف اس طرح دیکھا گویا میں بہت دُور فاصلے پر کھڑا ہوں۔ پھر جو کچھ کہا۔ وہ مجھے مرتے دم تک یاد رہے گا۔

یہ سچ ہے کہ وہ نیک ہے۔ لیکن نیک ہونا صرف کاہل لوگوں کا

شیوہ ہی۔ سمجھے میاں صاحب زادے! جو شخص نیک بننا چاہے اُس کے لیے ضروری ہی کہ وہ اپنی عقل سے کام لینا چھوڑ دے۔"

"اچھا سب کی تعریف کر چکے۔ ذرا اپنی تعریف بھی تو کرو۔"

یہ سُن کر وہ ہنس پڑا اور پھر بولا۔

میری بابت کیا پوچھتے ہو۔ میں فی الحال ایک نوجوان چھوکری کی طرح ہوں۔ جب عُمر کی منزلیں طے کر کے نانی اماں بن جاؤں اُس وقت یہ سوال کرنا۔ پھر میں جواب دیتا اچھا معلوم ہو سکوں گا اس اثنا میں تم دماغ پر زور ڈال کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے رہو کہ وہ چیز جسے دُنیا کا ہر شخص "میں" کہتا ہی درحقیقت کیا ہی۔ اور انسان کے جسم میں کس جگہ چھپی ہی۔ اگر تم اس حقیقت کو جان گئے تو سمجھ لو کہ بہت بڑا کام کر لیا۔"

اس گفتگو سے وہ تمام قیاسات جو میں نے اُس کے اور اُس کے دوستوں کے متعلق قائم کیے تھے بالکل بدل گئے۔

اس کے بیان کی صداقت پر شبہہ کرنا میرے لیے دُشوار تھا مجھے معلوم تھا چند کاریگر اور مستری اس بڈھے اوسپ کی قدر کرتے اور فہم و فراست میں سب سے بڑھا ہوا مانتے تھے۔ جب کسی معاملے میں کوئی پیچیدگی پیدا ہو جاتی تو اسی سے مشورہ طلب کرتے۔ اور وہ جو کچھ ہدایت کرتا اُس کے مطابق عمل کرتے۔

"براہِ کرم اپنے مفید مشورے سے ہمیں سرفراز کیجیے۔" وہ اپنی مصیبت بیان کر کے بڑی عاجزی سے درخواست کرتے لیکن موقع گزر جانے کے بعد اوسپ وہاں موجود نہ ہوتا تو

راج گریگوری سے کہتا۔

"ملحد ہی ملحد!"

اور گریگوری زبردست قہقہہ لگا کر اپنا خیال پیش کرتا۔

"تم اِس بُڈھے کھوسٹ سے اپنا پیچھا چھڑا لو۔ ورنہ پچھتاؤگے تمھیں بہت احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ ورنہ ایک وقت آئے گا کہ تم اُس کی انگلی کے اشارے پر ناچوگے۔ وہ بہت خبیث آدمی ہی خُدا اُس کی شرارتوں سے محفوظ رکھے"

"کِس قسم کی شرارتیں؟"

"یہ میں نہیں بتا سکتا" مستری نے مُنہ پھیر کر جواب دیا۔

میں اُس کی گفتگو کا سر پیر کچھُ نہ سمجھ سکا۔ میرا خیال تھا کہ کہ پیٹر اِن میں سب سے زیادہ دیانت دار اور نیک طینت ہی۔ وہ لمبی چوڑی گفتگو کرنے کا عادی نہیں تھا۔ وہ چند لفظوں میں بڑے پتے کی بات کہہ دیتا تھا۔ اُس کی باتیں زیادہ تر خدا رسُول جنّت دوزخ اور موت وزندگی کے اسرار اور رمُوز سے متعلّق ہوتی تھیں۔

"ارے میرے بچّو! میرے بھائیو۔ آخر تمھیں کیا ہوگیا ہی۔ تم عذاب الٰہی سے کیوں نہیں ڈرتے۔ تمھیں ایک نہ ایک دن مر کر قبر کے آغوش میں چلا جانا ہی۔ یاد رکھو بے دین کافروں کو نجات کبھی نہیں مل سکتی"

وہ پیٹ کے درد کا دائمی مریض تھا۔ ہفتے میں ایک دن ضرور آتا جبکہ اُسے فاقہ کرنا پڑتا۔ اگر وہ ذرا بے پروائی سے

کام رے کر ایک لقمہ بھی کھا لیتا تو تکلیف اتنی بڑھ جاتی کہ شدید دورے پڑنے لگتے اور اس کا مرض خوفناک صورت اختیار کر لیتا۔

کبڑے میاں بھی بظاہر بہت نیک اور دیانت دار معلوم ہوتے لیکن تھے عجیب و غریب انسان۔ کبھی کبھی وہ ذرا مزے میں آکر ایسی حماقتیں کرنے لگتے کہ اُن پر پاگل پنے کا گمان ہونے لگتا۔ وہ بیک وقت کئی کئی مختلف عورتوں سے بے تحاشا محبّت کرنے کے عادی تھے۔ اور لُطف یہ کہ ہر عورت کے متعلق اُن کی ایک ہی رائے ہوتی تھی۔

میں تمھیں یقین دلاتا ہوں وہ عورت نہیں ہے بلکہ پھول ہے۔ سُندر اور کومل۔ اور.... اور....“

جب بازار کی رہنے والی چلبلی مزدورنیں دُکانوں کے فرش دھونے کے لیے آتیں تو کبڑے میاں فوراً اوپر کی منزل سے اُتر کر نیچے آجاتے اور کہیں کونے کھدرے میں کھڑے ہو کر اپنی آنکھیں مٹکانے لگتے۔ خوشی کے مارے اُن کی باچھیں کِھل کر کانوں کی لو تک جا پہنچتیں اور وہ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ گنگنانے لگتے۔

”خدا کی قسم کیسی حسین تیتری میرے نصیب کی بھیجی گئی ہے۔ بس تعریف نہیں کی جا سکتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانی مسرّتوں کا چشمہ پھوٹ نکلا ہے۔ عورت کیا ہے بس پھول ہے۔ کومل اور سُندر۔ اِس بھاگوان گھڑی کو بہت غنیمت سمجھنا چاہیئے کہ یہ نعمت مجھے میسّر آگئی۔ ایسی حسین تیتریوں کا تصوّر میری رگوں میں نئے

جیون کی ایک گرم لہر دوڑا دینے کے لیے کافی ہے۔"

وہ عورتیں اُسے دیکھکر قہقہے لگاتیں اور آپس میں ایک دوسرے سے کہتیں۔

"ذرا سُنو تو، کبڑے میاں کیا بکواس فرمارہے ہیں۔ خُدا اُن کے حال پر رحم کرے۔"

سنگ ساز بھی کچھ کم مضحکہ خیز نہیں تھا۔ اُس کے چہرے کی اُبھری ہوئی نکیلی ہڈیوں پر ہر وقت غنودگی سی چھائی رہتی تھی اور جب وہ بات کرتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی خبطی بڑ ہانک رہا ہے۔ اُس کے چٹپٹے جملے خوابِ مدہوشی کی سی کیفیت پیدا کردیتے۔ جن سے وہ عورتیں اثر لیے بغیر نہ رہ سکیتں۔ حتّٰی کہ ان میں سے کوئی ایک اپنی سہیلی کو ٹہوکا دے کر تعجّب سے کہتی۔

"ذرا سُنو تو یہ شخص کس بُری طرح اَلاپ رہا ہے۔ یوُں تو اچّھا خاصا مردِ معقول دکھائی دیتا ہے۔"

"ہاں یہ بالکل پرندے کی مانند گاتا ہے۔"

"یا اُس فقیر کی طرح جو گرجے کے دروازے پر صدا لگاتا ہے۔" ایک ضدّی طبیعت کی لڑکی نے کہا جو اپنی بات کے آگے کسی کی نہیں چلنے دیتی تھی۔

لیکن یہ غلط ہے۔ سنگ ساز کو فقیر سے کوئی مشابہت نہیں تھی وہ بڑی آن بان کے ساتھ اکڑ کر چلنے کا عادی تھا۔ اُس کی آواز گونجتی ہوئی نکلتی۔ اور سُننے والوں پر ایک کیفِ بے خوُدی طاری کردیتی۔ تمام عورتیں اُس کے گیت سُننے کے لیے ہمہ تن گوش

ہو جاتیں۔ در اصل ایسا معلوم ہوتا کہ اُس کی آواز بلکہ اُس کی ساری ہستی شراب کی نشیلی موجوں میں بہتی چلی جا رہی ہے۔

اُس کی تان اُس وقت ٹوٹتی جب وہ شام کے کھانے پر اپنے یاروں کے ساتھ مل کر بیٹھتا یا چھٹی کا دن کہیں عیش و نشاط میں گزار کر آتا۔ وہ اپنی مُنڈیا مٹکا مٹکا کر اس طرح گفتگو کرتا کہ لوگ حیرت میں رہ جاتے۔

تُم کیا جانو وہ کتنی دلنواز عورت ہے۔ بس کلیجے کی ٹھنڈک ہے۔ میں نے اس شان کی دوسری ہستی کبھی نہیں دیکھی"

دوسرے لوگوں کی طرح ایفی مؤشکا عورتوں پر اپنی فتوحات کا ذکر کرتے وقت شیخی نہ بھگارتا۔ اور نہ اِن بیکس ہستیوں کا مذاق اُڑاتا۔ جن کا دِل اپنی جادو بیانیوں سے موہ لیتا تھا۔ بلکہ سیدھے سبھاؤ اصل واقعات بیان کر دیتا۔ اور خوشی سے پھولا نہ سماتا۔ اُس کی آنکھیں اِس طرح کھلی کی کھلی رہ جاتیں گویا اپنی کامیابیوں پر خود اُسے تعجّب ہو رہا ہے۔

اوسپ گردن مٹکا کر کہتا۔

"کیوں میاں ابوالامراض صاحب! بھلا تمھاری عُمر کتنی ہو گی؟"

"یہی چالیس پینتالیس کے لگ بھگ ہو گی۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ آج ایسا محسوس ہوا گویا میں نے آبِ حیات کے دریا میں غوطہ لگا لیا اور میری سابقہ عُمر بقدر پانچ سال کم ہو گئی۔ جوانی کا خون میری رگوں میں دوڑ پڑا اور روئیں روئیں سے مسرّت وانبساط ٹپکنے لگی۔ تم نہیں جانتے بعض عورتوں کے حُسن کا جادو

عجیب و غریب کیفیات پیدا کر سکتا ہی۔ کیا سمجھے؟"

راج نے اُجڈ پنے سے جواب دیا۔

"تم پچاس کے پیٹے میں ہو۔ بندۂ خدا ذرا احتیاط سے کام لو۔ ورنہ تمھاری یہ بے راہ روی باقی ماندہ زندگی کو تلخ بنا دے گی"

"تمھیں شرم آنی چاہیے ایفی موشکا! یہ عمر اور یہ کرتوت!"

شُشلین نے ٹھنڈا سانس لے کر کہا اور میں نے محسوس کیا کہ وہ کبڑے کی عشق بازی پر حسد کرنے لگا ہی۔

اوسیپ نے بِل نظرے پن کے ساتھ ہم سب کی طرف دیکھا اور دل لگی کے طور پر کہا۔

"بات یہ ہی کہ ہر عورت اپنے خیالات کی دُنیا الگ بساتی ہی۔ کسی کو حلوے مانڈے کی چاہت ہوتی ہی تو کسی کو لاڈ پیار کی۔ لیکن ایک نہ ایک روز وہ لڑکی سے ماں اور ماں سے نانی یا دادی بن جاتی ہی"

شُشلین کی شادی ہو چکی تھی۔ لیکن اس کی بیوی گانو میں رہتی تھی۔ اس لیے وہ بھی ان مزدورنوں پر ڈورے ڈالتا تھا۔ ان تک رسائی حاصل کر لینا کوئی بڑی مشکل بات نہ تھی۔ وہ خود اپنی آمدنی بڑھانے کے لیے کوئی "سہارا" ڈھونڈتی تھیں۔ اُن کا خیال تھا کہ اس طرح دو چار رُپے بنا لینا کچھ زیادہ معیوب نہیں ہی۔ کیونکہ اس غُربت و افلاس کے تھکا دینے والے ماحول میں ہر فعلِ مذموم بھی جائز سمجھا جا سکتا تھا۔ صرف گریگوری نے کبھی کسی عورت کے ساتھ کوئی بُرا تعلق پیدا نہیں کیا۔ اُس کی عادت تھی کہ وہ دُور

کھڑا اُن کو عجیب انداز سے گھورتا رہتا تھا۔ گویا اُسے ترس آتا تھا۔ اُن کی مُردہ حالت پر یا اپنی بے بسی پر۔ لیکن جب لوگ اس سے کھلّی کرتے یا اُسے بناتے تو وہ شرمندگی کی ہنسی ہنس کر وہاں سے بھاگ نکلنا چاہتا۔

"ارے تم لوگ . . . !"

"ابے اُلّو! تجھے ہوا کیا ہے؟" ایفی موشکا متعجب ہو کر پوچھتا۔ "کیا تو ایسے اچھّے موقع کو ہاتھ سے گنوا دینا چاہتا ہے؟"

"بھیّا! میری شادی ہو چکی ہے۔" گریگوری یاد دہانی کے طور پر کہتا۔

"تو پھر کیا ہوا؟ - کیا تم سمجھتے ہو کہ بیوی کو اس عشق بازی کا پتا لگ جائے گا۔"

"اس میں کیا شک ہے۔ اگر میں نفس پرستی کرنے لگوں تو میری بیوی کو فوراً پتا لگ جائے۔ عورت کو دھوکا دینا بہت مشکل ہے میرے بھائی!"

"آخر وہ کس طرح پتا لگائے گی؟"

"یہ میں نہیں جانتا۔ تاہم مجھے اِس بات کا یقین ہے کہ جب تک میری بیوی خود باعصمت ہے وہ میری تردامنی کا پتہ لگا سکتی ہے۔ بصورتِ دیگر، اگر میں پاکباز رہوں اور وہ بدکار ہو جائے تو فوراً مجھے معلوم ہو جائے گا۔"

"لیکن کِس طرح؟" ایفی موشکا نے دانت پیس کر پوچھا۔ اور گریگوری نے بہت سادگی سے جواب دیا۔

"یہ خود ییش بھی نہیں جانتا"

سنگ ساز گھونسہ تان کر کسی قدر سختی سے بولا۔

"ذرا آپ کی منطق ملاحظہ ہو۔ بڑے پاک باطن اور جانتے بوجھتے کچھ بھی نہیں۔ گویا اُن کے دماغ میں گوبر بھرا ہوا ہے"

شتشلین کے ماتحت سات مزدور کام کرتے تھے۔ لیکن سب کے سب اُس کے ساتھ اس طرح پیش آتے گویا وہ خود بھی انہیں کی طرح ایک مزدور ہے۔ وہ اُس کی امتیازی شان کو خاطر میں نہ لاتے اور پیٹھ پیچھے اُسے "بھیا کا باپ" کہہ کر پکارتے۔

جب وہ آکر دیکھتا کہ سب کے سب ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں تو وہ خود کدال یا پھاوڑا اُٹھا کر کام پر جٹ جاتا۔ اور انہیں پھسلاتے ہوئے عجیب انداز سے کہتا۔

"آؤ میرے بچو آؤ۔ اب کام پر لگ جاؤ۔ زیادہ وقت ضائع نہیں کرتے"

ایک روز اپنی ذمّے داریوں کو محسوس کرتے ہوئے ییش نے گریگوری سے کہا۔

"تمھارے یہ قلی بچّے بہت ہی نالایق ہیں"

یہ سُن کر وہ گھبرا سا گیا۔

"کیوں۔ خیر تو ہے۔ کیا ہوا؟"

"یہ کام کل تک ختم ہو جانا چاہیئے تھا اور مجھے آج بھی پورا ہوتا دکھائی نہیں دیتا"

"ہاں یہ ٹھیک ہے اب اُن کے ساتھ رعایت نہیں ہو سکتی"

اُس نے میری بات کو مان لیا۔ لیکن کچھ دیر خاموش رہ کر بہ تقاضائے مصلحت خود ہی بولا۔ بے شک! مجھے یہ حق حاصل ہی کہ جب چاہوں اُنھیں موقوف کردوں۔ لیکن سوچنے کی بات ہی۔ یہ سب کے سب میرے گانو کے رہنے والے اور میرے واقفکار ہیں۔ دوسری بات یہ کہ حکمِ الٰہی کے بموجب انسان کو اپنی پیشانی کا پسینہ بہا کر روزی کمانی چاہیئے۔ وہ حکم سب کے لیے برابر ہی۔ ہم دونوں بھی اِس زمرے میں شامل ہیں۔ لیکن ذرا سوچو۔ میرا اور تمھارا کام اُن کی محنت و مشقّت کے مقابلے میں کس قدر آسان اور ہلکا ہی۔ اور ایسی صورت میں اُن پر کسی قسم کی سختی روا رکھنا زیادتی نہیں تو کیا ہی؟"

وہ خوابوں کی دُنیا میں رہنے کا عادی تھا۔ کبھی کبھی ویران و سُنسان سڑکوں کو طے کر کے بہت دور ندی کے کسی پُل پر پہنچ جاتا اور کٹہرے کے قریب کھڑے ہو کر گھنٹوں پانی کی روانی اور آسمان کے عکس کو دیکھتا رہتا۔ یا قرب و جوار کے قدرتی مناظر کا جائزہ لیا کرتا۔ اِس محویت کے عالم میں اگر کوئی اُس کے قریب پہنچ کر پوچھ بیٹھتا کہ "تم اِس تنہائی میں کیا کر رہے ہو؟" تو وہ ایک دم چونک پڑتا اور پھر مُسکرا کر کھوئی ہوئی حالت میں کہتا "کچھ نہیں۔ یوں ہی آ کر کھڑا ہو گیا۔ اِدھر اُدھر نظر ڈال رہا تھا"

"قدرت کا نظام بہت خوب ہی" وہ عموماً کہا کرتا تھا۔ "یہ آسمان، یہ زمین، یہ بہتے ہوئے دریا اور ان کے سینے پر چلتے

ہوئے جہاز۔ تم کشتی میں بیٹھ کر جہاں چاہو چلے جاؤ۔ ایک شہر سے دوسرے شہر تک کسی قسم کی دقت نہیں ہو گی۔ مجھے یاد ہی ایک بار میں ریازان گیا تھا۔ اچھا خاصا مختصر سا شہر ہی۔ لیکن فضا میں اُداسی چھائی رہتی ہی۔ بجنی سے بھی زیادہ۔ اس کے مقابلے میں نجنی پھر غنیمت ہی۔ زندگی کی تھوڑی بہت چہل پہل نظر آجاتی ہی اور استرخان اس سے بھی گیا گزرا ہی۔ بھانت بھانت کے آدمی رہتے ہیں ہر قوم و ملت کے۔ کوئی ایرانی ہی تو کوئی تورانی۔ کوئی جرمن ہی تو کوئی فرانسیسی۔ مجھے ان سب سے نفرت ہی۔ ایک آن نہیں بھاتے۔"

وہ آہستہ آہستہ گفتگو کرتا۔ اور ایسا معلوم ہوتا کہ اُس کے الفاظ کسی کی ہمدردانہ تائید کے متمنّی ہیں۔ پیٹر کے سوا کوئی بھی اُس کی ہاں میں ہاں نہ ملاتا۔

"وہ کسی ملک کے باشندے نہیں بلکہ خانہ بدوش ہیں۔" پیٹر خود بھی برہمی کا اظہار کرتے ہوئے کہتا۔ "وہ حضرت عیسیٰ کے مبعوث ہونے سے قبل اس دُنیا میں پیدا ہوئے اور اُن کے دوبارہ نازل ہونے سے پہلے غارت ہو جائیں گے۔"

گریگوری کی جان میں جان آجاتی۔ وہ پورے جوش و خروش کے ساتھ کہتا۔

"ٹھیک ہی۔ بالکل ٹھیک ہی۔ اسی لیے مجھے رُوسی قوم سے اُلفت ہی کہ وہ بالکل خالص ہی۔ اس میں کسی کا میل نہیں ہی۔ حقیقتاً مجھے یہودی بھی پسند نہیں ہیں۔ اور اکثر متعجب ہوتا ہوں

کہ اُنھیں خُدا کی مخلوق کس طرح کہا جاتا ہے۔ بس اِس میں شک نہیں کہ ان کا نظام اچھا ہے۔"

سنگ ساز کسی قدر مبہم الفاظ میں کہتا۔

"کیا خاک اچھا ہے۔ سینکڑوں فضول اور بے تکی باتیں بھری پڑی ہیں۔"

اوسپ خاموش بیٹھا سب کی سُنتا رہتا۔ اور آخر میں جلی کٹی باتوں سے اُن کو رگڑ ڈالتا۔

"فضول اور بے تُکی باتیں! بے شک تمھاری گفتگو کی سب سے نُمایاں خصوصیت یہی ہے۔ ہر وقت بکواس کیے جاتے ہو۔ کبھی ڈھنگ کی بات نہیں کرتے۔ جی چاہتا ہے کہ تُم سب کو اُدھیڑ کر رکھ دیا جائے تب ہی ٹھیک ہو سکتے ہو۔

اوسپ بہت لیے دیے رہتا اور اپنے من کا بھید کسی کو نہ دیتا۔ اِس لیے وقت سے پہلے یہ صلاح کر لینا قطعی غیر ممکن تھا کہ وہ کس کی تائید کرے گا اور کس کی تردید۔ عموماً ایسا ہوتا کہ وہ اپنی رائے کے سامنے کسی کی نہ چلنے دیتا اور بہت جلد دوسروں کی گفتگو سے اُکتا کر اپنا خیال پیش کرنے لگتا۔ ان میں سے دو تین کا وہ خاص طور پر مذاق اُڑاتا اور بُرا بھلا تک کہہ ڈالتا تھا۔

وہ سب ہنستے۔ لیکن اُن کی ہنسی نہ تو دلی جذبات کا آئینہ ہوتی اور نہ حقیقی مسرّت کا مظہر۔ پھر بھی وہ ہنستے ضرور تھے۔ میرا مالک مجھے کھانے پینے کے لیے پانچ آنے روز دیتا تھا۔

ظاہر ہے کہ یہ رقم ناکافی تھی ۔ اور میں بھوکا رہ جاتا تھا ۔ اس صورتِ حال کو مدِ نظر رکھ کر مزدور لوگ مجھے ناشتے اور رات کے کھانے کے وقت بلا بھیجتے یا کوئی ٹھیکیدار چائے پلانے کے لیے مجھے گھسیٹ کر قہوہ خانے لے جاتا ۔ میں بڑی خوشی سے ان سب کی دعوت قبول کر لیتا ۔ کیونکہ اس کے سوا کوئی چارۂ کار بھی نہیں تھا ۔ اس کے علاوہ مجھے اُن کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے اور اُن کی دلچسپ گفتگو اور عجیب و غریب کہانیاں سُننے میں بڑا مزا آتا تھا ۔ میں بھی اپنا حق ادا کرنے کے لیے مذہبی کتابوں کے اخلاقی قصّے سُنا سُنا کر انھیں خوش کر دیتا تھا ۔

"تم کتابوں کے اِس قدر پیچھے پڑے کہ آخر کار اُن سے جی بھر گیا ۔ تمھارے سَر میں بھیجے کی بجائے اب کتابیں ٹھنسی ہوئی ہیں " اوسیپ اپنی نیلی نیلی آنکھیں جما کر مجھے گھورتا ۔ ان نگاہوں کی خاموش گفتگو کو سمجھنا بہت دشوار تھا ۔ اُس کی پتلیاں ایسا معلوم ہوتا کہ آنکھوں میں تیرتے تیرتے رقیق ہو جائیں گی ۔

"بہتر یہ ہے کہ اب بھی تھوڑا بہت مطالعہ کرتے رہا کرو ۔ بڑے ہو کر واعظ بن جانا اور پند و نصیحت سے لوگوں کا غم غلط کرنا ۔ اِس طرح تم "مالدار" کہلاؤ گے "

" مالدار نہیں ایماندار " راج نے گویا غلط لفظ کی درستی کر دی اس وقت اُس کے لہجے میں نہ جانے کیوں زبردست سوز پنہاں تھا ۔

"جی ۔ کیا کہا ؟ " اوسپ نے فوراً دریافت کیا ۔

"میں نے کہا۔ تمھارا مطلب "ایماندار" سے ہی نا۔ آخر تم سُنتے کیوں نہیں؟ کیا بہرے ہو گئے ہو؟"

"ہاں ٹھیک ہی۔ ایماندار بھی کہہ سکتے ہیں۔ خیر اس کے بعد تم کافروں سے خوب مُباحثے کیا کرنا۔ زندہ رہنے کا حق تو اُن لوگوں کو بھی حاصل ہی جو کافر کہلاتے ہیں۔ اگر انسان سمجھ بوجھ سے کام لے تو کافروں کے ساتھ مل جُل کر بھی زندگی بسر کر سکتا ہی۔"

گریگوری کو بوکھلاہٹ میں کچھ اور نہ سُوجھا تو بے اختیار ہنس پڑا اور پیٹر اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

"جادوگر ہی کونسی مصیبت کی زندگی گزارتے ہیں۔ اور اُن لوگوں کو دیکھ لو جو خُدا کو نہیں مانتے۔ وہ بھی مزے کرتے ہیں۔"

لیکن اوسپ نے فوراً پلٹ کر جواب دیا۔

"جادوگر تعلیم یافتہ نہیں ہوتے۔ تعلیم عموماً کسی جادوگر کی میراث نہیں ہوتی۔

اور اُس نے مجھے بتایا۔

"اچھا ذرا غور سے سُنو۔ ہمارے ضلع میں ایک زمیندار رہتا تھا جس کا نام توشیک تھا۔ وہ بہت ہی پتلا دُبلا اور بالکل ناکارہ شخص تھا۔ اِس کی زندگی قدرت کے رحم و کرم پر منحصر تھی۔ ایک روز اس نے سوچا کہ لاؤ خالی بیٹھنے سے بے گار بھلی ہی۔ کچھ دیر یادِ الٰہی کر لیا کریں۔ اور تقریباً دو سال کی آوارہ گردی کے بعد وہ نئے رُوپ میں جلوہ گر ہُوا۔ اُس کی لمبی لمبی زلفیں شانوں پر چھٹکی ہوئی

تھیں اور سر پر کنٹوپ منڈھا ہوا تھا۔ اس نے ایک خشمناک نظر ہم سب پر ڈالی اور دؤبدؤ ہو کر کہنے لگا" ارے نابکارو! توبہ واستغفار کرو" اور اس میں شک نہیں کہ انسان کو ہر وقت توبہ کرتے رہنا چاہیئے۔ خصوُصاً عورتوں کے لیے بہت ضرُوری ہی۔ اِس کے بعد توشیک نے ضرُورت سے زیادہ کھانا پینا اور عورتوں کے ساتھ کھل کھیلنا شرُوع کر دیا اور....."

راج نے برہم ہو کر بیچ میں بات کاٹ دی۔

"بھلا ان باتوں کا اصلِ موضوع سے کیا تعلق ہو سکتا ہی۔ وہ کتنا ہی کھائے پیے، ہمیں اِس سے کیا واسطہ"

"تو پھر اور کس چیز سے واسطہ ہی؟"

"ہمیں یہ دیکھنا ہی کہ اِس کے اقوال کس حد تک لایقِ وقعت تھے"

"میں نے اس کے اقوال پر بالکل توجہ نہیں دی۔ میرے پاس اپنے اقوال کی کیا کمی ہی جو میں اُس کی باتوں پر کان دھرتا"

"اچھا خیر۔ اس بے معنی بحث کو چھوڑو۔ اب تک جو کچھ سُنا وہی بہت کافی ہی" بیٹر ناراض ہو کر بولا۔ گریگوری نے کچھ نہیں کہا البتہ اظہارِ ناراضگی کے طور پر اپنی گردن جھکالی۔

"میں بحث تو نہیں کر رہا" اوسپ نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا "میرا خیال تھا کہ میکسی میچ کو روزی کمانے کے مختلف راستے سمجھا دوں"

"لیکن اِن راستوں کے علاوہ ایسی راہیں بھی ہیں جو انسان کو

جیل خانے تک پہنچا دیتی ہیں۔"

"ہاں - کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے۔" اوسپ نے تسلیم کیا۔ "لیکن ہر قسم کے راستوں پر پادریوں سے ملاقات ہو جاتی ہے اور وہ بتا دیتے ہیں کہ چوراہے پر پہنچ کر کس طرف مڑنا چاہیے۔"

اُس کی عادت تھی کہ وہ کم سخن لوگوں کا ہمیشہ مذاق اڑاتا تھا - وہ اُن سے بات کرنے کا بھی روادار نہیں تھا - لیکن یہ حقیقت کسی پر ظاہر ہونے نہیں دیتا تھا - وہ اپنے ظاہری برتاؤ سے لوگوں کو مغالطے میں ڈال دیتا تھا -

اس کی سب سے زیادہ "نظرِ عنایت" ایفی موشکا پر رہتی تھی جب کبھی مذہبیات پر گفتگو چھڑ جاتی یا زندگی کے مصائب و آلام موضوعِ بحث بنتے تو سنگ ساز کسی قسم کا حصّہ نہ لیتا - وہ ایسی باتوں سے دور بھاگتا تھا - وہ کھانے کی میز پر بیٹھتے وقت اپنی کرسی کو کھسکا کر دیوار کے رُخ اِس طرح کر لیتا کہ لوگوں کو اس کی کبڑی پیٹھ نظر نہ آسکتی تھی - وہ خاموش بیٹھا چائے کے گلاس بھر بھر کر پیے جاتا - پھر یکایک چونک کر کمرے کی دھنویں دار فضا پر ایک نظر ڈالتا اور اُن آوازوں کو سُننے کی کوشش کرتا جو مختلف لوگوں کے بیک وقت بولنے سے پیدا ہوتی تھی - کبھی کبھی وہ سب کی نظر بچا کر چپکے سے کھسک جاتا - سمجھنے والے سمجھ جاتے کہ قہوہ خانے میں کوئی ایسا شخص آگیا ہے جس سے سنگ ساز نے روپیہ قرض لے رکھا ہے - اِس غریب کے درجنوں قرض خواہ تھے - جن کی شکل دیکھتے ہی اُس کی روح فنا ہو جاتی تھی -

"یہ ستیاناسی خواہ مخواہ مجھ پر برہم ہوتے ہیں"، وہ دوسروں کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے کہتا۔ "ان کو خود سمجھ لینا چاہیئے کہ اگر میرے پاس رُپے ہوتے تو میں تقاضے کے بغیر ان کا حساب چکتا کر دیتا"۔

"آہ! یہ کمبخت مُفلسی کسی طرح دُور نہیں ہوتی"، اوسپ اس کا ہم نوا بن جاتا۔

بعض دفعہ وہ اپنے خیالات میں بالکل محو ہو جاتا۔ نہ کسی کی بات سُنتا نہ کسی طرف دیکھتا اس وقت اُس کے کلّوں کے گڑھے زیادہ گہرے ہو جاتے اور آنکھوں کا حسُن پہلے کی بہ نسبت حسین تر معلوم ہونے لگتا۔

"کیوں بھئی! کیا سوچ رہے ہو"، لوگ اُسے جھنجھوڑ کر پوُچھتے

"میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر مجھے بہت سی دولت مل جائے تو خدُا کی قسم کسی شریف زادی سے شادی کر لوں۔ ایک ایسی عورت سے جو حقیقی معنوں میں خاتوُن کہلا سکتی ہو۔ مثلاً کسی سردار کی بیٹی سے۔ اور میں اُس سے ایسی محبّت کروں کہ بس خدُا کی قسم کچھُ نہ پوُچھو۔ میرے سینے میں آتشِ عشق بھڑک اُٹھے گی۔ کیونکہ بات یہ ہی بھیّا کہ ایک بار میں نے ایک سردار کے مکان میں چھت ڈالنے کا ٹھیکہ لیا——"

"اور اس کی ایک بیوہ لڑکی تھی"۔ پیٹر نے بات کاٹ کر روُکھے پن سے کہا۔ "ارے میاں! رہنے دو۔ یہ قصّہ ہم کئی بار سُن چکے ہیں"۔ لیکن ایفی موشکا نے سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے اُس کی پرواہ

نہ کی اور اپنی بات جاری رکھی۔

"کبھی کبھی وہ باغ میں ٹہلنے چلی جاتی، سفید کپڑوں میں ملبوس، بڑی شانِ دلربائی کے ساتھ۔ میں چھت پر سے اُچک کر اُس کی طرف دیکھتا۔ اور میں بیان نہیں کر سکتا کہ اس وقت سورج کی شعاعیں کیسا غضب ڈھاتی تھیں۔ وہ سفید لباس کے ساتھ مل کر ایسی معلوم ہوتیں گویا نور کے سانچے میں ڈھلی جا رہی ہیں۔ یا وہ آسمان کی پری ہے جس کو شعاعوں نے اپنے کندھوں پر اُٹھا رکھا ہے، اس کی اُٹھتی جوانی تھی۔ اس کو اپنے آغوش میں لے لینے کے بعد ایک انسان صرف یہی آرزو کر سکتا تھا کہ سورج کبھی نہ نکلے۔ رات اتنی طویل ہو جائے کہ صبح نمودار ہونے کا نام نہ لے

"اور کیوں جی پیٹ بھرنے کا انتظام کس طرح کرتے؟" پیٹر ترش روئی سے اعتراض کرتا۔

"خدا کی پناہ!" وہ چلا کر کہتا "اس کے بعد بھی روپے پیسے کی کمی رہ جاتی۔ کہہ تو چکا ہوں کہ وہ حسین ہونے کے علاوہ بہت مالدار بھی تھی"

اوسپ کھل کھلا کر ہنس پڑتا۔

"کیوں میاں مجنوں کے سالے! تمھاری یہ آوارگی اپنا رنگ جمانا کب سے شروع کرے گی؟"

ایفی موشکا ہوا عورتوں کے اور کسی موضوع پر گفتگو نہیں کرتا تھا۔ اس کا کام بھی بھروسے کے لایق نہیں تھا۔ کبھی وہ دل لگا کر بڑی محنت سے سب کام ٹھیک ٹھیک کرتا اور کبھی جان

بوجھ کر ستیاناس کر دیتا۔ وہ پتھر کی سلوں کو ملاتے وقت ایسی بے پروائی برتتا کہ بیچ میں جھریاں باقی رہ جاتیں۔ اس کے پسینے کی بو کافی خوشگوار ہوتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تازہ کٹے ہوئے درخت کی لکڑی کہیں قریب ہی پڑی ہے۔

کسی دلچسپ موضوع پر گفتگو چھڑتی تو بڑھئی بہت شوق سے حصّہ لیتا۔ اس کی باتیں ہم لوگوں کو حیرت میں ڈال دیتیں۔ لیکن یہ بتانا مشکل ہوتا کہ وہ سنجیدگی سے کہہ رہا ہے یا مذاق سے۔ اُس کے برعکس گریگوری صرف مذہبی باتوں سے خوش ہوتا تھا۔ اور یہ ظاہر کرتا گویا خُدا اور رسول کے متعلق اس سے زیادہ کوئی نہیں جانتا۔ ایک روز میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا تم جانتے ہو کہ دُنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو خدا کو نہیں مانتے۔"

اس نے زیرِ لب مُسکرا کر پوچھا "تمھارا مطلب؟"

"ان کا خیال ہے کہ خُدا کوئی چیز نہیں ہے"

"اچھا۔ تمھارا یہ مطلب ہے — ہاں میں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں"

اور پھر بولنا شروع کر دیا "تمھیں حضرت داؤد کا قول یاد ہے۔ انھوں نے گمراہ لوگوں کی بابت کہا تھا کہ وہ لوگ جو خُدا کی ہستی سے انکار کرتے ہیں حد درجہ بے وقوف اور جاہل ہیں۔ اور اس میں کیا شک ایسی باتیں جاہلوں کے سوا کون کر سکتا ہے۔ لیکن ذرا سوچو خدا کے بغیر یہ دُنیا اور اس کی تمام کائنات قائم نہیں رہ سکتی"

شتشلین کے خوبصورت چہرے کی رنگت پلٹ گئی۔ وہ اپنی

ڈاڑھی کو اُن اُنگلیوں سے کھجانے لگا جن کے ناخنوں پر چونے کا رڈا جما ہوُا تھا۔ پھر مولویانہ انداز میں بولا۔

"گوشت پوست کے بنے ہوئے ہر انسان کا دل خدُا کا مسکن ہوتا ہے۔ ضمیر یا روُح کیا ہے؟ خدا کی وہ ودیعتِ خاص جو ہماری رہنمائی کرتی ہے"

"اور گناہ؟"

گناہ کا تعلّق صرف جسم سے ہے۔ اور شیطان اس کا ذمّے دار ہوتا ہے۔ چیچک کے بدنُما داغوں کی طرح گناہ بھی ایک بیرونی چیز ہے اس سے زیادہ کچھُ نہیں۔ میرا خیال ہے کہ گناہ کا خیال بھی دل میں نہیں لانا چاہیئے کیونکہ اس کے بعد گناہ سے بچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ تُم گناہ کا تصوّر دل سے نکال دو، گناہ سے بچے رہو گے۔ برُے خیالات صرف شیطان کی طرف سے ہوتے ہیں جو ہمارے نفس پر حاوی ہوتا ہے اور ہم کو ور غلاتا رہتا ہے۔

راج اپنا شبہہ ظاہر کرتا۔

"غالباً تم غلط کہہ رہے ہو"

"ہر گز نہیں۔ خدُا کی ذات گناہوں سے پاک ہے۔ اور اُس نے انسان کو اپنی ظاہری شکل و صورت اور باطنی خصلت کے مطابق پیدا کیا ہے۔ خدا کی ظاہری شکل و صوُرت یعنی گوشت کا پتلا گناہ کرتا ہے اور باطنی خصلت جس کا دوُسرا نام روُح ہے گناہوں سے بچی رہتی ہے"

وہ اپنی اس کامیاب تقریر پر خوشی سے پھوُلا نہ سمایا۔ لیکن پیٹر نے غرُّا کر کہا۔

"بالکل غلط ہی"

"تمھارے کہنے کے مطابق"۔ اوسپ نے راج کو مخاطب کرکے کہا "اگر ایک شخص گناہ نہ کرے تو پھر اُسے توبہ کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہو سکتی۔ لیکن جو توبہ نہ کرے وہ گناہ سے کس طرح بچا رہ سکتا ہی؟"

"نہیں جو کچھ کہا بالکل ٹھیک ہی۔ بزرگوں کا قول ہی کہ شیطان کا خیال دل سے نکال دو اس کے بعد خدا کو یاد کرو نہ کرو، کوئی مضائقہ نہیں"

شستیلین شراب پینے کا زیادہ دھتی نہیں تھا۔ دو ہی گلاس اس کو بری طرح متوالا بنا دیتے تھے۔ اس کا چہرہ سرخ ہو جاتا۔ آنکھوں میں کھلنڈرا پن پیدا ہونے لگتا اور آواز راگ بن کر گلے سے نکلنے لگتی۔

" بھائیو! دُنیا کی ہر چیز خوب ہی۔ یہاں ہم رہتے ہیں۔ تھوڑا بہت کام کرتے ہیں اور بس گزارے کے مطابق کھانے کو مل جاتا ہی۔ اس سے زیادہ کیا چاہیئے، خُدا کا ہر حال میں شکر ہی"

وہ بے تاب ہو کر رونے لگتا۔ آنسو ٹپ ٹپ اُس کی گھنی ڈاڑھی پر گرنے لگتے اور ریشم کی مانند نرم بالوں میں اُلجھ کر جھوٹے موتیوں کی طرح چمکنے لگتے۔

زندگی کے متعلق اُس کا عجیب وغریب نظریہ اور وفورِ غم سے بے تاب ہو کر اُس کا رو پڑنا مجھے ایک افسانہ بنا تا تھا۔ میری نانی نے زندگی کی تعریف میں پورے وثوق کے ساتھ شاندار گیت

گائے تھے اور ہر قسم کی تکلیف برداشت کرتے رہنے کے باوجود زندگی اُن کی نگاہ میں اتنی دردناک اور بھیانک نہیں تھی۔

اس قسم کی تمام بحثیں مجھے ایک مستقل تذبذب میں مبتلا رکھتیں اور زندگی میری نگاہ میں بے کیف و بے رنگ ہو کر رہ جاتی۔ میں نے دیہاتیوں کی بابت بہت سی کتابیں پڑھی تھیں۔ میں دل ہی دل میں مقابلہ کر کے حیران رہ جاتا۔ کیونکہ اُن کی اصلِ زندگی کتابوں کے بیانات سے بالکل مختلف ہوتی تھی۔ کتابوں میں لکھا ہوتا تھا کہ وہ کبھی خوش نہیں رہتے اور نیک ہوں یا بد معاش اُن کو غربت و افلاس کے رنگ میں ضرور پیش کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ مصنفین کا عام رنگ یہ تھا کہ وہ مذہبی اور اخلاقی باتوں کو چھوڑ کر عموماً حکومت و سیاست اور قانون و عدالت پر خامہ فرسائی کرتے تھے۔ عورتوں کا ذکر خیر بھی بہت کم ہوتا اور اگر ہوتا تو بہت ہی رُوکھے پھیکے الفاظ میں۔ اصلِ زندگی میں کسانوں کا بہترین مشغلہ عورت سے دِل بہلانا تھا۔ خطرناک سہی لیکن اُن کے لیے تو دلچسپ تھا۔ عورتوں سے میل جول رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ بہت چالاکی اور ہوشیاری سے کام لیا جائے۔ ورنہ وہ موقع پا کر مردوں پر چھا جاتیں اور ان کی زندگی کو تباہ کر دیتی تھیں۔ جہاں تک نیک و بد کا تعلق ہے دیہاتی روزمرہ زندگی میں وہی کچھ ہوتے جس رنگ میں ان کو کتابوں کے اندر پیش کیا جاتا تھا لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ وہ ضرورت سے زیادہ دلچسپ اور خوش طبع ہوتے۔ بات یہ تھی کہ اگر کوئی دیہاتی اپنے من کا سارا بھید

بے سوچے سمجھے کسی شخص کے سامنے بیان نہ کرتا تو اس کے متعلق رائے قائم کی جاتی کہ وہ بڑا اکائیاں ہے ۔ اس نے دراصل اسی بات کو چھپا لیا جو اس کی حقیقی زندگی کو بے نقاب کر سکتی تھی ۔

مَیں نے کتابوں میں جن دیہاتیوں کے حالات پڑھے اِن میں سے پیٹر نامی بڑھئی کا قصہ سب سے زیادہ دلچسپ اور مجھے بہت پسند تھا ۔ میں نے سوچا کہ وہ قصہ اپنے ساتھیوں کو بھی سُنا ڈالوں ۔ میری عادت تھی کہ اکثر راتیں کسی نہ کسی کارخانے میں بسر کرتا تھا ۔ خصوصًا اس لیے کہ دن بھر کے کام کاج سے بُری طرح تھک جاتا تھا اور گھر واپس آنے کی ہمت نہیں رہتی تھی ۔

جب میں نے اُن لوگوں کو بتایا کہ میرے پاس ایک کتاب ہے جس میں بڑھیتوں کے قصّے درج ہیں تو ان کے دل میں ایک خاص چٹیک سی پیدا ہو گئی ۔ خصوصًا اوسپ کے دل میں ۔ وہ میرے ہاتھ سے کتاب چھین کر لے گیا اور جلدی جلدی ورق پلٹ کر اِدھر اُدھر سے پڑھنے لگا ۔ گویا اسے میری بات کا یقین نہیں تھا ۔ تصدیق کر لینے کے بعد اُس نے سر ہلاتے ہوئے کہا ۔

" ارے بھئی ! واقعی یہ تو ہمیں لوگوں کی بابت ہے ۔ بڑے خبیث ہو تم ۔ بھلا اس کا مصنف کون ہے ؟ کیا کہا ۔ کوئی بھلا مانس شہری ہاں یہ خیال تو میرا بھی تھا ۔ مانی ہوئی بات ہے ۔ شہری لوگ ہر کام میں طاق ہوتے ہیں ۔ وہ اتنی دوُر کی کوڑی لاتے ہیں جہاں خدا کا وہم وگمان تک بھی نہیں پہنچ سکتا اور حقیقتاً اس کام کے لیے وہ دنیا میں بھیجے بھی جاتے ہیں "

"اوسپ! تم خدا کی شان میں بہت گستاخی کرتے ہو" پیٹر نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"سب ٹھیک ہی۔ خدا ہماری باتوں کی پروا کب کرتا ہی۔ پیارے! تم فکر نہ کرو۔ خدا تک ہماری تمھاری رسائی بھی نہیں ہو سکتی۔"

جب کبھی کوئی بات اس کی پسند کے خلاف ہوتی تو وہ فقرے کسنے سے باز نہ آتا۔ اپنی باتوں سے دوسروں کے تن بدن میں آگ لگا دینی اس کے لیے معمولی بات تھی۔ دن بھر میں وہ کئی کئی بار مجھ سے دریافت کرتا۔

"کیوں میاں میکسی مچ! آج کچھ پڑھ کر سناؤ گے؟ کیا کہنے! بہت ہی معقول طریقہ ہی۔" جب کام کاج سے فرصت ملی تو ہم کھانا کھانے کے لیے اُس کے کارخانے میں جمع ہو گئے۔ باقی لوگ بھی وہیں آ دھمکے۔ شِشلین کے ساتھ اُس کا لڑکا فوما بھی چلا آیا سائبان کے نیچے جہاں مزدور رہتے تھے ایک چراغ جلا کرتا تھا بس وہیں کتاب کھول کر پڑھنا شروع کر دیا۔ وہ بہت غور سے سُنتے رہے۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ بیچ میں بول پڑتا۔ البتہ جب دو ایک کی طبیعت اُکتا گئی تو وہاں سے اُٹھ کر چلدیے۔ سب سے پہلے گریگوری پر نیند کا غلبہ طاری ہوا۔ وہ مُنہ کھول کر سونے کا عادی تھا۔ اس کے بعد بڑھئی اونگھنے لگا۔ باقی لوگ اُن کو اُٹھا کر کھسکتے ہوئے میرے قریب آگئے اور زیادہ توجہ کے ساتھ سُننے لگے۔ جب میں نے کتاب ختم کرلی تو اوسپ نے فوراً پھونک مار

کر چراغ گل کر دیا۔ اس وقت ستاروں کی چمک سے ہم نے اندازہ لگایا کہ آدھی رات گزر گئی ہے۔

پیٹر نے اندھیرے میں لیٹے لیٹے دریافت کیا۔

"بھلا یہ قصّہ کیوں لکھا گیا ہے؟ کس کے خلاف ہے؟"

"اچھا اب سو جاؤ" اوسپ نے جوتے اتارتے ہوئے ہدایت کی۔

لیکن پیٹر کی تسلّی نہ ہوئی وہ اپنا سوال دُہرانے سے باز نہ آیا "میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ وہ کس کے خلاف لکھا گیا ہے!"

"بس خاموش رہو سوائے تمھارے سب کو معلوم ہے" اوسپ نے مچان پر اپنا بستر بچھاتے ہوئے جواب دیا۔

اگر وہ سوتیلی ماؤں کے خلاف لکھا گیا ہے تو سمجھنا چاہیئے کہ ہمارا وقت خواہ مخواہ ضائع ہوا۔ اس کے مُطالعے سے سوتیلی ماؤں کا طرزِ عمل سُدھر نہیں سکتا۔ اور اگر وہ پیٹر کی خاطر لکھا گیا ہے تو سمجھ لو کہ بالکل لغو ہے۔ کسی کو قتل کرنے کے لیے سائبریا تک چلے جانا کونسی تعجّب کی بات ہے۔ قصّے میں اس کے سوا اور کیا رکھا ہے۔ بھلا کتابیں اِس لیے ہوتی ہیں کہ اُن میں لوگوں کی گناہ آلود زندگی کے خاکے کھینچے جائیں۔ لاحول ولا قوۃ یہ مصنف بھی عجیب لوگ ہوتے ہیں۔ خود تو کوئی ڈھنگ کی بات کر نہیں سکتے اور دوسروں کے کام کاج پر حاشیہ آرائی شروع کر دیتے ہیں۔ محفل میں بیٹھ کر عورتیں بھی ایسا ہی کرتی ہیں۔ اچھا شب بخیر۔ اب نیند آ چلی ہے"

وہ اندھیری فضا میں چل کر کھلے دروازے تک پہنچا اور ایک منٹ کھڑے رہنے کے بعد پوچھنے لگا۔

"کیوں بھئی اوسپ! کیا سو گئے؟ اچھا بتاؤ تو سہی، قصے کے متعلق تمھاری کیا رائے ہے؟"

"کیا کہا؟" بڑھئی نے غنودگی کی حالت میں چونک کر کہا۔

"اچھا خیر۔ سو جاؤ۔"

تھوڑی دیر بعد سب دُنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر سو گئے۔ نیند کی حالت میں کسی کو اپنی پرائی خبر نہ رہی۔ کوئی کسی طرف لڑھک گیا اور کوئی کسی طرف۔ کچھ فاصلے پر ریل کے انجنوں کی چیخ پکار، پہیوں کی گڑگڑاہٹ اور گاڑیوں کی آپس میں ٹکرانے کی آواز برابر سنائی دیتی رہتی۔ سائباں کے نیچے مختلف سروں میں خراٹوں کی صدا بلند ہوتی اور میری حالت دگرگوں ہونے لگتی۔ میں توقع کیا کرتا کہ قصہ ختم ہونے کے بعد نفس موضوع پر کوئی دلچسپ بحث چھڑ جائے گی لیکن ایسا بہت کم ہوتا تھا۔

اچانک اوسپ کی مدھم لیکن صاف آواز سنائی دیتی۔

"میاں صاحب زادے تم ان باتوں کو نہیں مانتے۔ ابھی بچے ہو۔ تمھیں اِس دُنیا میں بہت عرصے زندہ رہنا ہے، خیر جس طرح بھی ہو، اپنے خیالات میں اضافہ کرتے رہو۔ وقت آئے گا کہ تم اکیلے عقل و فہم کے اعتبار سے دو آدمیوں پر بھاری رہو گے۔ کیوں فوما؟ کیا تم سو گئے ہو؟"

"جی نہیں۔ ابھی جاگ رہا ہوں۔" فوما بہت عجلت سے

جواب دیتا۔

"بہت خوب! دیکھو جی۔ تم نے کچھ تعلیم حاصل کرلی ہی۔ اِس لیئے پڑھتے پڑھاتے رہا کرو۔ لیکن کتاب کی ہر بات اس لایق نہیں ہوتی کہ اُسے سچ مان لیا جائے۔ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہی کہ جو جی میں آئے چھپوا ڈالتے ہیں۔ کیونکہ اُن کا کاروبار ہی اِس چیز پر منحصر ہوتا ہی"

اُس نے مچان کے اوپر سے دونوں ٹانگیں نیچے کی طرف لٹکا دیں اور تختے کے سرے پر دونوں ہاتھ ٹکا کر ہم لوگوں پر جُھک گیا۔ پھر کہنا شروع کیا۔

تمھیں بتاؤں کتابوں کا مقصد کیا ہوتا ہی؟ چند لوگوں کے خلاف زہر اُگلنا ــ بس اِس کے سوا کچھ نہیں۔ اچھا تم خود آزما لو۔ دیکھو وہ اپنی قلم سے کیا لکھتے ہیں۔ مثلاً بڑھئی کو لو یا کسی اور کو اور میں تمھارے سامنے موجود ہوں۔ کیا تم مجھے شریف آدمی نہیں کہہ سکتے۔ لیکن بڑھئی کا جو خاکہ اُنھوں نے پیش کیا ہی، اِس سے بالکل مختلف ہوں کوئی کتاب خاص مقصد کے بغیر نہیں لکھی جاتی۔ اور عام طور پر کسی نہ کسی کو خوش کرنے کے لیے ہوتی ہی"

فوما نے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"پیٹر نے اچھا کیا کہ اِس ٹھیکیدار کو مار ڈالا"

"واہ! بہت بُرا کیا۔ کسی اِنسان کو مار ڈالنا کبھی اچھا فعل نہیں ہو سکتا۔ میں جانتا ہوں کہ تم گریگوری سے نفرت کرتے ہو۔ لیکن اِس خیال کو دل سے نکال دو۔ ہم میں سے کوئی بھی امیر

نہیں ہی۔ آج یہ لوگ میرے ماتحت ہیں اور ہو سکتا ہی کہ کل ایک معمولی مزدور مجھ جیسا بن جائے۔"

"بچا اوسپ! میرا مطلب تم سے نہیں تھا۔"

"خیر مطلب ایک ہی ہی۔"

"تم تو......"

"ذرا ٹھیرو۔ میں تم کو یہ سمجھا رہا تھا کہ یہ کتابیں کیوں لکھی جاتی ہیں۔" اوسپ نے فوما کی بات کاٹ کر کہا۔" میں ایک عجیب غریب مثال کے ذریعے اس مسئلے پر روشنی ڈالوں گا۔ اچھا سنو ایک شہری ہی جس کا میل جول کسی دیہاتی سے نہیں ہی۔ اور ایک دیہاتی ہی جس کا میل جول کسی شہری سے نہیں ہی۔ اب ہوتا یہ ہی کہ وہ دونوں بری طرح مصیبت میں پھنس جاتے ہیں نتیجہ یہ کہ شہری کمزور ہوتے ہوتے بالکل لاغر و نحیف ہو جاتا ہی اور دیہاتی آوارگی اور بد معاشی میں گھر کر نازیبا حرکتیں کرنے لگتا ہی۔ اس کے سوا کوئی چارۂ کار ہو بھی نہیں سکتا۔ لیکن لوگوں کا خیال ہی کہ زمیندار کی حویلی میں یہ صورت پیدا نہیں ہو سکتی۔ زمیندار دیہاتی کو سنبھالے رکھتا ہی۔ اور دیہاتی اپنے آقا کو بس پھر کیا۔ دونوں چین چان امن وامان کی زندگی بسر کرتے ہیں میں اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ شہریوں کے ساتھ مل جل کر رہنے میں بھی زندگی مزے میں گزر سکتی ہی۔ اگر دیہاتی غریب ہو تو زمیندار کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن اگر وہ کھاتا پیتا اور عقلمند ہو تو اس کے وارے نیارے

ہو جاتے ہیں۔ وہ اُسے اپنا آلۂ کار بنا لیتا ہے۔ میں ان تمام رازوں سے واقف ہوں۔ میں نے بڑے بڑے لوگوں میں زندگی کے چالیس سال بسر کیے ہیں۔ میں نے اِتنا تجربہ حاصل کر لیا ہے کہ میرا رُواں رُواں اِس امر کا گواہ ہے۔"

اٹھارھواں باب

جس طرح لیکوف کی شخصیت میرے دل و دماغ پر چھا گئی تھی، اسی طرح اوسب میری نگاہوں میں چڑھتا چلا گیا۔ دونوں میں حد درجہ مشابہت تھی۔ محض اس کی وجہ سے مجھے بہت سے پرانے واقف کار یاد آجاتے تھے لیکن میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کی یاد میرے ذہن سے کبھی نہ مٹ سکے گی چاہے میں سارے زمانے کو بھول جاؤں۔ جس طرح لکڑی کو گھن اندر ہی اندر کھاتا چلا جاتا ہے وہ میری روح کی گہرائیوں میں گھستا چلا گیا۔ اس میں سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ دو جداگانہ خصلتوں کا مالک تھا۔ دن کے وقت جب وہ کام کاج میں مصروف ہوتا تو اس کی زندگی بالکل کاروباری آدمیوں جیسی ہوتی۔ وہ ہر معاملے میں تجارتی پہلو کو مدِّنظر رکھتے ہوئے بات کرتا۔ اس وقت اسے سمجھ لینا آسان ہوتا۔ لیکن اپنی ذمے داریوں سے فارغ ہو کر جب وہ میرے ہمراہ اپنے یاروں سے ملنے شہر جاتا تو اس کی دنیا ہی بدل جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ وہ ایک اور ہی اوسب ہے۔ حد درجہ چالاک اور ناقابل فہم۔ میں یہ جاننے کی کوشش کرتا کہ وہ کتنے پانی میں ہے مگر مجھے کامیابی نہ ہوتی۔ یہ یقین ہونے لگتا کہ اس کے جسم میں خود اس کے علاوہ کسی اور کی روح بھی چھپی ہوئی تھی جو اسے آلۂ کار بنا کر اپنا مقصد پورا کرتی رہتی تھی وہ بھی تاڑ گیا تھا کہ میں کس تگ و دو میں ہوں اور اسی لیے اس

نے مجھ سے کہا کہ اگر تم مجھ کو بے نقاب دیکھنا چاہتے ہو تو ہمت نہ ہارو کوشش کیے جاؤ۔

وہ چھپا رستم تھا اور ساتھ ہی بڑا مستقل مزاج بھی۔ اور یہ اندازہ لگالینا آسان تھا کہ اگر وہ دو سال اور زندہ رہے تب بھی اس کی طبیعت میں کوئی انقلاب پیدا نہیں ہوگا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس میں انانیت کا مادہ بہت بڑھا ہوا تھا۔ فطرتِ انسانی کا چھلاواپن مجھے بالکل پسند نہیں تھا بلکہ اس سے نفرت تھی۔ سوچنے کی بات ہی کہ تھالی کا بینگن ہو کر رہنا بھی کوئی زندگی ہی۔

جولائی کی ایک صبح کا ذکر ہی کہ ایک بھٹ بھٹی گاڑی ہمارے سامنے آکر ٹھہر گئی۔ یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ اس کا چلانے والا نشے میں دھت، پرانی کھانسی کا مریض ہمارا دوست سشٹلین تھا۔ اس کے پہلو میں ایک موٹی تازی لونڈیا بیٹھی تھی جس کے گال کچوری کی طرح پھولے ہوئے تھے۔ سشٹلین کی ڈاڑھی بڑھی ہوئی تھی اور نہ اس کے سر پر ٹوپی تھی اور نہ پاؤں میں جوتا۔ البتہ لڑکی نے تنکوں کا ٹوپ پہن رکھا تھا۔ پاؤں اس کے بھی ننگے تھے۔ اس نے دھوپ کی عینک اتار کر چلاتے ہوئے کہا۔

"یہ خرید و فروخت کی منڈی ہی یا شیطانوں کی بستی آتنا دن چڑھ آیا اور دکانیں ابھی تک بند ہیں۔ آخر اسے کیا سوجھی تھی جو مجھے ایسی جگہ لے آیا۔ لاحول ولا —"

سشٹلین بھنگڑوں کی صورت بنائے گاڑی سے اترا اور پھاوڑا مار کر زمین پر بیٹھ گیا۔ اب جو اس نے بے تکی ہانکنی شروع کی تو خدا

کی بناء کسی بات کا سر پیر معلوم نہ ہو سکا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے کرتے رو پڑا۔ لونڈیا کا ہنسی کے مارے بُرا حال ہو گیا۔ وہ ہنستے ہنستے دُہری ہوئی جا رہی تھی۔ کچھ دیر میں گاڑی میں جُتا ہوا گھوڑا بے قابو ہونے لگا۔ اس کا جسم پسینے سے شرابور تھا اور منہ سے کف جاری تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ بہت دور چل کر آیا ہے۔

ششلین کے سب ماتحت باہر نکل آئے۔ اس کی حالت پر انھوں نے بھی ہنسنا شروع کر دیا۔ صرف فوما کو غصہ آ رہا تھا۔ اس نے دانت پیس کر کہا۔

خدا اس چڑیل کو غارت کرے۔ یہ کہاں سے پیچھے لگ گئی۔ ششلین کی بیوی گھر میں پڑی سڑ رہی ہے اور وہ کتنی خوبصورت ہے۔"

لونڈیا سے نہ رہا گیا۔ وہ تن تناتی ہوئی نیچے اُتری اور ششلین کو گھسیٹ کر گاڑی پر لے گئی۔ ان کے چلے جانے کے بعد فوما نے سب کو آواز دی اور سب کاریگر اپنے اپنے کام پر دوبارہ جُٹ گئے۔ فوما کو رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا۔ کچھ بھی ہو ششلین ان کا افسر سمجھا جاتا تھا۔ اور اسے اپنی عزت کا مطلق پاس نہیں تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے بھی بڑی کوفت سی ہونے لگی کیونکہ وہ لونڈیا جو اس کے ساتھ تھی بہت مکروہ شکل کی تھی۔

فوما خوب ہٹا کٹا، چکنا چپڑا اور بھلا چنگا جوان تھا۔ اس کی آنکھیں اور بال بہت خوب صورت تھے۔ بظاہر وہ دیہاتی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ میں اکثر سوچا کرتا کہ اس میں کیا نقص ہے کہ وہ بیلدار سے زیادہ ترقی نہ کر سکا اور ششلین کچھ نہ ہونے پر بھی افسر بنا

بیٹھا ہی۔

اس کا خیال تھا کہ کام صرف تجربے سے آتا ہی۔ کتابیں وقت ضایع کرتی ہیں۔ محض ان کو پڑھ لینے سے کوئی ماہرِ فن نہیں بن سکتا۔ اسی لیے وہ ان کی بُرائی کرتا رہتا تھا۔

وہ اپنی معلومات وسیع کرنے کے لیے لوگوں کی باتیں بڑے غور سے سنا کرتا تھا۔ اور اگر کوئی دلچسپ چیز کان میں پڑجاتی تو اس کی تفصیلات میں پڑکر اسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہتا۔ لیکن اس میں ہٹ دھرمی بھی تھی۔ وہ ہر بات کو اپنے علم اور تجربے کی کسوٹی پر جانچنا چاہتا تھا۔ ایک روز میں نے اس کو صلاح دی کہ تم ٹھیکہ داری شروع کردو۔ اس نے جواب دیا کہ اگر معقول آمدنی ہوسکے تو یہ کام ٹھیک ہی ورنہ بے کار۔ بھلا دو چار رُپئے کے لیے کیوں مصیبت مول لی جائے۔ اس کا خیال تھا کہ کسی مالدار سوداگر کی بیوہ سے شادی کرلی جائے اور اس مقصد کے لیے وہ چاہتا تھا کہ پہلے شہر کی کسی خانقاہ میں جاکر داخل ہوجائے۔ اس نے ایک شخص کی مثال پیش کی جو ایک شہری عورت سے شادی کرکے بہت جلد امیر کبیر بن گیا تھا۔ اسی قسم کے بہت سے قصے اسے یاد تھے کہ کس طرح لوگ خانقاہوں میں نوکری کرنے کے بعد اپنی زندگی کو سدھار لیتے ہیں۔

جب منڈی میں کاروبار زور پکڑتا تو وہ محنت مزدوری چھوڑکر کسی ہوٹل میں بیرے کا کام شروع کردیتا۔ اس کے بعض ساتھی حیرت کا اظہار کرتے لیکن ان میں سے اکثر اس کا مذاق اُڑاتے تھے۔ چھٹی کے دن وہ سب اکھٹے ہوکر کہتے کہ لاؤ آج اپنے یار فوما سے مل

آئیں - وہاں پہنچ کر وہ چھیڑ خانی کے طور پر آواز دیتے -

"بوائے! ہمارے لیے ایک کپ چائے لاؤ -"

اس قسم کی فقرے بازی سے وہ بالکل نہ جھینپتا بلکہ اپنا کام پوری مستعدی سے کیے جاتا۔

چائے پی لینے کے بعد اس کے ساتھی ایک دوسرے سے پوچھتے کہ کیا ہم اسے کچھ بخشش دیں - اور پھر ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی جیب ٹٹولنے لگتا۔ گویا واقعی ایک آدھ پیسہ دینا چاہتے ہیں لیکن یہ خالی دکھاوا ہوتا - دیتا دلاتا کوئی بھی نہیں۔

ایک روز میں نے نوما سے پوچھا کہ جب تم خانقاہ میں داخل ہو جاؤ گے تو بیرے کا کام کس طرح کیا کرو گے - وہ بالکل مکر گیا۔ کہنے لگا کہ میں نے خانقاہ میں جانے کا ارادہ کبھی ظاہر نہیں کیا اور نہ میں بیراگیری کو زیادہ عرصے تک جاری رکھوں گا -

تقریبًا چار سال کے بعد اس سے اتفاقًا ملاقات ہوئی۔ اس وقت بھی وہ کسی ہوٹل میں ملازم تھا - پھر کچھ دن بعد اخبار میں پڑھا کہ وہ کسی چوری کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا ہے -

سنگ ساز کی رام کہانی نے مجھے بہت زیادہ متاثر کیا - ارد لون کافی عمر کا اور پیٹر کی ٹکڑی میں سب سے زیادہ ہوشیار مزدور تھا لوگ تعجب کرتے تھے کہ آخر پیٹر کی بجائے خود اسے مزدوروں کا چودھری کیوں نہیں سمجھا جاتا - وہ کبھی کبھار شراب پیتا اور وہ بھی برائے نام وہ اپنا کام اس قدر دل لگا کر کرتا گویا وہ اسے بہت عزیز ہے - اس کے مقابلے میں پیٹر کی حیثیت ایک بدِ فضول سے زیادہ نہیں تھی۔

وہ عموماً کہا کرتا تھا:-

"میں نے دوسروں کے لیے سینکڑوں سنگین مکان بنا ڈالے اور اپنے لیے صرف لکڑی کا تابوت تیار کیا ہے"

ایک روز کام کرتے کرتے وہ کہنے لگا:-

"موسم بہار شروع ہوتے ہی میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ بیری بہنوئی نے ایک گرجا تعمیر کرنے کا ٹھیکہ لیا ہے۔ وہ مجھے اورسیر کا کام کرنے کے لیے بلا رہے ہیں۔ میں گرجا بنانے کا کام بڑے شوق سے کرتا ہوں۔ اگر چاہو تو تم بھی میرے ساتھ چل سکتے ہو۔ اچھا روزگار مل جائے گا۔ سائبیریا میں پڑھے لکھے لوگوں کی بہت کھپت ہے۔ وہاں پہنچ کر تم محسوس کروگے گویا تمھارے ہاتھ میں سب پتّے ترپ کے آ گئے ہیں۔ بولو کیا ارادہ ہے"

میں فوراً رضامند ہو گیا۔

وہ پیٹر اور گریگوری کے ساتھ اس طرح برتاؤ کرتا گویا کوئی بزرگ اپنے بچّوں پر شفقت کا اظہار کر رہا ہو۔ وہ اوسپ کو مخاطب کرکے کہتا۔

"ارے شیخی خورو! تم کیوں ایک دوسرے کے سامنے اپنی بڑائی کرتے ہو۔ کیا محض رعب جمانے کے لیے"

اوسپ کسی قدر تنک کر جواب دیتا۔

"اور نہیں تو کیا۔ زمانے کا یہی دستور ہے۔ دوسروں کے سامنے بننا انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ دیکھتے نہیں بازار میں گزرنے والی ہر چھوکری اپنا سینہ ابھار کر چلتی ہے۔ آخر کیوں؟"

دیکھتے دیکھتے اچھی خاصی بحث چھڑ جاتی ۔ سبھی حصہ لینے لگتے ۔ اور پھر اردلون کو سنانے کی غرض سے کہتے :-

"کاش ہمارا بھی کوئی بہنوئی ہوتا ۔ وہ سائبیریا میں گرجا بنانے کا ٹھیکہ لیتا ۔ پھر ہم بھی اورسیر بنتے ۔"

اور غیر متوقع طور پر ایک دن اردلون غایب ہوگیا ۔ وہ اتوار کی چھٹی میں کارخانے سے گیا اور پھر تین دن تک پلٹ کر نہ آیا ۔ لوگوں میں عجیب بے چینی سی پھیل گئی ۔ ایک کہتا کہ اسے ضرور کسی دشمن نے ہلاک کر دیا ہے ، تو دوسرے کی رائے ہوتی کہ وہ خود ڈوب کر مر گیا ہے ۔ غرض جتنے منہ اتنی ہی باتیں ۔ لیکن ایفی موشکا کہیں سے بڑی سنسنی خیز خبر لایا ۔

" وہ ابھی تک زندہ ہے مگر حد سے زیادہ شراب پینے کے باعث اپنے آپے سے باہر ہے ۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جنون کی حد تک متوالا ہوگیا ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی پیاری بیوی مر گئی جس کا غم غلط کرنے کے لیے اس نے یہ تدبیر سوچی ہے ۔"

سب حیران رہ گئے ۔ اوسپ نے تہیہ کیا کہ اسے کسی نہ کسی طرح واپس لے آؤں گا ۔ میں بھی اس کے ہمراہ جانے کے لیے تیار ہوگیا ۔ راستے میں وہ کہنے لگا :-

" دیکھا تم نے ! انسان کے قول وفعل کا کوئی اعتبار نہیں ۔ ساری عمر ثقہ رہ کر گزری اور اب اخیر وقت میں عیاشی شروع کر دی ہے ۔ تم ان واقعات سے سبق لو ۔ سمجھے میاں میکسم !۔"

گناوِن پہنچ کر ہم ایک چکلے کے دروازے پر پہنچے جہاں ایک

بوڑھی کھوسٹ عورت نے ہمارا استقبال کیا۔ اوسپ نے خدا جانے اس کے کان میں کیا کہا کہ وہ ہم کو فوراً اندر لے گئی۔ ایک مختصر سے کمرے میں جو تاریکی اور عفونت کے اعتبار سے خچروں کا طویلہ معلوم ہوتا تھا ہم نے گھور کر دیکھا۔ ٹوٹی پھوٹی چارپائی پر ایک موٹی بھمبو نہایت بے شرمی کے عالم میں پڑی خراٹے لے رہی تھی۔ بڑھیا نے اس کے پہلو کو گدگداکر ذرا زور سے کہا:۔

"اری چمگادڑ! کیا سارے دن سوتی رہے گی۔ اُٹھ! دیکھ یہ کون لوگ آئے ہیں"

وہ آنکھیں ملتی ہوئی اُٹھ بیٹھی۔ اور ڈرتے ڈرتے بولی:۔

"آسمانی باپ کا ہم پر سایہ ہو۔ بھلا یہ اس وقت کیوں آئے ہیں؟"۔

سنو۔ ہم خفیہ محکمے کے جاسوس ہیں ——" اوسپ نے سخت لہجے میں کہا۔ بس اتنا سننے ہی وہ سر پر پانو رکھ کر بھاگی۔ اوسپ کھلکھلا کر ہنس پڑا اور مجھ سے کہنے لگا۔

"دیکھتے ہو۔ یہ چھنال عورتیں شیطان سے زیادہ جاسوس کے نام سے بھاگتی ہیں"

بوڑھی عورت بولی:۔

"تمھیں جس شخص کی تلاش ہو وہ غالباً برابر کے کمرے میں پڑا سو رہا ہو۔ پہلے دروازے کی جھری میں سے جھانک کر دیکھ لو۔ خواہ مخواہ اس کی نیند کیوں خراب کی جائے"۔

اوسپ نے اور اس کے بعد میں نے جھانک کر دیکھا۔ تابدان پر رکھا ہوا ٹین کا لیمپ ابھی تک جل رہا تھا۔ کھڑکی کے قریب ایک

تاتاری عورت بالکل برہنہ حالت میں کھڑی تھی اور رات کی مسکی ہوئی انگیا کو جلدی جلدی سی سِلا کر درست کر رہی تھی۔ اس کی پیٹھ کے پیچھے چھوٹے سے پلنگ پر ارد لون تکیوں کے بیچ میں سمٹا سمٹایا پڑا تھا۔ اس کی ڈاڑھی کے اُلجھے ہوئے بال شناخت کے لیے کافی تھے۔

ہم دونوں نے مل کر اسے ہوشیار کرنے کی کوشش کی۔ وہ نشے میں اس درجہ چور تھا کہ بڑی مشکل سے آنکھیں کھول سکا بیدار ہوتے ہی اس نے گھور کر ہماری طرف دیکھا اور حیران رہ گیا۔ آنکھوں کے ڈھیلے دہکتی چنگاریوں کی طرح لال ہو رہے تھے۔ اوسپ نے ذرا نرمی سے پوچھا:۔

"کیوں دوست! یہ کیا حال بنا رکھا ہے۔ کچھ بتاؤ تو سہی"

"بس یار کچھ پوچھو نہیں مجھے مجبور ہو جانا ہی پڑا" اور یہ کہ کر ٹھرے کی بوتل میز پر سے اٹھالی جس میں تھوڑی سی تلچھٹ باقی تھی اپنا حلق تر کر لینے کے بعد ہم سے کھانے پینے کی صلاح کی۔ اور پھر گزشتہ رات کی باتیں یاد کر کے کہنے لگا:۔

"حسن اتفاق سے ایک تاتاری عورت ہاتھ لگ گئی۔ ایسی جوان پٹھی تھی کہ میں بیان نہیں کر سکتا"

اوسپ بولا:۔ "ہاں میں جھری میں سے جھانک کر اسے دیکھ چکا ہوں"

میرا قیاس تھا کہ وہ اوسپ کو بہت کچھ لعنت ملامت کرے گا اور پند و نصیحت کی ایک لمبی چوڑی تقریر شروع کر دے گا۔ لیکن خلافِ توقع اس نے کچھ بھی نہ کہا۔ وہ بالکل بے تکلفی کے ساتھ اس طرح ایک دوسرے کے قریب ہو کر بیٹھ گئے اور باتیں شروع کر دیں گویا اس ملاقات کا د

پہلے سے طے ہو چکا تھا۔

میز پر کچھ خشک میوے پڑے تھے اوسب نے ایک اخروٹ اُٹھایا اور جوتے کے تلے سے کچل کر اسے توڑ ڈالا۔ وہ گری مُنہ میں ڈالتے ہوئے بولا:-

"او ریار! یہ تو بتاؤ کہ سائبیریا کب تک جاؤ گے؟"

"وہاں جاکر کیا کروں گا۔ میں نے ارادہ بدل دیا ہے۔ سب لوگ نئے ہوں گے۔ جان نہ پہچان۔ ان میں رہ کر زندگی گزارنی دشوار ہو جائے گی۔ اور یوں بھی بہن کے گھر جاکر ڈھئی دینا کچھ معیوب معلوم ہوتا ہے۔"

"اس میں کیا مضائقہ ہے۔ کام کرو گے۔ پیسے ملیں گے۔"

"اور پھر یہ بھی اچھا معلوم نہیں ہوتا کہ اپنے ہی رشتے داروں کے ساتھ مل کر زندگی کا بالکل نیا دور شروع کیا جائے۔"

اس تمام دوران میں تاتاری عورت دیوار کے پیچھے سے دل کھول کر گالیاں دیتی رہی۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ یہ لوگ ناراض نہیں ہوتے بلکہ گھل مل کر باتیں کیے جا رہے ہیں تو ہار جھک مار کر خاموش ہو گئی اور جب کھونٹی پر ٹنگی ہوئی قمیص لینے کے لیے دوبارہ کمرے میں آئی تو اوسب نے دبے لفظوں میں کہا:-

"پٹاخا ہے پٹاخا۔ بھائی تم اس حسین جادوگرنی سے بچو، ورنہ کسی کام کے نہیں رہو گے۔ واللہ پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔"

یہ کہہ کر رخصت کی اجازت چاہی اور دونوں یار ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ میں نے راستے میں پوچھا:-

"کیوں جی ! اس ملاقات سے تمھارا مطلب کیا تھا ۔ خواہ مخواہ ملنے آئے تھے ۔"

"بات یہ ہے کہ میں اس کی حالت کا اندازہ لگانا چاہتا تھا ۔ میں نے اس قماش کے بہت سے آدمی دیکھے ہیں جنھوں نے شروع میں معقول قسم کی زندگی بسر کی اور پھر شیطان کے چیلے بن گئے ۔ جہاں تک ممکن ہو پینے پلانے سے پرہیز کیا جائے ۔"

اور پھر ایک ہی لمحے کے بعد کہنے لگا :-

"لیکن اس کے بغیر زندگی بے کیف ہو جاتی ہے ۔ شراب بھی عجیب چیز ہے ۔ دو گھونٹ حلق سے اُترتے ہی انسان محسوس کرتا ہے کہ وہ کسی دوسری دنیا میں پہنچ گیا ہے ۔"

اور کون اس خرابات سے واپس اپنے کام پر نہ آسکا ۔ میں بہت عرصے بعد اس سے ملا ۔ وہ بندرگاہ پر کام کرنے والے خلاصیوں میں شامل ہو گیا تھا ۔ اس نے نہایت گرمجوشی کے ساتھ ہاتھ ملایا اور چائے پلانے کے لیے قہوہ خانے میں لے گیا ۔ وہاں بیٹھ کر اس نے خوب شیخی بگھاری اور ہر کام میں اپنی واقفیت کا ذکر اس انداز سے کیا کہ باقی سننے والے بھی حیران رہ گئے ۔

میں ہر چھٹی کے دن پھرتا پھراتا اس سے ملنے چلا جاتا ۔ مجھے دیکھ کر حیرت ہوتی کہ وہ کتنے جلدی ان لچے بدمعاشوں میں گھل مل گیا ہے ۔ اس کا چال چلن اور رہن سہن کا طریقہ بالکل انھیں جیسا ہو گیا تھا ۔ آدمی کو بگڑتے دیر نہیں لگتی ۔ جب وہ اکڑ کر چلتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ ہر شخص کو لڑنے جھگڑنے کی دعوت دے رہا ہے ۔ وہ بڑے فخر سے کہتا ۔

"تم جانتے ہو۔ یہ لوگ میری کتنی آؤ بھگت کرتے ہیں۔ میں اس چنڈال چوکڑی کا سردار بنا ہوا ہوں"

میں ان لوگوں کی زندگی کا مطالعہ بڑی گہری نظر سے کیا کرتا۔ وہ ایک گندی گھٹی ہوئی گلی میں گڈ مڈ ہو کر رہتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا کہ انھوں نے سماج کے عام اصولوں سے منہ موڑ کر اپنی زندگی کا بالکل نیا ڈھرا قایم کر لیا ہے۔ اور جو من میں آتی ہے کر گزرتے ہیں۔ ان کی بے پروائیوں اور اجڈ پنے کو دیکھ کر مجھے ملاحوں کے وہ قصے یاد آجاتے جو نانا جان سنایا کرتے تھے۔ جب ان کے پاس کوئی کام کاج نہ ہوتا تو وہ بجروں اور جہازوں پر چھوٹی موٹی چوری کا ارتکاب کر بیٹھتے۔ یہ معلوم کر کے مجھے ان پر غصہ نہ آتا کیونکہ میں جانتا تھا کہ ان کی زندگی اور چوری چکاری میں چولی دامن کا ساتھ ہو گیا ہے۔ وہ ایسا کیے بغیر رہ نہیں سکتے تھے۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ لوگ دل لگا کر کام کرنے کے عادی نہیں تھے بلکہ اس سے ہمیشہ جی چراتے تھے۔ وہ اس قدر چھٹیاں مناتے کہ دنیا کا کوئی شخص ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

جب اوسپ کو معلوم ہوا کہ میری اور ادلون کی دوستی بڑھ چلی ہے تو اس نے مجھے خوب آڑے ہاتھوں لیا۔

"دیکھو میاں صاحبزادے! یہ طور طریقہ ٹھیک نہیں ہے۔ ان لُچوں سے میل جول ترک کر دو۔ ورنہ ایسا نقصان اٹھاؤ گے کہ عمر بھر پچھتانا پڑے گا۔ ان کی بھلی چلائی۔ وہ تو جنگل کے پرندے ہیں۔ نکھٹو اور بے کار۔ ہاتھ پانْو ہلاتے انھیں موت آتی ہے"

"کام آخر ہے کس جانور کا نام! کچھ نہ کچھ تو وہ بھی کرتے ہیں۔

لیکن بالکل بے نتیجہ - ان کا کہنا ٹھیک ہی کہ ہم ایمانداری کے ساتھ کتنی ہی محنت مزدوری کریں، پکے مکانوں میں رہنے سے رہے ۔"

میں نے یہ کہنے کو تو کہہ دیا لیکن دل میں ڈرتا رہا کہ اوسپ بگڑ نہ جائے اور چنانچہ ہوا بھی یہی -

"کون گدھا کہتا ہی کہ محنت کا پھل نہیں ملتا - تم ایسی باتیں سنا بھی نہ کرو - تم ابھی بچّے ہو - اور ان کی ریس بے کار ہی - جو لوگ دنیا میں کچھ نہیں کرسکتے وہ اسی طرح بکواس کرتے ہیں - بس میرا کہا مانو ورنہ میں تمھاری شکایت مالک سے کردوں گا کہ اس کی اردلون وغیرہ سے دوستی ہی - سمجھے ۔"

اور چنانچہ اس نے دوسرے ہی دن میری شکایت کردی - مالک نے مجھے بلاکر خوب ڈانٹا -

"خبردار - پیشکوف! آئندہ ان لوگوں سے نہ ملنا وہ اٹھائی گیرے اور بدمعاش ہیں - نفس پرست اور حرام کار ہیں - ان سے دوستی کرنے کے بعد صرف دو راستے نظر کے سامنے رہ جاتے ہیں - ایک اسپتال کی طرف جاتا ہی اور دوسرا جیل خانے کی طرف - ان کی شکل پر لعنت بھیجو تمھیں ان سے کیا واسطہ ۔"

میں چھپ چھپاکر اس بستی میں جانے لگا - لیکن یہ سلسلہ زیادہ عرصے قایم نہ رہ سکا - ایک روز میں اردلون سے بیٹھا باتیں کر رہا تھا کہ اس کا دوست رونبوک آگیا - یہ شخص کبھی فوج میں سپاہی تھا لیکن ایک لڑائی میں لنگڑا ہوگیا جس کے باعث سخت کام کرنے سے معذور تھا - جب وہ اچھی حالت میں تھا تو اس نے بہت سے شہروں

کا سفر پیدل چل کر کیا تھا۔ اس نے بہت سے جھوٹ سچ قصّے سنائے جس پر سب ہنستے ہنساتے رہے۔ اتنے میں ایک عورت کچھ کپڑے بیچتی ادھر آنکلی میں نے چھت کے اوپر سے اچک کر اسے دیکھا اور فوراً پہچان لیا۔ وہ ہماری دھوبن نطالیہ تھی۔ میں دوڑ کر اس سے ملنے کے لیے نیچے اترا اور پھاٹک تک پہنچتے پہنچتے اسے جالیا۔ وہ مجھے دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"کمال ہی۔ تم اور اس جگہ۔ آخر تم یہاں کیوں آئے ہو۔ کیا آوارہ عورتوں پر ڈورے ڈالنے کے لیے۔ یاد رکھو یہ جگہ تمھارے لایق نہیں ہی"

میں نے محسوس کیا کہ اسے میری حالت پر ترس آرہا ہی۔ میں نے صاف صاف کہ دیا کہ میں اس جگہ نہیں رہتا بلکہ صرف ایک دوست سے ملنے آیا تھا۔ اس پر بھی اسے اعتراض تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ میں بھول کر بھی اس بستی میں قدم نہ رکھوں۔ سامنے کے قہوہ خانے پر نظر پڑی تو وہ مجھے مجبور کرکے وہاں لے گئی۔ اس نے سوچا کہ لاؤ کچھ دیر بیٹھ کر باتیں کریں۔

میں نے اس کی گفتگو سے اندازہ لگایا کہ اس کی حیثیت بازاری عورت سے زیادہ نہیں ہی۔ خوب دھڑلے سے شراب پینا اور اجنبی لوگوں کے ساتھ رات بسر کرنا۔ اس کے لیے روز کا معمول تھا۔ میں نے باتوں باتوں میں اس کی لڑکی کی بابت پوچھا کہ وہ کہاں ہی اور کیا کرتی ہی۔ یہ سنتے ہی وہ گویا چونک پڑی۔

"آخر تم نے میری لڑکی کی بابت کیوں سوال کیا۔ مجھے شرم آتی ہے کہ میں اس کی ماں ہوں۔ اس نے پڑھ لکھ کر اچھی تربیت پائی اور اب ایک امیر شخص سے شادی کر لینے کے بعد چین سے زندگی بسر کر رہی ہی۔

تم اگر چاہو بھی تو اسے اپنے قابو میں نہیں لا سکتے۔ بہتر ہے کہ اس خیال کو دل سے نکال دو۔"

میں نے اسے یقین دلایا کہ میرے سوال کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔

گرم چائے اور تھوڑی سی شراب پینے کے بعد وہ سنجیدہ ہوگئی اور ذرا سنبھل کر گفتگو کرنے لگی۔

"یہ گنہگاروں کی ایسی بستی ہے کہ یہاں شیطان کے بھی پر جلتے ہیں اس جگہ سے دور بھاگو۔ ورنہ گمراہ ہوجاؤ گے۔ لیکن تم میرے مشورے پر کیوں عمل کرنے لگے۔ میری نصیحت تو خود میری بیٹی نے بھی نہیں مانی۔ جب کبھی میں اس کو سمجھاتی وہ خودکشی کر لینے کی دھمکی دیتی لیکن خیر اب جس حال میں ہے اچھی ہے۔"

وہ خاموش ہوگئی اور بہت دیر تک اپنے خیالات میں محو رہی۔ میں نے دیکھا کہ جذبات کی ہیجانی کیفیات سے اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ چہرے پر جھریاں اس طرح پڑی ہوئی تھیں۔ جیسے کھیت میں ہل چل جانے کے بعد نشان باقی رہ جاتے ہیں۔ بالوں کی لٹیں رخساروں اور کنپٹیوں کے آس پاس ہوا سے بل کھا رہی تھیں۔ آنسوؤں کے چند قطرے بہتے ہوئے آئے اور پیالی کی ٹھنڈی چائے میں ٹپک پڑے مجھ سے یہ حالت نہ دیکھی گئی۔ میرا جی بری طرح بولانے لگا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں وہاں سے چلا جاؤں۔ چنانچہ اس سے اجازت طلب کی اور جواب کا انتظار کیے بغیر چپکے سے کھسک گیا۔ وہ اس طرح خاموش بیٹھی رہی گویا میرے وجود کو اپنے ذہن سے نکال چکی تھی۔

میں دوبارہ اردلون کے پاس گیا۔ کیونکہ ہم وعدہ کر چکے تھے کہ

دریا پر جاکر کیکڑے پکڑیں گے۔ میں نطالیہ کی بابت بھی اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ اور رونبوک دونوں چھت پر سے غایب تھے۔ میں صحن میں کھڑا اِدھر اُدھر نظر ڈال کر انھیں دیکھ رہا تھا کہ اتنے میں کچھ لوگ شور غل مچاتے سامنے کی سڑک سے گزرے۔ اس جھگھٹے کے بیچ میں نطالیہ سسکیاں لیتی آنسو پونچھتی اندھے بگلوں کی طرح چلی جارہی تھی۔ اردلون اور رونبوک اس کا پیچھا کررہے تھے۔ ایک نے دوسرے سے کہا۔

"اب اس حرام خور کو مت چھوڑنا۔ بس پکڑ کر پیٹ ڈالو"

اردلون گھونسا تان کر مارنا چاہتا تھا کہ میں نے آگے بڑھ کر اس کا بازو تھام لیا۔ وہ سخت حیران ہوا۔

"کیوں، کیا بات ہے؟ کیا تم بھی اس کے چاہنے والوں میں سے ہو؟۔ ارے بھائی! وہ تو بڑے بڑے نفہ لوگوں کو کنویں جھنکا چکی ہے"

رونبوک نے زور سے قہقہہ لگایا اور مجھے بُری طرح چھیڑنے لگا۔ اس کے بیہودہ مذاق کی مجھ میں تاب نہیں تھی میں نے غصے میں آکر اس کے سینے پر ایسی ٹکر ماری کہ وہ لڑھکتا نظر آیا اور میں سر پر پانو رکھ کر وہاں سے بھاگ نکلا۔

بہت دنوں تک میں نے اس بستی کا رُخ نہیں کیا۔ لیکن اچانک ایک روز دریا کے کنارے اردلون سے ملاقات ہوگئی۔ وہ کشتی چلا رہا تھا۔

"کیوں دوست! کہاں غایب رہے" اس نے ہنس کر دریافت کیا۔

میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ مجھے بے ہودہ مذاق پسند نہیں ہے۔ اور رونبوک نے جو کچھ لغویت کی وہ بالکل ناقابل برداشت تھی۔ یہ سُن کر وہ اپنی ہنسی کو ضبط نہ کرسکا۔

کیا واقعی! تم بُرا مان گئے۔ ہمیں خبر نہیں تھی کہ تم اس معاملے میں ضرورت سے زیادہ سنجیدہ ہو۔ محض چھیڑنے کی غرض سے دو ایک فقرے کس دیے تھے ورنہ یہ مقصد تھوڑی تھا کہ تمھیں ناراض کیا جائے۔"

کچھ دنوں بعد میں پال سے ملا۔ وہ پہلے سے زیادہ خوش نظر آتا تھا۔ اور اس کا لباس بھی بہتر تھا۔ اس کی عادت تھی کہ وہ ہمیشہ مجھے طعنے دیا کرتا تھا "ارے یار! تم وہ ذلیل کام کر کے اپنا وقت کیوں گنوار ہے ہو۔ وہاں تو سب گنوار لٹھ ہیں۔ اس جھنجھٹ کو چھوڑ کر کسی اور جگہ جاؤ جو تمھارے لیے زیبا ہو۔"

پھر اس نے کارخانے کی بہت سی تازہ خبریں سنائیں۔ اور ہر بات پر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو ہو گیا۔

"جیخاریف ابھی تک اس رکھنی کے ساتھ مزے کر رہا ہے۔ سیتانوف نے شراب نوشی میں بہت زیادتی کر دی ہے۔ گولونیف کو بھیڑیے ہضم کر گئے۔ یہ حادثہ بھی بڑا دلچسپ ہوا۔ وہ شراب کے نشے میں دھت اپنے گھر سے واپس آرہا تھا کہ بہک کر جنگل کی طرف جا نکلا۔ بس وہاں بھیڑیوں کی نظر پڑی اور وہ اسے ہڑپ کر گئے۔ گولونیف نے اس قدر شراب پی رکھی تھی کہ اس کا گوشت کھا کر خود بھیڑیوں پر بھی نشہ سوار ہو گیا۔ وہ بدحواس ہو کر آپس ہی میں لڑنے لگے اور دیکھتے دیکھتے سب فنا ہو گئے۔"

میں بھی اس کی بے تکی باتوں پر ہنستا رہا۔ اور ان واقعات کو جو کارخانے کی مختصر دنیا میں پیش آئے تھے۔ یاد کر کر کے سرد آہیں کھینچتا رہا۔
اب اس کے محض تصور سے دل پر چوٹ سی لگتی ہے۔

اُنیسواں باب

جاڑے کے دنوں میں کام کاج بالکل مندا پڑجاتا تھا۔ لیکن اس سے قطع نظر مجھے مکان پر بہت سے چھوٹے موٹے کام کرنے پڑتے تھے انھیں میں سارا دن ضایع ہوجاتا۔ تاہم شام کے وقت بالکل خالی رہتا میں گھر کے لوگوں کو ایسے ناول پڑھ پڑھ کر سناتا جو خود مجھے ناپسند تھے اور صرف رات کی تنہائی میں اپنے مذاق کی کتابیں پڑھا کرتا تھا۔ کبھی کبھی اشعار کہنے کی بھی کوشش کرلیتا۔ مجھے شاعری سے بہت دلچسپی تھی۔

ایک روز شام کے وقت گھر کی مستورات گرجا چلی گئی تھیں۔ صرف مالک مکان پر رہ گیا تھا۔ اس نے وقت گزارنے کے لیے مجھ سے گفتگو شروع کردی۔

" پیشکوف! وکٹر کہتا تھا کہ تم شاعر ہوگئے ہو۔ کیا یہ سچ ہے۔ اگر ایسا ہے تو مجھے بھی کچھ سُناؤ۔"

اس کی درخواست کو رد کردینا اچھا معلوم نہ ہوا اس لیے میں نے بادلِ ناخواستہ اپنا کچھ کلام سنایا۔ بظاہر وہ اسے سن کر خوش نہیں ہوا۔ تاہم مجھ سے کہنے لگا:-

" ہمت نہ ہارو۔ دل لگاکر کوشش کیے جاؤ۔ وقت آئے گا کہ تم پشکن کی برابری کرنے لگوگے۔ پشکن کا کلام بہت مقبول ہے۔ تم نے تو ضرور پڑھا ہوگا۔" پھر وہ بڑی سنجیدگی سے کہنے لگا:-

" تمھیں اچھی تعلیم حاصل کرنی چاہیے تھی لیکن اب وقت گزر چکا ہے، تمھاری بابت کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ تمھارا انجام کیا ہوگا؟ مجھے چاہیے کہ تمھاری بیاض

اچھی طرح چھپا کر رکھوں، اگر وہ مستورات کے ہاتھ لگ گئی تو تمھارا مذاق خوب اڑائیں گی۔ بھیا! عورتوں میں یہ مرض ہے انھیں دوسرے کی دکھتی رگ دبا کر بڑا لطف آتا ہے۔ سمجھے"

کچھ عرصے سے میرا مالک چپ چپ اور کھویا کھویا سا رہنے لگا تھا وہ بہت چوکنا رہتا اور ذرا سے کھٹکے پر اچھل پڑتا تھا۔ بدمزاجی کا یہ عالم تھا کہ معمولی معمولی باتوں پر الجھنے لگتا اور خواہ مخواہ ڈانٹ ڈپٹ کرتا رہتا تھا۔ گھر سے نکل جاتا تو آدھی رات سے پہلے نہ لوٹتا اور وہ بھی نشے کی حالت میں۔ سب کا خیال تھا کہ اس کی زندگی زبردست پلٹا کھا رہی ہے لیکن وجہ کسی کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔

ہر اتوار کو شام کا کھانا کھانے کے بعد میں پوری آزادی کے ساتھ سیر کرنے چلا جاتا۔ میرا وقت عموماً قہوہ خانے میں گزرتا جس کا مالک خاصا ہٹا کٹا اور گانے کا بہت شوقین تھا۔ گرجا کے مغنی اس رمز کو جانتے تھے۔ لہٰذا وہ اسی مقصد سے اس کے قہوہ خانے میں چلے جاتے وہ شراب اور چائے سے ان کی خاطر مدارات کرتا اور معاوضے میں صرف گیت گانے کے لیے کہتا۔ اس طرح گاہکوں کی بھی تواضع ہو جاتی اور وہاں ہر وقت جمگھٹا لگا رہتا۔ وہ لوگ موسیقی کے خیال سے نہیں بلکہ صرف اس لیے گاتے کہ اس طرح ان کی ڈاڑھ گرم ہو جاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ ان کی پیش کش میں صحیح ذوق کی بجائے بددلی ہوتی تھی۔ ان پارسا شرابیوں میں بعض ایسے شخص بھی شامل تھے جو ہر کس و ناکس کے سامنے گانا پسند نہ کرتے اس لیے وہ پردے کی آڑ میں بیٹھ جاتے اور گاہکوں کو صرف ان کی آواز سنائی دیتی تھی۔ اس قہوہ خانے میں زیادہ تر گاؤں

کے کسان اور مزدور آتے تھے۔ اس لیے دُکان دار عموماً انھیں سے پوچھ لیتا تھا کہ بتاؤ آج کل کون سا گانے والا زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔ اور پھر وہ کوشش کرکے اسی کو بُلا لاتا تھا۔

گانے والے عموماً اچھے ہوتے تھے اور کلشکوف خاص طور پر اچھا تھا۔ اس کے چہرے کی جھرّیاں دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا جیسے نچوڑا ہُوا آم۔ اس کی آنکھوں میں ہر وقت نیند چھائی رہتی تھی۔ جب وہ گانا شروع کرتا تو لوگ محوِ حیرت ہو جاتے کیونکہ اس کی آواز میں بڑا سوز تھا۔ وہ گانے سے کبھی نہ اُکتاتا۔ وہ چاہتا تھا کہ ساز کے تار ہر وقت جنبش میں رہیں اور اس کی آواز مسلسل نغمہ بن کر نکلتی رہے وہ اپنے دل کی پکار سے لوگوں کا دل موہ لیتا تھا۔ بعض دفعہ تو متوالے شرابی بھی نشے سے چونک کر اس کے گیت سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہوجاتے تھے۔ میں بھی بہت زیادہ متاثر ہوتا تھا۔ میں ہر اس نغمے کی قدر کرسکتا تھا جو دل کی گہرائیوں میں پہنچ کر روح کو بیدار کردے۔

گرجا کی طرح قہوہ خانے میں بھی خاموشی چھائی رہتی اور گانے والا ایسا معلوم ہوتا گویا پادری نثر میں وعظ کہنے کی بجائے گا گا کر لوگوں کے دلوں سے رنج و غم کو دھو رہا ہے۔ لوگوں پر کیفیت طاری ہونے لگتی۔ کوئی آنسو بہاتا اور کوئی صرف آہ کھینچ کر خاموش ہوجاتا۔ اس وقت مجھے محسوس ہوتا کہ لوگ اپنی روزمرہ کی زندگی میں کس قدر تصنع اور بناوٹ سے کام لیتے ہیں۔ ان کی زندگی غم سے لبریز ہوتی تھی اور پھر بھی وہ بظاہر ہنستے رہتے تھے۔

روزانہ آنے جانے والوں میں متروپولسکی خاص طور پر قابل ذکر

تھا۔ وہ گیت سنتے وقت اپنی نظریں گلاس میں بھری ہوئی شراب پر جمائے رکھتا اور کسی سے بات چیت نہ کرتا۔ باقی لوگ بھی اپنی اپنی جگہ اس طرح جمے بیٹھے رہتے۔ گویا گوند سے چپکا دیے گئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا گویا عرصے کی کوئی بھولی بسری یاد ان کے ذہن میں تازہ ہو رہی ہے۔ جس کا تصور ان کے لیے بہت عزیز ہے۔

جب کوئی مفت کا گانے والا تھک کر اپنی کرسی پر بیٹھ جاتا تو قہوہ خانے کا مالک شراب کا گلاس اسے پیش کرتے ہوئے کہتا۔

"واللہ آج آپ نے کمال کر دیا۔ اتنی خوبی کسی کے گانے میں نہیں ہے۔ کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔"

گویا خوش ہو کر کہتا۔

"اجی بات یہ ہے کہ اگر آواز اچھی ہو تو ہر شخص بڑی خوبی سے گا سکتا ہے۔ لیکن گیت کی اصل روح پیش کرنے میں صرف مجھی کو مہارت حاصل ہے۔"

"دیکھو! خود ستائی سے کام نہ لو۔" مالک ٹوک کر کہتا۔

اس کو کلنکوف کا گانا بہت پسند تھا لیکن اس کی شخصیت سے اسے نفرت تھی۔ اس لیے کبھی کبھی اس کا مذاق اڑاتا بلکہ سب کے سامنے ذلیل کر ڈالتا تھا۔ وہ اس سے کہتا تھا کہ غرور کرنا چھوڑ دو تو ساری دنیا تمھاری قدر کرنے لگے گی۔ آواز ایک خدا داد عطیہ ہے۔ لہٰذا اس پر فخر کرنا انسان کو زیب نہیں دیتا۔ گاہک بھی ہم خیال ہو کر اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگتے تھے۔

وہ بگڑ کر تیوری پر بل ڈال کر کہتا۔

اچھا تو میرے مقابلے پر بلا لو کسی اور کو۔ خدا کی یہ نعمت دوسروں

کو بھی ملی ہی۔ میں دیکھوں کہ مجھ سے بہتر کون گاتا ہی۔ میں نے اس ہنر کے سیکھنے میں بڑی محنت کی ہی۔ تم اس کی حقیقت کیا جانو۔ غالباً تم نے یہ سمجھ رکھا ہی کہ گانا بجانا مرغ لڑانے کی طرح آسان ہی۔

اور یہ کہتے کہتے وہ کنکھار کر اپنا گلا صاف کرتا اور گانا شروع کر دیتا۔ گویا نمونتہً اپنا کمال پیش کر رہا ہی۔ حالانکہ اس کی دلفریب تانیں اور رسیلے بول سب کے کانوں میں بسے ہوئے تھے۔ اس کی چنداں ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس کے گانے کے ساتھ ہی وہاں کی فضا بدل جاتی۔ کیسی بحث اور کس کی ناراضی۔ وہ سب کے گلے کا ہار بن جاتا اور داد تحسین کے نعرے بلند ہونے لگتے۔

مجھے اس شخص کی کامیابی پر رشک آنے لگتا۔ وہ کتنا ہی بُرا سہی لیکن ہر دل عزیز تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اس سے واقفیت حاصل کر کے دوستی گانٹھ لوں۔ لیکن ہمت نہیں پڑتی تھی۔ میں اس کی موسیقی سے قطع نظر خود اس کی بھی قدر کرتا تھا۔ گو اس میں چند عیب تھے لیکن نظر انداز کر دینے کے لایق۔ مثلاً ایک بار میں نے اسے مخاطب کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے بچّہ سمجھ کر مجھے ٹال دیا۔

متروپسکی اس اعتبار سے اچھا تھا۔ وہ خود دوسروں کو مخاطب کر لیتا اور چاہتا کہ آپس میں رسم و راہ بڑھتی رہے۔ اس میں نخوت نام کو نہیں تھی۔ تاہم بعض خیالات اس کے بھی عجیب تھے۔ مثلاً ایک روز میں نے پوچھا کہ میرے لیے کس کتاب کا مطالعہ بہتر رہے گا تو اس نے ناک بھوں چڑھا کر جواب دیا کہ کتابیں پڑھنے کی ضرورت ہی کیا ہی کیونکہ وقت دوسرے طریقوں سے بھی ضایع کیا جا سکتا ہی۔ لیکن جب

اس نے دیکھا کہ میں اس کے جواب سے مطمئن ہونے کی بجائے ناراض ہوگیا ہوں تو میرا دل رکھنے کے لیے بولا کہ مذہبی کتابیں پڑھ لیا کرو۔ ان کا مطالعہ تمھارے لیے مفید رہے گا۔ پھر فوراً ہی موضوع بدل کر مجھ سے پوچھنے لگا کہ میں گانا جانتا ہوں یا نہیں۔ میرے انکار پر اس نے تعجب کا اظہار کیا اور مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ اس زمانے میں سب سے زیادہ مضحکہ خیز زندگی بسر کرنے کا یہی ذریعہ ہے۔ اسے ضرور اختیار کرو۔ میرے ساتھ اس کا طرز عمل نسبتاً بہتر تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ دوسروں کے مقابلے میں مجھے بالکل مختلف پاتا تھا۔

اسے بھی کلشگوف کا گانا پسند تھا۔ اسے سنتے وقت وہ برابر داد دیتا اور بیٹھ پیچھے بھی تعریف کرتا تھا۔ لیکن اس سے قریبی تعلق پیدا کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ وہ کہتا کہ ایک حجام کا بیٹا کبھی اس لائق نہیں ہوسکتا کہ اس سے دوستی کی جائے۔ اسے تو محفل میں بیٹھنے کا طریقہ بھی نہیں آتا۔ وہ یہ تک نہیں جانتا کہ جو کچھ گا رہا ہے اس کا مفہوم کیا ہے لیکن آرٹ کے لحاظ سے خوب گاتا ہے۔ جب وہ سنجیدہ حالت میں ہوتا تو اس سے باتیں کرنے میں بڑا مزا آتا تھا۔ لوگ کہتے کہ اس نے جامعہ کازان میں تعلیم پائی ہے تو مجھے یقین نہ آتا لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ پڑھا لکھا ضرور تھا۔ وہ گفتگو کے دوران میں اکثر ایسے لفظ استعمال کرتا جن کا مطلب میرے پلّے نہ پڑتا۔ لغت دیکھنے کے بعد بھی میری مشکل حل نہ ہوتی۔ اور اگر خود اسی سے پوچھتا تو ایسا مطلب سمجھاتا کہ انسان دوبارہ اس گورکھ دھندے میں کھو کر رہ جائے۔ مثلاً ایک روز آپ فرمانے لگے:

"زندگی کی ایبسوبیت ختم ہوتی جا رہی ہے۔"

"انیسویت سے کیا مطلب ہی؟" میں نے فوراً دریافت کیا۔
"ارے بھائی! یہ لفظ انیس سے بنا ہی۔ مطلب یہ ہی کہ لوگوں میں بھائی چارہ نہیں رہا۔"

میں اس کا منہ دیکھتا رہ گیا اور اس وقت خیال آیا کہ یہ شخص خود الفاظ گھڑتا ہی۔

جب وہ نشے میں چور ہو کر مولویانہ انداز میں لوگوں پر لعنت بھیجتا تو مجھے بڑا مزہ آتا۔

"ارے میرے بھائیو! یاد رکھو۔ دنیا میں بدصورت اور بدمعاش ہی سب سے زیادہ مشہور ہوتے ہیں اور جوہر نایاب کو نظر انداز کر کے اندھے کنوئیں میں پھینک دیا جاتا ہی۔ خیر روزِ آخرت نزدیک ہی۔ وہاں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر کے رکھ دیا جائے گا۔ اس وقت پچھتانے اور افسوس کرنے سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔"

جب وہ اس قسم کی گفتگو کرتا تو میرے دل میں "دراصل صاحب" اور اسی قسم کے دوسرے لوگوں کی یاد تازہ ہو جاتی۔

میری اور اس کی دوستی ایک عجیب وغریب طریقے پر ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔

موسم بہار کا زمانہ تھا۔ میں سیر کے لیے نکلا تو میدان میں اس سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ وہ بھی چہل قدمی کے ارادے سے آیا تھا۔ ہم دونوں ساتھ ہو لیے۔ اس وقت اس کی چال عجیب متوالی تھی۔ اچانک ہم نے ایک خیمے کے اندر ایک شخص کو گڑھے میں دیکھا۔ اس نے ایک طرف کو جھک کر گڑھے کے کنارے کا سہارا لے رکھا تھا۔ اس کے کوٹ کا کالر اس طرح

اوپر کی طرف اٹھا ہوا تھا کہ کان تک ڈھک گئے تھے۔ ایسا معلوم ہوا کہ وہ اسے اتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اسے دیکھتے ہی ٹھہر گیا اور بولا کہ یہ شخص نشے میں چور معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس کے قریب ہی گھاس پر ایک ریوالور اور کچھ فاصلے پر ہیٹ پڑی تھی۔ ہیٹ کے قریب شراب کی بوتل رکھی تھی جس کے اندر سے بمشکل دو چار گھونٹ پیے گئے ہوں گے اس شخص کا چہرہ کوٹ کی آڑ میں تھا۔ دور سے دکھائی نہ دے سکا۔ میرا ساتھی کچھ دیر خاموش کھڑا دیکھتا رہا۔ پھر الفاظ پر زور دے کر بولا:۔

"ارے! اس نے تو خودکشی کر لی ہے"

تب اس شخص کی بے حسی دیکھ کر مجھے بھی یقین ہو گیا کہ وہ زندہ نہیں ہے۔ مجھے نہ تو ڈر لگا اور نہ اس کی حالت پر رحم آیا۔ میں صرف حیران تھا کہ کوئی شخص موسم بہار کی اتنی خوشگوار شام کو کس طرح خود کشی کر سکتا ہے، حالانکہ ایسے سمے تو بہت سی بے جان چیزوں میں بھی جان پڑ جاتی ہے

متر دیوسکی نے اسے اچھی طرح دیکھ بھال کر جب پورا یقین کر لیا کہ آثارِ حیات باقی نہیں ہیں تو مجھ سے کہا کہ شہر جا کر جلدی سے پولیس کو لے آؤ تاکہ معاملے کی تحقیقات شروع کر دی جائے اور خود گڑھے کے کنارے پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔

جب میں پولیس کو اطلاع کر کے واپس آیا تو وہ وہاں پڑی ہوئی بوتل کی شراب پی کر نشے میں بالکل دھت ہو چکا تھا۔ اس کے ہوش و حواس تک باقی نہیں تھے۔ مجھے دیکھ کر اس نے خالی بوتل کو زمین پر زور سے دے ٹپکا اور چلا کر بولا:۔

"یہی وہ بہتی ہوئی آگ ہے جس نے اس شخص کی زندگی کو تباہ کر دیا"

اس کی حالت دیکھ کر پولیس انسپکٹر کا ماتھا ٹھنکا کہ ہو نہ ہو یہی قاتل ہے
اس نے دریافت کیا:-

"تم کون ہو؟"

"تمھیں اس سے کیا غرض"

"اچھا تو پھر اپنا بیان لکھواؤ۔ تم ایک مردہ شخص کے پاس نشے کی حالت میں موجود ہو۔ ظاہر ہے کہ تم پر شبہ کیا جا سکتا ہے"

"نشے کی حالت! یہ تو میری زندگی کا ایک جزو ہے۔ میں گزشتہ بیس سال سے شراب پینے کا عادی ہوں"

انسپکٹر نے گڑھے میں اُتر کر مرنے والے کو اچھی طرح دیکھا بھالا۔ اور پھر باہر نکل کر سپاہیوں کو اشارہ کیا کہ اس شرابی کو ہتھکڑی لگا دو۔ میں وفورِ جذبات سے اس قدر بدحواس ہو گیا تھا کہ میری زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا اور وہ خدائی فوجدار میرے ساتھی کو گرفتار کر کے چلتے بنے۔

میں نے اپنے مالک سے کلشکوف کے گانے کی اس قدر تعریف کی تھی کہ ایک روز وہ بھی قہوہ خانے میں جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ وہاں پہنچتے ہی اس نے ناک بھوں سُکیڑنی شروع کر دی۔ وہاں کے ماحول اور فضا میں پھیلی ہوئی بدبو سے اسے خاص طور پر کراہت آ رہی تھی۔ لیکن جب گانا شروع ہوا تو وہ ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اور میری طرف ایسی نظروں سے دیکھنے لگا گویا میرے حسنِ انتخاب کی داد دے رہا تھا۔ کلشکوف خوب مزے میں گاتا رہا۔ اس کی آواز میں بڑا درد تھا۔ اور

جب وہ گیت کے اس حصے پر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ میرے مالک کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے ہیں۔

میں ہوں ایک دکھیاری بچاری　　تنہا گانو میں رہتی ہوں
کپڑے ہیں میرے بوسیدہ پرانے　　اشکوں سے انھیں دھوتی ہوں

گیت ختم ہونے سے پہلے وہ بے قرار ہوگیا اور مجھ سے کہنے لگا کہ اب برداشت ناممکن ہے۔ آؤ گھر چلیں لیکن راستے میں ایک رستوران کے سامنے سے گزرتے وقت بولا کہ ایسی حالت میں گھر جانا مناسب نہیں ہے۔ چلو اس جگہ کچھ کھا پی کر اپنی طبیعت بحال کریں۔

رستوران میں بیٹھ کر اس نے گویے کو برا بھلا کہنا شروع کردیا۔ "اس نے میری حالت دگرگوں کردی۔ ایسا گیت بھی کس کام کا جو انسان سے اس کی مسرت چھین لے۔ اچھا تمھیں بتاؤ تم نے بہت سی کتابیں پڑھی ہیں۔ آخر سوز میں ڈوبی ہوئی ان تک بندیوں سے کیا حاصل ہے؟ سب جانتے ہیں کہ ہماری زندگی اسی طرح گزرتی ہے۔ خود میری مثال لو، میری عمر چالیس سال ہے۔ میں نے شادی کی، بچے بھی ہوئے لیکن آج تک کوئی غم گسار نہ مل سکا۔ زندگی میں بعض لمحے ایسے بھی گزرتے ہیں بلکہ انسان دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے چاہتا ہے کہ اپنا رنج وغم کسی دوسرے سے بیان کرے۔ میں ایسی باتیں اپنی بیوی سے نہیں کرسکتا میرے اور اُس کے خیالات کی راہیں جُدا جُدا ہیں۔ وہ ہر وقت بچوں کی دیکھ بھال اور گھر کے کام کاج میں پھنسی رہتی ہے۔ اسے اتنا وقت ہی نہیں ملتا کہ اطمینان سے بیٹھ کر دو گھڑی باتیں کرے۔ بیوی بچہ ہونے سے پہلے ہماری رفیق رہتی ہے اور پھر اجنبی ہو جاتی ہے۔ میرے دل کا یہ

بوجھ کسی طرح کم ہونے میں نہیں آتا۔ بھیا! تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ دکان کا ہر شخص بدمعاش ہے۔ ہر روز کچھ نہ کچھ لوٹ لینا چاہتا ہے۔ میں اس بات کو جانتا ہوں۔ تم بھی جانتے ہو۔ لیکن اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار تم نے ایران جانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ وہاں جانے میں ایک فایدہ ضرور ہے۔ ان کی بول چال بالکل مختلف ہے۔ تم ان کی زبان نہیں سمجھ سکوگے۔ خواہ وہ گالیاں بکتے رہیں۔

وہ جام پر جام پیتا رہا، پھر بھی بدحواس نہیں ہوا۔ البتہ گفتگو میں تیزی پیدا ہوتی چلی گئی۔

"لوگ کہتے ہیں کہ گفتگو چاندی ہے اور خاموشی سونا۔ لیکن بھیا! میں سمجھتا ہوں کہ غم ہر حال میں اپنا رنگ دکھاتا ہے۔ ہم لوگوں کی زندگی کچھ ایسی ہوگئی ہے کہ محفل میں ہوتے ہوئے بھی تنہائی محسوس کرتے ہیں۔"

وہ کسی سوچ میں پڑکر ایک لمحے کے لیے خاموش ہوگیا۔ اور پھر بولنا شروع کردیا۔

"عرصہ ہوا میری ملاقات ایک لڑکی سے ہوئی۔ اس کا خاوند کسی جرم میں ماخوذ ہوکر سائبیریا بھیج دیا گیا تھا۔ وہ روپیہ پیسا نہ ہونے کے باعث بڑی مصیبت کی زندگی بسر کررہی تھی۔ میں نے اس کی مالی مدد کی۔ اور اس اعتبار سے ہم دونوں میں ربط ضبط بڑھتا چلا گیا۔ میں نے اس سے کہا کہ تمھارا خاوند بدمعاش تھا۔ جبھی تو جلاوطن کردیا گیا اس کا خیال دل سے نکالو اور کسی دوسرے کے ساتھ اپنی دنیا قایم کرلو۔ لیکن وہ کسی عنوان رضامند نہ ہوئی۔ وہ یہی کہتی رہی کہ اچھا ہو یا بُرا۔ میرا خاوند ہے۔ میں اس کے نام پر زندہ رہوں گی۔ بیہودہ

کم عقل چھوکری۔ آخری ملاقات کے وقت میری جیب میں کوئی اسّی روبل تھے۔ وہ سب کے سب میں نے اسے دے دیے۔ اور پھر کبھی نہیں ملا۔ بعد میں خدا جانے اس کا کیا حشر ہوا مجھے کچھ معلوم نہیں۔ آؤ اب گھر چلیں۔"

مجھے یہ واقعات سُن کر کچھ زیادہ تعجب نہیں ہوا۔ میں پہلے سے محسوس کرتا تھا کہ اس کی روح پر کوئی زبردست بوجھ ہے میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

بیسواں باب

متواتر تین سال میں اس مُردار شہر کی سنسان عمارتوں میں زندہ درگور مزدوروں کی کارگزاری کا جائزہ لیتا رہا۔ سردیوں میں یہ بھلے مانس جن مکانوں کو توڑ دیتے بہار میں دوبارہ انھیں بنا کر کھڑا کر دیتے۔

مالک اس اُدھیڑ بُن میں مبتلا رہتا کہ کہیں میں مفت کی تنخواہ تو نہیں اڑا رہا ہوں۔ چنانچہ اگر کسی کمرے کا فرش بدلنا ہوا تو میرا بھی فرض تھا کہ مٹّی ہٹانے میں ہاتھ بٹاؤں۔ اس احمق کی سمجھ میں یہ نہ آتا تھا کہ جیسے ہی میری آنکھ بچی کسی نے تالا کھول کر یا چٹخنی اُتار کر جیب میں رکھ لی۔

مزدور اور ٹھیکے دار دونوں مجھے دھوکہ دینے کی فکر میں رہتے اور بلاتکلّف چیزوں پر ہاتھ صاف کرتے۔ اور اگر میں ان پر چوری کا الزام لگاتا تو غصے کی بجائے اُنھیں حیرت ہوتی۔

"میاں، چند ٹکوں کے لیے دُنیا سر پر اٹھاتے ہو۔ تم نے بھی یہ کیا سودا سر لیا ہے۔"

میں نے مالک سے کہا کہ آپ ٹکے کی بچت کی خاطر مجھ سے مٹی اُٹھواتے ہیں۔ اور یہ نہیں دیکھتے کہ میری غیر حاضری میں اس سے دس گنا نقصان ہو جاتا ہے۔ لیکن اس نے مجھے گھور کر بس یہ جواب دیا۔

"فکر نہ کرو۔ اللہ مدد کرے گا۔"

میں سمجھ گیا کہ اسے میری نیت پر شبہہ ہے کہ میں چوروں کی امداد

کرتا ہوں۔ اس شبہہ کی وجہ سے مجھے اُس سے نفرت ہوگئی۔ لیکن غصّہ نہ آیا۔ اس طبقے میں چوری ایک فطری امر تھا اور مالک بھی پیراپا دھن مارنے کی تاک میں رہتا تھا۔

میلے کے بعد وہ ان دُکانوں کا معاینہ کرتا جن میں تبدیلی کرنی تھی اور اگر اس کی نگاہ کسی بھولے ہوئے برتن، دری یا قینچی پر پڑجاتی تو تو اس کی باچھیں کھل جاتیں اور وہ کہتا :۔

"اس مال غنیمت کی فہرست بنا کر داخل دفتر کردو۔"

لیکن بعد میں وہ ان چیزوں کو اپنے گھر لے جاتا اور مجھے حکم دیتا کہ فہرست سے انھیں خارج کردو۔

مجھے مال متاع سے کوئی دل چسپی نہ تھی اور میں کسی قسم کی ملکیت نہ چاہتا تھا۔ بلکہ زیادہ کتابیں ہوتے ہی مجھے کوفت ہونے لگتی تھی۔ اور سچ پوچھیے تو فرانسیسی شاعر "برانژیر" اور جرمن شاعر "ہائنے" کی کی نظموں کے سوا میرے پاس کچھ نہ تھا۔ پشکن کی نظمیں خریدنے کو بہت جی چاہتا لیکن کمبخت کتب فروش نے اس کی قیمت میں قارون کا خزانہ طلب کیا۔ مالک کے گھر میں جو آئینوں اور پھول دانوں کا انبار جمع ہوتا جاتا تھا تو مجھے اسے دیکھ دیکھ کر سخت وحشت ہوتی۔ خصوصاً مالکہ کے کمرے کی یہ حالت تھی جیسے کسی گنوار عورت نے اپنے صندوق کو بھرنے کے لیے ہر قسم کا کباڑ اُس میں بند کرلیا ہو۔ مالک کی یہ حرکت مجھے سخت ناپسند تھی۔ کہ گودام میں سے دوسروں کی چیزیں چرا لاتا تھا۔ ملکۂ حُسن کے کمروں میں بھی سامان اَٹا پڑا تھا لیکن اس کی رونق میں زیادہ فرق نہ آیا تھا۔

اس قسم کی زندگی میرے لیے قطعاً بے معنی تھی۔ ہمارا یہ کام تھا کہ

سال بھر عمارتیں بنایا کریں اور قدرت کا کام یہ تھا کہ ہر سال سیلاب بھیج کر ہر چیز کو تہ و بالا کر دے۔ دس برس سے یہی ہوتا آیا تھا اور بازار اس لیے بنتا تھا کہ پھر بگڑ جائے۔ بہار شروع ہوتے ہی برف پگھلتی اور بند ٹوٹ جاتے لوگ رو دھو کر پھر دیوار کھڑی کرتے لیکن پانی دوبارہ اُسے بہا لے جاتا۔ بس یہی چکّر تھا جو زندگی بھر چلا کرتا اور ہم جہاں تھے وہیں رہتے۔ جب میں نے اوسپ سے اس گورکھ دھندے کا ذکر کیا تو وہ بولا :-

"ارے بگلے بھگت، تجھے ان باتوں سے کیا واسطہ؟"

لیکن پھر وہ قدرے سنجیدگی سے کہنے لگا۔

"گو یہ سچ ہے کہ اس معاملے سے تمھارا کوئی تعلق نہیں تاہم اس کی نوعیت کو سمجھنے میں کوئی مضایقہ نہیں"

اس کے بعد شعر و اشعار اور پہیلی اور ضلع جگت کی چاشنی کے ساتھ اس نے یہ فلسفہ بیان کیا:-

"یہ ایک ایسا حادثہ ہے کہ انسانوں پر رحم کرنا چاہیے۔ بے چاروں کے پاس زرا زرا سی زمینیں ہوتی ہیں جنھیں دریائے وولگا کی پُرجوش لہریں بہالے جاتی ہیں۔ جب یہ مصیبت گئی تو برسات کی بلا زمین پر نازل ہوتی ہے۔

اب جنگل کی آگ کو لو۔

یہاں یہ کہ دوں کہ کوئی ایسا سال نہ جاتا تھا کہ جنگلوں میں آگ نہ لگتی ہو۔ جولائی کے مہینے میں اکثر آسمان پر دھنوئیں کے بادل چھا جاتے تھے۔

خیر، اوسپ کا سلسلۂ کلام یوں جاری رہا :۔

"لیکن جنگلوں کی بات کون پوچھے۔ زار یا راجا رئیس اُن کے مالک ہوتے ہیں، کسانوں کو ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ اور اگر شہروں میں آگ لگ جائے۔ تو بھی کوئی تردد نہیں کرتا۔ شہر میں امیر ہی تو رہتے ہیں اور امیر رحم و کرم کے ہرگز مستحق نہیں۔ لیکن سینکڑوں دیہات آگ کی نذر ہو جاتے ہیں۔ ہر سال بمشکل ایک سو۔ اس پر بھی کسان شاکی ہیں کہ یہ بہت بڑا نقصان ہے۔"

وہ بے اختیار ہنس پڑا : "بعض امیروں کو اپنی جایداد کے انتظام کا طریقہ نہیں آتا۔ اور یہ کتنی عجیب بات ہے کہ بہت سے لوگوں کی زندگی آگ اور پانی کی تباہ کاریوں سے لڑتے ہوئے گزر جاتی ہے۔"

"اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟"

"کیوں نہیں؟ نہ تو تمھارے آنسو آگ بجھا سکتے ہیں اور نہ پانی کی مقدار کو بڑھا سکتے ہیں۔"

یہ تو میں جانتا تھا کہ آج تک ایسے دانش مند سے دوچار ہونے کا موقع نہیں ملا، لیکن اس مردِ خدا کو کن چیزوں سے نفرت تھی اور کن سے محبت۔ میں اسی ادھیڑ بن میں رہتا تھا اور وہ اپنی مخصوص طرز میں اس قسم کے چُبھتے ہوئے بول سُنایا کرتا تھا :۔

"یہ سمجھنے کی کوشش کرو کہ معمولی لوگوں کی محنت کس طرح ضایع ہوتی ہے۔ تمھارا مالک تم سے کیا بُرا برتاؤ کرتا ہے۔ اور یہ دو ٹنگے جانور یہ نہیں سوچتے کہ مکان تو ٹوٹ کر ازسرِ نو بن سکتا ہے لیکن انسان ٹوٹ کر پھر سے اپنے جوہر کو نہیں پاتا۔"

ایک مرتبہ میں نے پوچھا: "تم میرے خیالات کی رپٹ مالک کو کیوں پہنچایا کرتے ہو؟"

اس نے بے باکی سے جواب دیا: "تاکہ وہ تمھارے نیک و بد سے آگاہ ہو جائے۔ اس کا فرض ہے کہ تمھارے خیالات کی اصلاح کرے۔ میں تمھارا ذکر شکایت کے طور پر نہیں کرتا بلکہ اس لیے کہ تم پر مجھے ترس آتا ہے۔ تم بے وقوف تو نہیں ہو لیکن تمھارے دماغ میں شیطان نے گھر کر لیا ہے۔ اگر میں تمھیں شراب پیتے چوری یا زنا کرتے دیکھ لیتا تو ہرگز کچھ نہ کہتا، لیکن تمھاری بیہودہ سرائی کی رپٹ مالک تک ضرور پہنچاؤں گا۔"

"اس کا یہ مطلب ہے کہ میں آیندہ تم سے بات چیت نہ کروں۔"

کچھ دیر چپ رہ کر اُس نے محبت بھری نظروں سے مجھے دیکھا اور کہا:

"یہ تو نہیں ہونے کا۔ میرے سوا اور کون ہے جس سے باتیں کرنے میں تمھیں مزہ آئے؟"

اوسپ کی کوئی نہ کوئی بات ان سب بوڑھوں سے ملتی جلتی تھی جن سے میں پہلے مل چکا تھا۔ نانا، لوہار یا کوف یا چغل خور پیٹر۔ یہ سب اپنی اپنی جگہ نہایت دل چسپ تھے۔ لیکن کسی بوڑھے کے ساتھ زندگی نبھانا سخت دشوار امر ہے۔ اس سے بڑا بار یا سزا اور کیا ہو سکتی ہے۔ ان کی روحوں میں گھُن لگ چکا تھا۔ ان کی ساری لن ترانی دلوں کی سیاہ کاری کو نہ چھپا سکتی تھی۔ کیا اوسپ نیک دل تھا؟ ۔ نہیں۔ تو کیا وہ سیاہ قلب تھا؟ یہ بھی نہیں۔ میری سمجھ میں تو بس اتنا آیا کہ وہ نہایت سرتا اور سیانا ہے۔ لیکن اس کی ذہانت میں سرد مہری کا ایسا پہلو ہوتا کہ میں گھبرا

جاتا۔ اس کی باتوں سے متاثر ہو کر اس قسم کے خیالات میرے ذہن میں گردش کرنے لگتے۔

"میٹھی میٹھی باتوں اور مسکراہٹوں کے باوجود تمام انسان ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں۔ یہی نہیں، بلکہ ساری دُنیا ہمارے لیے اجنبی ہی اور ہم اس کے لیے کوئی خاص محبت محسوس نہیں کرتے۔ نانی اور ملکۂ حسن کے علاوہ اور کسی کو میں نے زندگی سے بے لوث محبت کرتے نہیں دیکھا"۔

اس قسم کے وسوسے میرے گرد و پیش کو زیادہ تاریک بنا دیتے تھے۔ یہ زندگی زیادہ تکلیف دہ ہوتی جاتی تھی لیکن اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا؟ اوسپ کے سوا اور کوئی نہ تھا جس سے ہم کلام ہو کر لطف آئے۔ وہ میری گرم کلامی سے محظوظ ہوتا، چھیڑ چھاڑ کرتا اور آخر میں کہتا:-

"میاں، تم راہب بن کر کسی خانقاہ میں کیوں نہ رہو۔ پادریوں سے خوب بحث کرنا اور خاموشی کی زندگی گزارنا۔ یہ تو ظاہر ہی کہ تم دُنیا کے کام کے نہیں"۔

بھلا خانقاہ سے مجھے کیا سروکار، تاہم یہ احساس ضرور ہوتا تھا کہ دُنیا کے گورکھ دھندے میں میں گم ہو رہا ہوں۔ گویا زندگی پت جھڑ کے جنگل میں بسر ہو رہی تھی۔ سوکھے ساکھے جنگل سے زیادہ وحشت خیز اور کوئی ماحول نہیں ہو سکتا۔

نہ مجھے شراب پسند تھی نہ عورت۔ ان دونوں کا نشہ مجھے کتاب میں ملتا تھا۔ لیکن میرا مطالعہ جتنا وسیع ہوتا جاتا۔ اس قسم کی بے معنی زندگی بسر کرنا میرے لیے اتنا ہی ناممکن ہوتا جاتا۔

ابھی میری عمر صرف پندرہ سال تھی، لیکن کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا کہ میں بوڑھا ہوگیا ہوں۔ غور و فکر اور علم و مشاہدہ نے میرے دل و دماغ پر ایک بھاری وزن لاد دیا تھا۔ جب میں اپنے لاشعور کا تجزیہ کرتا تو یہ محسوس ہوتا کہ یہ ایک اندھیرا کباڑ خانہ ہے جس میں ہر قسم کی بھلی بُری چیزوں کا انبار لگا ہُوا ہے اور ان کا انتخاب کرنا میری صلاحیت سے باہر ہے۔ اور اس بہتات کے باوجود یہ چیزیں گویا بند نہ تھیں بلکہ دماغ کے پردوں میں تیرا کرتی تھیں جس کی وجہ سے میری طبیعت کو کبھی قرار میسر نہ ہوتا تھا۔

بیماری، ناخوشی اور چغل خوری وغیرہ کے نام سے بھی مجھے چڑھتی جبر و ظلم یا بدگوئی سے مجھے طبعاً نفرت تھی، اور اسے دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اُتر آتا تھا۔ چنانچہ اس قسم کے مشاہدے کے بعد میں خود بخود پیچ و تاب کھا کر اپنے کو جلایا کرتا۔

کبھی کبھی تو کسی ظالم کی حرکت مجھے دیوانہ بنا دیتی اور میں بے سوچے سمجھے اس پر ٹوٹ پڑتا۔ اب تک مجھے اس قسم کے دنگوں کی تفصیل یاد ہے۔

میرے اندر دو شخصیتیں پوشیدہ تھیں۔ ان میں سے ایک کو صرف برائیوں اور مظالم کا احساس تھا اور یہ احساس اس قدر رُوح سوز تھا کہ میں انسانوں کو حقیر اور ذلیل سمجھنے لگا۔ یہ شخصیت ایک خاموش ماحول کی جویا تھی جس میں کتابوں کے سوا کچھ نہ ہو۔ اس دُنیا میں انسان نہ ہوں، صرف خانقاہیں یا جنگل کے رکھوالوں کی جھونپڑیاں ہوں۔ اس عالم میں میں فارس کی سیر کرتا یا اپنے کو شہر کے باہر رات کے وقت پہرے دار کی خدمت انجام دیتے تصوّر کرتا۔

میری دوسری شخصیت کو عظیم الشان کتابوں نے تشکیل دی تھی۔ وہ جبر و ظلم سے لڑنے کو ہمیشہ تیار رہتی تھی اور اس کی محبت و عداوت بے حرکت نہ ہوتی۔ وہ ہمیشہ شمشیر بکف ہر دشمن کے مقابلے کے لیے تیار رہتی تھی۔

اِس زمانے میں میرا ایک سخت دشمن تھا جو کسی قحبہ خانے کا دربان تھا۔ ایک صبح بازار جاتے ہوئے کیا دیکھتا ہوں کہ ایک تانگے والے نے اس چکلے گھر کے آگے اپنی گاڑی روکی۔ تانگے کے اندر شراب کے نشے میں بیہوش ایک طوایف پڑی ہوئی تھی۔ تانگے والے نے اس کی ٹانگیں پکڑ کر اس بے دردی سے کھینچا کہ وہ کمر تک ننگی ہوگئی اور پھر زور سے قہقہہ لگا کر اس نے اس کے جسم پر تھوک دیا۔ وہ بال پریشاں لڑکھڑاتی ہوئی گاڑی سے اُتری اور مُنہ کے بل سیڑھیوں پر گر پڑی۔

تانگے والا تو چلتا بنا۔ اب دربان نے طوایف کی ٹانگیں پکڑ کر اسے یوں کھینچنا شروع کیا گویا کوئی مردہ لاش ہو۔ مجھے بڑا طیش آیا اور میں اس پر جھپٹا۔ لیکن ایک بالٹی سے ٹکرا گیا اور اس طرح ہم دونوں کی کھوپڑیاں سلامت رہ گئیں۔ دربان کو زور سے دھکّا دے کر میں نے پھاٹک پر وہ کہرام مچایا کہ لوگ بھنّا کر دوڑ پڑے۔ یہ دیکھ کر میں سستی بھول گیا اور فوراً بھاگ کھڑا ہوا۔

راستے میں وہی تانگہ ملا۔ تانگے والے نے کہا:

"یار تم نے بھی اس دربان کو خوب پٹخنی دی"

میں نے بگڑ کر کہا کہ تم نے طوایف کو اس بے درد دربان کے سپرد کیوں کیا۔ اس نے آنکھیں مٹکا کر جواب دیا۔

"میری بلا سے - مجھے تو ایک صاحب نے منہ مانگا کرایہ دیا کہ اس لونڈیا کو اس کے ڈیرے پُہنچا آؤں"۔

"اور اگر دربان اسے مار ڈالتا"۔

"اجی یہ طوائفیں ہیں بھی اسی قابل"۔

اس واقعے کے بعد تقریباً ہر روز اس دربان سے سلام علیک ہُوا کرتی تھی۔ وہ چکلے گھر کی گزرگاہ صاف کرتا ہوتا یا سیڑھیوں پر ایسے پینترے سے بیٹھا ہوتا گویا میرا ہی انتظار کر رہا ہے۔ میرے قریب آتے ہی وہ آستینیں چڑھاکر اعلان کرتا:

"آج میں تمھاری تکا بوٹی کر کے رہوں گا"۔

اس کی عمر چالیس سے زیادہ تھی اور اس کے ہاتھ اتنے چھوٹے اور توند اتنی بڑی تھی کہ ہاتھا پائی اس کے بس کی بات نہ تھی۔ اس لیے دو تین داؤں پیچ کے بعد وہ مجھے چھوڑ دیتا اور سخت حیرت کے عالم میں کہتا:

"ارے لونڈے، تو تو بڑا ہوشیار ہے"۔

میں اس کُشتی سے تنگ آگیا اور ایک دن اس سے پوچھا:

"آخر تم یہ چھیڑ چھاڑ بند کیوں نہیں کر دیتے"۔

"لیکن لڑائی تو تو نے ہی شروع کی تھی"۔

"تم نے اس لڑکی کی توہین کیوں کی؟"

"اس سے تمھیں کیا؟ کیا تمھیں افسوس ہوا؟"

"کیوں نہیں؟"

"کیا تمھیں کسی حیوان کے لیے بھی افسوس ہوگا؟"

"ضرور۔"

"ٹھیر تو رے گاؤدی، میں تیری گوشمالی کرتا ہوں۔"

یہ راستہ تو میں چھوڑ نہ سکتا تھا کیونکہ وہ سب سے قریب کا تھا، لیکن اس گھامڑ سے بچنے کے لیے میں صبح اُٹھنے لگا۔ ایک دن میں نے اسے سیڑھیوں پر کسی بلی کو کھلاتے ہوئے پایا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے بلّی کا سر پتھّر سے دے مارا اور جب اس کا خون ہر طرف پھیل گیا تو اس نے ایک فاتحانہ نعرہ لگایا:

"اب تو میرا کیا بگاڑ سکتا ہی؟"

ہم دونوں میں دیر تک کشتی ہوتی رہی۔ اور اس کے بعد عرصے تک مجھ پر رنج وغم کی کیفیت طاری رہی۔ جب کبھی مجھے یہ بات یاد آتی ہی تو تعجب ہوتا ہی کہ میں پاگل کیوں نہ ہوگیا اور کسی کو قتل کیوں نہ کر دیا۔

یہ سب گھنونی باتیں آپ کے گوش گزار کرنے سے مُراد یہ ہی کہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ ابھی ان کا سلسلہ بند نہیں ہوا۔ آپ کو ہیبتناک افسانے اور خوں چکاں واقعات پسند ہیں۔ لیکن میں نے اس اندھی اور اندھیری دُنیا میں چلتے پھرتے دیکھا ہی وہ کہیں زیادہ اندوہ ناک ہی اور خواہ آپ کو اُسے پڑھ کر لطف آئے، یا نہ آئے آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ آپ کی تہذیب کی نوعیت کیا ہی۔ حقیقت یہ ہی کہ آپ کی زندگی گھنونی اور گندی ہی۔

میں انسانیت کا پروانہ ہوں اور کسی کو دُکھ دینا میرا مشرب نہیں لیکن حسین دروغ کے پردے میں تلخ حقیقت کو چھپانا بہت بڑا گناہ

ہے۔ ہمیں زندگی کو توڑ مروڑ کر دیکھنے کا حق نہیں۔ دلوں کی نیکی اور دماغوں کی تازگی پر از سرِ نو جلا ہونی چاہیے۔ مجھ پر سب سے زیادہ اثر اس ہتک آمیز نظریے کا ہوا جو مرد عورت کے متعلق رکھتا ہے۔ کتابوں کے مطالعے نے مجھے یہ باور کرا دیا تھا کہ عورت دنیا کی بہترین اور حسین ترین ہستی ہے۔ نانی کی کہانیوں سے اس خیال کی تصدیق ہوئی۔ اور دھوبن نتالیا سے مل کر اور ان چتونوں اور مسکراہٹوں کو دیکھ کر جن سے عورت زندگی کے اندھیرے کو اُجالتی ہے، میرا یقین اور بھی راسخ ہو گیا۔

شام کو بازار سے لوٹتے ہوئے میں ایک ٹیلے پر چڑھ کر ڈوبتے ہوئے سورج کا نظارہ کیا کرتا۔ دریا کے پانی اور آسمان کی وسعت میں آگ سی لگی ہوئی اور ہر طرف رنگوں کا میلا سا لگ جاتا

اب میں ہمیشہ باہر کے ملکوں اور ان بڑے بڑے شہروں کے تصوّر میں مگن رہنے لگا جہاں لوگوں کی زندگی کا ڈھانچہ بالکل مختلف تھا۔ روس کی بوجھل اور ناکارہ زندگی کے مقابلے میں وہ زندگی کہیں زیادہ صاف ستھری تھی جس کی تصویر غیر ملکی مصنّف پیش کیا کرتے تھے۔ اس تصور سے میری بے چینی کچھ رام ہوتی اور میں سوچتا کہ دنیا روس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔

ایک روز میں اس ٹیلے پر بیٹھا قدرت کا نظّارہ کر رہا تھا کہ میرا ماموں یاکوف اُدھر آ نکلا۔ میں نے دیکھی ان دیکھی کر دی اور پھر کر اُسے دیکھا بھی نہیں۔ گو ہم دونوں برسوں سے ایک ہی شہر میں رہتے تھے لیکن ملنے کا اتفاق شاذ و نادر ہوتا اور وہ بھی ایک آدھ لمحے

کے لیے۔

اس نے ہنس کر کہا: "میاں، تمھاری باڑھ کسی تاڑ کے پیڑ سے کم نہیں"۔ اس کے بعد ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔

نانی کی زبانی میں سُن چکا تھا کہ یہ زمانہ ماموں نے نِٹھلّے بازی اور دنگے فساد میں گزارا۔ کہیں نوکری مل گئی تھی وہ بھی لڑ جھگڑ کر چھوڑ بیٹھے اب بیٹے کی کمائی پر حضرت کی گزر بسر تھی۔ لڑکا کلیسا کی سنگیت منڈلی میں ملازم تھا۔

ماموں پر عمر کا اثر صاف ہویدا تھا اور وہ کوئی پر شکستہ کوّا معلوم ہوتا تھا۔ جُھرّیاں پڑ گئی تھیں، رگیں اُبھر آئی تھیں، دانت ٹوٹ گئے تھے۔

میں نے موقعہ غنیمت جانا کہ ایک ایسے شخص سے ملاقات ہوئی جو جہاں دیدہ اور تجربہ کار تھا اور جس کی بولی ٹھولی سے محفل گرم رہا کرتی تھی۔

سڑک پر خوش پوشاک شہریوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی اور ماموں کبھی انھیں دیکھتا اور کبھی اپنی دھجیوں کو دیکھتا اور سخت پیچ و تاب کھاتا۔ وہاں سے اُٹھ کر ہم لوگ ایک قہوہ خانے میں جا بیٹھے۔ اس نے شراب پیتے ہوئے کہا:۔

"عمر اتنی گزر گئی اور ہمیں جینے کا انداز نہ آیا۔ تم شراب نہیں پیتے، اچھا کرتے ہو۔ کبھی نانا سے بھی ملتے ہو؟ وہ بھی بے چارے رو بسور کر زندگی کے باقی دن کاٹ رہے ہیں۔ مجھے تو وہم ہوتا ہے کہ وہ پاگل ہو رہے ہیں"۔

شراب پی کر اس میں جان آگئی اور وہ گویا اپنی رگوں میں جوانی

اور تازگی محسوس کرنے لگا:-

"جب میں اپنے ماضی کو دیکھتا ہوں تو شرم آتی ہے۔ اس میں خوشی کا جو عنصر تھا وہ تو دوسروں کا تھا اور میرے حصّے میں غم کے سوا کچھ نہ تھا۔ جب کبھی میں خوش ہونے کی کوشش کرتا تو میرے ابّا ڈانٹ کر کہتے :- خبردار! اور بیوی ڈپٹ کر کہتی : ہوشیار! میاں یوں ہی دن بیت گئے اور اب میں اپنے بیٹے کا غلام بنا پڑا ہوں۔ بھائی اسے سچ سمجھو۔ میں نوکر کی طرح اس کی خدمت انجام دیتا ہوں اور وہ آقا کی طرح مجھ پر حکم چلاتا ہے۔ ہاں، وہ اتنی شرافت ضرور برتتا ہے کہ اب بھی مجھے ابّا کہہ کر پکار لیتا ہے۔ کیا اسی دن کے لیے ساری عمر میں جد و جہد کرتا رہا کہ بڑھاپے میں اپنے بیٹے کی چاکری کروں۔ اسے چھوڑو، یہ کہو کہ ہم پیدا ہی کیوں ہوئے اور اس تگ و دو کا ماحصل کیا ہے؟"

میں نے یوں ہی ایک جملہ تراشا :

"خبر نہیں کہ میری زندگی کا کیا انجام ہونا ہے"

اس نے قہقہہ لگا کر جواب دیا: "کسی کو اپنے مقدر کا حال کیا معلوم۔ لوگ اسی لاعلمی کی حالت میں زندہ رہتے اور مر جاتے ہیں"

باتیں کرتے کرتے وہ تھک گیا اور شراب کے خالی پیالے کے اندر ایک آنکھ بند کر کے کسی نقطے کو گھورنے لگا۔ سگریٹ کا دھنواں مونچھ کے بالوں میں پھیلانے لگا۔

"جد و جہد بے کار ہے۔ کسی شئی کی توقع نہ کرو۔ کیونکہ انجام موت کے سوا کچھ نہیں" یہ کاریگر ہیٹر کے الفاظ تھے اور وہ ماموں

سے کس قدر مختلف تھا۔ مجھے اس قسم کے بے شمار اقوال بر زبان تھے۔

اب ماموں سے مجھے کچھ اور نہ پوچھنا تھا۔ اس کی سنگت میں رہ کر آدمی پر اُداسی طاری ہو جاتی تھی۔ تاہم مجھے اس پر ترس آیا۔ اس کے چہکتے ہوئے گیتوں اور سریلے چھتارے کو یاد کر کے میں بہت تڑپا۔ مجھے وہ زندہ دل بالکڑا ابھی یاد تھا جسے ماموں نے صلیب کے نیچے کچل کر قتل کر دیا تھا۔

اس درد انگیز سانحے کا ذکر چھیڑنا مناسب نہ تھا۔ میں نے پل کی طرف نظر اُٹھائی جو ہلکے سے کہر کے ہالے میں چھپا ہوا تھا۔ خربوزوں اور سیبوں کی مہک ہوا میں بسی ہوئی تھی شہر کے گلی کوچے روشنی سے جگمگا رہے تھے۔ اسی وقت دریا نے اگن بوٹوں کی روانگی کا بگل بجایا۔

ماموں نے کہا: "بھئی، اب چلنا چاہیے"۔

قہوہ خانے کے دروازے پر ہاتھ ملا کر اُس نے ہنستے ہوئے کہا:

"تمھیں مالی خولیا ہوا جا رہا ہے۔ ہر قسم کا خبط بُرا ہے۔ اُسے گولی مارو۔ ابھی تم نوجوان ہو۔ تمھیں تو بس یہ گُر یاد رکھنا ہے کہ بُری تقدیر بھی خوشی کی راہ میں حایل نہیں ہو سکتی"۔

میرا خوش مذاق ماموں اپنی گفتگو سے مجھے بھو چکا بنا کر چلتا بنا۔

شہر سے ہو کر میں کھیتوں میں نکل آیا۔ آدھی رات کا وقت تھا۔ کالے کالے بادل آسمان پر اُمنڈے ہوئے تھے اور میرا سایہ ان کے گہرے سائے میں گُم ہو گیا تھا۔ دریائے دولگا کے کنارے پہنچ کر میں گھاس پر لیٹ گیا اور دیر تک ندی، چراگاہ اور بے حرکت زمین

کو دیکھتا رہا۔ دریا کے پار بادلوں کے سائے آہستہ آہستہ گزر رہے تھے۔ چراگاہ تک پہنچتے پہنچتے ان میں ہلکی سی جوت پیدا ہو جاتی۔ گویا انھیں پانی میں غسل دیا گیا ہو۔ ہر شئے نیم خوابی کی حالت میں تھی اور اگر اس میں غیر محسوس طور پر حرکت پیدا بھی ہوتی تو گمان ہوتا کہ یہ کسی جبر کے تحت ہو رہا ہو ورنہ اسے زندگی اور حرکت سے کوئی خاص لگاؤ نہیں ہے۔

یک بیک خواہش ہوئی کہ کاش میں ساری دُنیا اور اپنے آپ پر ایسا افسوں پھونک سکوں کہ ہر فردِ بشر فرطِ مسرت سے متوالا ہو جائے، ہر طرف جشن و نشاط کا ترانہ بلند ہو، سب انسان ایک دوسرے کی محبت کے جویا ہوں، ایک دوسرے کے بھلے میں وقت گزاریں بغرض یہ کہ ساری انسانیت شرافت، حسُن اور جرأت کی صفات سے مالا مال ہو جائے۔

میں نے اپنے آپ سے کہا کہ: "اگر اپنے لیے کچھ نہ کیا تو تباہ ہو جاؤ گے۔"

پت جھڑ کے بے رنگ دِنوں میں جب سورج آنکھ سے اوجھل ہو جاتا ہے — بلکہ انسان اس کے وجود تک سے غافل ہو جاتا ہے — کبھی کبھی میں دشت نوردی کے لیے نکل پڑتا۔ نہ تو مجھے شاہراہ کا ہوش رہتا اور نہ پگڈنڈیوں کا بلکہ ان کی تلاش سے مجھے کوفت ہونے لگتی۔ ناک کی سیدھ میں خاک بسر سڑے ہوئے پیڑوں اور دلدل سے نکلے ہوئے لجلجے ٹیلوں کو پھاندتا ہوا چلا جاتا اور بالآخر ٹھیک رستے تک پہنچ ہی جاتا۔

اس طرح میں ایک فیصلے کی حد تک پہنچا۔

اسی پت جھڑ کے زمانے میں میں نے قازان، شہر کی راہ لی —— دل میں یہ خفیہ امید لیے ہوئے کہ شاید وہاں تعلیم کا کوئی سامان ہو سکے ——

تمام شد

ہماری زبان

انجمن ترقیٔ اُردو (ہند) کا پندرہ روزہ اخبار

ہر مہینے کی پہلی اور سولھویں تاریخ کو شایع ہوتا ہی

چندہ سالانہ ایک روپیہ - فی پرچہ پانچ پیسے

اُردو

انجمن ترقیٔ اُردو (ہند) کا سہ ماہی رسالہ

جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شایع ہوتا ہی

اس میں ادب اور زبان کے ہر پہلو پر بحث کی جاتی ہی۔ تنقیدی اور محققانہ مضامین خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ اُردو میں جو کتابیں شایع ہوتی ہیں، ان پر تبصرے اس رسالے کی ایک خصوصیت ہی۔ اس کا حجم ڈیڑھ سو صفحے یا اس سے زیادہ ہوتا ہی۔ قیمت سالانہ محصول ڈاک ملا کر سات رُپے سکہ انگریزی۔ (آٹھ رُپے سکہ عثمانیہ) نمونے کی قیمت ایک روپیہ بارہ آنے (دو رُپے سکہ عثمانیہ)۔

رسالۂ سائنس

انجمن ترقیٔ اُردو (ہند) کا ماہانہ رسالہ

ہر انگریزی مہینے کی پہلی تاریخ کو جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد سے شایع ہوتا ہی

اس کا مقصد یہ ہی کہ سائنس کے مسائل اور خیالات کو اُردو دانوں میں مقبول کیا جائے دنیا میں سائنس کے متعلق جو جدید انکشافات وقتاً فوقتاً ہوتے ہیں، یا بحثیں یا ایجادیں ہو رہی ہیں اُن کو کسی قدر تفصیل سے بیان کیا جاتا ہی اور تمام مسایل کو حتی الامکان صاف اور سلیس زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہی۔ اس سے اُردو زبان کی ترقی اور اہل وطن کے خیالات میں روشنی اور وسعت پیدا کرنا مقصود ہی۔ رسالے میں متعدد بلاک بھی شایع ہوتے ہیں۔

قیمت سالانہ صرف پانچ رُپے سکۂ انگریزی (چھ رُپے سکہ عثمانیہ)

خط و کتابت کا پتہ: معتمد مجلس ادارت رسالہ سائنس۔ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد۔ دکن

انجمن ترقیٔ اُردو (ہند) دہلی